هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

مرتبہ

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

مکتبہ الفرقان بریلی ۱۳۵۳ھ
میں ہر قسم کی علمی مذہبی کتابیں بکفایت ملتی ہیں

چندہ سالانہ
قسم اوّل
تین روپے
(۳ عہ)

ممالک غیر سے
قسم اول
سات شلنگ
پیشگی

جلد ۷ | بابت ماہ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ ہجری | نمبر ۱

باسمہ سبحانہ　　حمداً وسلاماً

نگاہِ اوّلین

افتتاح جلد ہفتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝

حق جل مجدہ کے فضل و کرم سے "الفرقان" کے سفر کی چھ منزلیں طے ہوگئیں، اور اُسی کی توفیق و بخشش کے اعتماد و بھروسہ پر ساتویں منزل کی طرف آج اس کا پہلا قدم اُٹھ رہا ہے جس مسبب الاسباب اور محافظ حقیقی نے اتنا سفر طے کرایا اسی سے پھر التجا ہے۔

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطَانًا نَّصِیْرًا ۝

خداوندا! توفیق دے کہ تیرے پاک دین کی حمایت اور تیری پسندیدہ ملت کی خدمت کا جو کام صرف تیری ہی اعانت کے بھروسہ پر کیا جا رہا ہے، ہم اس کو صحیح طور پر انجام دے سکیں،

الٰہ العلمین! نیتوں میں اخلاص، ارادوں میں عزیمت اور کوششوں میں برکت دے۔

مولا! رستہ کی مشکلات کو آسان فرما، اپنے نفس کے شر اور شیاطین الجن والانس کے مکروفریب سے بچا

غفور و رحیم! جو کوتاہیاں اب تک ہوئیں ان کو معاف فرما اور توفیق دے کہ آئندہ بھی کوئی کام تیری مرضی کے خلاف نہ ہو ———

رب کریم! ہم پر رحم و کرم فرما، ہم کو ظالموں کے فتنے سے بچا، ہم کمزور ہیں، آزمایش کے لائق نہیں، عاجز ہیں امتحان کے قابل نہیں، گنہگار ہیں بخشدے، خطاکار ہیں معاف کر ——— موت و حیات کے مالک! ہم جب تک زندہ رہیں تیرے دین پر قایم، تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنتوں پر عامل رہیں، اور انہی کی ملت بیضا پر ہمارا خاتمہ ہو ——— رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى

(اس سلسلہ کی اس سے پہلی قسط میں بندوں کے باہمی حقوق و تعلقات کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کا تذکرہ شروع کیا گیا تھا، اس ضمن میں "ماں باپ کے حقوق" "اولاد کے حقوق" "بڑوں کے چھوٹوں پر اور چھوٹوں کے بڑوں پر عام حقوق کے متعلق تعلیمات نبوی پیش کی جا چکی ہیں ——— آج اس سے آگے ملاحظہ ہو)

میاں بیوی کے باہمی حقوق و فرائض

انسانی تعلقات میں ایک اہم ترین تعلق میاں بیوی کا تعلق بھی ہے اور آدمی کی زندگی کو پُرسکون اور خوش گوار بنانے میں جتنا دخل اس تعلق کی درستی کو ہے شاید کسی اور چیز کو نہیں، اسی لیے پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات میں اس رشتہ کے حقوق و فرائض کو خاص اہمیت دی گئی ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جو میاں بیوی اس سلسلہ کے اسلامی احکام و ہدایات کی پوری رعایت رکھیں، اور ان کو اپنی زندگی کا دستور بنالیں ان کی زندگی راحت و برکت کی زندگی ہوگی، اور سکون و مسرت کے ساتھ اُن کے دن گزریں گے ——— اس باب میں اسلام کا اصولی اور بنیادی نظریہ وہ ہے جو سورہ بقرہ کی اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ ۲۰۶)

عورتوں کے حقوق مردوں پر دستور شرعی کے موافق ویسے ہی ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت حاصل ہے

ایک دوسری آیت میں اُن اسباب کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن کی وجہ سے مرد کو یہ فوقیت دی گئی ہے چنانچہ فرمایا گیا ہے۔

الرجال قوامون علے النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم (نساء ع ۶)

مرد عورتوں کے با اختیار کارپرداز ہیں بوجہ اس کے کہ اللہ تعالے نے بعض کے مقابلہ میں بعض کو بڑائی دی ہے اور نیز اس وجہ سے کہ مرد (عورتوں پر) خرچ کرتے ہیں

یعنی مرد کو درجہ کی فوقیت ایک تو اس لیے حاصل ہے کہ فطری طور پر مرد میں زندگی کا بار اُٹھانے کی قوت زیادہ ہے

اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو وہ صلاحیتیں زیادہ بخشی ہیں جو ذمہ دارانہ کارپردازی کے لیئے ضروری ہیں اور دوسرے اس واسطے کہ مرد، عورت اور اس کی اولاد کے مصارف زندگی کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ عقد نکاح ہی کے وقت دین مہر کی صورت میں وہ ایک رقم ادا کرتا ہے یا اُس کی ادائیگی اپنے ذمہ لیتا ہے ——— الغرض اسلام قانونی درجہ میں مرد کے لیئے ایک بڑائی ضرور تسلیم کرتا ہے اور مقررہ حدود کے اندر اس کو با اختیار کارپرداز اور گھر کا سردار قرار دیتا ہے اور عورت کو اس کی اطاعت کا بہ تاکید حکم کرتا ہے اور بے شک خانگی زندگی کو منظم کرنے اور ابتری سے بچانے کے لیئے کسی ایک کے لیئے یہ سرداری اور بالادستی ضروری بھی ہے (اور یقیناً بہ نسبت عورت کے مرد ہی اس ذمہ دارانہ عہدہ کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے) لیکن اسی کے ساتھ اسلام یہ بھی بتلاتا ہے کہ جس طرح عورت پر مرد کے حقوق ہیں اسی طرح، اور ویسے ہی حقوق عورت کے مرد پر بھی ہیں، اور اگر وہ اپنی بالاتری کو غلط طور پر استعمال کریگا اور عورت کے حقوق کی رعایت نہیں رکھیگا تو مجرم ہوگا۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے یہ چند ارشادات ملاحظہ ہوں :-

ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا شوہر کے ذمہ بیوی کے کیا حقوق ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا

ان تطعمہا اذا طعمت وتکسوھا اذا اکتسیت ولا تضرب الوجہ ولا تقبح ولا تھجر الا فی البیت (ابوداؤد)	یعنی کھانے پہننے میں اس کو برابر کا شریک رکھو اور اس کے منہ پر تھپڑ نہ مارو اور اسے بُرا بھلا نہ کہو، بدصورت نہ بتاؤ اور ناراضی میں بھی گھر کے علاوہ اس کو علیحدہ نہ کرو۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے اور کیسا حکیمانہ اور راحت بخش ارشاد ہے۔ فرمایا

لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منہا خلقاً رضی منہا اخر (مسلم)	کوئی مسلمان مرد اپنی مسلمان عورت (میں کوئی برائی دیکھکر اس) سے نفرت نہ کرے اگر اس میں کوئی عادت

ناپسند ہو تو کوئی نہ کوئی پسندیدہ اور خوش آئند عادت بھی ہوگی

اور آپ نے بارہا اپنے خطبات میں عورتوں کی راحت رسانی اور ان کے ساتھ اچھی معاشرت کی زبردست تاکید فرمائی۔ آپ کے خطابات میں بکثرت یہ ہدایت ملتی ہے کہ ——" استوصوا بالنساء خیرًا " عورتوں کے ساتھ حسن سلوک میں میری وصیت کو یاد رکھنا اور اس سے غافل نہ ہونا)

آپکی حیات مقدسہ میں غالباً سب سے اہم اور جامع ہدایات خطبہ وہ تھا جو حجۃ الوداع میں آپ نے دیا۔ اس میں بھی آپ نے اس بارہ میں بڑی تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا :-

الا واستوصوا بالنساء خیرًا فانما ھن عوان	خبردار! عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کے متعلق میری

عند کم الخ (ترمذی)

وصیت کو مانو اور یاد رکھو، وہ تمہاری ماتحت، اور تمہارے بس میں ہیں

ایک حدیث میں آپ نے آدمی کی بہتری اور خوبی کا معیار ہی یہ بتلایا کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں اچھا ہو فرمایا

خیرکم خیرکم لاھلہ (ابن ماجہ)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے حق میں زیادہ اچھا ہو

ایک اور روایت میں ہے "خیارکم خیارکم لنساءھم" یعنی تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے حق میں اچھے ہیں۔ (ترمذی)

عہد نبوت میں بعض لوگوں نے اپنی بیویوں کے ساتھ سختی کی اور ان کو مارا پیٹا۔ عورتوں نے آنحضرت کے اہل بیت (ازواج مطہرات)، کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی آپ نے صحابہ سے فرمایا:۔

لقد طاف بآل محمد نساء کثیر یشکون ازواجھن لیس اولئک بخیارکم (ابوداؤد)

بہت سی عورتیں میرے اہل بیت کے پاس اپنے شوہروں کی (بیجا سختی اور مار پیٹ کی) شکایت لے کر پہنچی ہیں —— ان بیچاریوں کو ستانیوالے یہ لوگ اچھے آدمی نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے حسن معاشرت کی تاکید کے علاوہ عورتوں کو حقوق وراثت بھی دیئے اور ان کے لیئے مناسب حصے مقرر کیئے

اس قسم کے احکام نے عورت کا درجہ کتنا بلند کر دیا۔ اس کا اندازہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے کیجئے:۔

ان کنا فی الجاھلیۃ ما نعد للنساء امرًا حتی انزل اللہ فیھن ما انزل وقسم لھن ما قسم (صحیح بخاری)

زمانہ قبل اسلام میں ہم لوگ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں سمجھتے تھے یہاں تک کہ حق تعالےٰ نے ان کے حقوق کے بارے میں احکام نازل کیئے اور ان کے حصے مقرر فرمائے

دوسری طرف عورت کو سخت تاکید کی گئی ہے کہ وہ شوہر کو اپنا آقا سمجھے، اس کی اطاعت کرے، اور ہمکان بھر اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرے یہاں تک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا۔

لو کنت اٰمرًا احدًا ان یسجد لغیر اللہ

اگر خدا کے سوا کسی اور کے لیئے سجدہ کرنے کا میں

لامرت المرأة ان تسجد لزوجها، والذی نفس محمد بیدہ لا تؤدی المرأۃ حق ربھا حتیٰ تؤدی حق زوجھا" (ابن ماجہ)	کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ اس ذات پاک کی قسم جسکے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی عورت اپنے خدا کے حق سے اُس وقت تک سبکدوش نہیں ہوسکتی جب تک کہ اپنے شوہر کا

حق ادا نہ کرے

ایک اور حدیث میں عورت کی نجات وفلاح کو شوہر کی رضامندی سے وابستہ بتلایا گیا ہے۔

ایما امرأة ماتت وزوجھا راض عنھا دخلت الجنۃ (ترمذی)	جو عورت ایسے حال میں اس دنیا سے جائے کہ اُس کا شوہر اُس سے خوش ہو وہ جنت میں جائے گی۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کا کہنا نہ مانے اس کی نماز تک قبول نہیں۔

اثنان لاتجاوز صلوتھما رؤسھما عبد أبق من موالیہ حتیٰ یرجع الیھم وامرأۃ عصت زوجھا حتیٰ ترجع (معجم صغیر واوسط، جمع الفوائد)	دو شخص ایسے ہیں جن کی نماز اُن کے سروں سے آگے نہیں جاتی، ایک وہ غلام جو اپنے آقا سے بھاگ گیا تا وقتیکہ لوٹ کر اُنکے پاس نہ پہنچے اور وہ عورت جو اپنے

شوہر کی نافرمان ہو تا وقتیکہ اس نافرمانی سے باز نہ آئے

بہرحال میاں بیوی کے باہمی حقوق کے بارہ میں اسلام کے احکام اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات کا حاصل یہ ہے کہ عورت شوہر کی فرماں بردار، اور اس کی خوشنودی کی متلاشی رہے اس کی آبرو اور اس کے گھربار کی محافظ اور امین رہے اور مرد بیوی کے ساتھ الفت ومحبت رکھے اس کی دلجوئی کرے، اس کے ساتھ اچھا سلوک رکھے اسکی ضروریات اور جائز خواہشات سے بے پروا نہ ہو، اور اس کو شریک زندگی سمجھے ——— اور ظاہر کہ جس گھرانہ میں فریقین ان ہدایات پر کاربند ہوں وہ گھرانہ مرد وعورت دونوں کے حق میں نمونہ جنت ہی ہوگا۔

عام قرابت داروں کے حقوق

ماں باپ، اولاد، اور میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ انسان کا ایک تعلق عام قرابت داروں سے بھی ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس کے اعتبار سے عام اہل قرابت کے بھی حقوق مقرر کیے ہیں، نیز میراث میں بھی ان تعلقات کا لحاظ رکھا گیا ہے اور علیٰ قدر مراتب ان اہل قرابت (ذوو الارحام) کو بھی وارث تسلیم کیا گیا ہے ——— قران کریم میں مکررات ومرات "ذوی القربیٰ" کے ساتھ حُسن سلوک کی تاکید

فرمائی گئی ہے اور کہیں کہیں تو نہایت اہم اور ضروری احکام و ہدایات کے ضمن میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے سورہ نساء میں ارشاد ہے:-

واعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا بہ شیئًا و بالوالدین احسانًا و بذی القربیٰ" (نساء ع ۶)	اور بس اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور اہل قرابت کے ساتھ نیکی کرو

اسی سورۂ نساء کے پہلے رکوع بلکہ بالکل ابتدائی آیات میں ایک جگہ تو "حق قرابت" کو "حق اللہ" کے ساتھ رکھا گیا ہے ارشاد ہے:-

وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِی تَسَاءَلُونَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ (نساء ع ۱)	اور جس خدا کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اُس کا اور رشتوں ناطوں کا خیال رکھو اور حق ادا کرو

محمدی شریعت میں حق قرابت کی اس رعایت کا نام "صلہ رحمی" ہے اور حدیث کی ہر کتاب میں اس کا مستقل باب ہے جس میں اس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت تاکیدی ہدایتیں دیکھی جا سکتی ہیں یہاں اس باب کی صرف ایک دو حدیثیں ہی ذکر کی جاتی ہیں۔

حدیث قدسی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب تعالیٰ شانہ کی طرف سے نقل فرماتے ہیں:-

قال اللّٰہ تعالیٰ انا اللّٰہ وانا الرحمٰن خلقت الرحم وشققت لھا اسمًا من اسمی فمن وصلھا وصلتہ ومن قطعھا بتتہ (ترمذی و ابوداؤد)	حق تعالیٰ کا ارشاد ہے میں اللہ ہوں اور میرا ہی ایک نام "رحمٰن" ہے "رحم" یعنی تعلق قرابت) میرا پیدا کیا ہوا ہے اور اپنے نام (رحمان) ہی کے مادہ سے میں نے اسکا

نام رحم رکھا ہے۔ تو جس نے اس تعلق کو جوڑا اور اسکا حق ادا کیا میں ذاسکو جوڑا اور جس نے اسکو توڑا اور اسکی رعایت نہ رکھی میں نے اسکو کاٹ دیا۔

حق قرابت کو پامال کرنے والے کے حق میں آپ نے ارشاد فرمایا

لا یدخل الجنۃ قاطع رحم" (بخاری و مسلم)	حق قرابت کو پامال کرنیوالا اور رشتوں ناطوں کا لحاظ نہ رکھنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

"صلہ رحمی" کی تاکید آپ نے یہاں تک فرمائی کہ اگر کسی کا کوئی رشتہ دار "حق قرابت" ادا نہ کرے تو جوابًا اور انتقامًا بھی دوسرے کو اُس سے ایسا معاملہ کرنے کی اجازت نہیں دی بلکہ حکم دیا کہ اس کے ساتھ بھی "صلہ رحمی" ہی کی جائے چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا

صل من قطعک	جو تم سے تعلق توڑے تم اس سے بھی جوڑو!

ایک اور حدیث میں فرمایا:-

لیس الواصل بالمکافی لکن الواصل من اذا	اصل "صلہ رحمی" کرنے والا وہ نہیں ہے جو صرف صلہ رحمی کو بدلہ میں

قطعت رحمہ وصلہا (بخاری) "صلہ رحمی" کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو الیسوں کے ساتھ بھی صلہ رحمی" کرے جو صلہ رحمی نہیں کرتے (یعنی جو اُن لوگوں کے حقوق قرابت کی بھی رعایت رکھتا ہے جو اس کا خیال نہیں کرتے)

ہمسایوں کے حقوق انسان کا ایک خاص تعلق اپنے اہل قرابت کے علاوہ ہمسایوں سے بھی ہوتا ہے اس تعلق کی استواری کے لئے بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں نہایت اہم اور مفصل ہدایات ہیں، خود قرآن مجید میں جہاں ماں، باپ اور دیگر اہل قرابت کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہاں ہی پڑوسیوں کے بارہ میں بھی ہی ہدایت کی گئی ہے، قرابت دار پڑوسی، غیر رشتہ دار پڑوسی مستقل پڑوسی اور عارضی وقتی رفیق غرض ہر قسم کے ہمسایوں کے ساتھ تفصیلاً حُسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے ــــ فرمایا گیا ہے۔

والجار ذی القربیٰ، والجار الجنب والصاحب بالجنب،

"جار ذی القربیٰ" سے مراد وہ پڑوسی ہیں جو پڑوس کے علاوہ کوئی دوسری بھی قرابت یا قربت رکھتا ہو اور "الجار الجنب" سے مُراد وہ پڑوسی ہے جس کے ساتھ ہمسائیگی کے علاوہ کوئی اور تعلق در ابطہ نہ ہو اور "صاحب بالجنب" سے مراد وہ لوگ ہیں جنکی عارضی صحبت و رفاقت حاصل ہو مثلاً رفیق سفر، ہمدرس طالب علم، شریک مجلس وغیرہ وغیرہ ــــ غرض قرآن پاک کی ہدایت ہے کہ قرابت داروں کی طرح اپنے ہر قسم کے ہمسایوں کے ساتھ بھی تمہارا برتاؤ نیک رہنا چاہیئے۔

"محمدی ہدایت" میں "حق جوار" کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے اس کا کچھ اندازہ ذیل کی احادیث سے فرمایئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ارشاد فرمایا

وَاللہ لا یومن، واللہ لا یومن، واللہ لا یومن، قیل من یا رسول اللہ؟ قال الذی لا یامن جارہ بوائقہ (بخاری)	خدا کی قسم وہ پورا مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ پورا مومن نہیں۔ واللہ وہ پورا مومن نہیں۔ عرض کیا گیا کون یا رسول اللہ؟ ارشاد فرمایا وہ جس کا پڑوسی اسکی شرارتوں سے امن میں نہیں۔

ایک حدیث میں فرمایا:۔

من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذی جارہ	جو شخص خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو کوئی ایذا نہ دے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا "لیس المومن بالذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ" (مشکوٰۃ)

وہ مومن نہیں جو خود سیر ہو کر کھائے اور پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے (مشکوٰۃ) (باقی)

تمدن اسلام کا پیام

بیسویں صدی کی دنیا کے نام

(از جناب مولٰنا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ بی۔ اے ایڈیٹر صدق لکھنؤ)

[یہ درحقیقت مولٰنا کا ایک لکچر ہی جو اب سے کئی ہفتے پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی "بزم تاریخ و تمدن اسلام" کے روبرو پڑھا گیا تھا۔ محترم مولٰنا نے اس میں جو کچھ کہا ہے تمدنِ اسلام کی زبان سے کہا ہی۔ بس یوں فرض کر لیجئے کہ اسلامی تمدّن کو قوت ناطقہ بخشدی گئی ہے اور وہ بصیغہ متکلم بیسویں صدی کی دنیا کو اپنا پیغام دے رہا ہے اور اپنی کہانی سُنا رہا ہے، خود مولٰنا نے اس پر ایک دو سطری نوٹ لکھا ہی وہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ مدیر]

"تمدن اسلام کا عظیم الشان پیغام اور اس کا حامل یہ گوشہ نشین و گمنام! نظر واسطے کی بے حقیقی و بے بساطی پر نہ کیجئے۔ تمدّنِ اسلام کا پیام خود تمدنِ اسلام کی زبان سے بصیغہ متکلم سنیئے"

بچّے، مسلم و کافر سب ہی کے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں مسلمان کے گھر میں ادھر بچّہ ہوا، اُدھر نہلا دُھلا، سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ گھر کے کسی بڑے بوڑھے نے، کسی نیک مرد نمازی نے آکر اُس کے دونوں کانوں میں اذان و اقامت کہی، گویا اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت کا پیام، بچہ کے دُنیا میں آتے ہی اُسے سنا دیا اور پھر کسی نے ایک خرما اپنے دانتوں سے کچل اور لعابِ دہن سے تر کر کے اُسے ذرا سا چٹا دیا کہ یہ سنت رسول اسلامؐ ہادی انام ہے۔

یہ سب کیا ہے؟ میری ہی یعنی مخصوص و خالص اسلامی تمدّن کی ایک جھلک!

بچّہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، ٹانگوں میں توانائی آئی، انگنائی میں اور باہر دوڑا دوڑ، ابھرنے لگا۔ زبان تلفظ پر کھلی، پڑھنے بٹھائے گئے، اب جو لفظ جو فقرہ سب سے پہلے زبان پر لایا گیا وہ یہ نہیں کہ "الف سے انڈا" یہ نہیں کہ A, FAT MAN RAN بلکہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہی بسم اللہ اس کی (BASIC) تعلیم ہے۔ یہی اُس کا کنڈر گارٹن یہی اس کا مانٹیسوری میتھڈ ——— وہی میری ایک جلوہ آرائی!

بچّہ نے اب ہوش سنبھالا، سیانا ہو کر اب تنہا سفر کرتا ہے۔ ریل پر جا رہا ہے، کھانے کا وقت آگیا، ناشتہ

ساتھ ہے یا تازہ کھانا اسٹیشن سے خریدا، ہاتھ دھویا، رومال بچھا کھانا رکھا، درجہ میں اور بھی ہمسفر ہیں، پہلے کے ملاقاتی نہیں، اجنبی محض، صاحب سلامت تک بھی نہیں لیکن ان میں سے جو مسلمان نظر آتے ہیں درخواست اُن کے سامنے پیش ہو رہی ہے کہ آئیے حضرت! کھانا حاضر ہے، اُدھر سے جواب ملتا ہے کہ بسم اللہ بارک اللہ، آپ نوش فرمائیں، نہ چھوت چھات کا سوال نہ ذات برادری کی پوچھ پاچھ، کہ اجنبی لوگ اپنی برابر کے ہیں بھی یا نہیں، اور نہ تعارف انٹروڈکشن کا انتظار ——— یہ آخر کیا ہے؟ میرا ہی ایک منظر تمدن اسلام ہی کا ایک اور نمونہ

بچہ جوان ہوا اور شادی کے قابل، لڑکے اور لڑکی دونوں کی مرضی پا لینے کے بعد ماں باپ تاریخ نکاح مقرر کرتے ہیں۔ دلھن کے گھر پر دولھا معہ اپنی پارٹی کے آئے، ہاتھوں ہاتھ لیئے گئے۔ زنانخانہ میں دلھن۔ مردانہ میں دولھا۔ دلھن نے کسی قدر رو رو کر باضابطہ منظوری وکیل نکاح کو دو گواہوں کے سامنے دی۔ انھوں نے محفل میں آکر قاضی کے سامنے دوہرایا۔ قاضی نے خطبہ میں حمد نعت پڑھی، اللہ و رسول کا کلام سنایا، آئندہ کے فرائض کو اسلام کی مقدس، اور مسلمانوں کی بین المللی زبان (عربی) میں یاد دلایا، نکاح اور اولاد کے برکات بیان کیئے، اور شوہر کی زبان سے مہر و قبول کا اقرار کرا کے اللہ سے زوجین کے حسن معاشرت کی دعائیں مانگ، رسم نکاح خوانی کو ختم کر دیا ——— شروع سے آخر تک نہ پوجا پاٹ، نہ مشرکانہ توہمات۔ وہی تمدن اسلامی کی ایک اور نقاب کشائی۔

بچہ بوڑھا ہوا سفر آخرت کی تیاریاں۔ بستر مرگ پر عزیز و قریب سب اکھٹے کوئی کلمہ پڑھ رہا ہے، کوئی سورۂ یٰس دم کر رہا ہے، کوئی صرف اللہ اللہ سنا رہا ہے، کہ جو آواز آنکھ کھولتے ہی دنیا میں سب سے پہلے سنی تھی، دم رخصت آنکھ بند بھی اسی نام پر ہو۔ کوئی آب زمزم حلق میں ٹپکا رہا ہے، کوئی چارپائی قبلہ رخ کر رہا ہے، دم آخر ہوا، بھائی، بھتیجے، بیٹے، پوتے سب لگے لپٹے ہوئے ہیں۔ کوئی ہاتھ پیر برابر کر رہا ہے، کوئی پیر کے انگوٹھے اور آنکھوں پر پٹی باندھ رہا ہے، یہ ہو چکا تو غسل کا پانی نیمگرم تیار ہوا، بیر کی پتیاں ڈالی گئیں کفن کا کپڑا آیا، اجلا اجلا پیراہن تیار ہوا۔ طہارت، وضو، غسل، سب باقاعدہ اور ترتیب کے ساتھ عمل میں آیا۔ کلمہ کا ورد، قرآن کی آیتیں، رسول کی بتائی ہوئی دعائیں برابر جاری۔ کافور جا بجا ملا گیا، کہ کل جو اعضا حشر میں چمکیں گے، اُن کی کچھ دھندلی سی جھلک تو یہیں نظر آ جائے، جنازہ بن ٹھن کر قبرستان روانہ ہوا "جیسے گلشن کی آخری ہو بہار" میت غریب سے غریب کی سہی، کاندھا بڑے سے بڑا آدمی دے رہا ہے۔ قبرستان سارے بستی والوں، یا سارے محلہ والوں کا ایک، یہ نہیں کہ سویلینس کا اور ملیٹری والوں کا، اور گورے اور کالے کا امتیاز مرنے کے بعد بھی قائم رہے نماز جنازہ پڑھی گئی، بوڑھے اور بچے سب نے مل کر خدائے واحد سے دعا مانگی کہ مغفرت و رحمت اس میت

کے بھی شامل حال رہے اور ہم سب کے بھی۔ میّت کو اگنی دیوتا، یا کسی اور دیوی دیوتا کے حوالہ نہیں کیا گیا، منتر کسی اور کے نام کے نہیں پڑھے گئے۔ بندہ کا ربط تمام تر و براہ راست معبود ہی کے ساتھ قایم رہا۔ قبر کے مکان میں آرام و احترام کے ساتھ اُتارا۔ قبلہ رُخ کر کے لٹایا۔ اُتارتے وقت آوازیں بلند رہیں بسم اللہ و باللہ و علیٰ ملۃ رسول اللہ، زمزم و عرق کیوڑہ کی خوشبو نے مٹی کے گھر میں قصرِ جنت کی دلآویزی پیدا کر دی۔ مکان کے دروازے پہلے لکڑی سے اور پھر مٹی سے بند ہوئے۔ ہاتھ مٹی کے ڈھیلے اُٹھا اُٹھا کر ڈال رہے ہیں، اور زبان ذکر الٰہی کا زمزمہ تسکین و تسلی سُناتی جا رہی ہے، کہ اس میں گھبرانے اور ڈرنے کی کونسی بات ہے (منہا خلقنکم) ارے یہ پیاری مٹی تو وہی ہے جس سے سارا گوشت پوست بنا تھا اور بنانے والے بھی ہم ہی تھے۔ بس اُسی کی طرف تو واپس ہو رہے ہو۔ یہ کوئی اجنبی اور نامانوس چیز تھوڑے ہی ہے، اور واپس کرنے والے بھی ہم ہی ہیں، اپنوں سے بڑھ کر اپنے کوئی غیر نہیں (وفیہا نعیدکم) اور اسی سے ایک دن پھر صحیح و سالم تمھیں برآمد کریں گے، اور پھر وہ بھی ہم ہی ہوں گے، سابقہ کسی اور سے پڑنے والا نہیں (ومنہا نخرجکم تارۃً اُخریٰ) چلتے چلتے پھر میّت کے حق میں دُعائیں خدائے واحد سے، اور پھر قبرستان سے واپسی مسلمان کی روزانہ زندگی کے سارے مناظر، پیدائش سے لے کر موت تک اپنی نگاہ کے سامنے لے آیئے، ہر جگہ آپ کو دوسری قوموں سے، دوسری ملتوں سے، دوسری متوں سے ایک شان امتیاز نظر آئے گی۔ اطوار و آداب میں، بیداری و خواب میں، وضع و لباس میں، بھوک اور پیاس میں، صبح بستر سے اُٹھے گا تو ساتھ ہی کہے گا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کھانے پر میٹھے گا تو لقمہ منہ میں بعد کو رکھے گا پہلے کہے گا بسم اللہ۔ پانی ٹھنڈا حلق سے اتارے گا تو ساتھ ہی منہ سے نکلے گا الحمد للہ۔ گوشت کے لیئے زبان چٹخارہ لے گی، تو تلاش حلال جانور کی کرے گا، اور اُسے بھی پہلے قبلہ رُخ لٹائے گا، بِسْمِ اللہ اور اللہ اکبر پڑھ لے گا جب کہیں جا کر چھری چلائے گا

بس اگر میری ہی نشانیاں اور میری ہی جلوہ آرائیاں نہیں ہیں تو آخر کیا ہیں؟

تعارف کے بعد یاد کر لیجیئے، اپنے ملک کے ایک زنار دار دہری کا یہ تجاہل کہ ہندوستان میں اسلامی تمدن سرے سے ہے کہاں؟ ——— آفتاب کی روشنی کا روز روشن میں اس سے بڑھ کر انکار کس نے اور کب کیا ہوگا؟ میں تو جزو ہوں ہر مسلمان۔ ہاں ہندی مسلمان کی بھی زندگی کا۔ اس کی روح میں داخل، اس کی ہر سانس میں شامل !

لیکن میری حقیقت اچھی طرح سمجھ لیجیئے۔ جزو ہوں۔ کل نہیں، فرع ہوں، اصل نہیں، شعاع ہوں آفتاب نہیں،

میری اصل و بنیاد جو کچھ ہے وہ دین اسلام ہے ——— دُنیا کی کشت زار کے حق میں بارانِ رحمت خالق کا اپنی مخلوق پر سب سے بڑا احسان ——— تمدّنِ اسلام کے معنے یہ نہیں کہ کسی ملک یا زمانہ کی مسلمان آبادی نے اکٹھے ہو کر جغرافی، تاریخی، نسلی حالات کے ماتحت اپنے لیئے کچھ دستور وضع کر لیئے اور ان کا نام تمدّنِ اسلام رکھ لیا۔ تمدن اسلام نام ہے اسلام کے تمدّن کا، مسلمانوں کے تمدن کا نہیں۔ میں مصنوع نہیں، مخلوق ہوں، بندوں کے ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں، خالق کے احکام کا آئینہ بردار ہوں۔ مسیحی تمدن، ہندو تمدن وغیرہ کے الفاظ سے دھوکا کھا کر میرے متعلق یہ نہ فرض کر لیجیئے، کہ جس طرح وہ نام ہیں دوسری قوموں کے ہزارہا سالہ مجموعی تاریخی روایات کے، حکایات کے، خرافات کے، اسی طرح میں بھی پیداوار ہوں، عرب و عجم کے اختلاط کا یادگار ہوں طغرل و سنجر کے اقتدار کا! تمدّن اسلام صرف وہ تمدن وہ طرزِ زندگی ہے، جو ثابت ہے قرآن پاک سے اور سنت رسول انام سے، اور یا پھر مستنبط ہوتا ہے انھیں دونوں سے، آئمہ مجتہدین واکابر فقہا کے قواعد واصول سے۔ یہ تصریح اس لیئے ضروری ہوئی کہ کہیں تعزیہ اور عَلَم، براق وضریح روشنی و آتشبازی، حلوہ و ملیدہ، ڈھول اور طنبورہ، چادر اور گاگر کو بھی میرا جزو نہ سمجھ لیا جائے، حاشا! میں ان سے بری، ایک بار نہیں، ہزار بار بری!

لوگوں کو یہ دھوکا یوں لگا، کہ اسلام کو دوسرے مذہبوں پر قیاس کر لیا گیا، اسلام دوسرے موجودہ مذہبوں کی طرح کوئی وردی نہیں کہ اسے اتوار کے دن گرجا جاتے ہوئے یا صبح و شام مندر میں پوجا کے لیئے جاتے وقت جسم پر ڈال لیا، اور واپسی میں اُتار کر ٹانگ دیا اور پھر ہر معاملہ میں آزاد، اور بے فکر اور مطلق العنان۔ جو چاہا کھایا پیا، جس طرح چاہا رہے سہے، جس سے چاہا ملے جلے ——— یہاں تو قدم قدم پر پہرا بیٹھا ہوا، آزادیوں کا دامن ہر طرف سے سلا ہوا۔ جانور فلاں حرام اور فلاں حلال۔ حلال کو بھی ذبیحہ کے طریق پر اپنے لیئے حلال کیجیئے، ورنہ اُس کے ذائقہ سے بھی محروم رہیئے۔ شراب نہ پیجیئے۔ افیون سے شوق نہ کیجیئے۔ بھنگ بوٹی سے دور ہی کی آشنائی رکھیئے، سودی کاروبار کے پاس نہ پھٹکیئے، ساہوکارہ کھول کر گھر بھر لینے کا خیال بھی دل میں نہ بسائیے۔ دہلی چاوڑی بازار یا لکھنؤ چوک سے گزرنا ہو تو کوٹھوں کی طرف آنکھ نہ اُٹھائیے۔ مرد ریشم سے اپنے جسموں کو زینت نہ دیں۔ عورتیں اپنی زیبائش جمال کی پھائیں بھی نامحرموں پر نہ پڑنے دیں۔ گھر میں بچّہ پیدا ہو تو یہ نہ ہو کہ خوشی میں آ کر لگے ڈھول پر ڈھول ٹوٹنے، اور طبلہ سارنگی کی آواز سے فضا گونجنے، اور کوئی عزیز چل بسے تو یہ نہ ہو کہ افراط غم میں شروع ہو جائیں شریعت کی زنجیریں ٹوٹنی غرض زندگی کا کوئی شعبہ، بڑا یا چھوٹا ایسا نہیں جس میں دینِ فطرت نے انسانی ہوا و ہوس کو آزاد و بے قید چھوڑ دیا ہو، اور اس کی انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کو طرح طرح کی ہدایات سے جکڑ نہ دیا ہو ——— ٹھیک اُس حکیم حاذق

کی طرح، جو مریض کو کھانے پینے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے، دوا دوش، ہر ہر جزیہ کی رعایت اپنے دستور العمل میں رکھے ہوئے ہے، اور ایک مکمل پروگرام چوبیسوں گھنٹوں کا آپ کے ہاتھوں میں دے چکا ہے۔

عقائد کے بعد، اس جامع، مفصل کامل و مکمل نظام عمل کے جتنے جزو کا تعلق براہ راست خالق سے ہے اُس کا نام سہولت کے لیئے عبادت پڑ گیا اور نماز و روزہ، حج وغیرہ اسکی قسمیں قرار پائیں، باقی جن اجزا کا تعلق بندوں کے باہمی میل جول، لین دین، صلح و جنگ، کھیل کود سے ہے، اُن کے مجموعہ کا نام ہے تمدن اسلام یا معاشرت اسلامی، اور یہی میں ہوں ——— میں پکار کر کہتا ہوں کہ دُنیا بھوک سے تڑپ رہی ہے اور میں ہوں اس کے لیئے ایک طاقت بخش غذا۔ دُنیا درد سے لوٹ رہی ہے، اور میں ہوں اُس کے حق میں نسخہ شفا۔ پریشانیاں جو کچھ بھی چھائی ہوئی ہیں سب اس لیئے کہ مجھے چھوڑ رکھا ہے مصیبتیں جتنی بھی آئی ہوئی ہیں سب اس لیئے کہ مجھسے مُنہ موڑ رکھا ہے۔ یہ دعوے کا اعلان ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ پیام پہونچ جائے بیسویں صدی کی زار و نزار لاغر و بیمار دُنیا کے کان تک، میرے فرزندوں کے ذریعہ سے، علیگڑھ کے جگر گوشوں کے وسیلہ سے۔

دُنیا آج نشہ بازی کی جن لعنتوں میں گرفتار ہے، اس کی داستان دُہرانے کے لیئے بھی وقت چاہیئے، افیون چانڈو، مدک، کوکین، ہیروئن، اور سب سے بڑھکر شراب۔ دنیا کی دولت کا اربوں روپیہ انھیں پر صرف ہو رہا ہے، اور پھر بیماریاں اور جرائم جوان سے پھیل رہے ہیں، ان کا شمار ہی نہیں۔ لیگ آف نیشنس کنونشن پر کنونشن تیار کرتی چلی جاتی ہے، کمیشن پر کمیشن بٹھاتی چلی جاتی ہے مختلف حکومتیں امتناع (پروہبیشن) کے قانون پر قانون بناتی چلی جاتی ہیں، اور دُنیا کے بڑے بڑے مُدبّرین کی عقلیں چرخ ہو گئی ہیں ——— میں جب زندہ و توانا تھا میرے عہد شباب میں بھی کوئی دُشواری اس قسم کی پیش آئی تھی؟ شراب تو عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اب اس کے اُن کے نزدیک جینا محال تھا، پھر محمد رسول اللہ کے زمانہ میں کتنے شرابی حجاز میں، نجد میں یمن میں، سارے ملک عرب میں باقی رہ گئے تھے؟ عمر فاروقؓ کے زمانے میں عراق، ایران، خراسان، حلب، دمشق، مصر سب میرے زیر نگیں آچکے تھے۔ اس سارے عرب امپائر میں کتنے افیونی تھے، کتنے شرابی؟ جواب دل کی عقیدت سے نہیں تاریخ کے اوراق سے حاصل کیجیے، تاریخ بھی شبلی نعمانی اور سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی نہیں، اُن کے قلم سے نکلی ہوئی جن کی زندگی کا مشن ہی اسلام، تاریخ اسلام کو سیاہ کر کے دکھانا ہے! ہمارے ہاں بھی کوئی تیوہار، کوئی مقدس گھڑی ایسی آتی ہے، کہ شراب کا چھونا، چکھنا، پینا، جسم پر لگانا بطور شگون ضروری ہو؟

میرے بچے بھی "یوکرسٹ" اور ہولی کے تقدس سے واقف ہیں، امتناع کے قوانین نافذ کرکے دُنیا میں ہی

ناقص اور ناتمام نقالی کی طرف آرہی ہے یا نہیں؟

نشہ اور جوئے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عرب تہذیب جاہلی جس طرح شراب کی متوالی تھی، جوئے کی بھی دیوانی تھی۔ اور آج کی مہذب قوموں کی زندگی میں تو جوا طرح طرح کے ناموں اور خوشنما و نظرفریب اصطلاحوں کے ساتھ رگ وریشہ میں پیوست ہوگیا ہے، لاٹری اور انشورنس، اور گھوڑ دوڑ میں بازی اور فٹ بال میں بازی، اور کارنیوال اور لکی بیگ اور کراس ورڈ پزل (الفاظ کے معمّے) وغیرہ وغیرہ مجنونوں اور امراض دماغی کے مریضوں کی کتنی تعداد ہر سال یہی خوش اعمالیاں بڑھا رہی ہیں (واقعات خودکشی کے اسباب، کس کثرت سے، بالآخر نشہ اور قمار ہی پر ختم ہوتے ہیں ——— میرے زمانہ عروج و اقبال کی تاریخ پڑھ جائیے، اُس عہد میں بھی کوئی مشہور جواری ملیگا! قمار کی عزت کسی نام کے ساتھ اور کسی پردہ میں نظر آئے گی، میرے دَور میں بھی کہیں اس کی نظیر ملے گی کہ فلاں عظیم الشان راجہ اپنے بھائیوں سمیت اپنا راج پاٹ، بلکہ اپنی عزت و ناموس تک جوئے میں ہار بیٹھے، اور بالآخر جلاوطنی پر مجبور ہوئے؟ میرے عہد میں بھی راجہ نل بطور ہیرو کے نظر آئینگے؟ میرے ہاں بھی دستور رہا ہے کہ نوروز یوں منایا جائے کہ لکشمی دیوی کی پوجا کے ساتھ جوئے کو بھی جزو عبادت بنا لیا جائے اور قانون تعزیرات ہند تک کو دو تین دن کے لیے جوئے کی آزادی دے دینی پڑے؟ میرے دَور میں بھی کسی مانٹ کارلو کی شہرت چکی ہے؟ میرے ہاں بھی کہیں ایسا ہوا ہے، کہ کسی علاقہ کی آمدنی کا بڑا حصہ جوئے ہی کی رقم سے آتا ہو؟ اُس وقت بھی کسی شہر سے متعلق یہ تصریح آپ کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں نظر پڑتی ہے کہ وہاں کے جوئے کی آمدنی کا ٹھیکہ فلاں کمپنی نے لیا ہے، اور وہ ہر سال حکومت کو ۹۰،۹۰ ہزار، یا ایک ایک لاکھ پونڈ دیتی رہتی ہے! ۱۳، ۱۳ لاکھ روپیہ سالانہ جب کمپنی کے کمیشن کا ایک حصہ ہو تو اُس بے انداز دولت کا جو جواریوں کی جیبوں میں اَول بدل کرتی رہتی ہے، کوئی اندازہ کرسکتا ہے؟ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے کہ قمار کی بندش ہو کیونکر؟ اسکی عمر تو تاریخ انسانیت کے دامن سے وابستہ ہے، بے شک یورپ کی تحقیق میں ایسا ہی ہوگا، کاش اس کلیہ سے تمدن اسلام کو مستثنےٰ کر دیا ہوتا!

خوشی کی تقریبات سبھی قومیں مناتی ہیں، لیکن جشن قومی کے موقع عموماً شرافت، متانت و عصمت کے مقتل ہی ہوتے ہیں، دوسری قوموں اور مذہبوں کی تاریخیں اُٹھا کر پڑھ لیجیے اور کتب بینی کی فرصت نہ ہو تو اپنی آنکھوں ہی سے گرد و پیش کی قوموں کا حال ملاحظہ فرما لیا جائے۔

سال میں دو جشن میرے ہاں بھی آتے ہیں، ایک عید، دوسرے عید الاضحیٰ، اور اسی کو عرف عام میں بقرعید کہتے ہیں، دونوں موقعوں پر خوشی اتنی ہوتی ہے کہ اس کے اظہار کے لیے عید کا نام ہی ضرب المثل بن گیا ہے لیکن اس بے اندازہ خوشی کے ساتھ، بدمستی اور بیخودی کہیں آس پاس بھی آنے پاتی ہے، یہاں یہ نہیں ہوتا، کہ ہزار ہا مرد ہر عمر اور ہر طبیعت کے اور ہزار ہا عورتیں ہر سن وسال کی دریا میں مخلوط غسل کے وہ وہ نظارے پیش کریں کہ خود بے حیائی کی نگاہیں نیچی ہو ہو جائیں۔ یہ بھی نہیں ہوپاتا کہ ہزار ہا کے مجمع پر (holiday mood) کی وہ بدمستی طاری ہو کہ پولیس کے سارے انتظامات اور ضبط و انضباط کی ساری بیجا شہرت کے باوجود سیوں لاشیں نکلیں، اور پچاسوں زخمیوں کے لیے ایمبولنس کار کی خدمات کی ضرورت پڑ جائے (امریکہ اور یورپ کے ہر میلے ٹھیلے کی رپورٹ انگریزی اخبارات میں پڑھ دیکھیے) یہاں ہوتا ہے تو یہ کہ عید سے لطف اٹھانے کے لیے پہلے مہینے بھر کے مسلسل روزے رکھیے، صبح سے شام تک دانا پانی اپنے اوپر حرام کر لیجیے، جب کہیں جا کر عید کا چاند نظر آئے گا، اس وقت اس عبادت کا شکر یوں عبادت ہی کی صورت میں منائیے، کہ روز صبح اٹھکر وضو کرتے تھے، آج غسل کیجیے، روز نماز پانچ وقت کی پڑھتے، آج چھ وقت کی پڑھیے۔ دن نکلنے کے بعد ذرا اچھا سا لباس پہن گھر سے باہر عیدگاہ کے قصد سے نکلیے اور وہاں پہونچکر سب کے ساتھ مل کر نماز پڑھیے، خطبہ سنیے۔ اور اس کے قبل ہی کچھ خیر خیرات کر ڈالیے اور دن بھر دوست احباب، عزیز آشناؤں سے ملتے رہیے جس عید کی اتنی دھوم مچی ہوئی ہے یہ ہے اس کی کل کائنات! بقرعید میں بجائے نقد و جنس کی خیرات کے، بعد نماز حسب مقدور جانوروں کی قربانی پیش کیجیے۔ عیدگاہ جاتے آتے، دونوں عیدوں کے موقع پر کسی مائی ماتا دیوی، دیوتا کی جے پکارتے نہیں، باواز بلند ذکر الٰہی کرتے رہیے!

کیا میرے ہاں بھی بندروں کے چہرے لگانے پڑتے؟ میرے ہاں بھی جسم پر راکھ اور بھبھوت مل، طرح طرح کے روپ بھرنے پڑتے ہیں؟ میرے ہاں بھی ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے گندے سے گندے گیت گانے ہوتے ہیں؟ میرے ہاں بھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے مارے پچکاریوں کے اس کی شکل بگاڑ دی، اور اس نے اسے اتنا رنگا کہ انسان کی بجائے انسان کا "کیری کیچر" بنا دیا؟ ——— مستیوں میں بھی اتنا ہوش، سوا میرے دامن کے، اور کس کے سایہ میں ملے گا؟ کھیل کود میں بھی اتنی صفائی اور ستھرائی! اس لطافت کی، اس نفاست کی، اس نظافت کی مثال اور کہیں ملے گی؟

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو؟

ہمسایہ قوموں میں اپنے اپنے تیوہاروں کو "پوتر" یعنی پاک وصاف بنانے کی جو تحریکیں شروع ہوئی ہیں یہ سب اگر میرا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟

حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کے اندازہ میں دُنیا اب تک کیسی کیسی خونریز غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے! اور آجتک اُنھیں غلط فہمیوں پر اصرار ہے۔ کوئی روس کی سوویٹ کے بُت کا پُجاری ہے، اور کسی کا عقیدہ ہے کہ فلاح قوم ونجات ملک نازیت یا فاسطیت سے وابستہ ہے، اور کسی نے اپنی لَو ڈیماکریسی (عمومیت) سے لگا رکھی ہے، اور پھر ان میں سے ہر ایک عقیدہ کے "پرچار" (اشاعت) کے لیے دلائل استعمال ہو رہے ہیں، توپ اور مشین گن، بم اور گیس کے، میں نے اپنی طاقت کے وقت بتایا، اور بتایا کیا صاف صاف راستہ دکھایا کہ یہ ساری غلط فہمیاں شاخ ہیں ایک اساسی غلط فہمی، یعنی مقصد حکومت کی گمراہی کی جڑ یہی ہے، انسان نے حاکم اپنے کو سمجھ لیا، اور قوی کمزور پر، زبردست زیردست پر حکمراں ہو بیٹھا۔ میں نے علی الاعلان کہا کہ حکومت تو صرف اللہ کی ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ بشر بشر پر حاکم کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ بشر کا کام خلافت الٰہی، نیابت الٰہی، قوانین الٰہی کا نفاذ ہے۔ قانون ساز وہ نہیں، قانون ساز تو کوئی اور ہے۔ بشر کا کام الٰہی قاعدوں اور ربانی ضابطوں کو دُنیا میں صرف چلانا، پھیلانا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن (آئین ودستور) والی ساری دشواریاں اس ایک نکتہ سے کافور ہوگئیں۔ اب میرے سامنے یہ سوال ہی نہ رہا کہ کانسٹی ٹیوشن کیا ہو سوال صرف یہ رہ گیا کہ اس کے چلانے والے کون ہوں؟ وہ ہوں جو متدین ہوں، جو صاحب ضمیر ہوں، کیرکٹر والے ہوں، امین ہوں متقی ہوں، اپنے اعمال، واقوال واحوال کے ذمہ دار وجواب دہ، مخلوق کے سامنے نہیں، خالق کے سامنے ہوں۔ اور فاروقؓ وصدیقؓ کی حکومتوں نے دکھلا دیا کہ بغیر انسانی دماغوں کے تیار کیے ہوئے کاغذی نظام کے بغیر لکھو کھا روپیہ کی اسمبلی اور کونسل کی عمارتوں کے بغیر کونسلوں میں نامتناہی سلسلۂ سوال وجواب کے بغیر منسٹروں سکریٹریوں، پارلیمنٹری سکریٹریوں کی وساطت، اور بغیر سکریٹریٹ کی انبوہ در انبوہ فوج کے، روئے زمین پر عدل کی حکومت کس طرح قایم ہو سکتی ہے۔

زن ومرد کا باہمی رشتہ اور تعلق سمجھنے میں دنیا نے شروع سے اب تک کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور برابر کھاتی جارہی ہے۔ کسی نے کہا عورت مرد سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے، اور اس کی پرستش شروع کر دی، کسی نے کہا مرد مالک ہے اور اس نے عورت کو باندی سے بدتر رکھا، اور کوئی بولا کہ دونوں بالکل مساوی ہیں، اور اپنے قاعدہ قانون کی بنیاد اس نظریہ مساوات پر رکھنی چاہی، میں نے اپنے دَور میں ان ساری بے اعتدالیوں سے

ہٹ کر عین منشائے فطرت کے مطابق فیصلہ یہ کیا کہ بلحاظ اصل و خلقت دونوں ایک ہی ہیں (خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً) بلحاظ عمل دونوں کے مرتبے آخرت میں یکساں ہوں گے (لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثیٰ اور للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن) میرے ہاں یہ بحث کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی کہ آیا عورت بھی ذی روح ہے؟ اور نہ میرے ہاں کبھی دینی مقتداؤں کی کونسل نے جمع ہو کر اس سوال کا جواب نفی میں دیا اور نہ میرے ہاں یہ عقیدہ رہا کہ عورت و شیطان ہم جنس ہیں بلکہ میں نے تو یہ کہا کہ علاوہ آخرت کے دنیا میں بھی جہاں تک انسانی حقوق کا تعلق ہے، عورت مرد میں کوئی فرق نہیں، بیویوں پر جس طرح شوہروں کی خدمت لازمی ہے، اسی طرح شوہروں پر بھی بیویوں کی دلجوئی فرض ہے (ولهن مثل الذی علیهن) لیکن اس کے آگے جہاں انسانیت کا اشتراک ختم ہوتا ہے، صنفیت کا امتیاز شروع ہوتا ہے اور اگر یہ امتیاز نہ ہو تو پھر دونوں صنفوں کی تفریق کے معنی ہی کیا رہتے ہیں؟) اس امتیاز میں انتظامی حیثیت سے مرد کو عورت پر افسری اور بالادستی حاصل ہے (للرجال علیهن درجة) کفالت، خبرگیری، بیرونی جد و جہد کے فرائض صنف قوی، مرد کے ذمہ عائد ہوتے ہیں (الرجال قوامون علی النساء) اور اسی مناسبت سے اُسے قوے بھی عطا کیے گئے ہیں۔ عورت کے ذمہ دوسری قسم کی، یعنی اہلی و خانگی ذمہ داریاں ہیں، بچوں کی پیدائش، پرورش، ان کی سیرت سازی وغیرہ، اور سب سے بڑھ کر مرد کی نظر میں مرغوبیت۔ محبوبیت (اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً) اور اسی لیے اُسے دوسری قسم کے آلات و قویٰ سے مسلح کر کے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اب اس قدرتی تفریق، امتیاز کو بھی اگر کوئی شخص خلاف عدل سمجھے تو یہ اعتراض بالکل اسی درجہ کا ہوگا جیسے کوئی یہ کہے کہ خاتم النبیین عرب میں کیوں پیدا ہوئے، ہندوستان اور جاپان کو اس دولت سے کیوں محروم رکھا گیا؟ یا فلاں ملک کے باشندے گورے کیوں بنائے گئے، اور فلاں ملک کے کالے کیوں؟ (ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض)

میرے ہاں کے سارے قوانین نکاح، طلاق، عدت، خلع، تعدد ازدواج وغیرہ انھیں بنیادی، و فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں اور آج دنیا کے سارے اگلے اور پچھلے قانون سازوں کو، مشرق اور مغرب کی ساری پارلیمنٹوں، قانونی کونسلوں کو، لیجسلیٹو اسمبلی کو چیلنج پر چیلنج دے رہے ہیں کہ دکھاؤ کوئی نظام قانون اتنا جامع۔ ایسا ہر پہلو کی رعایت رکھنے والا، ایسا ہر مصلحت پر شامل (فاتوا بسورة من مثله) رومی مشرکوں اور متاخر یونانیوں نے طلاق کا دروازہ کھولا، تو نوبت یہاں تک پہونچی کہ ایک ایک رومی خاتون کے لیئے آٹھ آٹھ دس دس شوہروں کی شمع خلوت روشن رکھنا معمولی سی بات بن گئی، اور بعض نے تو اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ترقی کر دکھائی۔ لیکی کی ہسٹری آف یورپین مارلس" (تاریخ اخلاق یورپ) اور ویسٹر مارک کی ہسٹری

آف میرج" (تاریخ نکاح) ذرا پڑھ کے تو دیکھیے۔ ادھر مسیحی کلیسا نے حضرت مسیح کی تعلیم کو مسخ کر کے وقوع طلاق پر بالکل مہر ہی لگا دی ، نتیجہ یہ ہوا کہ فحش اور بدچلنی کے گرد جو بند باندھ دیا گیا تھا، وہ ٹوٹا اور سیلاب پوری ہلاکت خیزیوں کے ساتھ بڑھا، خود آج امریکہ اور یورپ کی عدالتوں میں مقدمات طلاق کی کیسی گرم بازاری ہے۔ اخبارات میں ان کی رپورٹیں ملاحظہ فرمائیے۔ مشرق کی بدنام حرم سرا کی خلوتوں کا جواب کئی گنی کثرت کے ساتھ، مغرب کی نیک نام عدالتوں کی جلوتیں مہیا کر رہی ہیں یا نہیں؟ اسی طرح ہندوستان کے ہندی اور ہندو تمدن نے اس دروازہ پر قفل چڑھائے رکھنے کی صدیوں تک ناکام کوشش کر دیکھی۔ اور اب آخر کار، ہر طرف سے تھک کر، ہار کر، ہر تدبیر سے عاجز آ کر، برطانیہ اور فرانس، جرمن اور اٹلی امریکہ اور ہندوستان سب کہیں کے مصلحین اور مقننین، اسی نقطۂ اعتدال کی طرف آ رہے ہیں یا نہیں جو میں مدتوں پیشتر مقرر کر چکا ہوں؟ یعنی طلاق کی اجازت خاص خاص قیود اور شرائط کے ساتھ۔ گو اب بھی اپنی کج رائی و خود رائی پر اعتماد کر کے اور مجھ سے بے نیاز رہ کر، طرح طرح کی ٹھوکریں کھائی جاتی ہیں۔

میں نے جس طرح طلاق کو عین فطرت بشری و احوال انسانی کے مطابق چند قیود و شرائط کے ساتھ محدود کر کے روا رکھا ہے، اسی طرح مرد کے لیے بھی چار شادیوں کی اجازت" اس کی ضرورتوں، مصلحتوں، سہولتوں کی رعایت، نیز ملک و قوم کے عرف عام کا اعتبار کر کے دی ہے۔ اور علاوہ عدل کے، طلاق ہو یا تعدد ازدواج، بہ طور قاعدۂ کلیہ، حسن معاشرت کی قید ہر جگہ لازمی رکھی ہے (وعاشروھنّ بالمعروف) ایسی کسی صورت کی گنجائش میں نے نہیں رکھی، کہ عورت پر خواہ مخواہ ظلم ہو، ہندیوں نے مدتوں ایک بیاہتا بیوی کے ہوتے دوسری بیوی کا نام لیتے کانوں پر ہاتھ دھرے، فرنگیوں نے "پالیگمی" کا تلفظ کر کر کے خوب خوب ٹھٹھے لگائے لیکن حقائق و واقعات کی ٹھوس دنیا نہ تبرّی و تحاشی کے نعروں سے پگھل سکتی ہے۔ نہ تالیوں اور قہقہوں سے اب The case for Polygamy کے نام سے خاص لندن میں بیٹھ کر کتابیں لکھی جاتی ہیں، اور طنز و تعریض کے نعروں میں بھی اب نہ وہ بلند آہنگی باقی رہ گئی ہے، نہ وہ جوش و خروش۔ صنفیات کے وہ نئے نئے پیچدار مسائل جنھوں نے برنارڈ شا اور برٹرینڈ رسل جیسے فلسفیوں اور مفکروں سے لیکر ادنی اخبار نویسوں تک کو غلطاں و پیچاں، حیراں و سرگرداں کر رکھا ہے کبھی میرے دور عروج میں بھی پیدا ہوئے تھے؟ (What a show traffic) کی الجھنیں سلجھانے والی بیسیوں کمیشنوں اور کمیٹیوں کے بعد بھی قائم رہ جانے والی الجھنیں، کبھی اس وقت بھی نمودار ہوئی تھیں؟ برتھ کنٹرول اور کنٹراسیپشن کی عالمگیر ہنگامہ خیزی، گو خود یورپ و امریکہ میں ذلت و نامرادی کا منہ دیکھ رہی ہے لیکن مس رابرٹ سینگر اور مس میریا اسٹوپس کے بے پناہ پروپگنڈہ کی سلامتی میں خود ہندوستان کے ایک ایک اسکول تک پہونچ چکی ہے مگر جن ممالک میں میرا آج بھی تھوڑا بہت اثر باقی ہے

نجد و حجاز و مراقش وغیرہ وہاں کوئی خواب بھی اس کا دیکھ سکتا ہے؟ پیشہ ور (پروفیشنل) اور شوقیہ (امیچر) پراسٹیٹیوشن کے یہ اعداد (ملاحظہ ہو اسکاٹ کی ہسٹری آف پراسٹیٹیوشن) بن بیاہی ماؤں کی یہ افراط، ناجائز ولادتوں کا یہ انبار آج بھی کہاں ہے؟ ماسکو اور نیویارک، لندن اور پیرس کے جگمگاتے ہوئے ہوٹلوں، پارکوں، اور ایوانوں میں، یا ان ملکوں اور شہروں میں جہاں اب بھی کچھ ٹوٹے پھوٹے آثار پائے چلے جا رہے ہیں؟

"انقلاب زندہ باد" کا نعرہ آج بچہ بچہ لگاتا ہے۔ کبھی آپ نے اس شخص کی بھی سیرت پر نظر کی ہے جو دنیا میں ایک مستقل مستمر انقلاب (PERFECT UAL REVOLUTION) پھیلا گیا؟ اور جس کا پیدا کیا ہوا "انقلاب" عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، ہر شعبۂ حیات میں آج بھی ساری دنیا کے مقابلہ میں ایک چیلنج ہے اور قیامت تک رہے گا۔ آیئے اس کی ایک ہلکی سی جھلک مولانا شبلی کی سیرۃ النبی کی وساطت سے دیکھتے چلیں

"گھر کا سارا کام کاج خود کرتے کپڑوں میں پیوند اپنے ہاتھ سے لگا لیتے۔ گھر میں جھاڑو خود دے دیتے۔ بکریوں کا دودھ اپنے ہاتھ سے دوہ لیتے۔ بازار سے سودا خود جا کر لاتے۔ جوتہ پھٹ جاتا تو اسے ٹانک لیتے۔ غلاموں کے ساتھ، مسکینوں کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے، ان کے ساتھ کھانا کھانے میں کسی قسم کا تکلف نہ تھا گدھے کی سواری سے عار نہ تھا ایک بار مکان سے باہر تشریف لائے، لوگ تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا، یہ اہل عجم کی طرح بار بار تعظیم کے لیئے اٹھنا کیا معنی؟

صحابہؓ جانیں فدا کرنے کو تیار رہتے تھے، ہر بڑی سے بڑی خدمت، اور اس کی راہ میں بڑی سے بڑی .... مشقت اپنے لیئے باعث فخر و سعادت سمجھتے تھے اس پر بھی یہ حال تھا کہ جب وہ کوئی کام کرنے لگتے تو آپ بھی ان کے شریک ہو جاتے اور مزدوروں کی طرح کام انجام دینے لگتے۔ مدینہ میں جب مسجد نبوی تیار ہونے لگی، تو دست مبارک سے اینٹیں اٹھا اٹھا کر لاتے اور جاں نثار خدام کی جماعت یہ کہتی ہی رہ جاتی کہ ہماری جانیں آپ پر قربان، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ غزوۂ احزاب کے موقع پر جب صحابہ، شہر مدینہ کے گرد خندق کھود رہے تھے۔ آپ نے بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ جسم مبارک پر خاک کی تہہ جم گئی۔ غزوۂ بدر میں سواریاں بہت کم تھیں۔ تین تین آدمیوں کے درمیان ایک ایک اونٹ پڑتا تھا آپ بھی عام آدمیوں کی طرح ایک اونٹ میں دو اور شخصوں کے ساتھ شریک رہے اور خدام و جان نثاران اپنی باری پیش ہی کرتے رہ گئے"۔

(سیرۃ النبی جلد ۲ صـ۲۲۷ ملخصاً)

کوئی دو چار دس پانچ واقعات ہوں تو انھیں گن کر بیان کر دیا جائے، اُس مقدس ہستی کی مقدس زندگی تو لبریز انھیں واقعات سے ہے، کوئی پوری سیرت نبوی اس مختصر صحبت میں کیسے سُنا ڈالے، یہ نمونہ اُس ذات نے پیش کیا جو نبوت و رسالت کے روحانی مراتب سے قطع نظر بہر حال اپنی قوم کا بڑا دُنیوی سردار بھی تو تھا۔ آج دُنیا کے ڈکٹیٹروں (آمروں) کو چھوڑ دیئے، بادشاہوں اور تاجداروں کو بھی الگ کیجئے۔ رئیسوں اور امیروں کا جو برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ، اور افسروں کا جو معاملہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ رہتا ہے، ان سب کو بھی جانے دیجئے۔ جو صاحب جلسوں میں تھوڑی دیر کے لیئے صدر منتخب ہو جاتے ہیں خود ان کا رویہ والنٹیروں (رضاکاروں) کے ساتھ کیا رہتا ہے؟ —— ایک نمونہ زندگی کا وہ تھا، ایک یہ ہے۔ اُس نمونہ کے بعد کہیں بھی بالشویزم کا، انارکزم کا، بغاوت کا اسٹرائک کا جو باقی رہ سکتا ہے؟،

دو دو واقعات ملتے چلتے امیرے عہد زریں کے اور سُنتے چلیئے۔ غزوہ تبوک میں سامان رسد کی کمی پڑ گئی، اور صحابہ بھوک سے نہایت درجہ پریشان ہوئے خیال ہوا کہ اونٹ ذبح کیئے جائیں، اس پر جرح یہ ہوئی کہ معرکۂ جنگ میں سواریاں بھی تو اہم چیزیں ہیں، بالآخر آپ نے یہ کیا کہ ہر شخص کے پاس سے اس کا بچا ہوا سامان رسد طلب فرمایا کوئی کم لایا کوئی زیادہ ایک چادر پر اکٹھا کر کے آپ نے اُس پر دُعائے برکت فرمائی، اور پھر سب سے کہا کہ اپنے اپنے برتن اس مجموعہ سے بھر لیں راویوں کا بیان ہے کہ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لیئے اور خوب سیر ہو کر کھایا، اور سامان پھر بھی بچ رہا۔ اسی طرح ایک اور سفر میں جب آپ نے سامانِ رسد میں نمایاں کمی اور صحابہ میں بھوک کی بیتابی دیکھی تو سب کا زادراہ ایک چادر پر ڈھیر کرا لیا۔ اُس نے کل اُتنی جگہ گھیری کہ اُس پر ایک بکری بیٹھ سکے اور اشخاص کی تعداد.. ۱۴ لیکن اُس پر بھی سب لوگوں نے سیر ہو کر کھا لیا اور اپنے اپنے توشہ دان بھر لیئے

(سیرۃ النبی جلد ۳ صفحہ ۲۴۳ ملخصاً)

محدثین نے تو ان واقعات کو کتاب الایمان وغیرہ کے ماتحت درج کیا ہے اور انھیں معجزات نبوی میں شمار کیا ہے، معجزہ تو نبی کی ایک ایک بات تھی، لیکن میں کہتا ہوں کہ صحیح کمیونزم کی مثال ان واقعات سے کہیں بڑھ کر ملے گی؟ پھر اسی کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کو بھی ملا لیئے کہ ریاستِ حجاز، بلکہ سارے ملک عرب کے اُس فرماں روا کا عام سامانِ معیشت کیا تھا؟ رہنے کے لیئے صرف معمولی حجرہ! بادشاہوں کے محل اور رئیسوں، اور امیروں کی کوٹھیاں الگ رہیں، اُن کے ایک بڑے کمرہ سے بھی چھوٹا حجرہ! نہ کوئی الگ بڈ روم، نہ ڈرائنگ روم، نہ ڈائننگ روم، اسی حجرہ کے اندر سارا انتظام خانہ داری! اور اُس کا فرنیچر؟ محض کھجور کی کُھرّی چٹائی، جس پر لیٹنے سے جسم مُبارک پر بدھیاں پڑ پڑ جاتی تھیں کوچ اور صوفے نہ سہی روم کے پُر لطف اور ایران کے ریشمی قالین تو ہوتے! اور خیر یہ تو عہد سراپا خیر و برکت اور سراپا تقدس

تھا ہی صدیقی وفاروقی کے راستہ سے ہوتے ہوئے عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں آیئے کہ وہ تو ایک بادشاہ تھے، اور بادشاہ بھی خاندان بنو امیہ کے، وہاں بھی تاریخ کی زبان آپ کو یہ واقعات سُنائے گی کہ

"خلیفہ ہونے کے بعد جب شاہی سواریاں آئیں تو ان کو یہ کہکر واپس کر دیا کہ میرا خچر میرے لیئے کافی ہے سوار ہو کر چلے تو کوتوال نے برچھا لے کر آگے آگے چلنا چاہا اُس کو یہ کہکر ہٹا دیا کہ میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، قصر خلافت میں داخل ہوئے تو تمام پردوں کو چاک چاک کرا دیا اور خلیفہ کے لیئے جو فرش بچھایا جاتا تھا اُس کو فروخت کر کے اُس کی قیمت بیت المال میں داخل کر دی،

"ایک بار ایک لونڈی پنکھا جھل رہی تھی کہ اس حالت میں اُس کی آنکھ لگ گئی۔ انھوں نے خود پنکھا لے لیا اور خود اُس کو جھلنے لگے۔ وہ جاگی تو بولے کہ تو بھی میری طرح آدمی ہے تجھے بھی میری طرح گرمی معلوم ہوئی، میں نے چاہا کہ جس طرح تو نے مجھے پنکھا جھلا ہے میں بھی تجھے پنکھا جھل دوں" (سیرۃ عمر بن عبد العزیز صفحہ ۶۲-۶۳)

یہ سب میراہی تو پرتو تھا، اور آگے چلیئے، تاریخ اسلام کی چھ صدیوں کا سفر طے کر کے ساتویں صدی ہجری کی ہندوستان میں آجایئے۔ اس وقت دلّی کے تخت پر سلطان ناصر الدین محمود نظر آئیں گے۔ تاریخ کی زبان اُن کے حق میں یوں گویا ہے :-

نفقہ، خاصۂ خود را از وجہ کتابت مصحف مجید ساختہ روزگار خود می گزرانید و اموال پادشاہی را در نفقۂ خود اصلا صرف نہ می نمود

قرآن مجید کی کتابت کر کے اُسی کو وجہ معاش بنالیتے اور شاہی مال و دولت سے ہرگز اپنا ذاتی خرچ نہ چلاتے" (تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۷۱ نولکشوری)

اور پھر تصریح ہے کہ ایک بار ایک امیر سلطنت نے بادشاہ کا خط پہچان کر اُن کے مکتوب قرآن کو گراں معاوضہ پر لے لیا تھا، اس کی خبر سلطان کو ہو گئی تو ناخوش ہوئے اور حکم دیا کہ آئندہ میرا لکھا قرآن بازاری نرخ پر، بالکل خفیہ ہدیہ ہوا کرے۔

میرے عہد میں ممکن نہیں کہ کوئی بیوہ۔ بڑھیا، کوئی یتیم بچہ، کوئی معذور، کوئی اپاہج، کوئی مسکین، بھوکا اور بے رزق سوئے۔ میرے نظام میں زکوٰۃ فرض ہو۔ یعنی ہر صاحب استطاعت پر لازم ہے کہ اموال نامیہ یعنی نقد اور سونے چاندی سے چالیسواں حصّہ، اور زمینی پیداوار سے بیسواں اور دسواں حصّہ اور مویشیوں جانوروں

سے بھی ایک مقررہ تعداد میں، غریبوں، مسکینوں، اہل حاجت کو دیتا رہے۔ اور پھر یہ شرح لازمی ہے یعنی اگر نہ دے گا تو اسی طرح قابل مواخذہ رہے گا جس طرح اللہ کی براہ راست عبادت و نماز وغیرہ کے ترک سے اور پھر اس سے زیادہ جتنا بھی ہو سکے دیتا رہے۔ یہ دینا سب اپنے اجر و ثواب، اپنی ہی فلاح و بہبود کے لیے ہے، کسی poor law system کی اجرا کی میرے حدود کے اندر مطلق ضرورت نہیں۔ اس نظام زکوٰۃ و صدقات کی قدر کوئی ڈاکٹر ڈراپر امریکی سے، اور ڈاکٹر لائٹنر (سابق ڈائرکٹر پنجاب سے) اور پھر امریکہ کے ایک زندہ ماہر نفسیات و اجتماعیات ڈینیین کے وہاں سے پوچھیے کیپٹلزم (سرمایہ داری) کی لعنت کی اصل بنیاد کیا ہے؟ سود اور صرف سود، شرح زیادہ ہو یا کم، سود خوار ہی ایسا شخص ہے، جو برخلاف تاجر کے جسے صدہا خطرات سے دوچار رہنا پڑتا ہے، اور برخلاف ورکرز (عمال) کے بے ہاتھ پیر ہلائے اور بلا کسی قسم کا خطرہ برداشت کیے مال پر قابض اور جائداد کا حصہ دار ہو جاتا ہے۔ میں نے فلسفہ معاشیات میں اسی دکھتی ہوئی رگ کو پکڑ کر کاٹ دیا ہے۔ اور سود کو ہر صورت میں ممنوع قرار دیا ہے۔ آج دنیا، اور خود ہندوستان کی دنیا۔ سرمایہ داری کے خلاف بڑے سے بڑے پرشور نعرے بلند کر رہی ہے۔ لیکن ہے بجز میرے کسی میں یہ ہمت کہ خون چوس چوس کر پلنے والے ساہوکاروں ہی کی نسل کا سرے سے قلع قمع کر دے؟

اس زمین میں کمیونزم کا پودا جڑ پکڑ سکتا ہے؟ اس فضا میں سوشلزم کا تخم کبھی پھول پتیاں لا سکتا ہے؟ یہاں مراد اس جھوٹے سوشلزم اور کمیونزم سے ہے، جو مزدک ایرانی کا چلایا ہوا ہے اور جس کی ان سو ڈیڑھ سو برس کی زندگی کا حاصل صرف طبقہ واری جنگ اور اخلاقی انارکی نکلا اور جو محض روس کی نقالی میں ہندوستان کے سر تھوپا جا رہا ہے ورنہ سچی سوشلزم اور صحیح کمیونزم تو لازمۂ شرافت و انسانیت ہے، اور عین میرا جزو ہے، اور اسی کی تو مثالیں ابھی ابھی پیش ہو چکیں ——— میں نے اپنے نظام میں ہر شخص کو اس کی ذاتی محنت و اہلیت اور اس کے بزرگوں کی جائداد سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع دیا ہے اور فطرت کے قایم کیے ہوئے فرق مراتب کو پوری طرح قایم رکھا ہے، اور اس حد تک میں کمیونزم کا مخالف ہوں، لیکن دوسری طرف میں نے سود کو قطعی حرام کر کے سود در سود کے چکر کو ہمیشہ کے لیے بند کر کے جائداد کو مختلف حصہ داروں میں تقسیم کر کے خیرات و صدقات کی انتہائی ترغیب دے کر اور احسان رکھنے کے بجائے انھیں خود ایک نوع کی خدمت قرار دے کر، اور زکوٰۃ کی فرضیت پر زور دے کر اور ضعیفوں، مسکینوں، سب کے پورے پورے حقوق قرار دے کر، سرمایہ پرستی (کیپٹلزم) کو بھی ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔

موضوع کی وسعت قریباً بے پایاں، بزم کا وقت محدود مختصر۔ میرے پیام کا خلاصہ در خلاصہ چند لفظوں میں یہ ہے کہ دُنیا کے لیئے پیام امن اگر ہے تو میری ہی ذات ہے۔ خوب غور کر کے دیکھ لیجیئے۔ جرایم کی تعداد روز افزوں کہاں ہے اور بمنزلہ صفر کہاں؟ چوری کے، ڈکیتی کے، نقب زنی کے، آتش زنی کے، زہر خورانی کے، جعلی دستاویزوں کے، حرام کاری کے، دروغ حلفی کے، قتل کے، ضرب شدید و خفیف کے۔ خودکشی کے واقعات وہاں زیادہ پیش آتے ہیں، جہاں میرے نام سے بھی عداوت ہے، یا جہاں میری تھوڑی بہت حکومت قایم ہے؟ جنون اور دماغی اور عصبی بیماریاں شدت سے کہاں پھیلی ہوئی ہیں؟ میری عملداری میں، یا میرے دشمنوں کے قلمرو میں؟ اندھے پن کے، بہرے پن کے آنکھوں اور کانوں کی طرح طرح کی پیچیدہ بیماریوں کے لیئے نئے نئے آلات کی نئے نئے اسپتالوں کے کھلنے کی ضرورت کہاں پیش آ رہی ہے؟ کالجوں والے، یونیورسٹی والے، سینما والے، تھیٹر والے، ٹرام والے، مل اور فیکٹری والے، ورکشاپ اور مشین والے شہروں میں، یا وہاں، جہاں ابھی تک میری سادگی قائم ہے؟ معدہ، آنت، دانت اور آلاتِ ہضم کی خرابیاں کہاں زیادہ پھیل رہی ہیں؟ وہاں جہاں بڑے بڑے شاندار ہوٹل موجود ہیں، جہاں پُرتکلف غذاؤں پر منہ ہر وقت چلتا رہتا ہے، جہاں برف اور طرح طرح کے مصنوعی پانیوں کی گرم بازاری رہتی ہے، اور جہاں سگرٹ اور سگار اور ایل اور وسکی کے دور ہر وقت چلتے رہتے ہیں۔ یا میرے سادہ دسترخوان پر؟ عام صحتیں کہاں درست رہتی ہیں؟ وہاں جہاں طہارت و غسل سے لوگ ناآشنا ہیں اور جہاں صبح آٹھ آٹھ اور نو نو بجے ہوا کرتی ہے؟ یا میرے ہاں جہاں طہارت اور وضو فرض ہے، اور غسل کی پوری ترتیبات موجود اور جہاں سونے کے لیئے لازم کہ پچھلے پہرے اگر نہ سہی تو کم از کم قبل فجر تو ضرور ہی اُٹھ بیٹھے، اور دن رات میں کم از کم مسجد تک تو پانچ مرتبہ آمد و رفت رکھے۔ آتشک اور طرح طرح کی اور جان لینے والی گندی بیماریوں کا زور کہاں ہے؟ وہاں جہاں ہر پارک میں، ہر کلب میں، ہر موٹر پر، ہر ٹرین پر، ہر کشتی پر، ہر جہاز پر مرد و عورت کا آزادانہ اختلاط قایم ہے، جہاں زنانہ لباس کی عریانی یا نیم عریانی داخل فیشن ہے، جہاں نمائشِ جمال و زیبایش عیب نہیں، ہنر ہے، اور جہاں آرٹ اور فائن آرٹ کے پردہ میں ہر بے پردگی اور ہر بے حیائی دلیل کمال ہے، یا میرے حجروں اور زاویوں میں جہاں نہ کوئی سینما کے نام سے آشنا، نہ کوئی برہنہ رقاصی کا قدردان، جہاں نہ کوئی عصمت فروشی کا بازار نہ کوئی ہائڈ پارک، اور جہاں کے بسنے والے پابند ہیں قانون حجاب کے، اور پتلے ہیں شرم و غیرت کے؟ راحت قلب و سکون خاطر کہاں زیادہ نصیب ہے؟ وہاں جہاں چوبیسوں گھنٹے تار اور ٹیلیفون اور گراموفون اور ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر گھنگھناتے رہتے ہیں، اور جہاں اخبار فروش ہر لمحہ اپنی روزی کے لیئے ایک نیا ہیجان تلاش کرتے رہتے ہیں، یا وہاں جہاں کے باشندے قناعت

اور صبر ضبط نفس کے فضائل کا سبق پڑھ چکے ہیں؟ غرض روح کی بالیدگی و تازگی کے سوال کو تو چھوڑ دیجئے ٹھیٹھ مادیات کی عینک سے مجھے اور میرے حریف کو دیکھئے اور پھر اپنی حالت کو سوچئے ع

چشم بروے من کشا باز بہ خویشتن نگر

اور بیسویں صدی سے جو مجھے چھوڑ چکی ہے اور چھوٹتی جاتی ہے کہیئے،

بہ بیں کہ باکہ بریدی و باکہ پیوستی

گو یہ بھی ایک عجیب تماشہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ غیر شعوری طور پر میرے قریب آتی جاتی، اور میری بکھرے ہوئے اجزا کو میرا نام زبان پر لائے بغیر، میری جانب منسوب کیئے بغیر، ایک ایک کر کے اپنے اندر سمیٹتی ہی جاتی ہے

اسلام کا نظریۂ سیاسی

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ "یہ ایک جمہوری نظام ہے" پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے، مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے شاید ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنھوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو، اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظام جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر جمہوریت کا نام اس پر چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت ہی کچھ اس طرح بنی ہو کہ دنیا میں (اور خصوصًا ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو، اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا ان کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اُس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی با اثر شخص کی سرپرستی اُس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالبًا ان کا خیال یہ ہو کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قایم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم........ اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید اڈیشن ہے۔ اور جب ڈکٹیٹر شپ کا آوازہ اُٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعت امیر، اطاعت امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ دیکھو، یہاں سارا نظام جماعت ڈکٹیٹر شپ ہی پر قایم ہے۔ غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستاں، ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ کیا ہے۔ اس طرح نہ صرف اُن پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائیگا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنھوں نے حال میں علی الاعلان یہ لکھ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا" بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دُنیا کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہو جائے گی جس کی وہ سخت حاجتمند ہے اگرچہ

اپنی اس حاجتمندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف قسم کی چیزیں لاکر جمع کر دی گئی ہوں، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اُس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں سے متعلق اُس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصولِ اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصولِ اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں، اور جڑوں سے تنہ، اور تنے سے شاخیں، اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں، اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن

اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد ابن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اُٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اُتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھیے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مالکم من الٰہٍ غیرہ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی ہو کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری واطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟ آیئے ہم تحقیق کرکے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دُنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی

لڑائی بھی اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق، اور خود ان کفار مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے، اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں۔

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ؟ قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۔ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (المومنون - ۵)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کا ہے، کہو، پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ۔ کہو پھر تم کس ہو کہ میں ڈال دیئے گئے ہو؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنكبوت ۶)

اور تم اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں و زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ خدا نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟... اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی اُتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو، زندگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ... لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (الزخرف - ۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں، اور اس کے خالق ہونے اور مالک ارض و سما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے، لہذا ظاہر ہے کہ ان ہی باتوں کے منوانے کے لیے تو انبیا کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھیے کہ انبیا کی آمد کس لیے تھی، اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟ قرآن کہتا ہے

کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیا کہتے تھے جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو۔ مگر دُنیا اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ آئیے، ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیا کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دُنیا کیوں اس پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں، مگر معاف کیجیے گا، معبود کے معنے آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادّہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے ہیں۔ عبادت کے معنے محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت کے لیے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کرنا، جس کام کا اشارہ ہو اسے بجا لانا، جو کچھ آقا طلب کرے اُسے پیش کر دینا، اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ بنائے اُس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اُس پر چڑھ دوڑنا، جہاں اس کا فرمان ہو سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصلی مفہوم ہے، اور آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح کرتا ہے۔

اور رب کا مفہوم کیا ہے؟ عربی میں رب کے اصلی معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے، لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو رب المال، اور صاحب خانہ کو رب الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش اور سرفرازی کی اُمید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائے گی، جس کو اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرماں برداری و اطاعت کرے وہی اس کا رب ہے۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھیے اور پھر غور سے دیکھیے۔ انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعوے پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعوے لے کر اُٹھتا ہے اور اُٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشِ اقتدار، یا خواہشِ انتفاع اُسے اس بات پر

اُبھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے۔ ان سے اپنی بندگی کرائے۔ ان کے سر اپنے آگے جھکوائے۔ ان پر اپنا حکم چلائے۔ ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے۔ جس کو کچھ طاقت یا دولت، یا چالاکی و ہوشیاری، یا کسی نوع کا زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے، پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بے وقوف، یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جما دے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں، اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے یا جن کے پاس خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں، اس لئے وہ براہ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی پادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہدیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں) اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے) جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی الٰہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیجنے کی قدرت رکھتا ہوں لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو (لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ)، اسی طرح ایک وہ پادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انھیں ذرا غور کے ساتھ پڑھیے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھِیْمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ، قَالَ اِبْرٰھِیْمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (بقرہ ۳۵)	تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے ابراہیم سے حجت کی اس بارہ میں کہ ابراہیم کا رب کون ہے؟ (اور یہ حجت کیوں کی؟ اس لئے کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے

ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے، تو اسے ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا

غور کیجئے وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا اس لئے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرمان روا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں

تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً ارضِ بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ اور یہ دعویٰ اس بنا پر تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پر وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پر لٹکا دے اور جس کی چاہے جان بخشی کر دے، یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے، اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم سے اسکا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو۔ میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیم نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانونگا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کرونگا جو زمین و آسمان کا رب ہے، اور جس کی عبادت یہ سورج کر رہا ہے، تو وہ حیران رہ گیا، اور اس لیے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیونکر قابو میں لاؤں؟

یہ خدائی، جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دُنیا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لیئے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسمِ عبودیت بجا لائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدائیگان (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا، اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرمان روا خاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے — چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آج تک مشہور ہیں — راجہ کو ان داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کیئے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی، ایسا ہی حال دُنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرمان رواؤں کے لیئے الٰہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں، مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خدائی کے لیئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں الٰہ اور رب ہونے ہی کا دعویٰ کرے نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اُس فرماں روائی و حکمرانی، اُس آقائی و خداوندی کو قایم کرتے ہیں، جسے فرعون اور نمرود نے قایم کیا تھا، دراصل وہ الٰہ اور رب کے معنے و مفہوم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چاہے الفاظ کا دعوےٰ نہ کریں۔ اور وہ سب لوگ جو انکی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہرحال ان کے الٰہ اور رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہِ راست اپنی اُلٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لیکر اُٹھیں اور اسے منوالیں البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں۔ سو ان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح، کسی دیوتا، کسی بُت، کسی قبر، کسی سیّارے، کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں

کہ یہ تمھیں نفع اور ضرر پہونچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں یہ تمھارے ولی اور محافظ و مددگار ہیں. ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمھیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے. انھیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہونچیں گے. مگر انھیں خوش کرنے اور ان کو تمھارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں. ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں. ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان مال آبرو سب کچھ دیدو. بہت سے بیوقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں، اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہو۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے خدائی کرتے ہیں. کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست اللہ تک نہیں پہونچ سکتے، اس کی بارگاہ تک پہونچنے کا ذریعہ ہم ہیں. عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے، اور تمہاری پیدائش سے لیکر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی. کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کرتے ہیں. یوں ان کی زبان قانون بن جاتی ہے" اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں. یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصلی جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ. اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی اس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں. اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے. مگر اب تو ہزار ہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، گویا اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو. اگر اللہ کو نہ مانے گا، تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے، بلکہ اس صورت میں بہت سے الٰہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔

غور سے دیکھیے. کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس (Political Bureau) کے ارکان باشندگان روس کے ارباب و آلہہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین اُن کا رب الارباب نہیں؟ روس کا کونسا گاؤں اور

کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اس خداے روسیاں کی تصویر موجود نہیں؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے اس میں سوویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر سے واقف ہولیں، تب ان کو دین بالشویکی میں داخل کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو خواہ وہ جماعت (Community) کی نمائندگی ہی کر رہا ہو، کروڑوں انسان کے دماغوں اور ان کی روحوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اس کی شخصیت کا جبروت اور اس کی کبریائی ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے؟ اسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قایم ہوتا ہے یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے۔ یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت و نمرودیت کی اور زاریت و قیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اٹلی کو دیکھیے۔ وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الہٰوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ۔ جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ کبیر۔ انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بنک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب آلہہ بنے ہوئے ہیں۔

غرض آپ جدھر نظر ڈالیں گے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور کہیں ایک ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہیں رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قایم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اول تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے، جس محیط اور تمام حقائق پر حاوی نگاہ کی ضرورت ہے، جس حکمت اور عدل اور بے خطا میزان کی ضرورت ہے، اور جس بے لوثی و بے غرضی و بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں پر انسانوں کی الٰہیت و ربوبیت قایم ہوئی وہاں انسانی زندگی میں صحیح توازن کبھی قایم ہی نہ ہوسکا وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اس کی پیدایشی قوتوں اور

صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عاید ہو کر رہیں جنھوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقاء کو روک دیا کس قدر سچ فرمایا اُس صادق و مصدوق علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:-

قال اللہ عزوجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاء تھم الشیاطین فاجتالتھم من دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم (حدیث قدسی)

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے آکر ان کو گھیر لیا انھیں فطرت کی راہ راست سے ہٹالے گئے، اور جو کچھ میں نے ان کے لیئے حلال کیا تھا، ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اسکی تمام محرومیوں کی اصلی جڑ ہے۔ یہ اس کی ترقی کی راہ میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہ وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الہٰوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لیئے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الہٰوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انسانی زندگی میں انبیاء علیہم السلام نے کی۔ وہ دراصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لیئے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اُنھیں دھکیل کر پھر اُس حد میں واپس پہونچائیں، جو اس حد سے نیچے گرا دیئے گئے ہیں، اُنھیں ابھار کر اس حد تک اُٹھا لائیں، اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظام زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہٍ غیرہ[۵] "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اسکے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں ہے"۔ یہی حضرت نوحؑ نے کہا، یہی حضرت ہودؑ نے کہا، یہی حضرت صالحؑ نے کہا، یہی حضرت شعیبؑ نے کہا، اور اسی کا اعلان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہ:-

[۵] ملاحظہ ہو سورہ ہود رکوع ۴-۵-۶-۸

إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (ص۔ ۵)

میں تمھیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اُس ایک اللہ کے جو رب پر غالب ہے، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ... وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (اعراف ۷)

یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو.... اور سورج اور چاند اور تاروں کو سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اسی کی۔

ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوهُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ (انعام ۱۳)

وہ ہے اللہ، وہی تمہارا رب ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ ہر چیز کا خالق ہے۔ لہٰذا تم اس کی بندگی کرو۔ اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ (البینہ)

انسانوں کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی اطاعت کریں۔

تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ (آل عمران ۔ ۷)

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادّی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لیے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ویضع عنہم اصرھم والاغلال التی کانت علیہم یعنی یہ نبی ان پر سے بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریہ سیاسی کا نقطۂ آغاز انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لیئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قایم ہے۔ اسلامی سیاست کا اولین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لیئے جایئں کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں۔ وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے:۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ (یوسف۔ ۵)	حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو یہی صحیح دین ہے۔
یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ؟ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ (آل عمران)	وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہدو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّھٰذَا حَرَامٌ (النحل۔ ۱۵)	اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہدیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔
وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ۔ ۷)	جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت (Sovereignty) صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز (Law-giver) صرف خدا ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذات خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ ہی کے حکم کا پیرو ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (انعام ۵) "میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لیئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء۔ ۹)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن (Sanction) کے تحت اس کی اطاعت کی جائے
اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ (انعام۔ ۱۰)	یہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب دی حکم (authority) سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی۔

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (آل عمران - ۸)	کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم (authority) اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم ربانی ہو۔

پس اسلامی سٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات، جو قرآن کی مذکورۂ بالا تصریحات سے نکلتی ہیں، یہ ہیں کہ:-

(۱) کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ، بلکہ سٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت (Sovereignty) کی مالک نہیں ہے۔ حاکمِ اصلی صرف خدا ہے، اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہیں۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لیئے کوئی قانون بنا سکتے ہیں، اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

(۳) اسلامی سٹیٹ بہرحال اُس قانون پر قایم ہوگا جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے۔ اور اس اسٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیت

ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریت (Democracy) نہیں ہے۔ اس لیئے کہ جمہوریت تو نام ہی اُس طرزِ حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین بنیں اور انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو، جس قانون کو وہ چاہیں وہ نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتاب آئین پر سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے، لہذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لیئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں۔ مگر یورپ جس تھیا کریسی سے واقف ہے، اسلامی تھیا کریسی اُس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیا کریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ (Priest class) خدا کے نام سے خود اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرتا ہے[۱]، اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت

[۱] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں لہذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشات نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہکر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فویل للذین یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ۔

کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو (Theo-democracy) یعنی "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ (Paramountcy) کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت (Limited Popular Sovereignty) عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ یعنی (Executive) مسلمانوں کی رائے سے بنے گی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات، اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہوگا وہاں کوئی مخصوص نسل یا طبقہ نہیں، بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہوگا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہونچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے مگر جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی لیجسلیچر کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سرِ مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے۔

ایک اعتراض آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر یہ حدود و قیود کیوں عائد کیے گئے ہیں۔ اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ ایک خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی، جس کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھئے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انھیں اپنی حاکمیت چند منتخب لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور انھیں نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی، اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈا کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے اِلٰہ بن جاتے ہیں

عوام کے فائدے کے لیئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لیئے قوانین بناتے ہیں، اور اُسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے، ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے۔ یہی انگلستان میں ہے اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو آج جمہوریت کی جنت ہونے کا دعوےٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (judgment) عموماً ایک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قایم کر سکتا ہے، بلکہ بسا اوقات عقلی و علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اُس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لیئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition law) کی مثال پیش کرونگا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لیئے مضر ہے، عقلی اور ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے، اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لیئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔ مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو اُنہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پییں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار ان ہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تھا اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اُس قانون کو بدلنے پر مصر تھے جسے انھوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا۔ اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون (legislatot) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الہٰوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا، اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنا لے گا۔ لہذا وہ اس کا

محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" (Divine limits) کہا جاتا ہے۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبے کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیئے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لیئے ضمنی اور فروعی قاعدے (Regulations) بنا سکتے ہو مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کروگے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

حدود اللہ کا مقصد

مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کرکے چند سرحدی نشانات لگا دیئے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاشی معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal liberty) بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (class war) اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ پر منتہی ہوتی ہے

اسی طرح عائلی زندگی (family life) میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر بیوی اور بچوں کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعدد ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کرکے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کرے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ ان ہی گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اُٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیئے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لیئے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود اور ایسے ہی چند مستقل قاعدے مقرر کرکے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیئے بند کر دیئے ہیں۔

میرے لیئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کرکے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لیئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل، ناقابل تغیر

تبدل دستور (constitution) بناکر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح کی آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے اور اس کی قوتیں غلط رستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پر پیچ پہاڑی رستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی کو سلب کرنا ہے؟ نہیں۔ اصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرہ کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ رستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رُخ پر نہیں اس رُخ پر مُڑنا چاہیئے تاکہ تو بسلامت اپنی منزلِ مقصود پر پہونچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معین کرتی ہیں، اور ہر پرپیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا رستہ اِس طرف ہے، تجھے اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابل تغیر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ٹرکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے۔ یہ قیامت تک کیلئے اٹل دستور ہے اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور کے ساتھ بنے گا جب تک قرآن اور سنت رسول دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور رہے۔

اسلامی اسٹیٹ کا مقصد اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ بنے، اسکے لئے ایک مقصد بھی خدا نے معین کر دیا ہے، اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہی۔ مثلاً فرمایا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔ (الحديد — ۳)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایتوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ انصاف پر قایم ہوں، اور ہم نے لوہا اُتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد سیاسی قوت ہے۔ اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہی کہ اللہ تعالےٰ نے اپنی واضح

ہدایات اور اپنی کتاب آئین میں جو میزان اُن کو دی ہے، یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن (well balanced) نظام زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی ہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (social justice) قایم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا:۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج۔ ۶)	یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن دحکومت عطا کریں گے تو یہ نماز قایم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دینگے اور بدی سے روکیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۱۲)	تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے اس کا مقصد محض سلبی (Negative) نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایجابی (Positive) مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے۔ اس کا مُدّعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، انکی آزادی کی حفاظت کرے، اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے بلکہ اس کا مُدّعا اجتماعی عدل کے اُس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے۔ اس کا مقصد بدی کی اُن تمام شکلوں کو مٹانا، اور نیکی کی اُن تمام صورتوں کو قایم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع ومحل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائیگی، تبلیغ وتلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم وتربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ اس نوعیت کا اسٹیٹ، ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلّی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (Personal) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاسستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھینگے کہ اس کلّیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانہ کی کلّی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے، اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship)

پائی جاتی ہو اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قایم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قایم کی گئی ہیں انھیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل بے اختیار گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنھوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، اور جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس پر کامل عقیدہ رکھتے ہوں، بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے جو شخص بھی اسے قبول کرے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (Subject) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی، اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہوگا تو اس سے خدمت بھی لی جائے گی لیکن بہرحال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے، لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں ہے جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا بازار گرم ہو، اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر زمین کے جہنم سائبیریا کی طرف پھینک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لیے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خط امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی و جعلی مصلحین اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اس کے طرز تعمیر کی تھوڑی سی تشریح کروں گا

یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم خداوند تعالیٰ ہے۔ اس اصل اصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے اٹھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخود پکار رے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔ ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:-

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (النور۔ ۷)	اللہ نے وعدہ کیا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ ان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، اُسی طرح جس طرح اُن سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا

یہ آیت اسلام کے نظریۂ ریاست (Theory of state) پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کیے گئے ہیں:-

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت (Sovereignty) کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ (Vicegerent) ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات (Delegated powers) استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا، بلکہ یہ کہا کہ ان کو خلیفہ بناؤنگا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوئی ہے وہ عمومی خلافت (Popular vicegerency) ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راعٍ وکل راعٍ مسئول عن رعیتہ[1]) اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حقیقت یہی اسلام میں ڈیموکریسی کی اصلی بنیاد ہے۔ عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

(۱) ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہونگے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہوگی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

لیس لاحدٍ فضل علی احد الا بدین و تقوی الناس کلھم بنو آدم و آدم من تراب	کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ اگر ہے تو دین کے علم و عمل و تقوی کے اعتبار سے ہو۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی۔	کسی عرب کو عجمی پر فضیلت ہے نہ عجمی کو عرب پر نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے تو تقوی کی بنا پر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان، قریش کو، جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الآباء۔ ایھا الناس کلکم من آدم و آدم من تراب لا فخر للانساب۔ لا فخر للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ	قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے نسب کا فخر ہیچ ہے عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

(۲) ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کے لئے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے (social status) یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں (Disbilities) نہیں ہوسکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقا میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیئے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور سے بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے افسر اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چار جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج ان کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اسمعوا و اطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ بنا دیا جائے۔

(۳) ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا کسی گروہ (group) کی ڈکٹیٹر شپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی

رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیئے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف اُن عام خلفا کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاعِ مطلق، یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹر شپ اصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ ایک کلی ہیئیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اسکا دائرہ وسیع ہے، مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہی کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمراں کو نافذ کرنا ہے خدا نے زندگی کے ہر شعبے کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ کی جائینگی۔ مگر ان ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمراں خود (Regimentation) کی پالیسی اختیار نہیں کرسکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کرسکتا کہ فلاں پیشہ کریں، اور فلاں پیشہ نہ کریں، فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں۔ اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ جو اختیارات روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیئے ہیں، یا جن کو اتاترک نے ٹرکی میں استعمال کیا، اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کیئے علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ یہ شخصی جوابدہی (Personal responsibility) ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں لہذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری طرح آزاد ہونا چاہیئے کہ اپنے لیئے جو راستہ چاہے اختیار کرے، اور جدھر اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اُسی طرف بڑھنے کے لیئے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رُکاوٹ ڈالے گا اور اس کی شخصیت کے نشو و نما میں حائل ہوگا تو وہ خود اس ظلم کے لیئے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفاء راشدین کی حکومت میں (Regimentation) کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

(۴) ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیئے اس لیئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی خاص معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قایم کی ہے دوسری طرف اس نے ایسی انفرادیت (Individualism) کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت (Socialism) کی نفی کرتی ہو۔ یہاں فرد اور جماعت کا تعلق اس طرح قایم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت

جماعت میں گم ہو جائے، جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظام اجتماعی میں ہو جاتی ہے، اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لیئے نقصان دہ ہو، جیساکہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصد حیات وہی ہے جو جماعت کا مقصد حیات ہے، یعنی قانون الٰہی کا نفاذ اور رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید براں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح محفوظ کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لیئے مخصوص فرائض بھی عائد کر دیئے گئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت (Harmony) پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشوونما کا پورا موقع بھی ملتا ہے، اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح وبہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل مبحث ہے جس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سد باب کرنا تھا جو اسلامی جمہوریت کی مذکورہ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

اسلامی اسٹیٹ کی ہیئت ترکیبی

خلافت عمومی کے تصور کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کو نظر میں رکھنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدر حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے اُس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کر کے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اُس کے لیئے "خلیفہ" کا لفظ جو استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز (concentrate) ہو گئی ہے۔

اب میں مختصر طور پر اس طرزِ حکومت کی چند خاص خاص تفصیلات بیان کروںگا تاکہ اس کا ایک واضح خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔

(۱) امیر کا انتخاب ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کے اصول پر ہوگا، یعنی عام مسلمان جس کے کیرکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لیئے چُنا جائے گا۔ اور جب وہ چُن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ وسپید کے اختیارات ہوں گے۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جائے گا۔ جب تک وہ خدا ورسول کے قانون کی پیروی کرے گا اس کی کامل اطاعت کی جائے گی۔

(۲) امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابلِ عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا، اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔

(۳) امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے، اگرچہ اس کی مثال خلافت راشدہ میں نہیں ملتی۔

(۴) عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی طرف قلت ہے اور باطل کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ ایک جم غفیر اس کی تائید میں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ مگر ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوف خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے، یا نفسانیت کے ساتھ۔ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسند امارت سے نیچے بھی اُتار لا سکتی ہے۔

(۵) امارت، یا مجلس شوریٰ کی رکنیت یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لیے کوئی ایسا شخص منتخب نہ کیا جائے گا جو خود اس کا اُمیدوار ہو، یا کسی طور پر اس کے لیے کوشش کرے۔ اسلام میں اُمیدواری (Candidature) اور انتخابی پروپیگنڈا کے لیے قطعاً کوئی گنجایش نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت ہے کہ اُمیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔ اسلامی ذہنیت اس بات کے خیال تک سے نفرت کرتی ہے کہ ایک منصب کے لیے دو تین چار اُمیدوار کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی، جلسہ بازی اور اخباری پروپیگنڈا کریں، ووٹروں کو طرح طرح سے بیوقوف بنائیں، کھانوں کی دیگیں چڑھائی جائیں، موٹریں دوڑیں، اور ان میں سے وہ اُمیدوار بازی لے جائیں جو جھوٹ، فریب اور زرپاشی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ شیطانی ڈیموکریسی کے ملعون طریقے ہیں جن کا عشر عشیر بھی اسلامی حکومت میں برسرکار آئے تو خلافت کی مجلس شوریٰ میں منتخب ہو کر جانا تو درکنار، ایسے لوگوں کو قاضی کی عدالت میں پیش کرکے سزا دلوا دی جائے۔

(۶) اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹی بندی نہیں ہوسکتی۔ فرد فرد علٰحدہ ہوگا اور حق کے مطابق رائے دے گا۔ اسلام میں اس کا موقع نہیں کہ آپ ہر حال میں اپنی پارٹی کے ساتھ رہیں خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ بلکہ اسلامی اسپرٹ کا

تقاضا یہ ہے کہ آج کسی کی رائے کو آپ حق پہ پائیں تو اس کا ساتھ دیں، اور کل کسی دوسرے مسئلے میں اگر اسی شخص کی رائے آپ کے نزدیک خلاف حق ہو تو اس سے اختلاف کر دیں۔

(۷) اسلام میں عدالت کے شعبہ کو انتظامی شعبہ کے اثر سے کلیتاً آزاد رکھا گیا ہے۔ قاضی کا کام خدا کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرنا ہے۔ وہ عدالت کی کرسی پر امیر یا خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ عز و جل کے نائب کی حیثیت سے بیٹھتا ہے۔ لہٰذا عدالت میں اس کے سامنے خود خلیفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں کسی کو اپنی شخصیت یا اپنے خاندان یا اپنے عہدے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ قاضی کے سامنے حاضر ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایک ادنیٰ مزدور، ایک غریب کاشتکار، ایک فقیر بے نوا بھی اس کا حق رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے شخص حتیٰ کہ خود خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دے۔ اور قاضی کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو خدا کا قانون خلیفہ پر بھی ٹھیک ٹھیک اسی طرح نافذ کرے جس طرح ایک عامی مسلمان پر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خود خلیفہ کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی کے خلاف شکایت ہو تو وہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کر کے خود اس شکایت کو رفع کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ از روئے آئین وہ مجبور ہے کہ ایک عام شہری کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس مختصر خطبے میں میرے لئے موقع نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ کی تفصیلی صورت آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس کی اسپرٹ اور اس کے طرزِ کارروائی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دورِ حکومت کی نظیریں پیش کرنا ضروری ہیں اور اس کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کا ایک واضح تصوّر پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بوارق الغیب[10] حصہ دوم — حدیث نمبر ۱۰۵ — گزشتہ سے پیوستہ

"صحیح حدیبیہ"[149] سے واپسی پر صرف پندرہ بیس دن مدینہ طیبہ میں قیام فرمانے کے بعد محرم ۷ھ میں غزوۂ خیبر ہوا۔ اس کے مشہور واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ اور مسلمانوں کی فتح مکمل ہونے کے بعد جب قانون جنگ کے مطابق غنیم کے گرفتار شدہ مرد و عورت غلام اور باندیاں بنالئے گئے تو دحیہ نامی ایک صحابی نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ایک باندی ان میں سے مجھے عطا فرمادی جائے، آپ نے ارشاد فرمایا جاؤ ایک باندی لے لو، انھوں نے گرفتار شدہ عورتوں میں سے صفیہ بنت حیی کو لے لیا، اتنے ہی میں ایک اور صحابی حاضر خدمت ہوئے اور انھوں نے عرض کیا کہ حضور نے صفیہ بنت حیی کو دحیہ کو عطا فرمادیا حالانکہ وہ بنو قریظہ اور بنو نضیر کی سردار ہے (ان صحابی کا مطلب یہ تھا کہ اس سے ایک تو صفیہ اور اس کی قوم کی دل شکنی ہوگی کہ اسکی سیادت اور عالی مرتبی کے باوجود وہ ایک معمولی سپاہی کے حوالہ کردی گئی، دوسرے اس سے اور مسلمان مجاہدوں پر دحیہ کے امتیاز اور تفوق کا شبہ ہوگا، بہرحال ہر قسم کے مصالح کی وجہ سے ان صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں مشورۃً یہ عرض کیا کہ صفیہ کو حضور خود اپنے پاس رکھیں) آپ نے ان صحابی کا یہ مشورہ قبول فرمالیا اور دحیہ کو طلب فرماکر ارشاد فرمایا کہ اس کے بجائے تم اور کوئی باندی لے لو، اور حضرت صفیہ کو آپ نے آزادی دے کر خود زوجیت کے شرف سے مشرف فرمایا (صحیح بخاری[195] کتاب الصلوٰۃ باب ما یذکر فی الفخذ۔ و صحیح مسلم[196] کتاب النکاح ص ۴۵۹ ج ۱)

اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "علم غیب کلی" یا "علم جمیع ماکان و مایکون" نہ تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپ شروع ہی میں صفیہ کو دحیہ کے لیئے عطا نہ فرماتے۔ نیز اس صورت میں اُن دوسری صحابی کو خدمت اقدس میں اپنا مشورہ اور اپنی رائے پیش کرنے کی حاجت نہ ہوتی۔

حدیث نمبر ۱۰۶ و ۱۰۷

اور اسی غزوۂ خیبر کے واقعات میں سے ایک واقعہ جس کو "ابن جریر" کے حوالہ سے کنز العمال میں عبدالرحمن ابن ابی عمرہ کی روایت سے نقل کیا ہے یہ ہے:۔

ان النبی[141] صلی اللہ علیہ وسلم مر بامرأۃ مقتولۃ فقال من قتل ھذہ؟ فقال رجل انا اردفتھا خلفی فارادت ان تقتلنی فقتلتھا فامر بھا	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک مقتول عورت پر ہوا، آپ نے دریافت فرمایا کہ اسکو کس نے قتل کیا ہے؟ ایک شخص نے عرض کیا کہ

صلی اللہ علیہ وسلم بدفنہا“

(رواہ ابن جریر کنز العمال ۱۹۷ صفحہ ۲۹/۲۶)

میں نے اس کو (گرفتار کر کے) اپنی سواری پر پیچھے بٹھالیا تھا تو اس نے مجھے قتل کر دینا چاہا پس میں نے اس کا خاتمہ کر دیا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے بھی ہمارا مدعا صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ”علم غیب کلی“ یا ”علم جمیع ماکان ومایکون“ حاصل ہوتا تو مقتولہ کے متعلق آپ کو یہ دریافت فرمانے کی ضرورت نہ ہوتی کہ ”من قتل ہذہ؟“ (اس کو کس نے قتل کیا؟)

نیز (بیب ۱۴۲) قریب اسی مضمون کی ایک روایت اسی کنز العمال میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو کنز العمال ۱۹۵ صفحہ ۲۹/۲۶

حدیث نمبر ۱۰۸

(۱۴۱) نیز اسی غزوہ خیبر کے واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ ایک یہودی عورت (زینب بنت الحرث) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور بکری کے گوشت کے ساتھ زہر ملا دیا۔ پہلا لقمہ کھانے کے بعد آپکو معلوم ہوا کہ اس میں زہر کی آمیزش ہے اور اگرچہ بحمد اللہ آپ کے حق میں اس کا ناپاک ارادہ پورا نہ ہوا لیکن آپکے ساتھی بشر بن معرور (جنھوں نے شبہ کے باوجود صرف حضرت کے لحاظ سے لقمہ منہ سے اُگلنا مناسب نہ سمجھا) جانبر نہ ہوسکے اور اس زہر ہی نے اُن کا خاتمہ کر دیا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر بھی اگرچہ اُس وقت اس زہر کا اثر زیادہ نہ ہوا لیکن تین برس کے بعد مرض الوفات میں آپ نے اس کا بہت زیادہ اثر محسوس کیا حتےٰ کہ حضرت عائشہ سے آپ نے فرمایا:۔

یا عائشۃ مازال اجد الم الطعام الذی اکلت بخیبر وھذا اوان وجدت انقطاع ابھری من ذالک السم“ (صحیح بخاری ۱۹۹ باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)

(یعنی تین سال سے برابر میں اُس زہر آلود کھانے کی تکلیف محسوس کرتا ہوں جو خیبر میں مجھے کھلایا گیا تھا اور اِس وقت اُس زہر ہی کے اثر سے میری رگ جان کٹتی سی معلوم ہو رہی ہے۔)

اس واقعہ سے بھی ہمارا مُدعا بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ”علم غیب کلی“ یا ”علم جمیع ماکان ومایکون“ حاصل ہوتا تو اُس یہودیہ کی یہ حرکت آپ کو پہلے سے معلوم ہوتی اور یہ المناک واقعہ پیش ہی

نہ آتا۔

(اس واقعہ کی مزید تفصیل اگر درکار ہو تو کتب سیر کے علاوہ فتح الباری[۲۰] "باب الشاۃ التی سمت للنبی صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر" صفحہ ۱۹ میں بھی ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے)

حدیث نمبر ۱۰۹ تا ۱۱۵

اور اسی غزوۂ خیبر کے واقعات میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے ایک واقعہ یہ بھی مروی ہے کہ

(۱۴۴) کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ خیبر فاصبنا ضبابًا فاشتوی الناس منہا واشتویت ثم اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فوضعتہ بین یدیہ فاخذ عودًا فجعل یعد اصابعہ فقال ان امۃ من الامم مسخت دواب فلا ادری ای امۃ فلم یاکل۔ الحدیث

(رواہ ابن جریر کنز العمال[۲۰۱] صفحہ ۵۲)

غزوہ خیبر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے تو ہم نے بہت سی گوہوں کا شکار کیا اور لوگوں نے ان کو بھون بھی لیا میں نے بھی بھونا پھر میں نے اُس کو لاکر حضور کے سامنے رکھدیا تو آپ نے ایک لکڑی لی اور اُس کی اُنگلیاں شمار کرنے لگے پھر فرمایا اگلی اُمتوں میں سے ایک اُمت کو مسخ کر کے زمین پر رینگنے والے جانور بنا دیا گیا تھا پس مجھے معلوم نہیں کہ وہ مخلوق کی کونسی قسم ہے پھر حضور نے اس کو کھایا نہیں۔ الخ

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "جمیع ماکان ومایکون" کا علم محیط حاصل نہیں تھا، جیسا کہ آخری خط کشیدہ فقرہ شاہد ہے۔

پھر قریب قریب اسی مضمون کی ایک حدیث صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں:۔

(۱۴۵) اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بضب فابی ان یاکل منہ وقال لا ادری لعلہ من القرون التی مسخت (صحیح مسلم[۲۰۲] صفحہ ۱۵۱ ج ۲ و کنز العمال[۲۰۳] صفحہ ۱۱ ج ۸)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گوہ پیش کی گئی تو آپ نے اس کے کھانے سے انکار فرما دیا اور ارشاد فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں شاید یہ اُن امتوں میں سے ہو جو مسخ کی گئی ہیں۔

نیز صحیح مسلم ہی میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بدوی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ میں ایک ایسے نشیبی جنگل میں رہتا ہوں جہاں گوئیں بکثرت ہیں اور ہمارے یہاں کے لوگ عموماً ان کو کھاتے ہیں (تو اس بارہ میں مجھے کیا حکم ہے؟)..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ

یا اعرابی[146] ان اللہ عز وجل لعن اوٗ غضب علی سبط من بنی اسرائیل فمسخہم دوابًا یدبّون فی الارض فلا ادری لعل ھذا منہا الحدیث (صحیح مسلم ص۱۵۲ ج۲ و کنز العمال ص۹۸ ج۱۱)

بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ پر خدا کا غضب اور اس کی پھٹکار ہوئی اور ان کو مسخ کر کے زمین پر رینگنے والے جانور بنا دیا گیا جو زمین پر رینگتے ہیں تو مجھے معلوم نہیں شاید یہ گو انھیں میں سے ہو۔

اور مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ثابت ابن ودیعہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے ایک غزوہ میں بھنی ہوئی گو حضور کی خدمت اقدس میں پیش کی تو آپ نے اس کو تناول نہیں کیا اور اس سلسلہ میں فرمایا کہ

ان امۃً[147] من بنی اسرائیل مسخت دواب فی الارض وانی لا ادری ای الدواب ھی (کنز العمال ص۹۸ ج۹)

بنی اسرائیل کی ایک اُمت زمین پر چلنے والے جانوروں کی صورت میں مسخ کر دی گئی تھی اور مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون جانور تھے۔

(پوری روایت سنن ابی داؤد کتاب الصید والذبائح باب الضب میں ملاحظہ ہو)

اور مسند احمد میں یہی مضمون حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ مروی ہے:۔

امۃٌ[148] مسخت ما ادری ما فعلت ولا ادری لعل ھذا منہا یعنی (الضب) کنز العمال ص۹۸ ج۱۱)

ایک اُمت مسخ کر دی گئی تھی نہ معلوم کیا کیسے گئی اور مجھے پتہ نہیں شاید یہ گو اسی میں سے ہو۔

اور معجم کبیر طبرانی میں حضرت سمرہ بن جندب[149] اور جابر بن سمرہ[150] سے قریب قریب یہی مضمون انہی الفاظ میں مروی ہے (کنز العمال ص۹۸ ج۱۱)

---

٥ شک من الراوی ۱۲ منہ

حدیث نمبر ۱۱۶

صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ میں بروایت ابن عباس حضرت خالد بن الولید سے مروی ہے وہ بیان فرماتے ہیں (واللفظ لمسلم)

(۱۵۱) انہ دخل مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی میمونۃ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم (وھی خالتہ وخالۃ ابن عباس) فوجد عندھا ضبا محنوذا قدمت بہ اختھا حفیدۃ بنت الحارث من نجد فقدمت الضب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکان قلما یقدم یدہ لطعام حتی یحدث بہ ویسمی لہ فاھوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدہ الی الضب فقالت امرأۃ من النسوۃ الحضور اخبرن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بما قدمتن لہ قلن ھو الضب یا رسول اللہ فرفع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یدہ" الحدیث (صحیح مسلم ص ۱۵۱ ج ۲ [۲۱۰] وصحیح بخاری کتاب الذبائح والصید باب الضب)

ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت میمونہ رضی کے حجرہ میں داخل ہوا (یہ انکی حقیقی خالہ تھیں) تو اُس وقت اُن کے پاس بُھنی ہوئی گوہ رکھی ہوئی تھی جس کو اُن کی بہن حفیدہ بنت الحارث نجد سے اپنے ساتھ لائی تھیں، تو حضرت میمونہ نے وہ گوہ حضور کی خدمت میں پیش کر دی (اور آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ بہت کم کسی کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تھے جب تک کہ آپ کو بتلا نہ دیا جاتا کہ کیا ہے) جب آپ کھانے کے لئے ہاتھ بڑھانے لگے تو جو ازواج مطہرات وہاں حاضر تھیں اُن میں سے کسی نے کہا کہ جو چیز آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے وہ حضور کو بتلا دینی چاہیئے چنانچہ عرض کیا گیا کہ حضرت یہ گوہ ہے۔ تو آپ نے اس کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا الخ (دوسری روایت میں ہے کہ دسترخوان پر جو اور کھانا تھا آپ نے صرف وہی کھایا)

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "علم غیب کلی" اور "جمیع ماکان و مایکون" کا علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ حضور کو خود ہی اس کا علم ہوتا کہ میرے سامنے یہ گوہ پیش کی گئی ہے اور آپ شروع ہی سے اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کے فوائد بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں۔

(۱۵۲) "وانہ کان لا یعلم من المغیبات الا ما علمہ اللہ تعالیٰ" [۲۱۲] فتح الباری شرح بخاری ص ۳۱۹ ج ۲۳

(یعنی اس حدیث سے منجملہ اور چیزوں کے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کی صرف وہی چیزیں معلوم ہوتی تھیں جنکی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع دی جاتی تھی۔")

اور یہ حدیث ۵ھ ہجری کے بعد کی ہے کیونکہ حضرت میمونہ کو حضور کی زوجیت کا شرف عمرۃ القضا میں حاصل ہوا ہے جو ذیقعدہ ۷ھ میں ہوا تھا اور حضرت خالد اس کے بھی بعد مشرف باسلام ہوئے[۱] پس یہ واقعہ لا محالہ ۷ھ ہجری کے بعد ہی کا ہے۔ واللہ اعلم

حدیث نمبر ۱۱۷ تا ۱۱۹

صحیح مسلم و سنن ابی داؤد اور سنن نسائی میں بواسطہ ابن عباسؓ حضرت میمونہؓ سے مروی ہے:۔

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم[۱۵۳] اصبح عندها یوماً واجماً فقالت له قد استنکرت هیئتك منذ الیوم فقال ان جبریل کان وعدنی ان یلقانی فلم یلقنی اما واللہ ما اخلفنی فظلّ یومه علیٰ ذالک ثم وقع فی نفسه جرو کلب تحت فسطاط فامر به فاخرج ثم اخذ ماءً فنضح مکانه فلما امسیٰ لقیه جبریل فقال صلے اللہ علیہ وسلم لقد کنت وعدتنی ان تلقانی البارحة قال اجل ولکنا لا ندخل بیتاً فیه کلبٌ ولا صورة

الحدیث (جمع الفوائد ص ۲۱۰/۱۶ [۲۱۳]
و صحیح مسلم ص ۱۹۹/۲ [۲۱۴])

ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ کے یہاں تھے اور کچھ غمگین سے تھے انھوں نے عرض کیا آج بر ابر میں آپ کو اداس سا دیکھ رہی ہوں فرمایا کہ ہاں! جبریل نے مجھ سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ نہیں ملے اور خدا کی قسم انھوں نے وعدہ خلافی نہیں کی پھر اس دن بھر آپ کی یہی کیفیت رہی، پھر آپ کو خیال آیا کہ گھر میں کتے کا بچہ ہے چنانچہ آپ نے اس کے نکال دینے کا حکم دیا اور وہ نکالدیا گیا۔ پھر آپ نے پانی لیکر اس جگہ چھڑکا پھر جب شام ہوئی تو جبریل تشریف لائے آپ نے کہا کہ تم نے تو کل رات ملنے کا وعدہ کیا تھا، انھوں نے کہا بے شک، لیکن جس گھر میں کتا یا تصویر ہو ہم اس گھر میں نہیں جاتے ہیں الخ

اس حدیث سے بھی ہمارا مدعا صاف ظاہر ہے کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک بھی جمیع ماکان و یکون کا علم محیط حاصل ہوتا تو آپ پہلے ہی اس کتے کو نکلوا دیتے نیز اس صورت میں

---

[۱] ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۲۳ ص ۳۱۹ ۱۲ منہ غفرلہ

حضرت جبریل سے نہ آنے کا سبب معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ۸ھ ہجری کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے کیونکہ حضرت میمونہ اواخر ۸ھ ہی میں حضور کی زوجیت سے مشرف ہوئی ہیں۔

اور یہی واقعہ یا اسی قسم کا دوسرا واقعہ صحیح مسلم ہی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب آپ نے ایک چھپر کھٹ کے نیچے کتے کا پلّہ دیکھا تو حضرت صدیقہ سے دریافت فرمایا۔

"متی دخل هٰذا الکلب ههُنا؟ یہ کتا کب یہاں گھس گیا تھا؟[۱۵۴] انھوں نے عرض کیا" واللّٰہ ما دریت" خدا کی قسم مجھے کچھ پتہ نہیں۔ (صحیح مسلم ص ۱۹۹ ج ۲)[۲۱۵]

پس اس روایت میں حضرت عائشہ سے آپ کا یہ سوال ہمارے استدلال کیلئے ایک مستقل اور جُداگانہ وجہ بن سکتا ہے۔

اور اسی قسم کا ایک اور واقعہ بحوالہ مسند احمد و سنن نسائی، و ابن ماجہ و صحیح ابن خزیمہ و مستخرج سعید بن منصور کنز العمال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؓ نے آنحضرت کے مزاج میں ایک بار کچھ تغیر سا محسوس کیا تو اس کا سبب دریافت کیا اس کے جواب میں آنحضرت نے یہ واقعہ نقل فرمایا کہ

انی سمعت[۱۵۵] فی الحجرۃ حرکۃ فقلت من هٰذا؟ قال انا جبریل قلت ادخل قال لا، اُخرج، فلما خرجت قال ان فی بیتنا شیئاً لا یدخله ملك ما دام فیه قلت ما اعلمه یا جبریل قال اذهب فانظر فذهبت ففتحت البیت فلم اجد غیر جرو کان یلعب به الحسن فقلت ما وجدت الا جرواً قال انها ثلث لم یلج ملك ما دام فیها ابداً واحد منها کلب او جنابۃ او صورۃ (کنز العمال ص ۲۱۹ ج ۲)[۲۱۶]

مجھے حجرہ میں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی تو میں نے کہا کون ہو؟ جواب ملا کہ میں جبریل ہوں، میں نے کہا تشریف لائیے! انھوں نے کہا نہیں، آپ ہی باہر تشریف لے آئیے چنانچہ میں باہر آگیا تو انھوں نے بتلایا کہ ہمارے گھر میں کوئی ایسی چیز ہے جس کے ہوتے ہوئے فرشتے داخل نہیں ہوسکتے۔ میں نے کہا مجھے تو معلوم نہیں انھوں نے کہا آپ جاکر دیکھئے، چنانچہ میں آیا اور دروازہ کھولا تو سوائے کتے کے ایک بچے کے جس سے حسن کھیل رہے تھے کچھ اور مجھے نہیں ملا، تو میں نے آکر کہا کہ میں نے تو کتے کے ایک بچہ کے سوا کچھ بھی نہیں پایا، انھوں نے کہا کہ یہ تین چیزیں

ایسی ہیں جہاں انہیں سے کوئی ایک ہو وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے، کُتّا، جنابت، یا مورت
اس حدیث سے بھی ہمارا استدلال ظاہر بلکہ اظہر ہی اور یہ واقعہ بھی کم از کم ۵ھ یا ۶ھ ہی کا ہوسکتا ہے
کیونکہ حضرت حسن رضی اللہ کی ولادت رمضان المبارک ۳ھ میں ہوئی ہی اور اس واقعہ کے وقت اُنکی عمر چار پانچ برس سے کیا کم ہوگی
واللہ اعلم

حدیث نمبر ۱۲۰

صحیحین اور سنن ابی داؤد میں حضرت میمونہ سے مروی ہے:۔

عتقت (۱۵۶) ولیدۃً ولم تستاذن النبی صلے اللہ علیہ وسلم فلما کان یومھا قالت اشعرت یا رسول اللہ انی عتقت ولیدتی؟ قال اوفعلتِ قالت نعم قال اما انک لو اعطیتھا اخوالک کان اعظم لاجرک
(للشیخین و ابی داؤد، جمع الفوائد ص۲۱۷ ج۱)

کہ انھوں نے ایک باندی آزاد کی اور حضور سے اسکے متعلق اجازت نہیں لی پھر جب انکی باری آئی تو انھوں نے حضور سے عرض کیا کیا حضور کو معلوم ہو کہ میں نے اپنی اس باندی کو آزاد کر دیا ہو؟ آپنے فرمایا کیا تم کر چکیں؟ عرض کیا ہاں یا رسول اللہ میں تو کر چکی فرمایا اگر تم اپنے ماموؤں کو عطا کر دیتیں تو اسمیں تمھارے لئے زیادہ ثواب ہوتا۔

اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ آپکو پہلے سے اس کا علم ہوتا اور پہلے ہی آپ اُن کو یہ مشورہ دیدیتے، اور یہ واقعہ بھی لامحالہ ۵ھ کے بعد ہی کا ہی کما لایخفی

حدیث نمبر ۱۲۱

صحیحین (بخاری و مسلم) اور جامع ترمذی میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ بیت الخلا تشریف لے گئے تو میں نے آپ کے لئے وضو کا پانی تیار کر کے رکھدیا جب آپ نے باہر آکر اس کو دیکھا تو دریافت فرمایا

من وضع ھذا؟ (۱۵۷) فقالوا ابن عباس فقال اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل (صحیح مسلم ص۲۹۵ ج۲، صحیح بخاری ص۲۱۹، وجمع الفوائد ص۲۲۲ ج۲)

کہ یہ کس نے رکھا ہی؟ عرض کیا گیا کہ ابن عباس نے تو آپنے ہمیشہ لئے تفقہ فی الدین و علم تفسیر قرآن کی دعا فرمائی

اس حدیث سے بھی ہمارا مدعا صاف ثابت ہی کیونکہ اگر آپکو جمیع ماکان و مایکون کا علم محیط حاصل ہوتا تو یہ دریافت فرمانے کی آپکو ضرورت نہ ہوتی کہ یہ کس نے رکھا ہی؟ اور مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں یہ بھی تصریح ہے کہ یہ واقعہ حضور کی زوجہ مطہرہ اور حضرت ابن عباس کی خالہ حضرت میمونہ کی گھر میں پیش آیا تھا (کما فی الکنز ص۵۷ ج۷) لہذا یہ واقعہ بھی ۵ھ کی بعد ہی کا ہوگا واللہ اعلم
(باقی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

ماہنامہ **الفرقان** بریلی

مدیر

چندہ سالانہ قسم اول تین روپے ۳ؔ ؎

ممالک غیر سے قسم اول سات شلنگ پیشگی

جلد ۷ | بابت ماہ صفر و ربیع الاول ۱۳۵۹ ہجری | نمبر ۲-۳

پہلی ضروری بات

کئی مہینے سے الفرقان ایک مہینہ سے زیادہ لیٹ چل رہا ہے، محرم کا پرچہ شایع کرنے کے بعد خیال تھا کہ امکانی عجلت کے ساتھ صفر و ربیع الاول کا مشترکہ پرچہ شایع کر کے اسکی اشاعت کو ہم مقررہ وقت سے قریب لا سکینگے، اسی بنا پر اس کی ترتیب اور کتابت میں جلدی کی گئی لیکن ٹھیک اُس وقت جبکہ اسکے اکثر حصہ کی کتابت ہو چکی تھی اور طباعت شروع ہونے والی تھی، پریس سے اُجرت طباعت کے بارہ میں کچھ نزاع ہو گیا اور آئندہ کے لیئے طباعت کے مستقل انتظام کیلئے دوسرے پریسوں سے بات چیت کرنی پڑی اور معاملہ طے کرنے میں قریباً پورا ایک مہینہ صرف ہو گیا اس لیئے افسوس ہے کہ اشاعت کو بروقت لانے کی وہ کوشش اب بھی کامیاب نہ ہو سکی۔

ہمیں اپنے با اخلاص ناظرین کرام سے توقع ہے کہ وہ ہماری اس مشکل در مجبوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس بارہ میں ہمیں قصور وار نہ سمجھینگے اور حق تعالےٰ سے دُعا فرمائینگے کہ وہ ان مشکلات پر قابو پانے میں ہماری مدد فرمائیے طباعت کے دوسرے مستقل انتظام کے لیئے ہم بہت تیزی سے کوشش کر رہے ہیں، لیکن ممکن ہے کہ ابھی ایک آدھ پرچہ اور کچھ تاخیر سے شایع ہو۔

ناچیز۔ ناظم الفرقان بریلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہ اولیں

"الفرقان" کی اشاعت کو پابندِ وقت کرنے کے لیے بارہا کوشش کی گئی اور اکثر ایسا ہوا کہ جب کامیابی قریب نظر آئی تو اچانک کوئی ایسی مشکل پیش آگئی جس نے ساری کوشش کو بیکار کر دیا ——

اس وقت بھی یہی ہوا کہ صفر و ربیع الاول کے اس مشترکہ پرچہ کی تیاری اس حساب سے کی گئی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آخر ربیع الاول میں یہ آپ کے ہاتھوں میں پہونچ جاتا اور پھر ہر مہینے کا پرچہ مہینے کے اندر شایع ہوتا رہتا، لیکن اچانک کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اس کی طباعت کے لیئے دوسرا مستقل انتظام سوچنا پڑا اور وہ ایسی چیز نہ تھی جو دو چار روز میں ہو سکتی اس لیئے پھر ایک مہینے کی مزید تاخیر ہوگئی اور اس اتفاقی حادثہ کی وجہ سے "الفرقان" اپنی منزل سے پھر اسی قدر پیچھے رہ گیا جتنا پیچھے وہ کئی مہینے سے چل رہا ہے ——

اور پھر یقین تازہ ہوگیا کہ جب تک مشیت ایزدی نہ ہو ہمارے چاہنے اور کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ——

وَمَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَاۤءَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اگر اپنی کوتاہیوں اور "الفرقان" کی مسلسل اشاعتی بدنظمی کو دیکھا جائے تو بے شک "الفرقان" آپکی بلکہ کسی کی بھی ہمدردی اور نظر عنایت کا مستحق نہیں، اور اسی لیئے اب کسی دوست سے کوئی شکوہ شکایت نہیں لیکن صرف اس لیئے کہ دور رہنے والے احباب کو ہماری مشکلات اور مجبوریوں کا پورا اندازہ ہو سکے آج یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت "الفرقان" کے خریداروں کی تعداد اس سے بھی کم رہ گئی ہے جتنی کہ اُس کی اشاعت کے پہلے سال (۱۳۵۳ھ میں) تھی اور چھپوایا وہ صرف اتنا جا رہا ہے جتنا کہ پہلی جلد کا پہلا اور دوسرا پرچہ (محرم اور صفر ۵۳ھ کا چھپوایا گیا تھا ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

سے لے کر اب تک کہ پورے چھ سال گزرے کبھی وہ سات سو ساڑھے سات سو سے کم نہیں چھپوایا گیا تھا لیکن اب یہ پرچہ صرف چھ سو چھپوایا جا رہا ہے جس میں سے قریباً سو سوا سو تبادلہ اور ہدایا کے سمجھیے اور پچاس ساٹھ زائد اس طور پر اب کل خریداری صرف چار سو کے قریب ہے جن میں سے اچھی خاصی تعداد ایسے حضرات کی بھی ہے جن سے چندہ وصول نہیں ہوا ہے بلکہ وعدہ پر اُن کو پرچہ جاری ہے اور اب تک تجربہ یہی ہے کہ ایسے نصف حضرات سے بعد میں چندہ وصول ہوتا ہے اور باقی نصف خاموشی سے وی۔ پی واپس فرما دیتے ہیں اور پھر دفتر کے کسی خط کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرماتے، اس طور پر چندہ وصول ہونیوالے خریداروں کی تعداد گویا اب چار سو سے بھی کم ہے، اِدھر کاغذ کے نرخ پر ہر مہینے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو ہی جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی مہینے میں دو تین دفعہ) — چونکہ پرچہ کی طباعت کی تعداد بہت گھٹ گئی تھی اس لیئے پریس سے نرخ طباعت کم کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن پریس تخفیف پر تیار نہ ہوا۔ اسی لیئے طباعت کا انتظام اب بریلی سے باہر ایک دوسرے پریس میں کیا جا رہا ہے)

بہر کیف یہ ہے اس وقت "الفرقان" کا حال گویا آمدنی سابق کے لحاظ سے قریباً نصف رہ گئی ہے اور مصارف تقریباً دوگنے ہو چکے ہیں — گزشتہ سال کے اختتام کے وقت بھی اگرچہ پرچہ کی مالی حالت کچھ کم کمزور نہ تھی لیکن اتنی کمی کا تصور بھی نہ تھا اور اسی واسطے ذی الحجہ ۵۸ ۱۳ھ کے پرچہ میں اس سال ۵۹ھ کے ختم تک "الفرقان" کو بدستور جاری رکھنے اور ولی اللہ نمبر نکالنے کا حتمی اور غیر مشروط اعلان کر دیا گیا تھا، اب اگرچہ حالات میں کوئی گنجایش نہیں رہی ہے لیکن ہمیں بہر حال اپنے دونوں وعدے نباہنے ہیں خواہ حالت اس سے بھی بدتر ہو جائے۔ البتہ دوستوں سے اتنا عرض کرنا ہے کہ وہ ہماری ان مجبوریوں کو نظر انداز نہ فرمائیں۔

اس داستانِ غم سُنانے کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ "الفرقان" کی خریداری سے دستکش ہونے والے احباب کی شکایت کی جائے یا پھر ان کو خریداری کے لیئے آمادہ کیا جائے کیونکہ جن مجبوریوں سے وہ حضرات دستکش ہوتے ہیں ہم کو انکا کافی اندازہ ہے اور اس لیئے ہم ان کو اس بارہ میں قطعاً معذور سمجھتے ہیں، بلکہ ان سطور کے لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے احباب ہماری مجبوریوں کو بھی سمجھ سکیں اور جو کوتاہیاں اب ہوتی ہیں ان کے اسباب بھی اُن کے پیش نظر رہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر یہاں اُن تمام احباب کا شکریہ نہ ادا کیا جائے جو ہماری مسلسل کوتاہیوں اور

الفرقان کی اشاعتی بدنظمیوں کے باوجود اب تک اس سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں ریاست جودھپور، کلکتہ اور پنجاب میں ضلع جالندھر، ضلع گجرات، ضلع گوجرانوالہ اور ملتان کے احباب خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں اور ان کا مخلصانہ تعلق ادارہ الفرقان کیلئے قابل صد فخر ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

"ولی اللہ نمبر"

اس نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں توفیق الٰہی کی مسلسل سازگاری اور کوشش نے ہر قدم پر توقع سے زیادہ کامیابی میرے لیئے اگر سامان فرحت و مسرت پیدا نہ کرتی تو "الفرقان" کی موجودہ بدحالی اور بیدرمالی کمزوری کی وجہ سے مجھ پر آجکل افسردگی اور شکستہ دلی ہی کا غلبہ رہتا اور اپنی مخصوص افتادِ طبع کے باعث شاید میں پھر کچھ نہ کرسکتا لیکن اس نمبر کے متعلق ارادوں کی کامیابی کی اُمید نے بہت کچھ غم غلط کر رکھا ہے اور توقع ہے کہ جس وقت یہ تیار ہوکر ناظرین کی خدمت میں پہونچے گا انشاء اللہ وہ بھی محسوس فرمائیں گے کہ اس ورق کی تمام بے لطفیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا اسی ایک نمبر میں کافی سامان ہے۔

اس وقت جو مقالے دفتر میں پہونچ چکے ہیں اُن میں سے تین تو ایسے ہیں کہ ناظرین کرام کو ان کی خوش خبری آج ہی سُنانے کو جی چاہتا ہے۔ ان میں ایک مقالہ مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مدظلہ کا ہے۔ اکثر حضرات کو یہ معلوم ہوگا کہ ہندوستان (اور غالباً بیرون ہند میں بھی) حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف کے ماہر خصوصی ہیں، وہ شاہ صاحب کو حکمتِ اسلامیہ کا مستقل امام مانتے ہیں بلکہ دنیا بھر سے منوانا بھی چاہتے ہیں۔ اُن کا فرمانا ہے کہ میں نے اسلام کو شاہ صاحب ہی کی کتابوں سے پہچانا اور پہچانکر مانا ہے ممدوح نے اپنے اس مقالہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق جو کچھ حوالہ قلم فرمایا ہے یہ حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کی معرفت اور ان کی تصانیف سے استفادہ کے لیئے وہ بنیادی لٹریچر کی حیثیت رکھتا ہے ہوسکتا ہے کہ بعض اہل علم اس کے بعض اجزاء سے اتفاق نہ کریں لیکن حق یہ ہے کہ شاہ صاحب رح کا علمی، عرفانی اور تجدیدی مقام دریافت کرنے کے لیئے مولانا ممدوح کے اس مقالہ سے بہتر مواد کم از کم میرے علم میں کسی دوسری جگہ موجود نہیں ہے۔

اس مقالہ کے مسودہ کے صفحات ایک سو گیارہ ہیں "الفرقان" کے قریباً اسی نوے صفحات پر آئیگا گویا ایک مستقل کتاب ہے۔

دوسرا قابل ذکر مقالہ علامہ سلیمان ندوی مدظلہ کا ہے جس کا عنوان ہے "ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کا سبب شاہ صاحب کی نظر میں"۔

اگرچہ یہ مقالہ مختصر ہے لیکن موضوع بالا پر اس سے پوری روشنی پڑ جاتی ہے اور اس کے آئینہ میں شاہ صاحب کی سیاسی دور بینی ایسی صاف نظر آجاتی ہے کہ عقل دنگ رہجاتی ہے۔

ایک مقالہ مولانا ابوالنظر رضوی امروہوی کا ہے، اگرچہ اس سے پہلے الفرقان کو آپ کے کسی مقالہ کی اشاعت کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے اور اس لیئے ممکن ہے کہ ہمارے بعض ناظرین کے لیئے آپ کا نام نیا ہو لیکن علمی صحافت کے حلقہ میں آپ کافی متعارف ہیں آپ کے مقالہ کا عنوان ہے:۔

"حضرت شاہ صاحب رح کی بعض علمی خصوصیات"

ان کے علاوہ جو مضامین آنے والے ہیں اور جن میں سے اکثر کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ لکھے جارہے ہیں، ان میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ مولانا سید ابوالاعلےٰ مودودی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اڈیٹر برہان، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی ایڈیٹر "الندوہ" اور ان کے علاوہ بعض اور بھی مشہور اہل علم اور اہل قلم ہیں جن کے مضامین کے وصول ہوجانے کی خوش خبری انشاءاللہ آئندہ اشاعت میں درج ہوگی۔

"نمبر" کی کتابت ابھی سے شروع کرائی جارہی ہے وقت اشاعت کا حتمی اور قطعی اعلان انشاءاللہ آئندہ نمبر میں کیا جاسکیگا۔ واللہ ولی التوفیق وھو المستعان وعلیہ التکلان

خاکسار تحریک اور علّامہ مشرقی اصولِ دین کی روشنی میں

(از جناب مولٰنا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی ایڈیٹر ترجمان القرآن لاہور)

[رنگون (برما) کے مشہور دینی رسالہ المحمود کے ایڈیٹر صاحب نے محترم مولٰنا مودودی صاحب سے خاکسار تحریک اور علامہ مشرقی کے متعلق ذیل کے تین سوال کیئے تھے، مولٰنا ممدوح نے ان کا جو جواب دیا ہے وہ باوجود اختصار کے اس تحریک اور اس کے بانی کے متعلق قول فیصل کا حکم رکھتا ہے ـــــ اُن میں علامہ مشرقی کے جن نظریات و معتقدات اور ان کی جن دینی تحریفات کا صرف حوالہ دیا گیا ہے اُن میں سے ہر ایک کے متعلق علامہ کی پچاسوں عبارتیں اور ان کے متعلق ضروری بحث قارئین الفرقان ہمارے مقالہ ـــــ "خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں" ـــــ ملاحظہ فرما چکے ہیں اور جس کو پھر اُن حوالوں پر غور کرنا ہو وہ ہمارے اُس مقالہ کی طرف رجوع کرے ـــــ محترم مولٰنا مودودی نے یہ مضمون چونکہ ایک نجی سوال کے جواب میں لکھا تھا اور مخاطب ایسے صاحب تھے جو مشرقی صاحب کی تصانیف سے ناواقف نہ تھے اس لیئے علامہ صاحب کی عبارات نقل کیئے بغیر صرف ان کے خیالات ذکر کر دیئے ہیں

ان تعارفی اور تمہیدی سطور کے بعد ملاحظہ فرمایئے اصل سوالات اور جوابات۔ "مدیر"]

(سوالات)

(۱) عنایت اللہ مشرقی کے عقائد کفریہ ہیں یا نہیں؟ اور جن علما نے ان کی تکفیر کی ہے وہ حق بجانب ہیں یا نہیں؟

(۲) کیا بیلچہ رکھنا سُنت ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو استعمال کیا ہے؟

(۳) تحریک خاکسار فوجی تحریک ہے جو مسلمانوں میں سپاہیانہ اور مجاہدانہ ولولہ پیدا کرتی ہے، اس میں محض سپاہیانہ فن سیکھنے کی نیت سے داخل ہوں تو کیا حرج ہے؟ مشرقی کے کفریہ عقائد سے کوئی واسطہ نہیں، اور نہ اس تحریک کو مشرقی نے اس لیئے جاری کیا ہے کہ اس کے عقائد سے اتفاق کیا جائے بلکہ مسلمان کے اندر تیرہ سو سال قبل کا جہادی عمل اور جذبہ پیدا کرنا ہے۔"

جوابات

(۱) مشرقی صاحب جس چیز کو اسلام کے نام سے پیش کرتے ہیں اس کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ خالص مادہ پرستی ہے انھوں نے توحید، نبوت، خلافت، ایمان، عمل صالح، جہاد، ہجرت، غرض اسلام کے تمام اساسی اصولوں اور بنیادی مسائل کے معنی و مفہوم کو الٹ کر رکھ دیا ہے اور اس فلسفہ زندگی کو اسلام کے نام سے رائج کرنا چاہا ہے جسکو مٹانے اور جسکے خلاف جہاد کرنے ہی کیلئے دراصل اسلام آیا ہے۔ اس لحاظ سے مشرقی صاحب کو ان فرق باطلہ کے بانیوں کی صف اول میں جگہ دیجاسکتی ہے جنھوں نے اسلام کے گھر میں بیٹھ کر اسکی جڑیں کھودی ہیں۔ بلکہ زیادہ صحیح طور پر یہ کہنا ہوگا کہ یہ صاحب مرزائے قادیانی سے اور اس سے پہلے کے مدعیان نبوت سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ ان لوگوں نے نبوت کی حقیقت کو نہیں بدلا تھا، صرف نبی ہونے کا جھوٹا دعوی کیا تھا مگر ان صاحب نے نبوت کی حقیقت کو ہی بدل ڈالا ہے اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام دنیا میں وہی مشن لیکر آئے تھے جو ہٹلر اور مسولینی کا مشن ہے مرزا صاحب نے اتنا کیا تھا کہ صرف جہاد بالسیف کو منسوخ ٹھیرا دیا تھا مگر جہاد کی غرض اور اس کے مقصد میں شاید کوئی ردوبدل نہیں کیا مگر ان جناب نے جہاد کی روح ہی سلب کرلی ہے ان کے نزدیک اسلام کا جہاد وہی چیز ہے جو اٹلی نے حبش اور البانیہ میں جاپان نے چین میں، اور انگریز نے ہندوستان اور دوسرے ممالک عالم میں کیا۔ مرزا صاحب نے توحید کے عقیدے کو غالباً چھیڑا تک نہیں مگر مشرقی صاحب نے اس عقیدہ کو اسکی بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ انکے نزدیک کسی قوم کا ایک لیڈر یا ایک مرکزی اقتدار کی اطاعت میں متحد ہو جانا اور اپنی مادی ترقی کیلئے ملکر کام کرنا بس اسی چیز کا نام توحید ہے خواہ وہ قولاً اور اعتقاداً خدا کی منکر ہو۔ یا خدا کے سوا کسی اور ہستی یا ہستیوں کو الٰہ مانتی ہو اور عملاً کسی اور کی پرستش کرتی ہو۔ اس اعتبار سے جاپانی موحد ہیں، جرمن، اٹالین انگریز سب موحد ہیں ہندو بھی موحد ہیں کیونکہ گاندھی جی کی لیڈرشپ پر متحد ہوگئے ہیں اور اپنی قوم کی برتری کیلئے جدوجہد کررہے ہیں اور مسلمان جو قرن اول میں موحد تھے تو اس لئے نہیں کہ خدا کو ایک مانتے تھے بلکہ صرف اس لیئے کہ اہل عرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی "لیڈرشپ" پر متحد ہوگئے تھے حتے کہ اس قسم کی وحدت قومی اگر ابوجہل کی قیادت پر متحد ہو گئی ہوتی اور اس لیڈر کی قیادت میں اگر اہل عرب روم وایران کے ممالک فتح کرلیتے تب بھی وہ موحد ہی قرار پاتے اور کعبہ کی تین سو ساٹھ بتوں کی پوجا کرنے کے باوجود انکے موحد ہونے میں کوئی شک نہ ہوتا پھر جہاں تک میں سمجھتا ہوں مرزا صاحب نے عمل صالح کی حقیقت میں بھی کوئی ترمیم نہیں کی مگر مشرقی صاحب نے اس پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے ان کے نزدیک عمل صالح اس نوعیت کے عمل کا نام ہے جو جنگل میں بھیڑیا بکری کی ساتھ کیا کرتا ہے اور جو انسانوں میں چنگیز اور ہلاکو نے، اسکندر اور نپولین نے، کچنر اور فوش نے کیا ہے وہ عمل جس کا نتیجہ ایک شخص پر دوسرے شخص کی یا ایک قوم پر دوسری قوم کی برتری و بالادستی قایم ہونے کی صورت میں ظاہر ہو مشرقی صاحب کی اصطلاح میں عمل صالح ہے۔ ہوائی جہاز۔ بم اور گیس تیار کرنا اوران کے ذرائع سے کسی دوسری

"غیر صالح" (یعنی ایسے ذرائع نہ رکھنے یا کم رکھنے والی) قوم پر چڑھ دوڑنا اور اسے مغلوب کرکے اس کے گھر بار اور اس کی دولت وثروت پر قابض ہوجانا اس کا نام عمل صالح ہے اور اس عمل کی نتیجہ میں جو مقبوضات ہاتھ آئیں وہ اس وراثت ارضی کی تعریف میں آتے ہیں جس کا وعدہ "صالحین" سے کیا گیا ہے اور جب اس طرح وراثت زمین حاصل کرکے ایک غالب قوم (یا مشرقی کی اصطلاح میں صالح قوم) مفتوح یعنی غیر صالح قوم کو لوٹ لوٹ کر اپنے لیے کوٹھیاں اور باغ اور نہریں بناکر داد عیش دیتی ہیں تو یہ مشرقی صاحب کی زبان میں جنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کا مصداق ہے۔

میں نے بہت مختصر الفاظ میں مشرقی صاحب کے ان نظریات کا خلاصہ بیان کیا ہے جنکو انھوں نے تذکرہ میں بڑی شرح وبسط کے ساتھ پیش فرمایا ہے اب اگر حقیقی اسلام وہی ہے جو مشرقی صاحب پیش فرماتے ہیں تو معاذ اللہ قرآن کا ایک ایک لفظ جھوٹا ہے اور اگر در اصل اسلام وہ ہے جو قرآن میں ہمکو ملتا ہے تو مشرقی صاحب جھوٹے ہیں۔ بہرحال مشرقی صاحب کے تخیل اور قرآن کی تعلیم میں بعد المشرقین ہے مشرقی صاحب جس چیز کے معتقد ہیں وہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے، اور جو قرآن کی تعلیم ہے اسکے معتقد مشرقی صاحب نہیں ہیں۔

علماء امت نے مشرقی صاحب کی اگر تکفیر کی تو غلط نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کفر کسی عنقا کا نام تو ہے نہیں اسی قسم کے خیالات کو کفر کہتے ہیں، اگر کوئی مغربی مصنف قرآن کا حوالہ دیئے بغیر یہ خیالات ظاہر کرے اور اسکا نام عنایت اللہ کی بجائے ولس یا نکلسن ہو تو کسی کو بھی اسے مادہ پرست اور دہریہ بلکہ دشمن اخلاق و انسانیت کہنے میں تامل نہ ہوگا پھر آخر مشرقی صاحب ہی کے ساتھ کیوں رعایت کی جائے؟ کہ انکا نام چونکہ مسلمانوں کا سا ہے اور وہ ایک مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ لہذا انکی تکفیر کرنے میں ہمارا دل دکھے؟ البتہ میں ایسے لوگوں کو کافر کی بجائے "منافق" کہنا زیادہ صحیح سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک یہ کھلے دشمنانِ اسلام سے زیادہ خطرناک ہیں۔ کفار اور کھلے ہوئے دشمنوں کو ہر شخص پہچانتا ہے اور انکا مقابلہ کرسکتا ہے مگر یہ منافقین اندر سے حملہ کرتے ہیں قرآن کا نام لیکر اسکی تعلیم کو بدلتے ہیں۔ آیات قرآنی کی تلاوت کرکے ان کے معانی کو مسخ کرتے ہیں۔ دین اور ملت کی خدمت وحمایت کا چولا پہنکر اسکے ارکان کو مسمار کرتے ہیں۔ انکے نام اور لباس اور ان کی ظاہری باتوں سے دھوکا کھاکر مسلمان اس جال میں پھنستے ہیں جسمیں ایک کافر اور کھلا ہوا دشمن مسلمانوں کو کبھی نہیں پھانس سکتا۔ غلبہ اسلام اور اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اور مرکزیت وامارت اور جہاد کے پرفریب نعرے بلند کرکے مسلمانوں کی تنظیم کرنیکے لیئے اٹھتے ہیں۔ اور ہزاروں۔ لاکھوں بے علم سیدھے سادے مسلمان اسی اطمینان کیساتھ انکے جھنڈے تلے جمع ہوجاتے ہیں جس اطمینان کیساتھ جنگل کے بھولے بھالے جانور ان گڑھوں میں جاگرتے ہیں جن پر شکاری نے گھاس پھیلا رکھی ہو۔ اس فتنہ عظیم کو کفر سے کیا تعلق؟ یہ کفر سے بڑا فتنہ ہے۔ نفاق ہے جسکی فتنہ سامانیوں کو کفر بھی نہیں پہونچ سکتا۔

(۲) مشرقی صاحب کے بیلچہ کے متعلق آپ سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا مذہبی فن اور سنت ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ در اصل نازی لیڈر ہٹلر کی سنت ہے (محمد رسول کی سنت نہیں) اور مشرقی صاحب نے یہ چیز وہیں سے لی ہے البتہ چونکہ انھیں مسلمانوں کو

دھوکا دینا تھا لہٰذا انھوں نے اسے رسول کرم کی سُنت کی حیثیت سے پیش کیا ان کا بیان یہ ہے کہ غزوہ خندق میں حضور نے بیلچہ ہاتھ میں لیکر پتھر توڑا تھا لہٰذا یہ سُنت ہے لیکن یہ محض جھوٹ ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز سے پتھر توڑا تھا وہ بیلچہ نہ تھا۔ حدیث میں اس کے لیئے مِعوَل اور مِسحَاۃ کے الفاظ آتے ہیں جن کا اطلاق کدال یا پھاوڑے پر ہوتا ہے

(۳) سوال کے الفاظ یہ ہیں:۔

تحریک خاکسار فوجی تحریک ہے جو مسلمانوں میں سپاہیانہ اور مجاہدانہ ولولہ پیدا کرتی ہے اس میں محض سپاہیانہ قواعد سیکھنے کی نیت سے داخل ہوں تو کیا حرج ہے مشرقی کے کفریہ عقائد سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ اس تحریک کو مشرقی نے اس لیئے جاری کیا ہے کہ اس کے عقائد سے اتفاق کیا جائے۔ بلکہ مسلمانوں کے اندر تیرہ سو سال قبل کا جذبہ اور عمل پیدا کرنا ہے۔

یہ الفاظ جو لوگ زبان سے نکالتے ہیں وہ خود اس کے معنی نہیں جانتے۔ عام طور پر بازار میں جو الفاظ چل پڑے ہیں ان کو یاد کر لیا گیا ہے اور بے سوچے سمجھے زبان سے نکال دیا جاتا ہے۔ تیرہ سو سال قبل کا جذبہ اور عمل کیا تھا؟ مجاہدانہ ولولہ کس چیز کا نام ہے؟ جہاد کسے کہتے ہیں؟ اور اسکو بھی جانے دیجیے۔ فوجی تحریک کا مفہوم کیا ہے؟ یہ لوگ ان باتوں کی حقیقت کو کچھ بھی نہیں جانتے اگر محض قواعد دان سپاہی بننے اور فوجی ضبط و نظام کی عادت ڈالنے ہی کا نام مجاہدانہ ولولہ اور تیرہ سو سال قبل کا عمل ہے۔ تو انگریزی فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے ڈاکٹر مونجے کے ملٹری کالج میں داخل ہو جایئے۔ اور کچھ نہیں تو اسکاؤٹ تحریک ہی میں شامل ہو جایئے۔ ہر جگہ مشرقی صاحب کی فوج سے زیادہ فوجیت آپ کو مل جائیگی۔ جب لوگوں کی عقل و خرد کا اس قدر دیوالہ نکل گیا ہو کہ وہ مجاہد فی سبیل اللہ بننے اور محض فوجی بننے کے فرق کو بھی نہ سمجھ سکتے ہوں تو در اصل ان سے گفتگو کرنا ہی فضول ہے وہ جہاں چاہیں جھک مارتے پھریں۔

رہی یہ بات کہ ہمیں صرف سپاہی بننے کی مشق مطلوب ہے یا فوجی نظم درکار ہے۔ لیڈر کے خیالات سے سروکار نہیں۔ یہ ایک سراسر لغو بات ہے جسے کوئی صاحبِ عقل آدمی ایک لمحہ کیلیئے بھی باور نہیں کر سکتا۔ آپ کسی تحریک میں شامل ہوں اور اس کے لیڈر سے متاثر نہ ہوں یہ ناممکن ہے۔ لیڈر کی روح پوری تحریک کی روح ہوتی ہے۔ اور پیروؤں میں آپ سے آپ سرایت کرتی ہے۔ کوئی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور اگر وہ اس سے ہمرنگ و ہم آہنگ نہ ہو تو اس تحریک کے ساتھ زیادہ مُدت تک چل نہیں سکتا۔ لیڈر کی شخصیت اور اس کے خیالات اور جذبات کی کشش ہی افراد کو اس تحریک کی طرف کھینچتی ہے اور اسی کشش کے زور سے جماعت کا نظم قایم ہوتا ہے۔ فاشزم میں اگر مسولینی کی شخصیت اور اسکے خیالات کا زور کام نہیں کر رہا ہے؟ "نازی ازم" میں اگر ہٹلر کے عقائد و تخیلات کار فرما نہیں ہیں؟ "گاندھی ازم" میں اگر گاندھی جی کا فلسفہ اور ان کے نظریات نفوذ نہیں کیے ہوئے ہیں؟

تو بلاشبہ یہ مانا جا سکتا ہے کہ "خاکساریزم" کو مشرقی صاحب کے عقائد و خیالات سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ بات تو اب نظریہ کی حد سے گزر کر مشاہدہ میں آچکی ہے۔ ہر جگہ خاکسار صاحبان مشرقی صاحب کی طرف سے مناظرہ کرتے نظر آتے ہیں: تذکرہ پر اعتراض کیجئے اور ایک خاکسار فوراً اسکی مدافعت اور حمایت شروع کر دیگا۔ مشرقی صاحب کی کسی غلط سے غلط بات پر اعتراض کیجئے اور ہر خاکسار اسکو صحیح ثابت کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیگا حتیٰ کہ اگر مشرقی صاحب کا کوئی متعلق آپ کا قابل انکار شواہد سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ اپنی تحریک کو فروغ دینے کیلئے جھوٹ کے ہتھیاروں سے کام لیتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ خاکسار صاحبان سیاسی اور قومی اغراض کیلئے جھوٹ سے کام لینے کو سراسر جائز ثابت کرنیکی کوشش کرینگے اور الحرب خدعۃ سے استدلال کر کے تحلیل کذب کے حق میں ایسی ایسی شرمناک باتیں کہینگے جنھیں سنکر ایک شریف آدمی کا ضمیر کانپ اٹھیگا یہی نہیں بلکہ مشرقی صاحب کی سیرت عملاً خاکساروں کی زندگی میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ وہی اشتعال طبع اور تند مزاجی وہی بد مزاجی وہی بدزبانی اور جنگجوئی، وہی شیخی اور تفاخر جو مشرقی صاحب کی خصوصیات میں سے ہے۔ ہر جگہ ان نام نہاد خاکساروں میں دیکھی جاتی ہے یہ بھی ان ہی کی طرح جھوٹ کو بہترین پالیسی سمجھ کر بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ ان ہی کی طرح علماء اور اہل علم پر بدتمیزی کے ساتھ حملہ کرتے ہیں۔ انہی کی طرح نماز سے غافل ہیں۔ اور پریڈ کو اصل تنظیمی کام سمجھتے ہیں۔ انہی کی طرح مسائل دینی میں جاہلانہ اجتہاد کرتے ہیں۔ اور حدیث کو ساقط الاعتبار قرار دیا کرتے ہیں غرض یہ کہ چند سال کے تجربہ نے یہ بات اب پوری طرح نمایاں کر دی ہے کہ ایک غیر اسلامی عقیدہ اور غیر اسلامی سیرت رکھنے والے شخص کو محض تنظیم کی خاطر لیڈر اور امام تسلیم کر لینے سے لوگوں کے عقائد اور اخلاق پر نہایت مہلک اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ خیال کرنا سراسر خام خیالی ہے کہ لیڈر کی خیالات اور اس کی سیرت کو اس کی تنظیم اور قیادت سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں پر دنیا کی محبت اب اس قدر مسلط ہو گئی ہے کہ وہ دین و اعتقاد اور اخلاق کو محض ایک بے حقیقت اور بے قیمت چیز سمجھنے لگے ہیں اور ان کی نگاہ میں اصلی قدر و قیمت صرف دنیوی کامیابی اور مادی فلاح و بہبود کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کو اپنے اس معشوق کی ذرا سی جھلک بھی نظر آتی ہے یہ پروانہ وار اسی طرف دوڑتے ہیں۔ اور اگر اسلامی نقطہ نظر سے آپ انھیں بتائیں کہ اس جگہ بدعقیدگی اور پستی اخلاق کے نہنگ چھپے ہوئے ہیں تو یہ آپ کی اس تنبیہ کے باوجود اس طرف جانے میں کوئی تامل نہیں کرتے بلکہ ایسی تنبیہیں کرنے والوں کو احمق اور فرسودہ خیال سمجھتے ہیں۔ ڈیڑھ سو برس تک انگریز کی غلامی میں رہ کر اور پیٹ کی مار کھا کھا کر جو بدترین خصائل اس قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔ خاکسار تحریک اور اسی نوع کی دوسری تحریکات اور تنظیمات ان خصائل کا مجسم ظہور ہیں۔ یہ دراصل وہ پھوڑے ہیں جو ہمیں اس اندرونی فساد خون کا پتہ دیتے ہیں جو مدتوں سے اندر ہی اندر پرورش پا رہا ہے اب محض ان پھوڑوں پر آپریشن کر دینے سے کام نہیں چلیگا۔ اصلی کام یہ ہے کہ اس فسادِ خون کا علاج کیا جائے۔

نیاز مند :- ابوالاعلیٰ (محمود رنگون)

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزرا کہ مسلم لیگ نے پہلے پہل اپنی دہلی کی ایک میٹنگ میں "ہندوستان کی تقسیم" کے نظریہ کے حق میں اپنی رائے ظاہر کی تھی اور اس کا دستوری خاکہ تیار کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بھی بنادی تھی اُس وقت بھی ہم نے اس تجویز پر مختصر سا تبصرہ کیا تھا اور ہم منتظر تھے کہ اس کا تفصیلی خاکہ سامنے آئے تو اس پر اور زیادہ غور کیا جاسکے، اب قریباً سوا برس کے بعد لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اس میں اسی "تقسیمی تجویز" (پاکستانی اسکیم) کا انقطاعی فیصلہ کر دیا گیا —— اور گویا اب یہ چیز صاف ہوگئی کہ مسلم لیگ کے نزدیک مسلمانان ہند کے مستقبل کا تحفظ اسی تقسیم سے ہوسکتا ہے اور یہی اُس کے نزدیک ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا واحد حل ہے۔ ضرورت ہے کہ ملت کے اہل فکر و بصیرت افراد سنجیدگی سے اس تجویز کے تمام پہلوؤں پر غور فرمائیں! قوم کے مشتعل جذبات اور اس کی سیاسی ناواقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کو بلے چوڑے خواب دکھانا اور دوسری ممکن الحصول صورتوں سے اس کے عقل و دماغ کو پھیر کے نہ پوری ہونے والی تمناؤں میں الجھا دینا نہ دانشمندی ہے اور نہ دیانت داری۔

ہمارے نزدیک یہاں پہلا سوال یہ نہیں ہے کہ یہ تجویز مسلمانوں کے حق میں مفید ہوگی یا مضر؟ بلکہ جہاں تک ہم جیسوں کا تعلق ہے ان کی رائیں اس بارہ میں دو نہیں ہوسکتیں کہ اگر ہندوستان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصہ میں بھی صحیح معنی میں "آزاد اسلامی حکومت" قائم ہوسکے تو خواہ جس طرح بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو، ہونی چاہیئے، اور اس کے لئے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کو اگر زیادہ سے زیادہ قربانی کرنا پڑے تو اس سے ہرگز دریغ نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا یہاں پہلا سوال یہی ہے کہ یہ ہوگا کس طرح؟ اور بحالات موجودہ کہاں تک اس کا امکان ہے؟ —— کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان اس بلند تخیل ہی کے نشہ میں مست ہو کر اُن ضروری

تحفظات کی جد وجہد سے بھی نہ جائیں جن کا حصول اتنا زیادہ مشکل نہیں ہے اور جن کے لیئے جد وجہد کرنے اور مسلم رائے عامہ کو ان کے حق میں ہموار کرنے کا یہی وقت ہے

——————:(۱):——————

اس تجویز پر غور کرتے وقت سب سے پہلے یہ تنقیح سامنے آتی ہے کہ ہندوستان پر انگریزی اقتدار کے قایم رہتے ہوئے یہ "تقسیم" سوچی گئی ہے یا ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے آزاد فرض کر کے؟ —— بالفاظ دیگر آیا انگریز سے یہ اُمید باندھی گئی ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنی "شہنشاہی" کے ماتحت رکھتے ہوئے ہندو اکثریت کے صوبوں میں مستقل ہندو حکومتیں، اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں مستقل "اسلامی حکومتیں" اپنے زیر سایہ قایم کر دے گا۔ یا اس تقسیمی تجویز کی بنیاد اس خیال پر ہے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے بعد ایسا ہونا چاہیئے —— ؟

اگر پہلی صورت پیش نظر ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان حضرات نے یا انتہائی کم غوری سے کام لیا ہے اور یا دیدہ دانستہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے عوام مسلمانوں کو یہ "سراب" دکھایا ہے تاکہ آئندہ الیکشن میں "اسلامی حکومت" کے خوش کن اور روح افزا نام پر اُن کے زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کیئے جا سکیں —— ورنہ کم از کم مسٹر جناح جیسے پُرانے سیاست داں اور تجربہ کاروں سے ہرگز یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ انگریز کسی وقت بھی اپنے اختیار اور رضامندی سے ان کی اس آرزو کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ جہاں تک اُس کا بس چل سکیگا وہ اس کو پورا ہونے بھی نہیں دے سکتا۔

غور فرمایا جائے مسلمانوں کی معتدبہ اکثریت صرف صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان میں ہے اور یہ تینوں صوبے خارجہ مسائل کے لحاظ سے ہندوستان کے اہم ترین سرحدی صوبے ہیں بالخصوص سرحد اور بلوچستان ہندوستان کی نازک ترین سرحدیں ہیں، انگریز سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندوستان پر اپنی شہنشاہی کے قیام کے ارادہ کے باوجود ان صوبوں میں "آزاد اسلامی حکومتیں قائم کر دیگا" انگریز کو احمق ہی نہیں بلکہ پاگل سمجھ لینے کے مرادف ہے۔ اس معاملہ میں اس کی جو مستقل پالیسی ہے اُس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بلوچستان کو اُس نے اُن اصلاحات سے بھی محروم کر رکھا ہے جو آج دوسرے صوبوں کو ملی ہوئی ہیں* اور صوبہ سرحد کو اگرچہ وہ اصلاحات دیدی گئی ہیں لیکن پھر بھی وہاں کا نظم و نسق دوسرے صوبوں سے

* پھر وہاں کی مخلوق کو سیاسیات سے محض ناواقف رکھنے کے لیئے جو جو تدبیریں کی گئی ہیں اُنکا اندازہ صرف ایسے ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس لحاظ سے بلوچستان کے حالات کا جائزہ لیا ہو۔ مختصر یہ ہے کہ اس علم و روشنی کے زمانہ میں بھی ایک صوبہ بلوچستان ایسا ہے جہاں پورے صوبہ میں ایک بھی کالج اور ایک بھی باقاعدہ عربی مدرسہ نہیں ہے،

کافی امتیاز رکھتا ہے[1] وروہاں انگریزی نگرانی نہایت کڑی ہے۔

اندریں حالات یہ توقع رکھنا کہ انگریز ان علاقوں میں "آزاد اسلامی حکومتیں" قایم کردے گا نہایت سطحی درجہ کا عقلی فریب ہی کہا جاسکتا ہے۔

ان تین صوبوں کے علاوہ دو صوبے پنجاب اور بنگال ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ یہاں ہماری اکثریت صرف برائے نام ہے پنجاب میں ہم ۵۶ فی صدی ہیں اور ۴۴ فی صدی دوسری قومیں ہیں جن میں ایک سکھ بھی ہے جس کی خصوصیات محتاج بیان نہیں۔ اس کی ذہنیت کا تازہ نمونہ مسجد شہید گنج کے قضیہ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ شہید گنج مسجد تھی وہ کسی طرح اُس کو مسلمانوں کے حوالہ کرنے کے لیئے تیار نہیں ہوئے پس جو قوم مسجد کی چند گز زمین آپکو دینے پر تیار نہیں ہوئی اُس سے یہ توقع رکھنا کہ مسٹر جناح کے منطقی دلائل اُس کو اس کے لیئے تیار کر دینگے کہ وہ کل صوبہ پنجاب پر آپ کی مستقل حکومت تسلیم کرلے سادہ لوحی اور خود فریبی کی عجیب مثال ہے۔

علیٰ ہذا بنگال[2] کا ہندو بھی اپنی کچھ خصوصیات رکھتا ہے جن کا مظاہرہ وہ تقسیم بنگالہ کے مسئلہ پر کرچکا ہے پھر کیا اس سے توقع ہے کہ وہ امن چین کے ساتھ بنگال میں آپ کی "خالص اسلامی حکومت" قایم ہوجانے دے گا ـــــ اور اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ انگریز بہادر اپنی سنگینوں مشین گنوں کی حفاظت اور بمبار طیاروں کے سایہ میں سکھوں اور ہندوؤں کے علی الرغم ان صوبوں میں آپکی خالص اسلامی حکومت قایم کرادے گا تو یہ انگریز کی تاریخ اور سیاسی پالیسی سے انتہائی ناواقفی ہے۔

ہمارے ان مختصر اشارات سے قارئین کرام پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ انگریزی شہنشاہی اقتدار کے ہندوستان پر مسلط ہوتے ہوئے تو کسی طرح بھی تقسیم ہند کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اگرچہ بعض برطانوی اخبارات ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھانے اور ہندو مسلم اختلاف کی خلیج کو زیادہ وسیع کرکے برطانوی اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیئے آج اس تجویز کو اہمیت دے رہے ہوں۔

مجھے ایک نہایت ثقہ بزرگ سے جنھوں نے اس مسئلہ پر خود مسٹر جناح سے گفتگو کی تھی (اور

---

[1] مسلم لیگ کے اجلاس لاہور سے چند ہی روز بعد مسٹر جناح کا ایک بیان عام اخبارات میں شایع ہوا تھا جس میں اُنھوں نے یہ اُمید ظاہر کی تھی کہ میں اپنے دلائل کے زور سے ہندو اور سکھ سے یہ تقسیمی تجویز منوا لونگا ۱۲

[2] بنگال میں مسلمان صرف ۵۴ فیصدی ہیں اور غیر مسلم ۴۶ فی صدی ۱۲

وہ بذاتِ خود بھی اس تقسیمی تجویز کے حق میں ہیں) معلوم ہوا تھا کہ مسٹر جناح زیرِ سایہ برطانیہ ہی یہ تقسیم چاہتے ہیں گویا اُن کے پیشِ نظر یہی ہے کہ حکومتِ برطانیہ اپنی زیرِ سرپرستی ہندو اکثریت کے صوبوں میں "ہندو ریاستیں" اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں "اسلامی ریاستیں" قایم کر دے —— یہاں ہم کو اس سے بحث نہیں کہ ایسی صورت میں مسلم اکثریت والے صوبوں کی اُن حکومتوں کو جو تاجِ برطانیہ ہی کے زیرِ سایہ ہونگی "اسلامی حکومتیں" کہنا کیسا فریب، بلکہ "اسلامی حکومت" کے مقدس لفظ کی کتنی سخت توہین ہے۔ ہم کو تو اس وقت صرف یہ دکھانا تھا اور ہم دکھلا چکے کہ یہ اُمید کس قدر غلط اور یہ خیال کتنا خام ہے۔

رہا دوسرا احتمال کہ ہندوستان کو برطانوی اقتدار سے مکمل طور پر آزاد فرض کر کے یہ تجویز سوچی گئی ہے اور ان مجوزین کا منشا یہ ہے کہ آزادی کے بعد ہم ہندوستان کو اس طرح تقسیم کرنا یا کرانا چاہتے ہیں تو پھر اس وقت یہ غوغا بالکل ہی بے محل بلکہ مقصد کے لیئے مضر ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں تو یہ سوال اُٹھانے کے لیئے زیادہ موزوں وقت وہی ہو سکتا ہے جبکہ ہندوستان مکمل طور سے آزاد ہو جائے کیونکہ اُس وقت اس مسئلہ کا تعلق صرف ملک کی دوسری قوموں سے ہوگا اور انگریز کی طرف سے اپنے مخصوص مصالح کے لیئے جو رکاوٹ اس راہ میں اس وقت ہو سکتی ہے کم از کم وہی اُس وقت نہ ہوگی۔ بہر حال ہر مبصر معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے کہ اس تقسیمی تجویز کے بر روئے کار آنے میں جو مشکلات برطانوی تسلط کی موجودگی میں ہیں ملک کی آزادی کے بعد ان سے کچھ کم ہی ہونگی اس لیئے اگر فی الحقیقت ہمارے یہ لیڈر مسلمانوں کے حق میں اسی تجویز کو بہتر سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں اس کے امکانات ہیں تو پھر قرینِ دانش یہی ہے کہ برطانوی اقتدار سے ملک کی مکمل آزادی کے بعد وہ اس سوال کو اُٹھائیں، اور اُس وقت کو قریب تر لانے کے لیئے اس وقت اپنی پوری توجہ ملک کی آزادی کی طرف پھیر دیں۔

اگرچہ خود راقم الحروف کو بعض جوشیلے دوستوں کے اس مسلک سے سخت اختلاف ہے کہ مسلمان اپنے مخصوص ملی مسائل اور حقوق و تحفظات کی بحث کو ملک کی آزادی تک کے لیئے بالکل لپیٹ کر رکھ دیں لیکن جن حضرات کے نزدیک مسلمانوں کا تحفظ اس تقسیم ہی میں مضمر ہے اور ان کو اس کے بر روئے کار آنے کی بھی توقع ہے تو ان کے لیئے تو پھر بلاشبہ یہی راہ صحیح ہے کہ پہلے سب طرف سے اپنی توجہ ہٹا کے وہ ملک کی آزادی ہی کے لیئے جد و جہد کریں تاکہ اس تقسیم کے راستہ سے پہلے انگریز کا سنگِ گراں تو ہٹ جائے۔

:(۲):

ہماری یہاں تک کی بحث تو پہلی تنقیح کے متعلق تھی، دوسری تنقیح اس مسئلہ میں یہ پیدا ہوتی ہے کہ مسٹر جناح اپنے بیانات میں بار بار اس کی تصریح کر چکے ہیں کہ اس تجویز کی بنا پر ہجرت یا تبادلہ آبادی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ جو مسلم یا غیر مسلم اس وقت جہاں رہتے ہیں وہ بدستور اسی طرح اپنی اپنی جگہ رہینگے اس سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ ہندوستان کے تمام صوبوں کی آبادی جس طرح آج مخلوط ہے اسی طرح اور اسی تناسب سے آئندہ بھی مخلوط رہے گی ایسا نہیں ہوگا کہ مجوزہ "ہندو انڈیا" میں صرف ہندو رہیں اور مجوزہ "مسلم انڈیا" میں صرف مسلمان۔ — اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تجویز کی رو سے جن صوبوں کو "مسلم انڈیا" قرار دیا جائے گا تو کیا اُن کے متعلق یہ سوچا گیا ہے کہ وہاں کی حکومت بلا شرکت غیرے مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہوگی اور وہاں کی غیر مسلم آبادی کا نظم و نسقِ حکومت میں کوئی حصہ بھی نہ ہوگا؟ — یا مسلمانوں کی غالب حیثیت کو محفوظ رکھتے ہوئے وہاں کی غیر مسلم آبادی کو بھی حکومت میں کچھ حصہ دیا جائے گا؟

اس سوال کا جواب نہ تو تجویز کے متن سے ملتا ہے اور نہ مسٹر جناح یا مسلم لیگ کے کسی اور ذمہ دار لیڈر نے اپنے کسی بیان میں اس کا کوئی صاف صریح جواب دیا ہے۔ البتہ مسٹر جناح کے اس بیان سے جو انھوں نے اجلاس لاہور کے چند ہی روز بعد سکھوں کو مطمئن کرنے کے لیئے دیا تھا (اور جس میں اُنھوں نے سکھوں کو یقین دلایا تھا کہ "مسلم انڈیا" میں ان کی پوزیشن موجودہ پوزیشن سے بہتر رہے گی) یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اُنکی پیش نظر یہ نہیں ہے کہ "مسلم انڈیا" میں بلا شرکتِ غیرے خالص مسلمانوں کی حکومت ہوگی بلکہ وہاں کی غیر مسلم آبادی کو بھی وہ نظم و نسق حکومت میں حصہ دیں گے اور اتنا حصہ دیں گے کہ اُن کی پوزیشن موجودہ پوزیشن سے بہتر اور بلند تر ہوگی۔ پس اگر حقیقت حال یہی ہے اور مسلم اکثریت کے ان صوبوں میں اس تقسیمی تجویز کی رو سے جو حکومت قایم ہوگی، وہ بھی مشترکہ ہی ہوگی اور حکومت کو چلانے والے اداروں اور مجالس قانون ساز میں غیر مسلم بھی شریک کیئے جائینگے تو پھر اس کو "اسلامی حکومت" کہکر کیوں خلقِ خدا کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ ایسی "اسلامی حکومت"، تو پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد میں آج بھی قایم ہے کیونکہ وہاں کی مجالس قانون ساز میں بہر حال کثرت مسلمانوں ہی کی ہے اور جب تک کہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے صورت حال یہی رہے گی۔

اور اگر ان حضرات نے یہ سوچا ہے کہ اس تجویز کی رو سے مسلم اکثریت والے صوبوں میں جو حکومتیں

قایم کی جائینگی وہ خالص مسلمانوں ہی کی ہونگی اور ان کے نظم ونسق میں وہاں کی غیر مسلم آبادی کو کوئی حصہ نہیں دیا جائے گا بلکہ وہ محض "محکوم رعایا" کی حیثیت سے وہاں رہ سکیں گے اور "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" ان کا مقام ہوگا ——— تو یہ تصوّر تو یقیناً بہت بلند ہے۔ مگر ذرا یہ تو فرمایا جائے کہ یہ صورت بحالات موجودہ بلا "جہاد بالسیف" کے ممکن اور متصوّر ہے؟ اور کیا قوم اس کے لیے تیار ہے؟ یا کم از کم اس کے کچھ اسباب بھی فراہم ہیں؟ کتنے ہوائی جہاز اور کتنے بمبار طیارے۔ کتنی مشین گنیں اور کتنے رائفل آپنے تیار کر لئے ہیں؟ ——— زمانہ کی رفتار تو یہ ہے کہ وہ ریاستیں جو خالص شخصی اور خاندانی جاگیر دارانہ کی حیثیت رکھتی تھیں وہ بھی اب مجبور ہیں کہ بلا لحاظ مذہب و ملت اپنی رعایا کے ہر طبقہ کو کچھ نہ کچھ حصہ نظم ونسق حکومت میں دیں حتےٰ کہ وائسرائے بہادر بھی مجبور ہوتے ہیں کہ ایوان ریاستہائے ہند میں تقریر کرتے ہوئے ان بیچارے نوابوں اور راجوں ہی کو نصیحت کریں کہ وہ وقت کے ان رجحانات کو نظر انداز نہ کریں۔ اور رعایا کے مطالبات سے بے اعتنائی نہ برتیں۔ اور پھر خصوصاً آپ کا اور آپ کی قوم کا حال تو یہ ہے کہ ریاست حیدرآباد کے حکومتی اقتدار میں حصہ لینے کے لیے ماضی قریب ہی میں جب ہندوؤں نے ایجی ٹیشن شروع کیا تو اس ڈنڈ کچار کے باوجود کہ یہ ریاست

"ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی واحد یادگار اور سلطنت مغلیہ مرحومہ کے تیل سے جلا ہوا چراغ ہے

اگر ہندو اس شرارت سے باز نہ آئے تو ہم یہ کر ڈالیں گے اور وہ کر ڈالینگے"، آپ کچھ بھی نہ کر سکے اور ریاست کو مجبوراً ہندوؤں کے مطالبات ماننے پڑے اور اسمبلی میں ان کی نمائندگی منظور کر کے نظام حکومت میں انھیں حصہ دینا پڑا۔ اور جب دکن کے مسلمان باشندوں نے اس فیصلے کے خلاف ریاست میں ایجی ٹیشن شروع کیا تو خود مسٹر جناح ہی ان کو تسلّی دے کر ایجی ٹیشن رکوا دینے کے لئے حیدرآباد تشریف لے گئے اور وہاں کے زخمی دل مسلمانوں کے مجروح قلوب پر اپنے چند بیانات سے ٹھنڈا مرہم رکھ کر آخر ان کو آرام سے بٹھا ہی دیا۔ اور اس طرح آپکے دیکھتے دیکھتے "اس اسلامی ریاست" میں ہندو نے بھی اپنا حصّہ پیدا کر لیا۔ اور آپ کچھ بھی نہ کر سکے۔

آپ نے اپنی اکثریت والے صوبہ (پنجاب) ہی میں سکھ سے مسجد شہید گنج لینی چاہی اور نہ لے سکے / انگریز کے انصاف سے بھی اپیل کیا اور اس نے بھی یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ یہ مسجد آپ ہی کی تھی صرف اس بنا پر اس کو آپ کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا کہ عرصہ دراز سے اس پر سکھ ہی قابض ہیں" اور آپ اپنی طاقت سے اس فیصلہ کو نہ بدلوا سکے۔ جب یہ ہے حالت ہماری قوت و طاقت کی اور ہمارے جذبہ عمل کی تو یہ تصوّر کہ ہم اپنی اکثریت کے صوبوں میں بلا شرکت غیرے خالص اسلامی حکومت قایم کریں گے اور وہاں کے غیر مسلم

بس ذمیوں کی حیثیت سے ہماری رعایا بن کر رہیں گے"۔ یقیناً چند افیونی ہی کر سکتے ہیں یا پھر اس کو عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیئے ایک شاطرانہ حرکت ہی کہا جا سکتا ہے جس کے نتائج نہایت افسوسناک نکلیں گے۔

اس کے جواب میں کوئی صاحب خطیبانہ انداز میں یہ نہ فرما دیں کہ تم مسلمانوں کی توہین کرتے ہو، کیا تمہارا ایمان "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" پر نہیں ہے مسلمان کی تاریخ میں تو بے سروسامانی کے باوجود بدر اور یرموک کے جیسے سیکڑوں معرکے موجود ہیں"۔ ایسے جذباتی حضرات کو سوچنا چاہیئے کہ ہماری بحث عہد حاضر کے اُن ہندی مسلمانوں کے متعلق ہے جنکے قائد اعظم مسٹر جناح جیسے بزرگانِ قوم ہیں اور جنکی ایمانی شان ہمارے سامنے ہے اُن اسلاف کے متعلق یہ گفتگو نہیں ہے جن کا دستور زندگی قرآن تھا اور جنکے "امیر المومنین" ابوبکر و عمر تھے رضی اللہ عنہما۔ بہرحال اس تقسیمی تجویز کے حامیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے منصوبہ کی ضروری تفصیل کریں اور اس سلسلہ میں جو اہم ابتدائی سوالات پیدا ہوتے ہیں کم از کم انکا جواب دیں تاکہ عام مسلمان انکے مقاصد اور انکی امکانات پر پوری طرح غور کر کے نتیجہ پر پہونچ سکیں۔

———— (۳) ————

تیسری چیز یہاں غور طلب یہ ہے کہ اس تجویز پر عملدرآمد کے بعد ہندو انڈیا یعنی ہندو اکثریت والے صوبوں میں جو قریباً دو کروڑ مسلمان رہتے ہیں اور آپ کی اس تجویز کے مطابق آئندہ بھی ان کو وہیں رہنا ہے اُن کے مذہبی و ملی حقوق کے تحفظ کی آپ نے کیا صورت سوچی ہے؟ کیونکہ زیادہ خطرہ میں تو انہی کا مذہب، انہی کی تہذیب اور انہی کے حقوق مدنیت ہیں، بنگال۔ پنجاب۔ سرحد اور سندھ کے مسلمان تو آج بھی ہندوؤں کے زیر حکومت نہیں ہیں، اس لیئے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے جور و ظلم اور اس کی غلامی و محکومی سے بچانے کے لیئے اگر کوئی تجویز سوچی جائے تو اس میں سب سے زیادہ لحاظ انہی مسلمانوں کا ہونا چاہیئے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہتے ہیں کیونکہ ہندو اکثریت سے جو خطرہ ہے وہ دراصل انہی کے لیئے ہے مسلم اکثریت کے صوبوں میں تو آج بھی سیاسی اقتدار مسلمانوں ہی کا ہے۔ اور اگر بفرض یہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی آئندہ بھی نافذ رہے تو بھی صورت حال یہی رہے گی، لہٰذا اصل مسئلہ انہی مسلمانوں کے تحفظ کا ہے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہیں اور اُن کی تعداد اچھی خاصی دو کروڑ ہے گویا مسلم اکثریت والے صوبوں کی تعداد کی پوری نصف لیکن اس پاکستانی اسکیم میں ان کے مسئلہ کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس تجویز کے سلسلہ میں جو تقریریں ہوئی ہیں اس کے اجلاس میں یا زعماء لیگ کے جو ذمہ دارانہ بیانات بعد میں شایع ہوئے ہیں انمیں جو کچھ اس سلسلہ میں کہا گیا ہے وہ قطعاً تسلی بخش نہیں بلکہ سنجیدہ فکر اور صاحب بصیرت رکھنے والوں کیلئے اسکی حیثیت کسی طرح طفل تسلی سے زیادہ نہیں۔

ایک بات تو اس سلسلہ میں یہ کہی گئی ہے کہ اس تقسیم یا بٹوارہ کے بعد "ہندو انڈیا" میں جو مسلمان رہیں گے انکے حقوق کا تحفظ "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" کے درمیان مستقل بین الاقوامی معاہدات سے کیا جائے گا۔

لیکن عملی دُنیا میں صرف معاہدات کی جو حیثیت ہے، کیا ہمارے یہ زعما اس سے ناواقف ہیں؟ مکتب سیاست کا آج کون طفل ہے جو یہ نہیں جانتا کہ اسٹیٹ اور حکومتی اقتدار میں با اختیار حصہ داری کے بغیر فی زمانا مساویانہ مدنی حقوق تو کجا اپنی ملی ہستی کی بھی حفاظت نہیں کی جا سکتی۔

غور فرمایا جائے کہ اس تجویز کی رو سے ہندو انڈیا میں جو دو کروڑ مسلمان رہ جاتے ہیں اُن کی حیثیت وہاں پر غیر ملکی باشندوں کی ہوگی جن کا نظام حکومت میں کوئی حصہ نہ ہوگا وہ نیابت اور ملازمتوں سے قطعاً محروم کیئے جا سکیں گے۔ اور چند دنوں میں ان کی اقتصادی اور تمدنی حالت سب سے بدتر ہو سکیگی اُن کے جینے کا سہارا بس وہ معاہدات ہوں گے، جو ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے درمیان ہوں گے ___ اگر مثالی شکل میں اس پوزیشن کو سمجھنا ہو تو یوں سمجھیے کہ برما میں آج ہندوستانیوں اور خاص کر ہندی مسلمانوں کی جو کس مپرسانہ پوزیشن ہے اُس سے بھی بدتر اور کمزور تر اُن دو کروڑ مسلمانوں کی قانونی اور عملی پوزیشن ہوگی۔ جو اس پاکستانی اسکیم کی رو سے ہندو انڈیا میں رہینگی، پس غور فرمایا جائے کہ یہ پوزیشن کس قدر غلط اور مہلک پوزیشن ہوگی۔

ایک دوسری بات اس سلسلہ میں بعض کم سوچنے اور زیادہ بولنے والے حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ "ہندو انڈیا" میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ اگر وہاں کی ہندو حکومتیں کچھ زیادتی اور ان کے حقوق میں دراندازی کرینگی تو مسلم انڈیا کی مسلم حکومتیں اس کا انتقام اپنے علاقوں میں بسنے والے ہندوؤں سے لینگی اور اس وجہ سے ہندو انڈیا کی حکومت کو اپنی مسلمان رعایا کے حق میں اپنا رویہ منصفانہ رکھنا پڑے گا تاکہ مسلم انڈیا میں بسنے والے اُن کے ہم مذہب بھائیوں کے ساتھ بدسلوکی نہ ہو۔

اسی طرح کی ایک دوسری لغو اور مہمل بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اگر ہندو انڈیا کی حکومتیں اپنے علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ کوئی ناواجب سلوک کرینگی تو مسلم انڈیا کی مسلم حکومتیں ان پر یلغار کر دینگی اور اس طرح ہندو انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں کے مذہبی و ملی حقوق کی حفاظت بھی مسلم انڈیا کی طاقت و قوت کرے گی۔

یہ دونوں باتیں اس قدر لغو اور طفلانہ ہیں کہ سنجیدہ بحث میں درحقیقت ان کا تذکرہ بھی نہیں آنا چاہیئے تھا مگر چونکہ بعض اچھے خاص ذمہ دار لیڈر بھی آج عوام مسلمانوں کے سامنے یہ چیزیں پیش کر رہے ہیں

اس لیئے ان کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ناگزیر ہوگیا ہے۔

پہلی بات کے متعلق تو ہر معمولی عقل رکھنے والا بھی اتنا سوچ سکتا ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعایا کے کسی بے قصور طبقہ پر صرف اس لیئے ظلم نہیں کرسکتی کہ کسی دوسرے ملک اور دوسری حکومت میں اس کے ہم مذہب اس حکومت کے ہم مذہبوں پر زیادتی کر رہے ہیں۔ اور نہ ایسی حکومت کو کسی دن چین سے بیٹھنا نصیب ہوسکے گا۔ اس کو آئے دن بغاوتوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیئے اُسے کسی وقت بھی مہلت نہ ملے گی، بلکہ اُس کی عمر بھی گنتی کے چند دنوں سے آگے نہ بڑھے گی۔

اور پھر یہ حکومت شریعت اسلام اور قانون اخلاق کی بھی مجرم ہوگی، کیونکہ اسلام اور مسلمہ اصول اخلاق ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ ایک ملک کے مجرموں کا انتقام دوسرے ملک کے رہنے والے اُن کے بے قصور ہم مذہبوں سے لیا جائے۔

علیٰ ہذا دوسرا تخیل (کہ اگر ہند وانڈیا کی کسی حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ بے انصافی یا بدسلوکی ہوئی تو مسلم انڈیا کی مسلم حکومتیں اس کے خلاف جارحانہ اقدام کریںگی) محض شیخ چلیانہ تخیل ہے جو کبھی بھی عملی شکل اختیار نہ کرے گا اور نہ اس دُنیا کے موجودہ ماحول میں ایسا ممکن ہے، آج کل ہر حکومت جو اپنا بقا چاہتی ہے سب سے مقدم اپنے ذاتی مسائل کو سمجھتی ہے جن سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ دوسری حکومت میں رہنے والے اپنے ہم مذہبوں کی حمایت میں کسی حکومت سے برسرِ پیکار ہوجانے کی توقع اس دُنیا کی کسی حکومت سے نہیں کی جاسکتی اور صرف احتمال عقلی کے درجہ میں یہ اُمید کی بھی جاسکتی ہو تو صرف ایسی حکومت سے کی جاسکتی ہے جو شدید قومی و مذہبی حمیت کے علاوہ غیر معمولی طاقت و قوت رکھتی ہو اور اپنے اندرونی نظم و نسق کی طرف سے بالکل مطمئن ہو اگر اس پاکستانی اسکیم کی رو سے جو مسلم ریاستیں آپ بنانا چاہتے ہیں اُن سے تو اس قسم کے اقدام کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا ان کو تو اپنا سنبھالنا ہی مشکل ہوگا کیونکہ اُن کے جن صوبوں میں غیر مسلم آبادی کم ہے (یعنی سندھ۔ سرحد۔ بلوچستان) ان کی تو مالی حالت حد درجہ کمزور ہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ ہی دوسروں کی مالی اعانت کے دستنگر رہیں گے، اور جن صوبوں کی مالی حالت اچھی ہے (یعنی بنگال و پنجاب) ان میں آپ کی اکثریت محض برائے نام ہے جس کی وجہ سے کسی وقت بھی وہاں کی مسلم حکومتوں کو اتنا اطمینان حاصل نہیں ہوسکے گا کہ وہ ہندو انڈیا میں رہنے والے مسلمانوں کی حمایت کیلئے اپنی ہمجوار ہندو حکومتوں کے خلاف کوئی موثر جارحانہ اقدام

کر سکیں —— اور اصل بات وہی ہے جو ہم ابھی عرض کر چکے کہ یہ سب اول سے آخر تک محض شیخ چلیانہ تخیّل ہے ورنہ کون اس حقیقت سے ناواقف ہے، کہ سلطنت مغلیہ کے سقوط کے بعد سے اب تک مسلمانانِ ہند پر کتنی مصیبتیں ٹوٹیں، اُن کے مذہبی و ملّی کس قدر حقوق پامال ہوئے لیکن کبھی بھی کسی آزاد مسلم حکومت نے حتّے کہ خلافتِ اسلامیہ نے بھی ہماری حمایت کے لیے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا بلکہ کبھی کوئی نوٹس بھی نہیں لیا۔

اور دور جانے کی کیا ضرورت ابھی ابھی فلسطین میں کیا ہوا؟ وہاں کے مصیبت زدہ مسلمانوں نے بار بار اپنی داستانِ غم دُنیا بھر کے مسلمانوں کو سُنائی، اسلامی حکومتوں کو خصوصیت کے ساتھ انھوں نے خطاب کیا، فریاد پہ فریاد کی لیکن کیا کسی بھی آزاد یا نیم آزاد "اسلامی حکومت" نے ان کے پھٹے میں پیر رکھا؟ کسی طرف سے بھی ہمدردی کے زبانی پیغاموں یا چندہ کے چند روپیوں کے سوا ان کی فریاد اور دعوت انتصار کا کوئی جواب ملا؟

ان مسلسل تجربات کے بعد کوئی احمق ہی ان طفل تسلیوں سے مطمئن ہو سکتا ہے۔

بہر حال اس "پاکستانی اسکیم" کے بر روئے کار آنے کی صورت میں جو دو کروڑ مسلمان ہندو اکثریت کے صوبوں میں رہ جاتے ہیں ان کو اس تجویز میں بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ مسلم لیگ کے بازار میں گرمی انہی کی مظلومیت کے سچے واقعات یا مبالغہ آمیز افسانوں سے پیدا ہوئی تھی۔ یا پیدا کی گئی تھی۔

ان تین سوالوں کے علاوہ اور بھی چند اہم اصولی سوال اس اسکیم کے متعلق قابل غور ہیں جن کا تعلق صوبوں کی اقتصادی اور جغرافیائی پوزیشن سے ہے لیکن سر دست ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں اور مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ طبقہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے وقت ان پہلوؤں کو پیش نظر رکھیں کسی چیز کو قوم کا نصب العین بنانا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس بارہ میں زعماء قوم کا غلط فیصلہ قوم کی منزل کو بہت کھوٹا کر سکتا بلکہ قوم کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔

اور اگر اس "تقسیم اور بٹوارہ" کا منشا صرف "واحد فیڈریشن" کی مصیبت سے نجات حاصل کرنا ہے اور آپ اس طرح ہندوستان کی از سر نو تقسیم کرا کے بس دو فیڈریشن قایم کرانا چاہتے ہیں تاکہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی اکثریت کو فیڈریشن کا شکنجہ بے اثر نہ کر سکے تو پھر "پاکستان" اور "اسلامی حکومت

جسے مغالطہ آمیز الفاظ نہ بنایئے اور اپنا منشا صاف ظاہر کیجئے تاکہ پھر براہ راست اُسکی منفعت و مضرت کے تمام پہلوؤں پر بحث کی جاسکے اور ہر شخص سلجھے ہوئے دماغ سے اس پر غور کر سکے

ہماری ان معروضات پر غور کرتے وقت یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اس "تقسیمی اسکیم" سے ہمارا اختلاف "قوم پرست" حضرات کے نقطۂ نظر سے نہیں ہے۔ بلکہ واحد قومیت اور انگلستانی طرز کی وحدانی جمہوریت کے اصول پر جس قسم کے وحدانی اور ہمہ گیر سٹیٹ کی تعمیر کانگریس کے ہندو لیڈر اور ہمارے بعض "قوم پرست" حضرات کرنا چاہتے ہیں ہم غالباً اُس کے مسلم لیگی حضرات سے بھی زیادہ خلاف ہیں اور ہمارا غیر متزلزل اعتقاد ہے کہ ہندوستان میں صرف "بین الاقوامی وفاق" کے اصولوں ہی پر ملکی حکومت کامیاب ہوسکتی ہے۔ جسکے متعلق اب سے پہلے کئی بار ہم اجمال و تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر بھی کرچکے ہیں لیکن پاکستانی اسکیم ہمارے نزدیک کسی طرح بھی ہندوستان کے مسئلہ کا صحیح حل نہیں ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی

(۳)

(از حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر دینیات عثمانیہ یونیورسٹی دکن)

حضرت امام کا نظریہ امام صاحب نے اپنے عمل کا نظام نامہ کیا مرتب کیا تھا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس کا صحیح علم تو اُسی وقت ہو سکتا تھا جب امام صاحب یا ان کے شاگردوں کا کوئی بیان اس سلسلہ میں مجھے کسی طرح مل سکتا، مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ تو بڑی بات ہے، یہاں تو ارباب تاریخ نے بھی کوئی مسلسل چیز اس ذیل میں نہیں چھوڑی ہے، لیکن امام صاحب کا نظام نامہ اگر ہمارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا، ان کا کام تو ہمارے سامنے ہے۔ "آخران" سے بھی "تو لِمَ" تک راہ بنائی جاتی ہے اور پھلوں سے اکثر درختوں کو پہچانا گیا ہے، میری کوشش کی بھی اس راہ میں یہی نوعیت ہے،

میں نے عرض کیا تھا، امام کو اپنی جوانی کے دنوں میں روشنی کے بعد جس تاریکی سے سابقہ پڑا تھا، وہ یزید بن عبدالملک کی حکومت اور اس حکومت کی بنیاد کا وہ اساسی فرمان تھا جسے عقد الفریہ سے میں بجنسہ نقل کر چکا ہوں، اس فرمان کا وہ فقرہ یعنی اعیدوا الناس الی طبقتھم الاولیٰ دراصل تشریح کا محتاج ہے کہ اسی کی تشریح سے امام کے ابتدائی منصوبہ (پروگرام) کا جہاں تک میرا خیال ہے کچھ نہ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

اس فقرہ کا سیدھا سادہ مطلب تو یہی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کی حکومت سے پہلے مسلمان جس حال میں تھے، اسی حال کی طرف وہ واپس کر دیئے جائیں، اسے یزید نے اپنے ولاۃ اور گورنروں کے نام حکم جاری کیا تھا لیکن سوال یہ ہے؟ کہ مسلمانوں کا وہ حال کیا تھا؟ جس کی طرف وہ انھیں لوٹا کر پہونچانا چاہتا تھا؟

ممکن ہے لوگوں کو مجھ سے اختلاف ہو لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ کچھ اسی زمانہ میں نہیں، بلکہ تقریباً ایک حد تک ہر زمانہ میں حکومتوں کے اثر سے زیادہ تر وہی بگڑتے ہیں، جو دراصل خود بگڑنا چاہتے ہوں، خصوصاً مذہب[1] کی حد تک شاید میرا یہ دعوے بالکلیہ غلط نہیں قرار دیا جا سکتا علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ حکومت

---

[1] اس زمانہ میں جب اچھوں کے نزدیک مذہب قیامتی تفوق کا ذریعہ ہو یا نہ ہو لیکن سیاسی برتری کے حصول کا ایک آلہ ہے، میری یہ بات گراں گزرے گی لیکن "والذین اتقوا فوقھم یوم القیمۃ" (اور تقوی والے کافروں سے قیامت

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہو، وہ خود اپنے کو اُسی مذہب کا پیرو بتاتے ہوں، اور وہ مرتد و منافق نہ ہوں۔

میرا مطلب یہ ہے کہ خلفاء بنی امیہ کی ذاتی زندگی مذہبی حیثیت سے جیسی کچھ ہو لیکن باایں ہمہ ان پر بہتان ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ العیاذ باللہ اسلامی عقائد کو ترک کرکے کفر کے خیالات پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرتے تھے، کون ثابت کر سکتا ہے کہ جس حکومت کے اکثر خلفاء خود جماعت کے پابند تھے، خود امامت کراتے تھے روزے رکھتے تھے، حج کرتے تھے، وہی مسلمانوں کو نماز روزہ حج زکوٰۃ سے روکتے تھے۔

ہاں ان کے بعض ذاتی حالات جن میں سے بعض چیزوں کا تذکرہ تمثیلاً میں نے بھی کیا ہے، ان کو سُن کر یا دیکھ کر بیساختہ آدمی کے ایمانی جذبات میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور یہ ایمان ہی کا تقاضہ ہے، لیکن اُس وقت اگر کسی کو مرحوم بادشاہ ظفر کا یہ مشہور مصرعہ یاد آجایا کرے کہ ؎

پڑی اپنے عیب پر جب اپنی نظر تو جہاں میں کسی کا گلہ نہ رہا

تو سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جایا کرے یا اس کو ٹھنڈا پڑ جانا چاہیئے آخر اسلامی مطالبات پر ہم میں سے کتنوں کی شخصی زندگی منطبق ہے، (بشرطیکہ اپنے گریبانوں میں مُنہ ڈالنے کی ہمیں عادت ہو)

لیکن باایں ہمہ ہمیں بھروسہ ہے کہ ہمارا انجام وہ نہ ہوگا، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کذب اور جھٹلانے والوں کے ساتھ مخصوص ہے، جب ہم خود اسی بھروسہ پر جیتے ہیں، تو جن کی کمزوریاں ہماری کمزوریوں سے نسبتاً ہلکی تھیں اسی بھروسہ پر اُن کو مرتا ہوا تسلیم کرکے

تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت وعلیہا وہ ایک طبقہ تھا جو گزر چکا، جو کچھ اپنے نفع کے لیئے

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) کے دن اونچے رہیں گے)، پر جو ایمان لا چکا ہے وہ انسان کو خدا کی بادشاہی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے عقیدہ کو انسان کی بادشاہی کا حیلہ کیسے قرار دے۔ ممکن ہے کہ معاشی بگاڑ میں حکومتوں کو دخل ہو، اور کبھی کبھی اس کا دُنیا نے ضرور تماشا کیا ہی لیکن کیا یہی سبب ہر کہ ہزارہا سال سے یہودی سارے عالم میں اور صدیوں سے پارسی ہندوستان میں اس نظریہ کو بھی جھٹلا رہے ہیں، تاہم معاشی بگاڑ کا تو حکومتوں کی وجہ سے آدمی کو تجربہ بھی ہی لیکن حکومت کے اثر سے زیادہ تر مذہب کو ان ہی لوگوں نے چھوڑا ہے جو خود اس کے چھوڑنے پر آمادہ ہوئے ورنہ ہزار پندرہ سو سال سے ہندو اپنے مذہب پر باقی نہیں رہتے، اور یہ تو پہلے زمانہ کی بات ہی، آج ہندوستان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ اگر مسلمانوں کا مذہبی بگاڑ حکومت کے دباؤ کا نتیجہ ہی تو آخر اسی دباؤ کے نتائج ہندوؤں ہی مسلمانوں کے خلاف کیوں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ہندو تعلیم یافتہ تعلیم پاکر ہندویت میں کٹر ہو جاتا ہی، اور مسلمان جو کچھ ہو رہا ہی وہ سب کے سامنے ہی۔

ہندوؤں میں دن بدن سنسکرت کا شوق ترقی پذیر ہی اور مسلمان دن بدن عربی چھوڑ رہے ہیں۔ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جو بگڑنا چاہتے ہیں وہ بگڑ رہے ہیں اور جو بننا چاہتے ہیں بن رہے ہیں ۱۲

ما اکتسبت ولا تسئلون عما کانوا یعملون (القرآن محکم)	انھوں نے کیا ہو ان کو ملے گا، اور جو کچھ اپنے نقصان کا کیا اُس کا تعلق بھی ان ہی سے ہے اور وہ جو کچھ

کرتے تھے اس سے تم پوچھے نہ جاؤگے

تلاوت کرتے ہوئے ہم کیوں نہ خاموش ہو جائیں، کم از کم اپنا تو ذاتی طرزِ عمل یہی ہے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ جن واقعات کا تذکرہ اس سے پہلے میں نے کیا ہے یا کچھ آئندہ کروں گا اس کے لئے مجھے اپنے اوپر کتنا جبر کرنا پڑا ہے؟ اذکروا موتاکم بالخیر" (اپنے مردوں کا ذکر بھلائی کے ساتھ کیا کرو) اس کے مکلفوں کو ایسے واقعات کے بیان کرنے میں تکلیف ہوتی ہو، تو یقیناً اسے ہونا چاہیے، خصوصاً جس زمانہ کے یہ واقعات ہیں، اس وقت کی سیاسی الجھنوں میں اُلجھنے والوں کے سامنے جو دشواریاں تھیں ان کا صحیح اندازہ اس زمانہ میں آسان نہیں ہے، بیچارے بنی اُمیہ کے خلفاء تو بدنام ہی ہیں لیکن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے فضل و کمال، تقویٰ و طہارت، اخلاص و صدق میں کسے شک ہو سکتا ہے لیکن تاریخ کی یہ شہادت اگر صحیح ہو تو اس زمانہ کی مجبوریوں کی شرح بہت کچھ اس ایک واقعہ سے بھی ہو سکتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن زبیر کا اقتدار حجاز میں اچھی طرح قایم ہو گیا، اور جیسا کہ سب جانتے ہیں مکہ معظمہ کو مرکز قرار دے کر آپ نے اپنے مقبوضہ علاقہ پر حکومت شروع کی تو حسب دستورِ خلفاء راشدین جمعہ کا خطبہ بھی آپ پڑھنے لگے، لیکن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا گیا کہ اپنے خطبوں میں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر چھوڑ دیا نہیں فرماتے ہیں، لیکن ان سے جب وجہ پوچھی گئی تو اس کا جواب انھوں نے جو دیا ہے۔ اگرچہ ایک جزئی واقعہ ہے، لیکن اس عہد کی سیاسی ذہنیتوں کی شرح کا شاید ایک کلی قانون بن سکتا ہے، بہرحال انھوں نے فرمایا۔

واللہ ما منعنی من ذکرہ علانیۃ انی اذکرہ سرا واصلی علیہ ولکن رأیت ھذا الحی من بنی ھاشم اذا سمعوا ذکرہ اشرأبت قلوبھم، وابغض الاشیاء الیّ ما یسرھم [1]	خدا کی قسم حضور کے علانیہ ذکر سے کسی اور بات نے نہیں روکا۔ میں نے تو خاموش طور پر حضور کی یاد مشغول رہتا ہوں آپ پر درود بھیجتا ہوں لیکن یہ بنی ہاشم والے جب حضور کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل خوشی سے بھر جاتے ہیں ان کا خوش کرنا مجھے منظور نہیں۔

[1] الفرقان۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی جو جلالت، دور وسیع پختہ اور ثابت شدہ روایات سے معلوم ہے وہ اس قسم کی حکایات تسلیم کرنے سے مانع ہے اور ابن الزبیر کے مقابلہ میں ہاشمی حکایت گزار ناظمین کو سیاسی الجھنوں کا شکار مان لینا زیادہ آسان ہے بلکہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

خیر! یہ تو ایک ذیلی بات تھی بعض خاص وجوہ سے میں نے اس کا تذکرہ ضروری خیال کیا اب میں اپنے اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

میں اس سوال کا جواب دے رہا تھا کہ یزید بن عبدالملک اپنے فرمان سے کس سابق حال کی طرف مسلمانوں کو لوٹانا چاہتا تھا، میں نے جیسا کہ عرض کیا، اس کی قطعاً یہ غرض نہ تھی کہ مسلمان بے دین بنا دیئے جائیں اور ان میں فسق و فجور پھیلایا جائے۔

کیونکہ نہ اس سے پہلے بنی اُمیہ کے خلفا نے ایسا کیا تھا، اور نہ عموماً حکومتیں اپنی رعایا کے مذہبی معاملات میں اتنا براہ راست دخل دیتی ہیں۔

سلاطین و امرا کے شخصی حالات سے متاثر ہو کر جو بگڑتے ہیں، زیادہ تر یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی فطرت چھچھوری، اور جن کا دماغ کھوکھلا ہوتا ہے، پھر کسی قوم کے چند افراد جب بگڑ جاتے ہیں تو ان کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بتدریج ان ہی راہوں پر چل پڑتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب یہ خود چلنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن پختہ عزم، اور بلند حوصلہ رکھنے والوں نے جب کبھی یہ طے کر لیا ہے کہ "دہر میں جو کچھ بھی ہو رہا ہو ہونے دو لیکن ہم اس کے ساتھ نہیں گھومیں گے، تو خواہ کسی قسم کی حکومت ہو، ان کو اپنی راہ سے ہٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئی خصوصاً جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں یہ وہ زمانہ ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی انتھک کوششوں نے اسلامی دنیا کے گوشہ گوشہ کو اہل علم و فضل سے بھر دیا تھا، ایک بڑا گروہ ایسے علما کا تقریباً ہر مرکزی مقام پر پیدا ہو گیا تھا، جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی نگرانی ہی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین بنائے ہوئے تھا، تاریخوں میں لکھا ہے کہ اسی بنیاد پر حضرت عمر بن عبدالعزیز کو قوم کی جانب سے معلم العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن سعد نے مشہور محدث میمون بن مہران سے نقل کیا ہے

کان عمر بن عبد العزیز معلم العلماء (ج ۲)　　عمر بن عبدالعزیز علما کے معلم اور استاذ تھے!

بہر حال اور کسی حکومت کے عہد میں ایسا ہو یا نہ ہو، لیکن جس عہد میں حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے ہوش سنبھالا تھا، اس وقت مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا مذہب ان کا دین سلاطین و امرا کے دسترس سے باہر تھا، کم از کم میرا تو یہی خیال ہے،

لیکن باوجود اس کے مسلمانوں کی زندگی کے دو شعبے، یعنی ان کا مال اور ان کا انصاف حکومت کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا اور یہ دو چیزیں ہیں بھی ایسی کہ حکومت کے سوا اس کی نگرانی کوئی دوسری طاقت کر بھی

نہیں سکتی خلافت کے نام سے حکومت کا جو نظریہ اسلام نے پیش کیا تھا منجملہ اور خصوصیات کے ان دونوں شعبوں میں اس کا جو نقطۂ نظر تھا، اور خلافت کے نظریہ کو بادشاہت اور ملوکیت کے نظریہ سے جب بدل دیا گیا تھا، تو پھر حکومتوں کا جو طرز عمل اس سلسلہ میں ہو گیا تھا، اگرچہ اجمالاً اس کا علم تقریباً ہر پڑھے لکھے مسلمان کو ہے لیکن میں جو کچھ کہنا چاہتا اس کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ چند جزئی مثالوں سے اسے واضح نہ کیا جائے۔ اسلامی اموال یا بیت المال کے متعلق خلافت کے نقطۂ نظر کی تعبیر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ان واقعات سے ہو سکتی ہے جو تواتر کی حیثیت میں تاریخ کی اکثر کتابوں میں عموماً بکھرے ہوئے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس کوفہ کا عامل آیا، حضرت اندر تھے، عامل وہیں بلا لیا گیا اس نے دیکھا کہ حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں وہ سخت متعجب ہوا۔ جب ایشیا و افریقہ کے اتنے بڑے بادشاہ کے سامنے صرف جو کی روٹیاں اور زیتون کا تیل رکھا ہوا تھا، عامل نے کہا کہ آپ کے ممالک محروسہ میں گیہوں کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے پھر حضرت جو کی روٹی گیہوں تناول فرما رہے ہیں؟ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ کیا گیہوں کی اتنی مقدار پیدا ہوتی ہے کہ ہر مسلمان تک اس کی روٹی پہونچ جائے، اس نے کہا کہ اس کی ذمہ داری کون لے سکتا ہے، فاروق نے اس وقت خلافت کے نظریہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا "مسلمانوں کا امیر گیہوں کی روٹی اس وقت تک کیسے کھا سکتا ہے جب تک ہر مسلمان کو جو ہمارے علاقہ میں آباد ہیں گیہوں کی روٹی نہ پہونچ جائے، عام رمادہ میں آپ کا غلام کچھ گھی اور پنیر لے آیا، حضرت نے فرمایا مجھے مسلمانوں کے حال کا احساس کیسے ہو سکتا ہے جب تک کہ خود بھی وہی نہ کھاؤں جو عام مسلمین کھاتے ہیں (کامل ابن اثیر، ابن سعد وغیرہ میں اس قسم کے واقعات کا ایک ذخیرہ موجود)

لیکن جب خلافت سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تو مسلمانوں کا وہی امیر جس کے فرائض کی ذمہ داریاں خواہ جتنی بھی اونچی ہوں لیکن مالی حقوق کے میدان میں وہ مسلمانوں کی صف کا سب سے آخری آدمی قرار دیا گیا تھا اب بادشاہ بن کر وہ اسلامی اموال کا سب سے پہلا مطلق العنان خود مختار حقدار بن گیا، رسول (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وہی گدی جس پر بیٹھنے والوں کو خلافت کے زمانہ میں اس حال میں پایا گیا تھا جیسا کہ امام مالک حضرت انس رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے راوی ہیں۔ کہ

رائیت عمر بن الخطاب وھو یومئذ	میں نے عمر بن الخطاب کو دیکھا اس زمانہ میں
امیر المومنین قد رقع بین کتفیہ	جب وہ مسلمانوں کے امیر تھے کہ اپنے دو مونڈھوں

برقع ثلاث لبّد بعضها فوق بعض — کے بیچ میں تین پیوند لگائے ہوئے ہیں ایک کو دوسرے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا۔

اور یہ تو امام مالک جیسے ثقہ راوی کا بیان ہے ورنہ تاریخوں میں ذ۱۰ دس بارہ۱۲ بارہ پیوندوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے ان پیوندوں میں کبھی کبھی سرخ چمڑے کا ٹکڑہ بھی ہوتا تھا۔ اور جس کے "توشہ خانہ عامرہ" کی یہ رپورٹ ہے کہ کبھی کبھی حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ وقت مقررہ پر گھر سے باہر نہ نکلتے، وجہ پوچھی جاتی تو اس زمانہ کی دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ فرماتا

غسلت ثیابی فلما جفّت خرجت الیکم (ازالۃ الخفاء) — کپڑے دھو رہا تھا جب خشک ہوئے، تو تم لوگوں کے پاس آیا ہوں۔

لیکن رسول کی یہی گدی مدینہ منورہ سے منتقل ہو کر جب دمشق میں پہونچی ہے تو اس پر بیٹھنے والوں میں سے ایک کو گھر میں نہیں، سفر میں، اور وہ بھی حج کے سفر میں دیکھا گیا کہ

خرج حاجًا فحمل ثیاب ظهره علی ستمائة جمل (عقد الفرید ص ۳۶۶ ج ۱۷) — حج کے ارادہ سے نکلا، اور چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے بدن کے کپڑے تھے،

یہ عبدالملک کا بیٹا ہشام خلفاء بنی امیہ کا پانچواں خلیفہ تھا، زمانہ کی کیسی نیرنگیاں ہیں مسلمانوں کا وہی مال جس کی ذمہ داریوں کے احساس میں کبھی اتنی نزاکت ہوتی جاتی تھی کہ بحرین سے کچھ مشک کے نافے آتے ہیں) حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ اس کو وزن کرانا چاہتے، آپ کی حرم محترمہ بی بی عاتکہ فرماتی ہیں کہ حکم ہو تو میں تول کر بتا دوں، آپ چپ ہو جاتے ہیں، وہ پھر عرض کرتی ہیں، حضرت عمر نے اس کے بعد جواب میں جو کچھ فرمایا دنیا کی قوموں میں نہ پہلے اس کی نظیر تھی، اور نہ آئندہ اب تک ملی ہے، بی بی کو مخاطب فرما کر ارشاد ہوتا ہے :-

لا احبت ان تضعیه فی الکفّة ثم تقولی هکذا — میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ تم ترازو کے پلے میں مشک کو رکھو اور پھر یوں کرو (یعنی ہاتھ سے اپنے اشارہ فرمایا)

راوی کہتے ہیں، کہ حضرت کا مقصد یہ تھا کہ چھونے چھانے [illegible] ہاتھ میں مشک کی جو خوشبو رہ جائیگی اور تم نے اپنے اوپر اسے مل لیا، تو ؟

فاصیب بذلک نصلا علی المسلمین۔ (ازالۃ الخفاء)

عام مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ حصہ ہم تک پہنچ جائے گا

لیکن بیت المال کا یہی مال ہے، مسلمانوں کے حقوق اس کے ساتھ اسی طرح بلاکم وکاست متعلق ہیں جس طرح پہلے تھے مگر خلافت کے نام سے رسول کی وراثت کے مدعی بن کر جو بادشاہت کرتے تھے، وہی اس مال کو خرچ کرتے ہیں، اور کس پر خرچ کرتے ہیں، ابن عبد ربہ کی زبانی سنیئے عقد الفرید میں لکھتے ہیں:-

کتب الولید الی المدینۃ حمل الیہ اشعب[1] فالبسہ سراویل جلد قرد[2] ذنب، وقال لہ ارقص وغنّ صوتا اعجبنی فان فعلت اعطیتک الف درھم فرقص وغنّی فاعجبہ فاعطاہ الف درھم ص ۲۷۱

ولید نے مدینہ لکھا کہ اشعب (مسخرہ) کو میرے پاس بھیجا جائے، اشعب جب دمشق پہونچا، تو ولید نے بندر کی کھال جس میں دم بھی تھی اسے پہنائی اور فرمائش کی کہ کھال پہنے ہوئے تم میرے سامنے ناچو اور گاؤ، اگر ایسا کروگے تو ہزار درہم تمھیں انعام دونگا،، اشعب ولید کے سامنے ناچا، گایا ولید کو پسند آیا اور ہزار درہم اسنے انعام میں دیے

اور یہ کوئی نادر یا الشاذ واقعہ نہیں ہے، بلکہ عمر بن عبدالعزیز کے سو مسلمانوں کے بیت المال کے ان خلفا میں سے اکثر نے اپنی ذاتی ملکیت قرار دے رکھا تھا من مانے طرز پر جس طرح جی چاہتا تھا اس میں تصرف کرتے تھے، کس کو دے رہے ہیں، کتنا دے رہے ہیں، کس لیئے دے رہے ہیں، ان سوالات میں سے کوئی سوال ان کے سامنے نہیں تھا، تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے، گڑے مردوں کی ہڈیاں اکھارنی فطرتاً میرے لیئے نہایت مکروہ مشغلہ ہے، اس لیئے اسی پر اکتفا کرتا ہوں، میں نے تمثیل کے لیئے ایک واقعہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے خلیفہ ولید بن الملک کا درج کیا ہے۔ اور دوسری مثال کا تعلق ہشام بن عبدالملک سے ہے جو عمر بن عبدالعزیز کے بعد کا خلیفہ ہے، دکھانا یہ مقصود ہے

---

[1] اشعب عہد بنی امیہ کا مشہور مسخرہ تھا، لطائف و نوادر کے بیان کرنے میں طاق تھا کسی نے پوچھا میاں اشعب! کبھی کوئی حدیث بھی تم نے یاد کی بولا ہاں مجھ سے نافع نے نافع نے ابن عمر سے روایت کی ہے کہ جس میں دو خصلتیں ہونگی وہ خدا کے یہاں خالص مخلصین میں لکھا جائے گا، پوچھا گیا کون سی دو خصلتیں؟ بولا ایک خصلت تو نافع ہی کو یاد نہ رہی تھی اور دوسری میں بھول گیا۔ اسکے بعض عجیب نوادر "محاضرات" کی کتابوں میں منقول ہیں۔ ۱۲

کہ جس حال کی طرف یزید لوگوں کو واپس کرنا چاہتا تھا اس کا سب سے بڑا اہم شعبہ بیت المال ہی کا مسئلہ تھا عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنی خانگی اور ذاتی زندگی سے اسلامی بیت المال کے نقطہ نظر کو سمجھانا چاہا، اور ایسی مثالیں پیش کیں جن کی نظیر خلافت راشدہ کے سوا دنیا کی کسی حکومت میں مل نہیں سکتی، بلکہ ہر قسم کی قوت جو انھیں حاصل تھی انھوں نے چاہا کہ اس کے ذریعہ سے اس غیر اسلامی روح کو خلافت کے قالب سے نکال دیں، لیکن ان کے بعد کے خلفا میں پھر وہی خبیث روح گھس گئی، بنی امیہ کی عادت اتنی بگڑ چکی تھی کہ عمر بن عبد العزیز نے جس وقت اعلان کیا کہ مسلمانوں کا بیت المال مسلمانوں کا ہے اور اس کی تقسیم اسی اصول پر ہوگی، جس پر اللہ اور اس کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) نے اسے بانٹا ہے، تو ابتدا میں اچھی خاصی بے چینی امراء بنی امیہ میں پیدا ہوئی لیکن جب ایک دن کھڑے ہو کر بر سر منبر انھوں نے اعلان کیا۔

ان للّٰہ فی بنی مروان ذبحاً وایم اللّٰہ لئن کان ذلک الذبح علی یدی (ابن سعد)

شاید بنی مروان پر خدا کی طرف سے کوئی سخت خونریزی مقدر ہے، خدا کی قسم یہ خونریزی میرے ہاتھوں اگر ہوئی (تو مجھے اس سے انکار نہ ہوگا)

راوی کا بیان ہے کہ مروانی جانتے تھے کہ عمر ارادہ کا پکّا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کر گزرے اس لیے

فلما بلغہم ذلک کفوا وکانوا یعلمون صرامتہ وانہ ان وقع فی امر مضی فیہ (ابن سعد)

جب مروانی امراء کو اس کی خبر پہونچی تو شورش سے رک گئے کیونکہ حضرت عمر کے عزم کی پختگی سے واقف تھے جانتے تھے کہ جس بات کا ارادہ کرتا ہے کر گزرتا ہے۔

ایک دفعہ یہی امراء وفد کی صورت میں ان کے پاس حاضر ہوئے اور اپنا یہ معروضہ پیش کیا

انک قصرت بنا عما کان یصنعہ بنا من قبلک وعاتبوہ (ابن سعد ج ۶)

تم سے پہلے جو سلوک ہم لوگوں کے ساتھ تمہارے پیش رو کرتے تھے، تم نے اسے بہت گھٹا دیا ہے

اس پر ان لوگوں نے حضرت عمر کو لعنت ملامت بھی کی

اس وفد میں مروانی خاندان کا تقریباً ہر چھوٹا بڑا شریک تھا۔ اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ بیت المال کے متعلق خلفاء نے لوگوں کو کس بات کا عادی کر دیا تھا، حضرت عمر نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات کا اعلان کیا کہ ان کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے اور آخری اُمید جو عمر کی موت سے وابستہ تھی اس کو بھی ختم ہوتے ہوئے

دیکھ کر وہ چپ ہو گئے، حضرت عمرؓ نے جواب میں فرمایا، اور پورے عزم و ارادہ کے ساتھ فرمایا

لئن عدتم لمثل هذا المجلس لاشدن رکابی ثم لاقدمن المدینة ولاجعلنها امیرها شوری (ابن سعد)	اگر تم لوگوں نے پھر کبھی میرے پاس آکر ایسا کیا تو میں سوار ہو کر فوراً مدینہ چلا جاؤنگا اور حکومت کو مسلمانوں کے مشورہ کے سپرد کر دونگا۔

جس کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی حکومت اور ان کے بیت المال کو تمہارے خاندان سے ہٹا کر پھر مسلمانوں ہی کے حوالہ کر دونگا، ظاہر ہے کہ ان میں ایسے افراد بھی شامل تھے جو عمرؓ کے بعد اپنی خلافت و بادشاہت کا خواب دیکھ رہے تھے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں سارا خواب، خواب پریشاں ہو کر نہ رہ جائے، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد پھر اس قسم کی آواز ان لوگوں کی طرف سے نہیں اٹھی اور یہ تو بیت المال کے مصارف کا حال تھا، خلافت راشدہ کے بعد مداخل میں بھی جو بے اعتنائیاں برتی جاتی تھیں، ان کی داستان طویل ہے بس وہی مشہور تاریخی واقعہ کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے کہ جب مصر کے فلاحوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا اور اس کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی کم ہونے لگی تو اموی خلیفہ نے گورنر مصر کے نام حکم بھیجا، کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکے، اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حضرت عمر بن عبدالعزیز ہی نے اپنے فرمان سے اس کا انسداد نہ فرمایا، شریح بن حبان مصر کے گورنر تھے، انہوں نے حسب دستور قدیم بارگاہ خلافت میں اطلاع بھیجی۔ کہ

ان اهل الذمة قد اسرعوا فی الاسلام وکسروا الجزیة	ذمی رعایا، رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہو جس سے جزیہ کی آمدنی میں ٹوٹا آرہا ہے۔

لیکن اب تخت خلافت پر ولید یا عبدالملک نہیں تھا بلکہ عمر فاروقؓ کا نواسہ تھا، جواب میں ارقام فرمایا

اما بعد فان الله بعث محمدا صلی الله علیه وسلم داعیا ولم یبعثه جابیا فاذا اتاک کتابی هذا فان کان اهل الذمة اسرعوا فی الاسلام وکسروا	اما بعد معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی اور خدا کی طرف بلانیوالا بنا کر مبعوث کیا تھا، حضور کو خدا نے محصول ٹیکس) وصول کرنیوالا بنا کر نہیں بھیجا تھا جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے

الجزیۃ فاطو کتابک و اقبل۔ (ابن سعد ج ۶ ص ۳۱) اور ذمی رعایا تیزی سے اسلام میں داخل ہوتی چلی جا رہی ہو جس کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی ختم ہو رہی ہو تو اپنے حساب کتاب کے جسٹر کو لپیٹ کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔

انھوں نے صرف یہ ہی نہیں کیا، بلکہ تمام صوبوں کے عمال و ولاۃ کے نام احکام جاری کیے۔ کہ

ان یدعوا اھل الجزیۃ الی الاسلام — جزیہ دینے والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے

مروانی حکومتوں کے بگاڑے ہوئے ایک خراسانی امیر نے اس پر عرض کیا کہ دل سے یہ لوگ اسلام نہیں لاتے اس لیے مناسب ہے کہ ختنہ کرانا بھی ان کے لیے آپ ضروری قرار دیجئے، اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس تدبیر سے مقصد میں کامیابی حاصل ہو جائے لیکن حضرت نے جواب میں فرمایا۔

افانا رادھم عن الاسلام بالختان؟ — کیا ختنہ کی وجہ سے میں ان لوگوں کو اسلام سے روک دوں؟

اس کے بعد جو بات آپ نے فرمائی، ان تشدد پسند مولویوں کے لیے اس میں عبرت ہے، جو مچھروں کے بچانے کے لیے اونٹوں کو قربان کر دینے کے عادی ہیں، اور جو ایسا نہیں کرتا اس پر مداہنت کا الزام لگاتے ہیں عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ اسلامی تاریخ میں صحابہ کے بعد متصلب فی الدین ہونے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے لیکن وہی کہتے ہیں اور ختنہ جیسی موکدہ سنت بلکہ شعاری سنت کے متعلق فرماتے ہیں۔

ھم لو قد اسلموا فحسن اسلامھم کانوا الی الطھرۃ اسرع (ابن سعد)	جب وہ اسلام لے آئیں گے اور ان کا اسلام خوب اچھی طرح ان کے دلوں میں جم جائیگا تو ختنہ کی طرف خود دوڑیں گے

راوی کہتا ہے کہ اس نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک اس علاقہ میں

اسلم علی یدہ اربعۃ الاف	ان کے ہاتھ پر چار ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا

بہرحال یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں یہ کہہ رہا تھا، کہ مصارف کے ساتھ مداخل میں بھی اسلامی حدود کی پروا نہ کی جاتی تھی، اور اس سلسلہ میں یہاں تک غلو بڑھ گیا تھا کہ مالی ترقیوں کی ہوس میں اسلام کے تنزل تک کو گوارا کر لیا جاتا تھا۔

بیچارے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مداخل کی اصلاح کی بھی پوری کوشش کی، لیکن اس اصلاحی تحریک کی وجہ سے خزانہ کو جو تاوان برداشت کرنا پڑتا تھا، ہر شخص کے قلب میں اس کی قوت کہاں تھی جو عمر بن عبدالعزیز کی طرح تاوان کی شکایت کو سن کر یہ فرماتا جیسا کہ میموں بن مہران ان سے راوی ہیں کہ کسی علاقہ کا

عامل حاضر ہوا آپ نے محصولات کی آمدنی کا حال پوچھا اس نے جمع بتائی تو گزشتہ خلفاء کے زمانہ سے وہ بہت کم نکلی، حضرت نے وجہ پوچھی، عامل نے کہا کہ فلاں فلاں مدّوں کی آمدنیوں کو آپ نے روک دیا یہ اسی کا نتیجہ ہے جواب میں ارشاد ہوا۔

ما القیتہ ولکن اللہ القاہ (ابن سعد) | میں نے ان محصولوں کو ساقط نہیں کیا ہے اس کا ساقط کرنے والا تو خدا ہے

بیت المال کی جو حالت ان خلفاء کے زمانہ میں ہوگئی تھی اس کے اندازہ کے لیئے غالباً میرا اتنا بیان کافی ہو سکتا ہے۔

اب میں دوسرے مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، یعنی مسلمانوں کا جو "انصاف" ان خلفاء کے ہاتھ میں تھا، اس پر کیا گزر رہی تھی،

کس قدر افسوس کی بات تھی کہ وہی "عدل" جسکے متعلق قرآن نے کفر و اسلام کی تمیز باقی نہیں رکھی ہے اور جن قوموں سے مسلمانوں کو عداوت و بغض کا تعلق ہو قرآن نے ان کے ساتھ بھی انصاف ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ اکبر جس شریعت کے شارع (علیہ السلام) نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا ہو،

دلوان فاطمۃ بنت محمد سرقت لقطعت یدھا۔ (اعاذھا اللہ منہ) | فاطمہ بنت محمد (اعاذہا اللہ تعالےٰ) بھی اگر چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دونگا۔

اور جہاں جبلہ بن ایہم جیسے بادشاہ کی شاہی قوت کو ایک معمولی غریب بدو کے انصاف پر ہمیشہ کے لیئے قربان کر دیا گیا ہو۔ ایک بے جان بت کی آنکھ کے بدلہ میں زندہ مسلمان سپاہی کی آنکھ صرف اس لیئے کہ انصاف قایم ہو، قانون کا احترام باقی رہے، ایک کافر کے حوالہ بخوشی کر دی جاتی ہو؎ مگر جب خلافت نے سلطنت کا چولا بدلا، اس وقت کیا ہوا اور کیا ہوتا رہا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ قانون کے نافذ کرنے میں قریب و لعبید دوست و دشمن کا فرق کیا جاتا تھا بلکہ الیا

؎ یہ قصہ مصر میں پیش آیا تھا، کسی مسلمان سپاہی نے ایک بت کی آنکھ توڑ دی بت کا مالک حضرت عمرو بن عاص کے پاس داد خواہ ہوا۔ فیصلہ یہی کیا گیا کہ تم بھی سپاہی کی آنکھ توڑ دو۔ اگرچہ بت پرست نے روپیہ لے کر خود معاف کر دیا لیکن اسلام نے تو اسلامی آنکھ کو کفر کے حالہ اس لیئے کر دیا کہ انصاف کیلئے تم اس کو توڑ سکتے ہو، خلافت راشدہ کی تاریخ کا ورق ورق ان حیرت انگیز واقعات سے معمور ہے بطور مثال کے میں نے چند مشہور باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عام ناظرین اس واقعہ کو قاضی سلیمان مرحوم کی سیرت رحمۃ للعلمین جلد سوم میں دیکھ سکتے ہیں ۱۲

معلوم ہوتا ہو کہ اسلامی قانون کی اپنے مطلب کے مطابق تشریح کا حق بھی ان "بادشاہ خلیفوں" اور ان کے والیوں حکام نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے خلاف جب مدینہ منورہ کے والی عمرو بن سعید نے عبدالملک کے حکم سے چاہا کہ مکہ معظمہ پر فوجی حملہ کیا جائے اور اس کے لیئے وہ مدینہ ہی سے فوج بھیجنے کا سامان کر رہا تھا، تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو شریح کھڑے ہوئے بخاری میں ہے کہ انھوں نے فرمایا:-

ایذن لی ایھا الامیر احدثك قولاً قام به رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم الغد من یوم الفتح سمعته اذنای ووعاہ قلبی وابصرته عینای حین تکلم به

ای امیر مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ سے ایک ایسی بات کہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن فرمایا تھا میرے دونوں کانوں نے اسے سُنا ہی، اور میرے دل نے اسے یاد رکھا ہی، اور جس وقت حضور ارشاد فرما رہے تھے میری آنکھیں حضور کو دیکھ رہی تھیں

ابو شریح نے اپنے کلام میں اتنی قوت پہونچانے کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا مشہور حکم کہ "حرم مکہ میں خونریزی وغیرہ ہمیشہ کے لیے حرام کی جاتی ہے" بیان فرمایا، لیکن سب کچھ سننے کے بعد عمرو بن سعید جو خود اپنے کو اسلامی قوانین کا شارح سمجھتا تھا۔ آپ کو جھڑک کر کہتا ہے:-

انا اعلم منك یا ابا شریح ان الحرم لا تعیذ عاصیا ولا فارا بدم

ابو شریح! میں تم سے زیادہ عالم اور ان امور کا جاننے والا ہوں حرم کسی نافرمان اور خون کرکے بھاگنے والوں کو پناہ نہیں دیتا بیچارے ابو شریح (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اسکے بعد یہ فرما کر چپ ہو گئے:-

انی کنت شاھداً وکنت غائباً وقد امرنا رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم ان یبلغ شاھدنا غائبنا وقد ابلغتك فانت وشانك (عینی)

میں تو حضور کی صحبت میں موجود تھا اور تم غائب تھے حضور کا چونکہ فرمان تھا کہ ہم میں جو حاضر ہوں وہ ان کو پہونچا دیں جو ہم میں سے غائب ہوں، میں نے تم کو پہونچا دیا، اب تم جانو، اور تمہارا کام

"قانون" اور "انصاف" کے ساتھ خلفا کا یہی طرز عمل تھا، جس کی اصلاح کا ارادہ فرماتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اعلان کیا تھا!

لست بقاضٍ ولکنی منفذ ولست بخیر

میں فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں میرا کام بحیثیت خلیفہ

من اَحدٍ ولکنی اَثقلکم حملاً واحسبہ قال ولستُ بمبتدع ولکنی متبع طبقات ج ۲

(ہونے کے) صرف نافذ کرادینا ہے، تم میں سے کسی ایک سے میں بہتر نہیں ہوں لیکن میرا بار زیادہ بوجھل ہی اور میری بازپرس زیادہ سخت ہے۔ میں دین اور شرعی قانون میں کسی کمی بیشی کتر بیونت کا حق نہیں رکھتا بلکہ قانون جس حال میں ملا ہو اس کی اتباع ہی میرا فرض ہی۔

دراصل یہ تین منفی فقرے ہی اپنے اندر اس عہد کے "قضا" اور عدلیہ" کی پوری تاریخ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں پہلا فقرہ کہ "میں فیصلہ کرنے والا قاضی نہیں ہوں بلکہ بحیثیت خلیفہ ہونے کے میرا کام صرف نافذ کرا دینا ہے"۔

مروانی خلفا اور ان کے ولاۃ کے اس طرز عمل کی تردید ہے، کہ وہ شریعت کی تشریح اور واقعات پر اس کے انطباق کا اپنے کو مختار قرار دیئے ہوئے تھے، کہ قضا کے یہی معنے ہیں،

دوسرا فقرہ کہ تم میں سے کسی ایک سے بہتر نہیں ہوں"، یہ اس غلط خیال کی تردید تھی جس کے سلاطین اور ان کے حوالی موالی ہمیشہ شکار رہے ہیں۔ یعنی عام رعایا برایا سے وہ اپنے کو ایک الگ جنس قرار دیتے تھے، اور اسی لیئے چاہتے تھے کہ قانون ان کے ساتھ وہ برتاؤ نہ کرے جو عام لوگوں کے ساتھ کرتا ہے۔

تیسرا فقرہ کہ "دین اور شریعت (قانون) میں مجھے کسی کمی بیشی، کتر بیونت (ابتداع) کا اختیار نہیں ہے، بلکہ میرا کام صرف شریعت کے احکام کی تعمیل و اتباع ہی"

یہ ان بیجا تصرفات کی طرف اشارہ تھا جو شریعت کے قوانین میں اپنے من مانے اغراض کے تحت خلفا کر رہے تھے، اور شائد اس کا اپنے کو مقتدر سمجھتے تھے، آپ نے اس اعلان کے ذریعہ اس بدعت شنیعہ کی بیخکنی کرنی چاہی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد، اگرچہ قضا کے محکمے ہر مرکزی جگہ میں ضرور قایم تھے، لیکن جن لوگوں نے "حکومت"، جس کے لغوی معنے حکم اور فیصلہ کرنے کے ہیں اس کا مقصد صرف ٹکس وصول کرنا قرار دے رکھا تھا جس کی طرف حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک بلیغ تعریضی اشارہ ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ "ما بعث اللہ محمداً صلے اللہ علیہ وسلم جابیا"، اللہ تعالے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محصول وصول کرنیوالا بناکر نہیں بھیجا تھا، ان لوگوں کے عہد حکومت میں بہ تدریج اس محکمہ کی اہمیت کم ہوتی چلی جارہی تھی، کہاں ایک وہ زمانہ تھا، کہ قاضی کے تقرر کا

اختیار براہ راست خلیفہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا، اور جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ازالۃ الخفا میں لکھا ہے، کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ کی ایجاد تھی، کہ ہر صوبہ میں مستقلاً وہ اپنی طرف سے تین نمائندوں کو بھیجتے تھے، ایکؔ والی (وائسرائے) دوسرؔا قاضی تیسرؔا وزیر خزانہ، حضرت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تینوں عہدہ دار کسی ایک کے ماتحت نہیں ہوتے تھے، بلکہ ہر ایک براہ راست بارگاہ خلافت کے آگے ذمہ دار تھا، شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

در کوفہ و بصرہ و غیرہما من البلاد حاکمے جدا معین فرمود، و قاضی جدا و تحویلدار بیت المال علحدہ وایں امریست کہ تا زمان حضرت فاروق واقع نشدہ بود۔

کوفہ بصرہ اور دوسرے شہروں میں حضرت عمر حاکم اعلیٰ (گورنر) جدا قاضی (جج) جدا، اور بیت المال کا تحویلدار جدا مقرر فرماتے تھے۔ اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے، جس کا ثبوت حضرت فاروق اعظم سے پہلے نہیں ملتا

علاوہ دیگر مصالح کے ایک بڑا فائدہ شاہ صاحب کے خیال میں اس کا یہ تھا کہ

اگر بالفرض از یکے خیانتے ظاہر شود، دیگرے بانکار برخیزد، و اجتماع جماعۃ مسلمین کہ مجرب بصدق باشند برخیانت بعید ست ص۶۱ ازالۃ الخفاج ۲

بالفرض کسی سے اگر بد دیانتی سرزد ہو تو دوسرا ٹوکنے پر آمادہ ہو، اور یہ بات کہ تینوں کے تینوں بد دیانتی پر اتفاق کرلیں ایسی صورت میں کہ ان کی راستبازی کا پہلے سے تجربہ بھی کرلیا گیا ہو نا ممکن ہے

اسی نظم کا یہ نتیجہ تھا، کہ کسی خاص صوبہ سے نہیں بلکہ سارے اسلامی محروسہ سے ممتاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قاضیوں پر والیوں کو کسی قسم کا اقتدار چونکہ حاصل نہ تھا، اس لیے بے خوف و خطر جو بات اُن کے سمجھ میں آتی تھی فیصلہ کرتے تھے، لیکن جوں ہی خلافت مدینہ سے منتقل ہو کر دمشق پہونچی، قضا اور فصل خصومات کی اہمیت اس درجہ گھٹا دی گئی کہ ہر صوبہ کے والی کو اس کا اختیار دیدیا گیا، کہ اپنے صواب دید سے جس شخص کو وہ چاہیں اپنے علاقوں میں قاضی مقرر کرلیں۔

انما کان ولاۃ البلاد ہم اللذین یولون القضاء (حسن المحاضرہ ص۸۵)

یعنی ہر شہر کا والی قاضی کو مقرر کرلیتا تھا۔

کیا زیادہ دن کے بعد نہیں مروان ہی کے زمانہ میں اس کا نتیجہ یہ دیکھا گیا تھا کہ جب وہ مصر دورہ پر پہونچا اور قاضی کو بلایا جس کا نام قاضی عابس تھا۔ عابس کے علم و فضل کا کیا حال تھا تاریخ والے بیان کرتے ہیں۔

کان امیاً لا یکتب	وہ ان پڑھ تھا، لکھنا بھی نہیں جانتا تھا۔

مروان نے اس غیر خواندہ قاضی کو مخاطب کرکے پوچھنا شروع کیا

مروان ۔ اجمعت کتاب اللہ؟ (کیا تم نے قرآن یاد کر لیا ہے؟)

قاضی ۔ لا (نہیں مجھے قرآن یاد نہیں ہے)

مروان ۔ فاحکمت الفرائض؟ (تو کیا تم نے فرائض کے مسائل کو پختہ کر لیا ہے؟)

قاضی ۔ لا (فرائض سے بھی ناواقف ہوں)

مروان ۔ مروان کو اس جواب پر حیرت ہوگئی، اور بولا: فبم تقضی؟ (آخر تم کس چیز سے فیصلہ کرتے ہو؟) بیچارے عابس اس کا کیا جواب دے سکتے تھے! الغرض بجائے خلیفہ کے "قاضیوں کا تقرر الیوں کے سپرد کر دینے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے دلی اغراض کے مطابق جو آدمی ہوتا تھا، اسی کا وہ تقرر کر دیا کرتے تھے، ان ہی قاضی عابس صاحب کے تقرر کی وجہ یہ لکھی ہے کہ حضرت معاویہ نے مصر کے والی مسلمہ کو لکھا کہ یزید (کربلائی) کے لیے لوگوں سے بیعت لی جائے۔ حسب الحکم مسلمہ نے بیعت لینی شروع کی اور کسی کی طرف سے انکار تو نہیں ہوا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح مصر عمرو بن عاص کے مشہور صاحبزادے ہیں، اور علم و فضل اور علو سیرت میں لوگوں نے باپ پر بھی انہیں ترجیح دی ہے۔ انھوں نے بیعت سے انکار کیا، مسلمہ نے ان کے انکار پر اعلان کیا۔

من لعبد اللہ؟	عبداللہ کو درست کرنے کے لیے کون آمادہ ہے،

کہا جاتا ہے کہ یہی عابس بن سعید کھڑے ہوئے اور بولے میں اس کام کو انجام دیتا ہوں عبداللہ بن عمرو اس زمانہ میں اپنے والد کے مشہور قصر واقع فسطاط میں قیام فرما تھے، عابس پولیس کے نوجوانوں کو لے کر پہونچا، اور ان کے مکان کو گھیر لیا، کہلا بھیجا کہ بیعت یزید کے متعلق اب کیا ارادہ ہے؟ انھیں پھر بھی انکار ہی پر اصرار رہا۔ عابس نے اس کے بعد کیا کیا۔ مورخین لکھتے ہیں:

دعا بالنار والحطب لیحرق علیہ قصرہ (حسن المحاضرہ)	اس نے آگ اور لکڑی جمع کی تاکہ اُن کے قصر میں آگ لگا دے۔

عبداللہ بن عمرو نے اس کے بعد اپنے کو مجبور اور معذور پایا، بیچارے گھر سے نکلے اور جو کچھ اس جاہل نے کہنے کے لیئے کہا دُہرا دیا۔

ان پڑھ عابس کا یہی سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ ایک صحابی کو آگ میں جلا دینے کی دھمکی دے کر حکومت میں سرخروئی حاصل ہوئی تھی، اسی سرخروئی کا یہ صلہ ملا تھا کہ غریب مسلمانوں کی منڈیاں اُن کی جانیں، ان کے مال وجائداد حکومت نے سب قرآن وحدیث اور فرائض سے بالکل جاہل اس شخص (عابس) کے سپرد کردیئے۔ میں نے تمثیل کے لیئے یہ ایک جزئی واقعہ پیش کیا ہے، ورنہ قاضیوں کے تقررات میں جو بے اعتنائیاں مختلف اثرات کے تحت میں برتی جاتی تھیں، ان کی داستان طویل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے قاضی جو اپنے علم وفضل، تقویٰ ودیانت کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض کسی والی کے رحم وکرم پر جیتے تھے، خود تو جو کچھ کرتے ہوں گے وہ تو ظاہر ہی ہے، اس کے سوا بھی ان والیوں کے دباؤ سے کہاں تک ان کے فیصلے محفوظ رہ سکتے تھے اس کا ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے۔

شامت کا مارا بیچارہ کوئی قاضی اپنے والی کی مرضی کے خلاف اگر کچھ کر گزرتا تھا تو پھر اس کی خیر نہ تھی۔ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں قضا کا عہدہ طلحہ بن ہرم کے سپرد تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب بنی امیہ کا مشہور گورنر خالد[1] بن عبداللہ القسری مدینہ کا والی تھا، شیبی خاندان (جو کعبہ کے کلید بردار ہیں) کے دو آدمیوں میں کسی زمین کے متعلق جھگڑا ہوا قاضی صاحب نے ایک فریق کے حق میں جس کا نام اعجم تھا فیصلہ کردیا، لیکن دوسرا فریق خالد کا درباری تھا، اس نے فوراً مدینہ پہونچکر خالد سے قاضی کے خلاف حکم حاصل کرلیا۔ قاضی طلحہ کو اس پر غصہ آگیا اور چپ چاپ انھوں نے سلیمان بن عبدالملک کو اس واقعہ کی اطلاع دی، خلفاء بنی امیہ میں سلیمان کا شمار بھی مغتنم لوگوں میں ہے۔ قاضی صاحب کا خط جسے بصیغہ راز قاضی نے اپنے لڑکے محمد بن طلحہ کے ہاتھ بھیجا تھا سلیمان کو ملا، تو وہ برہم ہوا اسی وقت اس نے ایک حکم محمد بن طلحہ کو لکھوا کر دیا کہ سیدھے مدینہ جاکر خالد کے حوالہ کرو، اور کہدو کہ اعجم کے معاملہ میں وہ دراندازی نہ کرے، محمد بن طلحہ اس خط کو لے کر جس وقت مدینہ پہونچتے ہیں اور خالد کے حوالہ کرتے ہیں۔ خالد بس یہ سن کر ہی آگ بگولہ ہوجاتا ہے اور قبل اس کے کہ سلیمان کا خط پڑھے جلاد کو حکم دیتا ہے کہ محمد بن طلحہ کو سو کوڑے لگائے۔ محمد بن طلحہ کا اس کے بعد کیا حال ہوا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے

[1] اموی عہد کا یہ مشہور رئیس ہے اسکی ماں چونکہ نصرانیہ تھی اس لیئے ابن النصرانیہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے یافعی نے لکھا ہے کہ اسکو ایک نائب طارق نے اپنے بچے کی ختنہ کی خالد کے پاس ہزار غلام اور ہزار جوڑے اور خدا جانے کیا کیا ہزار بھیجے بیت المال کے سلوک کا اس سے بھی اندازہ ہوسکتا ہے۔

کہ قاضی طلحہ نے اپنے بیٹے کے خون آلود لباس کو سلیمان کے پاس بھیجا، تو سلیمان بھی اس واقعہ کے بعد آپے سے باہر ہوگیا اور حکم دے چکا تھا کہ خالد کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں، لیکن بعض امیروں کی سفارش سے معاملہ ٹل گیا۔[1]

اور یہ ایک معاملہ نہیں ہے، خلفاء بنی امیہ اور خلفاء بنی عباس کے زمانہ میں ہارون الرشید تک ایسے واقعات مسلسل پیش آتے رہتے تھے، مثالاً میں دونوں خلافتوں کے متعلق ایک ایک واقعہ درج کرتا ہوں۔

سیوطی نے اپنی مشہور کتاب "حسن المحاضرہ" میں قاضی خیر بن نعیم کے ذکر میں بنی امیہ کے عہد کا ایک واقعہ یہ بیان کیا ہے میں بجنسہٖ ان کے الفاظ میں اسے درج کرتا ہوں سیوطی لکھتے ہیں:-

ان رجلا من اھل الجند قذف رجلا فخاصمه الیه و ثبت علیه بشاھد واحد فامر بحبس الجندی الی ان یثبت الرجل شاھدا آخر فارسل ابو عون عبد الملک بن یزید فاخرج الجندی من الحبس فاعتزل خیر و جلس فی بیته و ترک الحکم فارسل الیه ابو عون فقال لا حتی ترد الجندی الی مکانه فلم یردو تم علی عزمه ص ج ۲

ایک فوجی سپاہی نے کسی آدمی کو گالیاں دیں اس نے قاضی خیر کے اجلاس میں دعوے دائر کر دیا اور اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف ایک گواہ پیش کیا، قاضی خیر نے سپاہی کو حوالات میں رکھنے کا حکم اس وقت تک کے لیے دیا جب تک کہ مدعی دوسرا گواہ حاضر کرے (مصر کے گورنر وقت) ابوعون عبد الملک بن یزید نے اپنا آدمی بھیج کر سپاہی کو حوالات سے نکلوا دیا، قاضی خیر کو جب اس کی خبر ہوئی تو قضا سے کنارہ کش ہو کر گھر بیٹھ گئے، ابوعون نے ان کے پاس آدمی بھیجا (گویا معذرت طلب کی) لیکن قاضی صاحب نے کہلا بھیجا کہ جب تک سپاہی واپس نہ ہوگا میری واپسی بھی ناممکن ہے، مگر ابوعون نے سپاہی کو واپس نہ کیا، قاضی صاحب بھی اپنے ارادہ پر ڈٹے رہے۔

دوسرے واقعہ کا ذکر طاش کبری زادہ اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں مشہور قاضی حفص بن غیاث کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ہارون الرشید نے ان کو بغداد کا قاضی مقرر کیا، اتفاق سے ہارون کی مشہور چہیتی بیوی زبیدہ کے مرزبان (ڈپٹی یا ممبردار) کا ایک معاملہ قاضی صاحب کے پاس پیش ہوا، مرزبان کسی کا مدیون تھا

---

[1] عقد الفرید ص ۲۶ ج ۲ ۱۲

دین اس پر ثابت ہوگیا، قاضی صاحب نے مرزبان کے خلاف ڈگری دیدی، زبیدہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ قاضی نے یہ جاننے کے بعد کہ مرزبان میرا آدمی تھا، پھر بھی اس کے خلاف فیصلہ کیا، آگ بگولہ ہوگئی، ہارون جب محل سرا آیا، زبیدہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی،

و الحت علی الرشید حتی عزلہ ص ۱۱۹ ج ۲	وہ ہارون کے سر ہوگئی کہ ایسے قاضی کو معزول کر دیا جائے آخر ہارون نے قاضی حفص کو معزول کر دیا۔

اور ایک مرزبان پر اسلام کا اتنا بڑا عالم محض ایک عورت کی خاطر قربان کر دیا گیا۔

اگرچہ یہ ایک جزئی واقعہ ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کو یاد رکھنا چاہیے، آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہی ہارون الرشید ہے اور وہی اس کی قاہرہ حکومت لیکن امام ابوحنیفہ کے تلمیذ رشید قاضی ابو یوسف جن کا تقرر امام صاحب کی شہادت کے بعد ہارون ہی نے کیا ۔ اپنے زمانہ قضا میں ہارون کی بیوی یا کام ہی کے خلاف نہیں، بلکہ خود ہارون کی مرضی کے خلاف فیصلے کرتے ہیں، لیکن بجز خاموشی کے وہ اپنے لیے کوئی چارۂ کار نہیں پاتا، آخر یہ طرز عمل کیوں بدلا، اور اس کے پیچھے کس کے اخلاص و قربانی کی قوت تھی، افسوس مورخین نے اس پر غور نہیں کیا، بہرحال اتنی مدت کے بعد بکھرے ہوئے واقعات کو جمع کرنے سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کا ذکر تو آئندہ آتا ہے ۔ ابھی تو میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے "انصاف" کا جو حال ان خلفاء کے ہاتھوں ہو رہا تھا اس کی نوعیت کیا تھی؟

خلفاء کی ان بیجا طرفداریوں ہی کا نتیجہ یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ ہی نہیں جن کا واقعہ مشہور ہے اور بھی اس زمانہ کے کتنے ارباب صدق و امانت، تقوی و دیانت، حکومت کے شدید اصرار کے باوجود قضا سے انکار کرتے تھے، اور اگر بارے باندھے کسی نے قبول بھی کر لیا تو ہمت کر کے وہ خلفاء سے اس کا معاہدہ لیتے تھے کہ فیصلوں میں ذاتیات کو دخل نہ دیا جائے گا، ان بیچاروں کی تسلی کے لیے اقرار بھی کر لیا جاتا تھا، لیکن زیادہ تر یہ وعدے "عرقوبی مواعید" بن کر شرمندۂ ایفا بہت کم ہوتے تھے، اس سلسلہ میں قاضی شریک کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ان خلفاء کے طرز عمل پر اس سے روشنی پڑتی ہے کہا جاتا ہے کہ ابوجعفر منصور عباسی نے قاضی شریک کو بلا کر قضاء کا عہدہ پیش کیا، پہلے تو انھوں نے مختلف حیلے بہانے کیے لیکن جب کوئی بات سنی نہ گئی تب قاضی صاحب نے منصور کو مخاطب کر کے فرمایا :-

انی احکم علی الصادر والوارد، وانا لا ابالی	میں ہر آنے جانے والے وارد و صادر پر فیصلے کروں گا

انی حکم علی کل من کان ولا انظر الی القریب والبعید	اور مجھے اس کی پروا نہ ہوگی کہ میں کس کے خلاف فیصلہ کر رہا ہوں کوئی بھی ہو، میں نہ (خلیفہ) کے

مقربوں کو دیکھوں گا، نہ ان کو جو بارگاہ خلافت سے تعلق نہیں رکھتے ہیں

چند الفاظ کے تلفظ میں منصور کا کیا بگڑتا تھا، بولا

احکم علی وعلی ولدی	آپ میرے اور میری اولاد کے مقابلہ میں بھی فیصلے کرسکتے ہیں

گویا منصور نے اپنے پیشروؤں کے مقابلہ میں یہ کہہ کر انتہائی انصاف پسندی کا اظہار کیا ورنہ سچ یہ ہے کہ اسلام کے قانون عدل کے ماننے والوں کے لیے اس تصریح کی بھلا کیا ضرورت تھی، تاہم منصور نے بڑی کشادہ دلی کو راہ دے کر خود اپنے کو اور اپنی اولاد کو قانون کے نیچے ڈالدینے کا اعلان کیا لیکن قاضی صاحب کی اس سے بھی تشفی نہ ہوئی، خلفاء سے بھی زیادہ خطرہ جن لوگوں سے تھا، اور زیادہ تر اس زمانہ کا "عدلیہ" ان ہی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا کھل کر خلیفہ کے سامنے انھوں نے اس خطرہ کا اظہار ان الفاظ میں کیا

اکفنی حشمک	اپنے حاشیہ نشینوں (درباری امرا والی موالی) سے میری حفاظت کیجیے، یعنی ان کے

خلاف فیصلے اگر کروں، تو آپ اس معاملہ میں میری مدد کیجیے۔

منصور نے اس کے جواب میں بھی قاضی صاحب کو یہ کہتے ہوئے گویا مطمئن کر دیا کہ

افعل (ہاں میں ایسا ہی کرونگا)

مگر سب کچھ ہو جانے کے بعد قاضی شریک جب اپنے عہدہ کا جائزہ لے کر اجلاس کے لئے بیٹھتے ہیں، تو بدقسمتی سے سب سے پہلا مقدمہ جو ان کے آگے پیش ہوتا ہے، وہ خلیفہ کی "مولاۃ" چھوکری کا معاملہ کسی شخص سے تھا، عادتیں تو عام طور پر بگڑی ہوئی تھیں، اجلاس میں جب فریقین حاضر ہوئے تو صرف اس لیے کہ چھوکری خلیفہ کی چھوکری تھی، اپنے فریق کے برابر کھڑے ہونے میں اس نے اپنی توہین محسوس کی، اور آگے بڑھ کر قاضی صاحب کے سامنے آگئی۔ وہ مطمئن تھی کہ شاہی آدمیوں کے ساتھ عدالت میں یہی امتیاز کا رواج ہے لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ شاہی انتساب کے جس نشہ میں وہ مخمور ہو نیا قاضی بھی خلیفہ کے معاہدہ کے نشہ سے چور ہے، لونڈی کے ہوش اڑ گئے، جس وقت قضا کی گدی سے اس کے کان میں یہ آواز گونجی

تاخری یا خناء	او گندی عورت پیچھے ہٹ جا،

قاضی صاحب کا مطلب یہ تھا کہ یہ اسلامی عدالت ہے، جس میں حاضر ہونے والوں کو

خواہ وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا آدمی یعنی خلیفہ ہی کیوں نہ ہو، ہر ادنیٰ معمولی رعیت کے مساوی سمجھا جاتا ہے اگرچہ قاضی صاحب بیچارے جانتے تھے کہ اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا ہے لیکن خلیفہ کے عہد پر اُن کو غرّہ تھا اس لیئے شاہی لونڈی کی شان میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے، خدا جانے چھوکری کو بھی اپنے آقا کے معاہدہ کا علم تھا یا نہیں. بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جانتی تھی خصوصاً جب یہ ایک نئی بات تھی، خلیفہ نے دین کے جوش میں بھر کر مدت کی ایک رسم کے خلاف معاہدہ کیا تھا قدرتاً اس کی خبر ہر کہ ومہ کو ہونی چاہیئے. بہر حال اگر وہ یہ جانتی بھی تھی لیکن اسی کے ساتھ ان معاہدوں کا جو وزن تھا اس سے بھی ناواقف نہ تھی. ایک کنیز دار الخلافہ کے سب سے بڑے قاضی کو مخاطب کر کے اس فقرہ کا جو جواب دیتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نقل کرتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے. چھوٹے منہ چھوکری نے بوڑھے قاضی کو کہا:۔

انک یشیخ احمق | تم بڈھے احمق ہو

ایک چھوکری کی زبان سے اسلام کا ایک مشہور عالم یہ جملہ سُنتا ہے اور دم بخود ہو کر رہ جاتا ہے اپنے کیئے پر پچھتاتا ہے اور کہتا ہے:۔

انی قلت کذالک فلم یقبل مولاک | میں نے خلیفہ سے اپنے متعلق یہی کہا تھا (یہی کہ میں احمق ہوں) لیکن تیرے آقا نے قبول نہیں کیا

خیر یہ تو قاضی صاحب نے جواب دیا، لیکن شاہی عدالت کی اس صریح اہانت پر منصور نے عام عدالتی رسم کی بنیاد پر نہیں، اسلامی عدالت کے اصول پر نہیں، کم از کم اپنے معاہدہ کی لاج ہی کے لیئے اس چھوکری سے کوئی جواب طلب کیا؟ کس قدر عجیب ہے کہ

احکم علی وعلی ولدی | میرے اور میرے بچّوں کے خلاف بھی فیصلہ کر سکتے ہو

کا بر سر دربار معاہدہ کرنے والا منصور اپنے متعلق یا اپنی اولاد کے متعلق پاس عہد و زبان تو کیا کرتا اپنی ایک چھوکری کے متعلق بھی قاضی صاحب کے اس برتاؤ کو برداشت نہ کر سکا، اور جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے:۔

فعزلہ (قاضی شریک کو لوگوں نے معزول کر دیا)

اگرچہ منصور کے بعد مہدی کے اصرار سے قاضی صاحب کو پھر یہ عہدہ قبول کرنا ہی پڑا جس کا ذکر اپنے موقعہ پر انشاء اللہ تعالےٰ آگے آئے گا، لیکن منصور کے زمانہ میں تو اس نوکری کا انجام یہ ہوا۔ ان ہی باتوں کا یہ اثر تھا، کہ جو لوگ اپنے دین و علم کی حفاظت کرنا چاہتے تھے، وہ ان خلفاء کے قول و قرار پر اعتماد نہیں کرتے تھے، ابن خلکان میں ہے کہ عباسی خلیفہ مہدی نے حضرت سفیان ثوری کو گرفتار کرکے اپنے دربار میں بلایا، اور وہی قضا کا عہدہ پیش کیا۔ اُن کو انکار پر اصرار تھا، لیکن وہ قبول کرا لینے پر مصر تھا، اس وقت مہدی اور سفیان ثوری میں ایک سخت گفتگو بھی ہوئی، جس کا ذکر انشاء اللہ تعالےٰ آئندہ آئے گا۔ اور اسی وقت یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب ان خلفاء کو اپنے ڈھب کے آدمی بکثرت مل رہے تھے۔ تو پھر ان بیچاروں کو پکڑ پکڑ کر وہ کیوں مجبور کرتے تھے، بہر حال حضرت سفیان نے نہ قبول کرنے کی وجوہ میں خلفا اور ان کے امراء و موالی کی غلط دخل اندازیوں کا ذکر کیا تو اس نے اپنے باپ منصور کی طرح زبانی نہیں۔ بلکہ تحریری معاہدہ لکھ کر حضرت کے حوالہ کرنے کا حکم دیا۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ مہدی نے اپنے میر منشی کو کہا،

اکتبوا عہدہ علی قضاء الکوفۃ علی ان لا یعترض علیہ فی حکم	کوفہ کی قضارت کا فرمان اس شرط کے ساتھ لکھ کر انھیں دیدو! کہ کوئی ان کے فیصلوں میں دراندازی نہ کرے گا

معاہدہ لکھ کر حضرت سفیان ثوری کے حوالہ کیا گیا، لیکن جس آسمان کے نیچے اور جس زمین کے اوپر آدم کی وہ اولاد بھی تھی جنھیں تم اس زمانہ کے خلفاء و امراء کے لباس میں دیکھ رہے ہو، وہیں زندگی کی تمام ضروریات رکھنے والی وہ ہستیاں بھی تھیں کہ ایک صوبہ کی جج دی جاتی ہے، لیکن اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ قاضی ابن خلکان راوی ہیں۔

فاخذہ وخرج فرمی بہ فی دجلۃ و ھرب ص۲۱۰ ج۱	حضرت سفیان نے فرمان لے لیا، اور دربار سے باہر نکل کر انھوں نے اُسے دجلہ میں ڈال اور غائب ہو گئے

(تتبعھا الرادفہ)

لہ میں نے یہ سارے واقعات صدر الائمہ موفق بن احمد اور حافظ الدین البزازی الکردری سے لئے ہیں دونوں کتابوں میں واقعہ کے مختلف اجزا مختلف مقامات میں درج ہیں ۱۲

اسلام کے قلعے

(از جناب مولٰنا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی استاذ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ)

جدید اجتماعی و سیاسی تغیرات نے بہت سے مذہبی و قومی مسائل کو موضوع بحث بنا دیا ہے اور زندگی کے بہت سے شعبوں اور اداروں کی ضرورت اور فائدہ پر بحث و تنقید کا دروازہ کھل گیا ہے مسلمانوں کے بعض حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ عربی مدارس کی اس انقلابی زمانہ میں کیا ضرورت ہے اور ان کے نہ ہونے سے ہماری قومی زندگی کا کونسا خانہ خالی رہتا ہے آج کی صحبت میں ہم اسی سوال کے جواب دینے کی کوشش کرینگے۔

اس سلسلہ میں چند بنیادی حقائق کا سمجھ لینا ضروری ہے جو اس مسئلہ میں مبادی کا کام دیں گے پہلی چیز یہ ہے کہ مسلمان قوم کا مزاج اور قوام دنیا کی تمام قوموں سے مختلف ہے،

مذہب "اُمت مسلمہ" کے خمیر اور ترکیب میں داخل ہے یہ قوم کسی جگہ اور کسی وقت بھی غیر مذہبی نہیں ہو سکتی، بلکہ مذہب اور ایک متعین مذہب (اسلام) کے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں، مذہب اس کے فکر و عمل کا مرکز، اس کے کاموں کی صحت و غلطی اور اس کی ترقی و تنزل کی میزان اور اس کی صحت طبعی اور انحراف مزاج کا قیاس ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس اُمت کی بنیاد ایک خاص قانون (شریعت) اور ایک خاص دستور (قرآن و حدیث) پر ہے یہ قانون مکمل اور یہ دستور منضبط ہے، اس اُمت کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور فکر کا سرچشمہ تغیر پذیر انسانی اجتہادات و تجربات اور غیر قطعی نظریات کے بجائے وحی الٰہی ہے، دنیا کی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اسکی تہذیب و تمدّن کی بنیاد، دیواروں اور ستونوں، میناروں اور گنبدوں، کاغذ کے شیرازوں، تصویروں کے نقوش اور موسیقی کے آلات پر نہیں بلکہ چند ابدی حقائق چند اصول و نظریات، اور اس مخصوص اخلاقی فلسفہ پر ہے جو وحی سے ماخوذ اور اس کا پیدا کیا ہوا ہے، دنیا کی دوسری خود رو اور خود ساختہ قوموں کے برخلاف اس کے مستقبل کی بنیاد اس کے ماضی پر ہے، اس کے سامنے زندگی کا ایک بلند ترین معیار اور ترقی کا آخری نمونہ ہے اور یہ نمونہ گزر چکا ہے لیکن تاریخی و تحریری طور پر محفوظ ہے یہ سنت رسول اسوۂ صحابہ اور خلافت راشدہ کا عہد ہے "سُنت" اور "سلف" کی جو اہمیت اسلامی تعلیمات میں ہے غالباً کسی دوسرے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔

یہ چیز بھی قابل ذکر ہے کہ "دین" کا مفہوم جتنا اسلام میں وسیع اور ہمہ گیر ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے، بلکہ

اگر دیکھا جائے تو اسلام کے صحیح نقطۂ نظر اور تعلیمات نبوی کے مطابق سچّے مسلمان کی پوری زندگی دین ہے اور نیت کے تغیر سے اس کا ہر کام عبادت ہے اس لیے اس میں دین و دنیا کی وہ تقسیم نہیں ہے جو مسیحی مذہب میں ہے نہ دین و دنیا کے شعبے اور ان کے اشخاص اس طرح علٰحدہ علٰحدہ اور ان کے حدود ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں جس طرح عیسائیوں میں مذہب مسلمانوں کی زندگی میں جلد موثر ہوتا ہے اور جلد متاثر، اگر اس کی زندگی کے مسائل نہایت ہوشیاری و احتیاط کے ساتھ دین کی روشنی میں اور اس کی مصالحت اور سمجھوتہ سے طے نہ کیے جائیں تو نہایت آسانی سے وہ دین سے ٹکرا جاتے ہیں اور مسلمانوں کی زندگی اور اس کے مذہب پر ان کا اثر پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر صلح و جنگ قوانین و تعزیرات بین دین کے معاملات اور کتنے اجتماعی و معاشرتی سیاسی اور معاشی مسائل ہیں جن کا مذہب سے گہرا تعلق اور اسلامی قانون سے ارتباط ہے۔ ان مسائل کو طے کرنے کے لیے کتنی دینی بصیرت اور کس قدر علم کی ضرورت ہے۔

جس قوم کا مزاج اتنا نازک اور پیچیدہ ہو اور جسکے مذہب و قانون کا دائرہ اتنا وسیع ہو اس کے علاج و طبی مشورہ کیلئے کیسے مزاجداں و نباض اور کیسے حاذق طبیب کی ضرورت ہے؟

جو طبقہ یا جماعت مسلمانوں کی رہنمائی کے منصب کی اُمیدوار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسکے قانون اور دستور سے واقف ہو اس سرچشمہ سے سیراب ہو جس سے اس کی زندگی کی نہریں پھوٹی ہیں اور اس کی رگوں میں اس کا آب حیات جاری ہو۔ ان ابدی حقائق کا علم اور ان اصول و نظریات پر ایمان رکھتا ہو اور اس اخلاقی فلسفہ کا قائل اور عامل ہو جس پر اس کے تمدن و تہذیب کی بنیاد ہے اس کے ماضی سے باخبر اور اس بلند معیار اور نمونہ سے متاثر ہو جس پر اُمت کے حال و مستقبل کی تعمیر ہونی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں ایک اور حقیقت سمجھ لینی چاہیئے۔ اسلام، در اصل نام ہے اس مستقل واضح اور متعین دینی اخلاقی اور اجتماعی نظام کا جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دنیا میں لے کر آئے، اس کا نام شریعت محمدی ہے اس میں عقائد بھی ہیں۔ اعمال و اخلاق اور معاملات بھی۔ باقی جو کچھ ہے یا اس کے لیے وسیلہ ہے یا اس کا نتیجہ اُمت کا سب سے بڑا فریضہ اسی نظام کی حفاظت ہے۔ عقائد کی حفاظت بھی ضروری ہے اور احکام کی حفاظت بھی، ضرورت ہے کہ عقائد ان تمام تحریفات سے محفوظ رہیں جو دوسرے مذاہب میں پیش آئیں اور جن کا اس اُمت میں بھی ہر وقت خطرہ ہے۔ ضرورت ہے کہ نبوت محمدی نے ذات و صفات باری تعالےٰ توحید و رسالت، قضا و قدر، حشر و نشر۔ امور غیب اور وحی کے متعلق جو تشریح کی ہے اور جتنی تشریح کی ہے اور ان کے جو حدود قایم کیے ہیں وہ باقی رہیں۔ اس لیے کہ ان تمام مسائل کی بنیاد قیاس و تخمین پر نہیں بلکہ

وحی و نبوت پر ہی اور نبوت محمدی نے انکی تکمیل کر دی ہو۔

احکام پر عمل اسی طرح ہو جس طرح آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا اور صحابہ کرام کے زمانہ میں ہوا، شرعی احکام و عبادات میں ترمیم و اضافہ سے مذہب کو محفوظ رکھا جائے۔ اس لیئے کہ پرانے آسمانی مذاہب ان ہی بدعات کی وجہ سے اس طرح مسخ ہوئے کہ اب ان کے انبیا کے لیئے بھی اپنے اُن مذاہب کا پہچاننا ناممکن ہے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ ان عقائد و احکام کی برابر اشاعت و تعلیم ہوتی رہے اس لیئے کہ دین کا بقا اسی پر منحصر ہو۔

اس کے علاوہ اُمت محمدی کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ دنیا میں بھلائی کی تلقین (امر بالمعروف) اور بُرائی کی ممانعت (نہی عن المنکر) کرتی رہے ایک آیت میں اُمت کی پیدائش و ظہور کا یہ مقصد بتایا گیا ہو۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللّٰہ (آل عمران)

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو عالم میں بھیجی گئی اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

لیکن اُمت کا بحیثیت مجموعی فریضہ ہے اگر اس میں سے ایک معتد بہ جماعت یہ فرض انجام دے تو گویا پوری اُمت یہ فریضہ انجام دے رہی ہے اس لیئے دوسری آیت میں اُمت کے ایک بڑے گروہ کا جس پر خود اُمت کا اطلاق ہو سکے یہ فریضہ بتایا گیا ہو۔ مگر اس امت صغریٰ کا پیدا کرنا اور اس کو اس کا موقع دینا خود امتِ کبریٰ کا فرض قرار دیا گیا ہو فرمایا۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر (آل عمران)

تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔

اس تقسیم عمل کے اصول کو یہ آیت اور زیادہ واضح کرتی ہے

وما کان المومنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا

اور یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مومن سب کے سب نکل آئیں تو یوں کیوں نہ کریں کہ ہر جماعت میں سے

فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون ۰ (براءۃ)

چند اشخاص نکل جائیں تاکہ دین کا علم سیکھیں اور اسمیں سمجھ پیدا کریں اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آئیں تو ان کو خوف دلائیں تاکہ وہ کچھ خوف کریں

نہایت آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مندرجہ بالا فرائض نظام شرعی کی حفاظت عقائد و احکام کو اپنے مقام پر رکھنا اور ان کو تحریف و بدعات سے بچانا شریعت کی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے فرائض قوم کا کونسا طبقہ انجام دے سکتا ہے۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلام کے نظام شرعی کی حفاظت اور اس کے لیئے ایثار و قربانی صرف وہ طبقہ کر سکتا ہے جس کی ذہنی اور عملی تربیت اس کے موافق ہوتی ہو جس کے رگ و ریشہ میں اس نظام کی محبت اور اس کا عشق و احترام پیوست ہو گیا ہو اور جس کے قلب و دماغ کی گہرائیوں میں اس کا یقین اُتر گیا ہو، اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ جب اس نظام پر کوئی ضرب لگائی گئی یا اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تو ہمیشہ یہی طبقہ بیچین ہوا۔ اور سر سے کفن باندھ کر میدان میں اُتر آیا، حضرت حسین رضؓ زید شہید، محمد ذوالنفس الزکیہ اور ابراہیم بن عبد اللہ کی قربانیاں اور سرفروشیاں اور اموی و عباسی محرفانہ نظام سلطنت کے خلاف تحریک جہاد، اسلامی نظام کی حفاظت کی کوششیں ہی تھیں، پھر ان خونیں معرکوں کے مظلوم شہدا اگر "عالم" کہلانے کے مستحق نہیں تو روئے زمین پر پھر "عالم دین" کہلانے کا مستحق کون ہے، ان کے حامیوں اور مددگاروں میں بھی سر فہرست نام امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا ہے۔

جب عباسی سلطنت کی طرف سے امت پر جبر یہ "خلق قرآن" کا عقیدہ مسلط کیا جانے لگا تو اس خطرناک تحریف و الحاد اور اس غیر اسلامی عقیدہ کے خلاف وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی" کے مقابلہ میں حفاظت دین کے لئے جو شخص تنہا میدان میں آیا وہ جماعت علما کا ممتاز فرد امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) تھا۔

جس کے عزم و استقامت اور ایمان کے سامنے حکومت وقت کو جھکنا پڑا۔ اور یہ عقیدہ تاریخی یادگار بن کر رہ گیا۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں۔

تیسری صدی کے آغاز میں جب عباسی سلطنت کی غفلت سے بغداد میں سخت اخلاقی ابتری۔ فسق و فجور اور بدامنی پھیلی تو دو عالموں خالد الدریوش اور سہل بن سلام الانصاری نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا اور قوت و جمعیت کے ساتھ من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ" پر عمل کرنا شروع کر دیا جس کے

پاداش میں وہ دونوں گرفتار ہوئے اور قید کردیئے گئے[1]

بعد کے زمانہ میں دو جلیل القدر عالموں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رح اور امام ابن جوزی نے اسلامی نظام اخلاق کی حفاظت اور مسلمانوں کی روحانی و دینی اصلاح کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں ان کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اسلامی نظام کو اپنے مرکز اصلی پر لانے کے لیئے عقائد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور صحابہ کے فہم کے مطابق سمجھنے کے لیئے امام ابن تیمیہ نے جو علمی و عملی خدمات انجام دیں وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔

ہمارے ہندوستان میں اسلام کے نازک ترین دور میں جب (مورخ اسلام کے الفاظ میں) "عجم کے ایک جادوگر نے بادشاہ کے کان میں یہ منتر پھونکا کہ دین عربی کی ہزار سالہ عمر پوری ہوگئی اب وقت ہے کہ ایک شہنشاہ امی کے ذریعہ نبی اُمیّ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین منسوخ ہوکر دین الٰہی کا ظہور ہو۔ مجوسیوں نے آتش کدے گرمائے۔ عیسائیوں نے ناقوسیں بجائیں برہمنوں نے بت آراستہ کیئے اور جوگ و تصوف نے مل کر کعبہ اور بت خانہ کو ایک ہی چراغ سے روشن کرنے پر اصرار کیا"[2] تو جو مسلمان مجاہد اس "فتنہ اکبر" کے مقابلہ کو لیئے میدان میں آیا اور جس نے سلطنت مغلیہ کا رُخ ہی بدل دیا اور جس کی عہد آفریں تحریک اور تجدید نے اکبر کے گھرانے میں عالمگیر جیسا متشرع فرماں روا اور حامی دین پیدا کیا وہ علماء ہی کا سرتاج مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی تھا (رحمۃ اللہ علیہ)

اس کے بعد آج اس وقت تک ان عجمی دربار میں اس غریب الوطن عربی مہمان کی جس نے سرپرستی اور حفاظت کی اور ہوا کے طوفانوں میں اس چراغ کو جو بارہا چراغ سحری بنا گل نہ ہونے دیا۔ وہ علماء دہلی کا مشہور بابرکت خاندان ہے جس میں شاہ ولی اللہ صاحب اپنے مجددانہ علمی کارناموں اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید اپنی قربانی اور سرفروشیوں کی بنا پر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کے علاوہ بھی حفاظت دین۔ رد بدعت۔ اصلاح رسوم اور الحاد و زندقہ کے مقابلہ کا جتنا کام اس وقت تک ہوا اور اس وقت بھی ہو رہا ہے وہ سراسر اسی طبقہ سے ہو رہا ہے۔

اگر دین اور اس کے شرعی نظام کی ضرورت ہے اور مسلمانوں کو محض ایک "قوم" بن کر نہیں بلکہ ایک صاحب شریعت و کتاب قوم بن کر رہنا ہے تو مذہب کے محافظین و حاملین اور شریعت کے ترجمان و شارحین کی ضرورت ہے اور

---

[1] ملاحظہ ہو طبری جلد ۱۰ صفحہ ۱۴۲ و مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۳۴ ۱۲ [2] مقدمہ سیرت سید احمد شہید از مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ ۱۲

اگر ان کی ضرورت ہے تو لامحالہ ان مرکزوں اور اداروں کی ضرورت ہے جو ایسے اشخاص پیدا کر سکتے ہیں اور یہ ضرورت مسلمانوں کی ہر قومی ضرورت سے اہم ہے۔

خلافتِ راشدہ کے طرز کی اسلامی سلطنت میں بھی دینی مدارس اور تربیت گاہوں کی ضرورت ہے تاکہ اُمت کے اسلامی جسم میں ہر دم تازہ خون پہنچتا رہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ جس نظام کے پشت پر ایسا ادارہ یا تربیت گاہ ہو جو اس قسم کے اشخاص پیدا کرتا رہے جو اس نظام کو چلا سکیں۔ اگلوں کی جگہ لے سکیں اور اس مشین میں فٹ ہو سکیں۔ اُس نظام کی جڑیں ہمیشہ کھوکھلی اور اس کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔

اگر کہیں برائے نام اسلامی سلطنت بھی ہے تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے دیندار امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں۔

لیکن اگر کسی ملک میں قسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ "قایم مقامی" کر سکتی ہے اور حفاظت دین کا فرض انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علما ہے چنانچہ اسی نکتہ کی وجہ سے اسلامی سلطنت کے زوال کے وقت حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا وہ نظام قایم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں۔ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ علمی حیثیت سے اسلام ہندوستان میں ان ممالک سے بہتر حالت میں ہے جہاں برائے نام اسلامی سلطنت (مسلمانوں کی سلطنت) آج بھی موجود ہے۔ مگر دینی آزاد مدارس کا کوئی نظام یا خاندان ولی اللہی کی شان کے علما نہیں پیدا ہوئے۔

جب ہندوستان میں حکومت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا اور مسلمانوں کا سیاسی قلعہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو بالغ نظر اور صاحب فراست علما نے جابجا اسلام کی شریعت اور تہذیب کے قلعے تعمیر کر دیے انہیں قلعوں کا نام "عربی مدارس" ہے اور آج اسلامی شریعت و تہذیب انھیں قلعوں میں پناہ گزیں ہے اور اس کی ساری قوت و استحکام انہیں قلعوں پر موقوف ہے۔

آئندہ صحبت میں ہم انشاء اللہ ان اسلامی قلعوں کے فرائض پر کچھ عرض کریں گے۔

جدید تعلیم
اور
علما کا جرم عظیم

(از جناب مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ صاحب بلیاوی رفیق ادارہ الفرقان بریلی)

یہ ایک حقیقت ہے جس کا انکار حقائق و واقعات سے ناواقف یا اعلیٰ درجہ کا معاند ہی کر سکتا ہے کہ ہندوستان پر انگریزی تسلط کے قیام کے دن سے آج تک جس طبقہ نے اپنی قومی و ملی خصوصیات کو انگریز کے آستانہ پر قربان نہیں کیا اور جو ہمیشہ ہی "حکومت متسلطہ" کے لیے باعث فکر و پریشانی بنا رہا جس نے کبھی ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں پر جتھہ بندی کی کبھی اندرون ہند ہی ہنگامہ برپا کر دیا کبھی پٹنہ اور تھانہ میں بیٹھکر حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریاں کیں کبھی دوسری حکومتوں سے سازشیں کیں، اور جو حکومت انگلشیہ کو زک دینے کے لیے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ہمیشہ ہی منصوبے بناتا رہا وہ یہاں کے علما کا ایک مخصوص طبقہ تھا جس کی سرگرمیوں اور جس کے ارادوں کا علم ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے زیادہ یورپ کے مبصروں کو ہے۔ اور اسی لیے اس طبقہ کی اہمیت یا اس کی خطرناکی کا اندازہ بھی کچھ انھوں نے ہی کیا۔

یورپ کے سیاستدانوں کو جو خصوصی مہارت اس طریقہ جنگ میں حاصل ہے جس میں سانپ مر جائے اور لاٹھی نہ ٹوٹے" اس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنھوں نے غائر نظر سے ان کی رفتار سیاست کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنے اس دشمن (ہندوستان کے "سر پھرے" علما) کے خلاف بھی یہی خاموش حربہ استعمال کیا اور یہ اندازہ کر لینے کے بعد کہ ان کا "سیدھا ہونا مشکل ہے" "عامہ مسلمین" کو ان سے متنفر کر کے ان کو بے دست و پا بنا دینے کی پالیسی اختیار کی پھر اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے عجیب عجیب حربے استعمال کیے۔ انہی حربوں میں سے ایک موثر ترین حربہ یہ پروپیگنڈا بھی ہے کہ یہ "مولوی جامد ہیں بے عمل ہیں۔ قوم کی ضرورتوں سے ناآشنا ہیں قوم کی موجودہ پستی اور ذلت

حکومت بالخصوص انکی تعلیم اپسماندگی کے یہی ذمہ دار ہیں انھوں نے ہی مسلمانوں کو "جدید تعلیم" سے روکا اور انہی کی رکاوٹ کی وجہ سے مسلمان تعلیم کے میدان میں برادرانِ وطن سے پیچھے رہ گئے "

یہ پروپیگنڈا کچھ اس قدر ہوشیاری سے کیا گیا بلکہ ہماری ہی بعض زبانوں سے کرایا گیا کہ ساری فضا پر چھا گیا اور "ایک ناقابل شک حقیقت ثابتہ" بنکر دماغوں اور ذہنوں پر اس طرح قابض ہو گیا کہ آج واقعات کی روشنی میں اسکو جانچنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی اور بہت سے زبان و قلم اس طرح آج اس کی اشاعت کرتے ہیں کہ گویا یہ "وحی منزل من اللہ" یا کم از کم ایک "مسلمہ حقیقت" ہے۔

"خساکسار تحریک" سے متعلق جناب سید گوہر صاحب بلوی کے ایک پمفلٹ نے (جس کا ذکر بلکہ جس کا جواب بھی قارئین کرام "الفرقان" کی قریبی اشاعت میں ملاحظہ فرما چکے ہیں) اس بحث کی طرف پھر ذہن کو متوجہ کر دیا اور جی چاہا کہ اس پروپیگنڈے کی حقیقت واصلیت پر پوری تفصیل سے کچھ لکھا جائے تاکہ اُن بیچاروں کو اپنے خیالات کی اصلاح کا موقعہ مل جائے جن کا ذریعہ معلومات صرف "بازاری خبریں" یا حقائق سے بے خبر مضمون نگاری کی بعض شوقینوں کی تحریریں ہی ہیں سید گوہر علی صاحب نے اپنے اس پمفلٹ میں مسلمانوں کی "تعلیم و ترقی" میں رکاوٹ ڈالنے کی ذمہ داری "علماء" پر ڈالتے ہوئے لکھا ہے:-

"جس وقت سر سید احمد خاں صاحب مرحوم مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ اس مقدس گروہ (یعنی جماعت علماء) نے جو سلوک کیا اس کی یاد آج بھی تازہ ہے لیکن چونکہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنا اس وقت کی اہم ضرورت تھا اور ماحول کا شدید تقاضا تھی لہذا وہ سر سید کی ہو کر رہی اور انکی ایک نہ چلی لیکن یہ ضرور ہوا کہ مسلمان ۶ دنیاوی ترقی میں کم از کم پچاس سال پیچھے رہ گئے۔ اور اس پسماندگی سے جو جو مصیبتیں مسلمانوں کو اُٹھانا پڑیں انکو وہ خود ہی خوب جانتے ہیں اس مقدس گروہ کی شمولیت نہ ہونے کے باعث تھوڑے عرصہ کے لیے مسلمانوں میں جو مذہب سے بُعد پیدا ہوا اس کی ذمہ داری انھیں حضرات کی گردن پر رہی کاش کہ جس طرح سر سید مرحوم نے قوم کو حکومت وقت کی زبان کی تعلیم دینے کے لیئے اپنی زندگی وقف کی تھی اگر اسی طرح اس مقدس گروہ کے چند افراد بھی سر سید مرحوم کے ساتھ اسلام اور احکام اسلام کی تعلیم دینے اور انگریزی تعلیم سے پیدا ہونیوالے نقائص کو رفع کرنے کے لیئے اشتراک عمل کرتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی مگر مسلمان تو آخر مسلمان ہے وہ فتنہ فتنہ خود ہی دائرہ اسلام میں واپس آگیا اور اسی علیگڑھ کالج نے علی برادران رحمہم اللہ تعالیٰ اور مولانا ظفر علی خاں جیسی ہستیاں پیدا کیں جن پر آج ہندوستانی مسلمان جتنا بھی فخر کرے کم ہے" پمفلٹ مذکور ص ۲ و ۳

قبل اس کے کہ اصل بحث کے متعلق کچھ عرض کیا جائے ان سطور کے راقم جناب سید گوہر علی صاحب کی بصیرت کے لیئے گزارش ہے کہ سر سید مرحوم کے ساتھ "اشتراک عمل" نہ کرنے کا الزام جو علماء پر آپ نے لگایا ہے وہ بھی خلاف واقعہ ہے "تہذیب الاخلاق" کی جلدیں ابھی دنیا سے مفقود

نہیں ہوئی ہیں انکا بغور ملاحظہ کیا جائے انشاء اللہ اس الزام کا بے بنیاد ہونا معلوم ہو جائیگا۔ "غریب علما" جن پر آپ برس رہے ہیں انکی تجویز یہی تھی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس پر سر سید احمد خاں صاحب نے لکھا اور انکی ہی "مقدس" زبان میں لکھا:۔

"بڑے بڑے معمم و مشمل قدوسی عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ و اصول تفسیر و حدیث علم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محققانہ تعلیم مذہبی اصول حقہ واقعیہ پر بلاشبہ مانع نقصان عقائد حقہ اسلامیہ کے ہوگی مگر تقصیر معاف ہو یہ اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہو سکتی اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جاویں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلیگی۔" تہذیب الاخلاق ص ۱۵۳ بحوالہ روشن مستقبل ص ۲۰۳

یہاں یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ سر سید احمد خاں صاحب کے نزدیک محققانہ تعلیم مذہبی اصول حقہ واقعیہ پر وہی تھی جس کے وہ خود مبلغ تھے گویا مذہب کو اپنی تحریفات سے جس طرح وہ خود مسخ کرتے تھے جس کا نمونہ ان کی تفسیر اور انکی دیگر تصنیفات متعلقہ مذہب میں دیکھا جا سکتا ہے چاہتے تھے کہ قوم کے نوجوانوں کی مذہبی تعلیم بھی یا تو اسی نہج پر ہو اور یا پھر وہ مذہبی تعلیم سے بالکل کورے رہیں اتنا ہی نہیں بلکہ اس زمانہ میں علماء نے مختلف شہروں میں جو خالص دینی درسگاہیں مذہبی تعلیم اور حفاظت دین کیلئے قایم کی تھیں سر سید تو ان کے بھی سخت خلاف تھے چنانچہ اسی زمانہ میں انھوں نے لکھا کہ:۔

"اس زمانہ میں پرانے طریقے پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لیئے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کیئے ہیں مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں قدیم کتابیں ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی کی تعلیم نہیں کرتیں برخلاف اس کے جھوٹی تحریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر اور غرور کو خود پسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت کرنا اور ہمدردی نہ رکھنا سکھاتی ہیں۔" تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۴۹۶

جو شخص "مذہبی تعلیم" کے متعلق یہ خیالات رکھتا ہو اس کے متعلق آج یہ کہنا کہ "علما نے اس کے ساتھ مل کر مذہبی و دینی تعلیم کا انتظام کیوں نہیں کیا اور کیوں اس بارے میں اس سے تعاون اور اشتراک عمل نہیں کیا اور انکی شمولیت نہ ہونے کے باعث مسلمانوں میں جو مذہب سے بعد پیدا ہوا اس کی ذمہ داری انہی علماء کی گردن پر ہے" غور فرمایا جائے کہ یہ کہنا کس درجہ خوش فہمی کی دلیل ہے۔ خود سر سید احمد خاں صاحب کی شہادت موجود ہے کہ مغربی تعلیم سے پیدا ہونیوالے جراثیم کا علاج علماء کرام دینی تعلیم کے تریاق سے کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے سر سید احمد خاں صاحب کو یہ پیشکش کی تھی لیکن آپکے ناخدائے تعلیم نے

یہ کہکر اس پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ جس کو تم "تریاق" کہہ رہے ہو وہی "زہر" ہے اور نہ صرف یہ کہ انھوں نے اس مذہبی تعلیم کو کالج کی حلقہ میں پسند نہ کیا بلکہ وہ دہلی دیوبند اور سہارنپور وغیرہ کی خالص دینی درسگاہوں کو بھی اس زمین پر دیکھنا پسند نہیں فرماتے تھے

ارشاد ہو کہ اس کے بعد جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں مذہب سے جو بُعد پیدا ہوا اس کی ذمہ داری اب بھی علما ہی پر ہی؟

پھر مرحوم علی برادران اور مولوی ظفر علی خاں صاحب کی نظیر پیش کر کے یہ اندازہ لگانا کہ سر سید احمد صاحب مرحوم کی تعلیمی پالیسی کی بدولت تعلیم یافتہ طبقہ میں مذہب سے جو بُعد پیدا ہوا تھا کچھ عرصہ کے بعد وہ ختم ہو گیا اور "مسلمان خود ہی دائرہ اسلام میں واپس آگیا" ——— انتہائی سادہ لوحی اور بے بصیرتی کا ثبوت دیتا ہے غالباً گوہر علی کو یہ بھی معلوم نہیں ہو کہ ان حضرات پر جو کچھ بھی "دینی رنگ" آیا وہ کب اور کن اسباب سے آیا۔ اور غالباً انھیں اس کی بھی کچھ خبر نہیں ہو کہ سر سید احمد خاں صاحب کی مخصوص تعلیمی پالیسی کے متعلق خود ان صاحبوں کی رائے کیا رہی ہے۔

اور قطع نظر اس سے کیا پھر اسی تین یا تیس یا تین سو ہستیاں بھی اُن ہزاروں کا کفارہ بن سکتی ہیں جو صرف سر سید مرحوم کے اس پسندیدہ مغربی نظام تعلیم کی بدولت مغربی الحاد کے آغوش میں چلے گئے اور چلے جا رہے ہیں، معلوم نہیں گوہر علی صاحب اس سلسلہ کے واقعات سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں یا نہیں، سر سید احمد خاں صاحب کی تعلیمی تحریک کے آغاز کے وقت تو یہ مسئلہ کسی قدر نظری بھی تھا اور "دور بین علما" جو کچھ اپنے اندازہ سے کہتے تھے اس کے یقین کرنے کے لئے بصیرت اور دور بینی کی ضرورت تھی لیکن اب تو وہ سب چیزیں واقعات بن کر آنکھوں کے سامنے سے گزر چکیں ایسی حالت میں علماء کے اس اختلاف کو جو سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی تعلیمی پالیسی سے ان کو تھا آج بھی غلط اور بے محل کہنا اور انہی و قومی مجرم گرداننا محض بے بصیرتی ہی نہیں بلکہ بے بصارتی کا بھی ثبوت دینا ہے در حقیقت علماء کو اگرچہ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کی مخصوص تعلیمی پالیسی سے اختلاف تھا لیکن مطلق "جدید تعلیم" یا "انگریزی تعلیم" سے ان کو اختلاف نہ تھا ——— یا یہ کہ ہندستانی مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی کمزوری کا سبب علماء کے اس اصولی اختلاف کو سمجھنا صرف انہی سادہ لوحوں کا کام ہے "جو ہندستان کی تعلیمی تاریخ کا مطلق علم نہیں رکھتے اور صرف سنی سنائی باتوں پر خیالی عمارتیں کھڑی کرنے کے عادی ہیں۔

علماء پر یہ سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کا الزام محض جھوٹ اور ہمارے خداوندان حکومت کا پروپیگنڈا ہے اور یہ مغربی مدبرین کا عام قاعدہ ہے کہ اپنی شرارتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ دوسرے کے سر الزام تھوپ دیتے ہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ وہ حکومت جو اپنے آپ کو علمبردار تہذیب کہتی ہو اور جس نے ہندوستان کی حکومت اپنے مفاد کے لئے نہیں نہیں بلکہ یہ دوسری صرف ہم جاہل وحشی ہندوستانیوں پر ترس کھا کر انسانیت کا درس دینے کے لئے طوعاً کرہاً اختیار کی ہے اس کی حکومت میں ایک صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود ابھی تک ہندوستان کی چوتھائی آبادی تو کیا آٹھواں حصہ بھی تعلیم یافتہ نہ ہو سکا۔ اس کلنک کا ٹیکہ چھپانے کے لئے یہ مشہور کرا دیا کہ ہم تو تعلیم پھیلانا چاہتے تھے مگر "علما" آڑے آگئے اور مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے سے روک دیا۔

آج ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اسی موضوع پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں پہلے تو ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جدید تعلیمی تحریک کے آغاز کے وقت علما نے جو اختلاف کیا تو انکا یہ اختلاف خود "جدید تعلیم" یا بالفاظ دگر "انگریزی تعلیم" سے تھا یا کسی اور چیز سے جو تعلیم کے ساتھ بلکہ تعلیم ہی کے پردہ میں مسلمانوں پر مسلط کی جا رہی تھی۔

اس کے بعد ہم اس پر بھی روشنی ڈالیں گے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور علما کے اختلاف کو اس کا سبب بنانے والے حقائق و واقعات سے کس درجہ بے خبر ہیں۔

جدید تعلیمی تحریک کا آغاز!

جدید تعلیمی تحریک کا سنگ بنیاد ۱۸۳۵ء میں رکھا گیا جبکہ لارڈ میکالے کی صدارت میں ایک مجلس بیٹھی جس میں یہ طے کرنا تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے یا فارسی و سنسکرت ہی باقی رکھی جائے؟ مجلس میں خوب بحث ہوئی آخر میں جب رائے شماری ہوئی تو موافقین و مخالفین برابر تھے لارڈ میکالے نے اپنا کاسٹنگ ووٹ انگریزی کے حق میں دیا اور رپورٹ میں یہ الفاظ تحریر کیے۔

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریزی ہو (تاریخ التعلیم از میجر باسو ص۸)"

ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ یہ تھا "جدید تعلیم" کے اجراء سے ہمارے آقاؤں کا اصل منشا اور ظاہر ہے کہ صرف انگریزی زبان سکھانے اور مغربی علوم بطور علوم پڑھانے سے یہ قلب ماہیت ہرگز نہ ہو سکتا تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اس تعلیم کے لیے نظام اور ماحول ایسا بنایا جائے کہ تعلیم حاصل کرنے والوں کا دل و دماغ آپ سے آپ انگریزی دل و دماغ بن جائے اور ان کا مذاق اور ان کے خیالات یورپی مذاق اور یورپی خیالات سے تبدیل ہو جائیں۔

اس منشاء کی تکمیل کے لیے جو کوششیں حکومت نے براہ راست کیں (جن کا کچھ ذکر آئندہ آئے گا) ان کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہو سکی یہاں تک کہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے سر سید احمد خاں صاحب غالباً اپنی ایک اجتہادی غلطی سے ان کے آلہ کار بن گئے انھوں نے مسلمانوں میں جدید تعلیم پھیلانے کے لیے جب جدوجہد شروع کی تو صرف "انگریزی تعلیم اور یورپی علوم" ہی کی ترویج ان کے پیش نظر نہ رہی بلکہ لارڈ میکالے کے دلی منشا کے مطابق انھوں نے اس پر بھی ابتدا زور صرف کیا کہ مسلمان "مغربی تہذیب و مغربی معاشرت" کو بھی اختیار کر لیں اور اساتذہ یورپ سے وہ پورا پورا اثر لے کر مکمل طور پر ہندوستانی انگریز بننے کی کوشش کریں ــــــ ان کا خیال تھا کہ

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں انکو دیکھتی ہیں وہ رفع ہوں اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب کہلاویں"

(تہذیب الاخلاق جلد دوم ص ۱ بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۸۴)

اور اس خیال سے ان کو ترکوں کے طرز عمل سے بہت تقویت ملی چنانچہ انھوں نے تہذیب الاخلاق میں لکھا کہ:-
ترکوں کا تمام لباس بجز ٹوپی کے بالکل یورپین ہے سب نے زمین پر بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے میز و کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ میز پر چھری کانٹوں سے کھانا کھاتے ہیں ان کے مکان کی آراستگی اور طریقہ بالکل یورپینوں کا سا ہے جب ترک اپنی ہمسایہ قوموں فرینچ اور انگریزوں میں مل کر بیٹھتے ہیں تو ہمجولی معلوم ہوتے ہیں اور امید ہے کہ روز بروز اور زیادہ مہذب ہوتے جائیں گے۔ پس ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی ہم یہی چاہتے ہیں کہ اپنے تعصبات اور خیالات خام کو چھوڑ دیں اور تربیت و شائستگی میں قدم بڑھائیں
(روشن مستقبل ص۱۸۶)

یہاں ہم کو اس سے بحث نہیں کہ اسلامی روایات اور اسلامی احکام سے لاپروا ہو کر تہذیب و معاشرت میں یورپ کی اس نقالی سے یہ مقصد حاصل بھی ہو سکتا تھا یا نہیں نیز ہم کو فی الحال اس پر بھی غور کرنا نہیں ہے کہ ہندوستان کے عام مفلوک الحال مسلمان اس گراں تہذیب و تمدن کو اختیار بھی کر سکتے تھے یا نہیں ہم کو تو صرف اس وقت یہ دکھلانا ہے کہ قوم کو بام عروج پر پہونچانے کے لئے سرسید احمد خاں صاحب کے سامنے صرف "جدید تعلیم" یا "مغربی علوم" کی تحصیل ہی کا سوال نہ تھا بلکہ وہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان اپنی قدیم تہذیب و معاشرت چھوڑ کر یورپین تہذیب اور یورپین معاشرت بھی اختیار کر لیں اور اس لئے "جدید تعلیم" کے پیغام کے ساتھ ہی وہ قوم کو یورپین معاشرت و تہذیب اختیار کر لینے کی بھی دعوت دیتے تھے — اور چونکہ مسلمانوں کے قدیم مذہبی خیالات اس مقصد کی راہ میں حائل تھے اس لئے سرسید احمد خاں صاحب نے مذہب میں بھی "اصلاح و تجدید" کو ضروری سمجھا —— مذہب کے وہ احکام جو یورپین تہذیب و معاشرت اختیار کرنے میں مانع تھے پوری قوت سے انکی کاٹ چھانٹ شروع کی اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہل یورپ کے مقابلہ میں انکی ذہنی مرعوبیت نے انھیں اس پر بھی آمادہ کیا کہ اسلام کا ہر وہ عقیدہ اور حکم جس کے خلاف "عقلاء یورپ" نے نفرت کا اظہار کیا یا تو سر موصوف نے سرے ہی سے ان سے انکار کر دیا اور اعلان فرما دیا کہ یہ اسلام میں ہے ہی نہیں" اور یا اس کی ایسی یورپ پسندانہ تاویلیں کیں جن سے اس کی حقیقت بالکل ہی مسخ ہو گئی

[1] چونکہ سرسید احمد خاں صاحب کی مذہبی حیثیت کا ذکر یہاں ہمارے موضوع سے خارج ہے نیز وہ تطویل طلب بھی ہے اس لئے بالقصد یہاں ہم نے اس بحث کو نظر انداز کر دیا ہے جو حضرات اسلام میں انکی ترمیمات اور تحریفات سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں وہ اگر صرف انکی تفسیر قرآن کا بھی مطالعہ فرمائیں تو ہمارے اس خیال کی تصدیق فرمائیں گے، بشرطیکہ وہ خود یہ جانتے ہوں کہ "اسلام" کیا ہے۔ اور اس کی بنیاد کن محکم اصولوں پر ہے لیکن جن بیچاروں کی پوری زندگی بقول اکبر مرحوم کے "بس کالج کے حلقہ اور "صاحب" کے دفتر میں گزری ہو اور اسلئے انکی معلومات اس سے زیادہ کچھ نہ ہوں کہ اسلام وہ ہے جو اسلام ہے اور اس کے بنیادی اصول وہی ہیں جو اس کی بنیادی اصول ہیں غرض جو بیچارے اسلام اور اصول اسلام کے صرف لفظوں کو جانتے ہیں وہ اگر "اصلاح و تجدید" اور "ترمیم و تحریف" میں فرق نہ کر سکیں تو معذور ہیں، لیکن اس عدم واقفیت کے باوجود جو حضرات اس بحث میں اپنے کو دخل اندازی اور رائے زنی کا حقدار سمجھتے ہیں وہ ضرور قرآن پاک کی اس آیت کے مصداق ہیں ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر (اور کچھ ایسے ظالم لوگ ہیں جو بغیر علم اور بلا ہدایت ربانی اور بلا کتاب الٰہی کے اللہ اور اسکے دین کے بارہ میں بحث کرتے ہیں)

بہر حال "جدید تعلیم" کے پیغام اور یورپین تہذیب و معاشرت کی دعوت کے ساتھ ساتھ سر موصوف نے مسلمانوں کے مذہبی اصول و احکام پر بھی عمل جراحی شروع کیا بلکہ واقعہ یہ ہو کہ یہ مذہبی تراش خراش اور تحریف و ترمیم کا مشغلہ (اور ان کے حامیوں کے لفظوں میں اصلاح و تجدید کا سلسلہ) وہ تعلیمی جدوجہد سے کچھ پہلے ہی شروع فرما چکے تھے ان کے رفیق اور سوانح نویس مولانا حالی کے الفاظ میں اس کی غرض یہ تھی کہ

"چونکہ مفتوح قوم کو فاتح قوم کے ساتھ مذہبی تعصبات ضرور باقی رہتے ہیں اور وہ قومی تعصبات مسلمانوں میں مذہبی تعصبات کے لباس میں ظہور کر رہے تھے جس میں حکمران قوم کی نظر میں مسلمانوں کا اعتبار روز بروز کم ہوتا جاتا تھا۔ اور ان کا مذہب سلطنت کے حق میں خطرناک خیال کیا جاتا تھا اور مسلمانوں کی ہر بُری بات ان کے مذہب کی طرف منسوب کی جاتی تھیں اور فقہا کے فتوے جو دنیوی ترقی کے مانع ہوتے تھے انھیں قومی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے اور مسلمانوں کی پولیٹکل حالت کو بھی اس سے بہت کچھ تعلق تھا اس لیے سر سید نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا" (روشن مستقبل ص۱۸۱)

الغرض سر موصوف نے جس وقت مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کو ہاتھ میں لیا اور اس کے پیغام بر ہو کر حیثیت سے وہ مسلمانوں کے سامنے آئے تو وہ صرف "جدید تعلیم" ہی کے داعی نہ تھے بلکہ یورپین تہذیب و معاشرت کی اشاعت و تبلیغ اور مذہب میں ترمیم و تحریف یا "اصلاح و تجدید" بھی ان کی زندگی کا مشن تھا اور وہ مسلمانوں کے دماغ کو "جدید تعلیم" سے آراستہ کرنے کے ساتھ ان کی زندگی کو یورپین تہذیب معاشرت سے اور ان کے دل کو اس "یورپ پسند" اور ترمیم و اصلاح شدہ اسلام" سے "مزین" کرنا چاہتے تھے جس کی اچھائی اور برتری پر وہ خود یقین رکھتے تھے ـــــ سر سید احمد خاں صاحب کے ان تینوں کاموں میں ایسا باہمی ربط تھا کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ اور بے شک مسلمانوں میں "جدید تعلیمی اسکیم" کے واضعین لارڈ میکالے اور ان کے رفقاء کی وہ آرزو کہ

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے .... جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔

سر سید احمد خاں کے اس مجموعی پروگرام سے پوری ہوتی تھی۔

یہ تھی اصلی صورت حال کہ جدید تعلیمی تحریک کے ساتھ ہی ساتھ اپنی تہذیب معاشرت کی تبدیلی اور مذہب کی ترمیم و تحریف کا بھی سوال تھا پس اگر خدا نے کچھ بھی عقل و انصاف آپ کو دیا ہو تو سوچیے اور فیصلہ کیجیے کہ وہ علما جو اپنی مذہبی ذمہ داریوں کا کچھ بھی احساس رکھتے تھے اور ہندوستان سے اسلامی اقتدار کے رخصت ہونے کے بعد اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت، اور امانت الٰہیہ یعنی دین مقدس کی حفاظت و صیانت

کے بارے میں ان کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ گئی تھیں ان کے لیئے اس کے سوا اور کیا چارہ کار تھا کہ سر سید احمد خاں کی غلط پالیسی کے خلاف آواز بلند کرتے چنانچہ انھوں نے اس پالیسی سے اختلاف کیا اور ان کی تحریریں شاہد ہیں کہ اس اختلاف میں بھی انھوں نے حد اعتدال سے تجاوز نہ کیا بلکہ انگریزی تعلیم کو فی نفسہ جائز ہی بتلایا البتہ اس کے ساتھ جو اور زہر مسلمانوں کے حلق سے اتارنے کی کوشش کی جاتی تھی انھوں نے اس کو برملا زہر کہا اور مسلمانوں کے دین و ایمان کو اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی —— ابھی ابھی خود سر سید احمد خاں صاحب کی یہ شہادت گزر چکی ہے کہ علما نے مسلمانوں کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیئے انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کے لزوم کی تجویز پیش کی جس کو سر سید احمد خاں نے اپنے خیال کے مطابق غلط اور مضر سمجھا اور ماننے سے انکار کر دیا۔ بہر کیف حقیقت یہی ہے کہ ذمہ دار علما نے "نفس انگریزی تعلیم سے کسی وقت بھی اختلاف نہیں کیا ان کا اختلاف دراصل اس چیز سے تھا کہ "انگریزی تعلیم کے ساتھ" مغربی تہذیب و معاشرت کو اختیار کیا جائے اور یورپ سے مرعوب ہو کر اسلام میں ترمیم و تحریف کا دروازہ کھولا جائے

اس زمانہ کے اکابر علما کے وہ فتاوے آج بھی موجود ہیں اور ہمارے اس دعوی کے لیئے وہی سب سے بڑا ثبوت ہیں۔ نمونتاً ہم دو تین فتوے یہاں درج کرتے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے فتاوے میں انگریزی تعلیم کے متعلق یہ سوال و جواب آج بھی موجود ہے۔

سوال :۔ انگریزی پڑھنا پڑھانا درست ہے یا نہیں ؟

الجواب :۔ انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور کوئی نقصان دین اس سے نہ آئے۔

اور حضرت مولانا عبد الحی لکھنوی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (جن کی وفات ۱۳۰۴ھ میں ہوئی جو انگریزی سنین کے لحاظ سے ۱۸۸۶ء کے برابر ہے اور یہی زمانہ سر سید کی تعلیمی تحریک کا ہے) اپنے فتاوی میں اس سوال کے جواب میں کہ "انگریزی پڑھنا پڑھانا کیسا ہے" فرماتے ہیں :۔

جواب :۔ "لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبہ ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لیئے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں مشکوۃ شریف میں ہے کہ حضور سرور عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کا خط سیکھنے کے لیئے حکم فرمایا اور انھوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے سیکھ لیا۔ مجموعۂ فتاوی مولانا عبد الحی ج ۱ ص ۱۱۱

اس فتاویٰ میں اس کے علاوہ اور چند جگہ بھی اسی مضمون کے چند فتاویٰ موجود ہیں۔
اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہٗ انگریزی پڑھنے ہی کے متعلق اسی قسم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں

انگریزی ایسے ہی ہندی منجملہ لغات یعنی زبانوں کے ایک زبان ہے اور زبان فی نفسہ کوئی قبیح نہیں بلکہ نعم خداوندی سے ایک نعمت ہے کما قال تعالیٰ ومن اٰیاتہ خلق السموات والارض واختلاف السنتکم والوانکم ان فی ذلک لاٰیات للعالمین الاٰیۃ اور خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فارسی میں کہ آپ کے زمانہ میں آتش پرستوں کی زبان تھی تکلم فرمایا ابوہریرہ سے پوچھا اشکمت درد الی اٰخر الحدیث رواہ ابن ماجہ البتہ کبھی بعض عوارض کی وجہ سے قبیح لغیرہ ہو جاتی ہو پس اگر وہ عوارض نہ ہوں صرف کسی مصلحت دینی مثل رد نصاریٰ وہنود یا دنیوی مثل کسب معاش وغیرہ کے لئے سیکھے تو جائز ہو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابت کو لغت وخط سریانی کہ اس زمانہ میں یہود کا لغت وخط تھا واسطے ضرورت مراسلت ومکاتبت یہود کے سیکھنے کے لئے فرمایا تھا چنانچہ وہ آدھے مہینے سے کم میں سیکھ کر لکھنے پڑھنے لگے وعن زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قال امرنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان اتعلم السریانیۃ وفی روایۃ انہ امرنی ان اتعلم کتاب یہود وقال انی ما امن یہود علے کتاب قال زید بن ثابت فما مربی نصف شہر حتے تعلمت فکان اذا کتب الی یہود کتبت واذا کتبوا الیہ قرأت لہ کتابہم رواہ الترمذی)۔ اگر وہ عوارض ہوں تو اس وقت اجتناب واجب ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو توریت شریف پڑھنے سے منع فرمانا صحاح میں مذکور ہو کہ احتمال مفاسد کثیرہ کا تھا سو اگر کوئی ایسا شخص جو اپنی ضروریات دینیہ عقائد ومسائل سے واقف ہو اور ظن غالب ہو کہ یہ شخص بوجہ صحبت کفار وفجار کے اُن کے خیالات یا رسوم یا وضع کی طرف مائل اور اپنے دین سے سست عقیدہ نہ ہوگا واسطے کسب معاش حلال وغیرہ کے انگریزی یا ہندی پڑھے جائز ہے اور جو ہنوز اپنے مذہب سے واقف نہیں خصوصاً جبکہ کم عمر ہو اور غالب ہے کہ ایسے لوگوں کی مصاحبت سے ان کی طرف میلان ورجحان اور اپنے مذہب سے ضعف اعتقاد پیدا ہوگا ایسے شخص کے لئے البتہ ممنوع ومصداق ویتعلمون ما یضرھم ولا ینفعھم کا ہے۔ فتاویٰ امدادیہ جلد چہارم ص ۱۹۰ و ۱۹۱

اُسی زمانہ کے علماء کرام کے ان فتاویٰ سے صاف ظاہر ہے کہ ان حضرات نے نفس تعلیم انگریزی سے ہرگز اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ کسب معاش وغیرہ کے لئے ان حضرات نے صراحۃً اس کے جواز کا فتویٰ دیا البتہ جس صورتیں کہ مختلف اسباب سے متعلم کے دین وایمان پر

اس کا اثر برا پڑتا ہو اور وہ غیر اسلامی تہذیب، غیر اسلامی اخلاق، اور خلاف اسلام معتقدات کے اختیار کر لینے کا ذریعہ بنتی ہو تو اس کو ناجائز بتلایا — للہ کوئی بتلائے کہ اس کے سوا صحیح اور معتدل راہ اور کیا ہو سکتی تھی؟

اور یہ تو سرسید احمد خاں صاحب کے ہم عصر علماء کے فتاوے تھے جو اُن کی تعلیمی تحریک ہی کو سامنے رکھ کر حوالہ قلم کیے گئے تھے لیکن ان علما کے استاذ الاساتذہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس سے بہت پہلے "نفس انگریزی تعلیم" کے جواز کا فتوےٰ دے چکے تھے —— جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی۔ اے ہوم ڈپارٹمنٹ شملہ (جو جدید تعلیم یافتہ گروہ ہی کے ایک فرد ہیں اور اخباری دُنیا بالخصوص مسلم لیگی حلقوں میں کافی شہرت کے مالک اور غریب "مولویوں" کی دشمنی میں فی زمانہ ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں) اپنے ایک مضمون میں جو موصوف نے "متاع کارواں" کے عنوان سے رسالہ ترجمان القرآن بابت ماہ رمضان ۱۳۵۶ھ میں شایع کرایا تھا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے حقیقی اسباب اور تعلیم کے میدان میں ان کو پیچھے رکھنے کے واسطے ہماری مہربان حکومت کی ایک منظم اسکیم کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

> الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے "ملّانوں" نے انھیں انگریزی پڑھنے سے روکے رکھا اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی لیکن مذکورہ صدر واقعات کو سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے ان کے ملانے تھے یا ایک منظم اسکیم تھی؟ ملانے جو یوں بدنام کیے جاتے ہیں ان کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب رحمۃ اللہ نے فتوےٰ دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے۔ علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھیرایا جاتا ہے۔ ترجمان القرآن جلد ۱۱ عدد ۳ صہ ۲۲۱، ۲۲۲

سوچا جا سکتا ہے کہ ان روشن اور محفوظ شہادتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ "علما نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا اور ان کی اس رُکاوٹ ہی کی وجہ سے مسلمان ترقی کے میدان میں پچاس سال پیچھے رہ گئے" خوش فہمی کی کیسی روشن اور اعلیٰ مثال ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ سرسید احمد خاں صاحب کی مخصوص پالیسی اور ان کے طریقہ کار سے بھی علماء کا یہ اختلاف صحیح تھا یا نہیں؟ اور کون فریق اس نزاع میں حق بجانب تھا؟ سو اب سے پچیس تیس برس

پہلے تو یہ مسئلہ کچھ قابل غور بھی ہو سکتا تھا لیکن اب جبکہ سرسید احمد خاں کی اس پالیسی کے یہ نتائج آنکھوں کے سامنے آچکے کہ ہم میں سے جتنوں نے انکے پسندیدہ اور جاری کردہ نظام تعلیم سے زیادہ استفادہ کیا وہ اسی قدر اسلامی تہذیب، اسلامی معاشرت بلکہ نفس اسلام سے ہی دور جا پڑے۔ ان کا لباس، ان کی معاشرت، ان کی زبان، ان کے خیالات بلکہ ان کی پوری زندگی غیر اسلامی بن گئی اور وہ اپنے نام اور خاندانی رسم و رواج کے لحاظ سے مسلمان ہونے کے باوجود حقیقت اسلام اور احکام اسلام سے اسی قدر اجنبی ہو گئے جس قدر کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے اور اس تلخ تجربہ کے بعد ہی ماضی قریب میں خود انھوں نے کانگریس کی وضع کردہ اور کانگریسی حکومتوں کی پسندیدہ "واردھا تعلیمی اسکیم" اور "ودیا مندر اسکیم" کو بالکل انہی وجوہ سے اور انہی خطرات کی بنا پر مسترد کیا جن وجوہ سے بیچارے علمانے سرسید احمد خاں کی تعلیمی پالیسی سے اختلاف کیا تھا۔ اور خدا کی شان ہے کہ گزشتہ سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں واردھا اسکیم کے استرداد کا یہ رزولیوشن کسی مولوی مُلّا نے نہیں بلکہ سرسید احمد خاں صاحب کے گویا سچے جانشین اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر سرضیاء الدین احمد صاحب بالقابہ ایم۔ ایل۔ اے (مرکزی) نے پیش کیا۔

پس اگر خدا نے کچھ فہم و بصیرت دی ہو تو سوچیے کہ علمانے میکالے اسکیم اور سرسید احمد خاں کی تعلیمی پالیسی کے متعلق جو رائے اب سے ساٹھ ستر برس پہلے قایم کی تھی اور جس کی بنا پر ان کو جمود اور تنگ نظری کے طعنے آج تک دیئے جا رہے ہیں اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا ذمہ دار ان کو گردانا جا رہا ہے وہی رائے "واردھا تعلیمی اسکیم" کے مقابلہ میں اُن حضرات نے بھی قایم کی جو ساٹھ سال سے علما کے "جمود" پر طعنہ زن تھے اور برابر یہ درس دیتے تھے کہ ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

علما کی اصابت رائے کا اس سے زیادہ روشن ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟ فرق صرف دوربینی اور نا دوربینی کا ہے خدا نے جن کو صرف بصارت بخشی ہوتی ہے وہ بس "حال" کو دیکھتے ہیں اور جن کو بصیرت سے بھی حصّہ ملتا ہے وہ ماضی اور حال ہی کے آئینہ میں مستقبل کو بھی دیکھ لیتے ہیں ـــــ سرسید احمد خاں کے متبعین تلخ تجربوں اور دینی بربادیوں کے بعد اب جس نتیجہ پر پہونچے ـــــ علما اس پر اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے پہونچ چکے تھے ـــــ جس "اسلامی تہذیب" اور "اسلامی معاشرت" کو اب ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں میں اشتعال پیدا کرنے اور اقتدار کی جنگ میں کانگریس سے بازی لے جانے کے لیئے نعرۂ جنگ بنایا جا رہا ہے یہ وہی متاع فرسودہ" تو ہے جس کو ذبح کرنے کے لیئے خود آپ خنجر بکف تھے اور

اب تک جس کو خود آپ ہی نے اپنے عمل سے پامال کیا تھا اور جس کی حفاظت اور اس "دور تجدد" میں بھی جس کو سینے سے لگائے رکھنے کے جرم میں کل تک "مولوی" کو تنگ نظر، ترقی دشمن، اور دور وحشت کی نشانی کہا جاتا تھا۔

خدا کی شان ہے کہ جو زبانیں کل تک علماء کے اس "اسلام پرستانہ" اور "قدامت پسندانہ" رویہ پر طعنہ زن تھیں آج وہی یہ "مولویانہ بولی" بولنے کے لئے مجبور ہیں۔ اور سیداحمد خاں صاحب کے جو متبعین اب تک "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کے فلسفہ کے قائل تھے اب "واردھا تعلیمی اسکیم" کے مقابلہ میں وہی علماء کا مجاہدانہ نظریہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"، اختیار کر رہے ہیں۔

معاف کیجئے اس صورت حال کو دیکھ کر اگر علما کا کوئی کفش بردار کہے کہ

انچہ دانا کند کند ناداں

لیک بعد از خرابی بسیار

تو ضرور اس کو یہ کہنے کا حق پہونچتا ہے

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ گاندھی جی اور ان کے ہوشیار رفقاء کو "واردھا تعلیمی اسکیم" اور ودیا مندر تعلیمی اسکیم" کے عمومی اجراء و تنفیذ کی ہمت اسی وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے یہ لیڈر صاحبان اسی قسم کے ایک زہریلے لقمہ (میکالے اسکیم) کو صرف حکومت وقت کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی "نعمتوں" سے حصہ لینے کی طمع میں نوش جان فرما چکے ہیں بلکہ ذرا دیر سے ملنے کی وجہ سے کسی فرضی تخیل کی بنا پر ابھی تک اپنے علماء مذہب کو گالیاں دے رہے ہیں کہ ان "کمبخت ملانوں" ہی نے ہماری قوم کو اس "رحمت" میں حصہ لینے سے روکا ورنہ آج ہم بھی ترقی کے آسمان بلکہ شاید عرش پر ہوتے۔

اور وہ تو کہئے بڑی خیریت ہوئی کہ ۱۹۳۷ء میں جواہرلال نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈروں سے فتح الیکشن کے نشہ میں ایک سنگین غلطی ہوگئی کہ انھوں نے کولیشن وزارت بنانے سے انکار کرکے ہمارے ان لیڈران کرام کو اپنے خلاف صف آرا کر لیا اور پھر ضمنی الیکشنوں اور پروپگینڈے نے اس اختلاف کی خلیج کو اور زیادہ وسیع کر دیا ورنہ اگر کہیں اس وقت کانگریس فراخ دلی سے نہ ہی بلکہ مصلحت بینی ہی سے کام لے کر غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کا تعاون حاصل کر لیتی اور ہمارے ان زعمائے قوم کو بس ایک ایک دو دو وزارتیں دے کر کولیشن وزارت بنانے پر راضی ہو جاتی تو میکالے اسکیم کی طرح واردھا تعلیمی اسکیم بھی انہی "حافظین تہذیب اسلامی" کے ہاتھوں سے

مسلمانوں پر مسلط کرا سکتی تھی۔ اور تحفظ دین و مذہب کی خاطر اس کے خلاف آواز بلند کرنے والے علماء پر یہی لیڈران کرام پھر وہی جمود و تنگ نظری ترقی دشمنی اور زمانہ ناشناسی کا الزام رکھ کر مخالفانہ پروپیگنڈے سے زمین و آسمان ایک کر دیتے جس طرح "میکالے اسکیم" کے بارے میں اب تک ہو رہا ہے۔

اگرچہ بات کسی قدر موضوع سے ہٹ جائے گی مگر دینوی تعلیمی تحریکوں کے بارے میں علماء کا معتدل اور پختہ کارانہ رویہ و مسلک اور زیادہ واضح کرنے کے لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ناظرین کرام کو یہ بھی بتلا دیں کہ "واردھا تعلیمی اسکیم" کے متعلق بھی ان علماء کرام نے وہی صحیح اور معتدل رویہ اختیار کیا جو "میکالے تعلیمی اسکیم" اور سرسید احمد خاں صاحب کی تعلیمی پالیسی کے متعلق انھوں نے اب سے ساٹھ ستر برس پہلے اختیار کیا تھا اس کے لیے ہمیں علماء کے انفرادی آرا کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں صرف مرکزی جمعیتہ علماء ہند کی وہ تجویز ہم یہاں نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو اس نے اپنے اجلاس دہلی منعقدہ ماہ مارچ ۱۹۳۸ء میں پاس کی تھی۔

جمعیتہ کی مجلس عاملہ نے "واردھا تعلیمی اسکیم" پر غور و خوض کرنے کے لئے پہلے ایک سب کمیٹی مقرر کر دی تھی جس نے کامل غور و فکر کے بعد اپنی رپورٹ مرتب کی جو بجنسہ درج ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ——— نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

ہم نے واردھا تعلیمی اسکیم پر غور کیا۔ اول اجمالی طور پر ہم اس کے مفصلہ ذیل بنیادی اصول پر بحث کرتے ہیں

(۱) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

(۲) نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ بنیادی۔ دستکاری بھی سکھائی جائے۔ بلکہ دستکاری ہی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے۔

(۳) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازم کرنا

(۴) بچوں کے ذہن میں ابتداہی سے رواداری اور روشن خیالی پیدا کرنیکے ذرائع اختیار کرنا اصان کو تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مفید شہری اور کارگزار انسان بنانا۔

مقدم الذکر تین اصول تو بلاشبہ مستحسن اور قابل قبول ہیں۔ البتہ چوتھا اصول اگر اسی قالب میں رہتا جس میں ہم نے اسے ذکر کیا ہے تو وہ اصول ثلاثہ متقدمہ کی طرح مستحسن اور قابل قبول تھا لیکن جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس چوتھے اصول کو اپنی رپورٹ

کے ص۱۱۱ و ص۱۱۸ و ص۱۱۹ (طبع ثانی از رسالہ جامعہ) میں ذکر فرمایا ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ ان کی عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ آئندہ ہندوستان میں اس اسکیم کے ماتحت تعلیم یافتہ ایک تہذیب اور ایک قسم کے عقائد اور مشابہ اعمال کے پابند ہوں وہ تمام مذاہب کی عزت کریں (یعنی تمام مذاہب کو سچا سمجھتے ہوں) اور ان میں مذہبی لحاظ سے کوئی امتیاز باقی نہ رہے نیز وہ اہنسا کی حقانیت کے معتقد اور اس پر عامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ اصول نہ صحیح ہے نہ قابل عمل ہے۔ اور اس میں ہندوستان کے مختلف مذاہب اور مختلف رجحانات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ مختلف مذاہب کے ساتھ رواداری برتنا اور چیز ہے اور مختلف (بلکہ متضاد) مذاہب کو صحیح اور حق سمجھنا بلکہ سب کو ایک سمجھنا اور شے ہے۔ یہ بات تو دو ہندو فرقوں مثلاً سناتن دھرمیوں اور جینیوں میں بھی متحقق الوقوع نہیں پھر غیر مسلموں اور مسلمانوں میں کس طرح اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے عدم تشدد کو اپنے موجودہ ماحول کی وجہ سے بطور پالیسی اختیار کر لیا تھا اور اب تک اختیار کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قرآن حکیم کی آیاتِ جہاد کو بھول گئے یا چھوڑ بیٹھے اور تشدد کو اگرچہ وہ ضروری مواقع میں اختیار کیا جائے گناہ اور پاپ سمجھنے لگے۔ نیز یہ لفظ ایسے انداز سے ذکر کیا گیا ہے جس سے خطرہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذہنوں میں اس کا مفہوم "جیو ہتھیا" کے معنی میں بیٹھ جائے گا۔ یا بٹھا دیا جائے گا جس کا اثر مسلمانوں کے ایک خاص معاشرتی اور مذہبی عمل ذبح حیوانات پر بھی پڑے گا اور آئندہ ہندوستان میں یہی ایک چیز ہمیشہ منشاء نزاع بنی رہے گی اور اگر خاکم بدہن یہ اسکیم اس معنی سے کامیاب ہو گئی کہ بچوں کے دماغ میں ابتدا ہی سے ذبح حیوانات اور عقیدۂ جہاد سے نفرت بیٹھ گئی اور سب کے سب انسان اس کو مذموم سمجھنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جدید تعلیم نے مسلمانوں کا ایک مذہبی عقیدہ بدل دیا اور ان کے ایک معاشرتی اور مذہبی حق کو باطل کر دیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بے شمار مختلف مذاہب موجود ہیں بغیر باہمی رواداری کے زندگی گزارنا مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ متحدہ قومیت کا تخیل کہ مسلمان بھی اپنی خالص اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر کسی ایسی تہذیب میں مدغم ہو جائیں گے جس میں اسلامیت اور غیر اسلامیت کا

امتیاز نہو اس سے زیادہ مشکل اور بداہتہً محال ہے مسلمان ایسی رواداری کہ جس میں مختلف و متضاد مذاہب کے لوگ امن و اطمینان سے زندگی بسر کریں اختیار کرنے اور برتنے کے لیئے نہ صرف تیار رہیں بلکہ ان کی قدیمی روایات اس کی شاہد ہیں اور اس کے خلاف ان کو کسی ایسی متحدہ قومیت کا درس دینا جس میں اسلامی تہذیب کے نقوش بھی مٹ گئے یا مٹا دیئے گئے ہوں نہ صرف فضول بلکہ فتنہ و فساد کی بنیاد ڈالنا ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی رپورٹ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں اُن میں سے منفصلۂ ذیل اُمور قابلِ ترمیم و اصلاح ہیں۔ اُن کی تفصیل سے پہلے ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ناقابلِ تزلزل عقیدہ اور یقین راسخ یہ ہے کہ ان کا دین اسلام ان کے ایمان اور اعمال اور معاشرت اور تمدنی زندگی کے تمام اصول و فروع کو حاوی ہے۔ ان کی اسلامی تہذیب ممتاز ہے اور اس کی حفاظت کے لیئے اسلامی کلچر کی حفاظت ضروری اور لازمی ہے۔ وہ ایک سکنڈ کے لیئے بھی اس کے لئے تیار نہیں کہ اسلامی تعلیم و تہذیب کو چھوڑ کر کسی دوسری تہذیب کو اختیار کریں۔ وہ سیاسی آزادی سے مذہبی آزادی کو اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کسی ایسی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں جو ان کے اسلامی عقائد یا اعمال یا معاشرت پر مخالفانہ اثر ڈالے ہندوستان میں آٹھ کروڑ یا ساڑھے سات کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اتنی بڑی قوم کی ضروریات کو نظر انداز کر کے کوئی حکومت سرسبز نہیں ہو سکتی اور تعلیم کا مسئلہ تو ایک بنیادی مسئلہ ہے جس پر قوم کے تمام ذہنی نشو و نما کا مدار ہے۔ اس لیئے کوئی تعلیمی اسکیم اس وقت تک مقبول اور کامیاب نہیں ہو سکتی جس پر مسلم قوم کے تعلیمی ادارے اور مذہب کے ماہرین اطمینان ظاہر نہ کریں۔

ہمیں افسوس ہے کہ واردھا تعلیمی اسکیم پر کسی ذمہ دار مذہبی مسلم تعلیمی ادارے کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور مسلمانوں کی مذہبی جماعت جمعیتہ العلما سے بھی استصواب نہیں کیا گیا یہ ایک اصولی غلطی ہے جس کا جلد از جلد ازالہ کر دینا لازمی ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اس اسکیم میں حسب ذیل امور کی اصلاح لازم ہے۔

(۱) لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم نہ ہو۔

(۲) جداگانہ لڑکیوں کے اسکول میں بھی لڑکی پر ۱۲ سال کی عمر کے بعد جبری حاضری کی پابندی قبول نہیں کیجا سکتی۔

(٣) مسلمان بچوں کو گانے بجانے اور تال سُر کی تعلیم نہیں دی جا سکتی

(٤) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو تصویر کشی یعنی جاندار کی تصویریں بنانا اور سیکھنا جائز نہیں

(٥) مسلمان لڑکوں کو اگر وہ جبری تعلیم کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر رہے ہوں جبری تعلیم سے مستثنے کر دینا لازمی ہوگا۔

ان کے علاوہ اس اسکیم میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہم ابتدائی تعلیم کے زمانے میں مذہبی تعلیم کے لزوم کو ضروری سمجھتے ہیں اور مسلمان لڑکیوں کے لیئے امورخانہ داری اور گھریلو صنعتوں کی تعلیم کا خاص انتظام چاہتے ہیں یعنی کورس کی ترتیب کے وقت اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ لڑکوں کا کورس لڑکوں کے مناسب حال ہو اور لڑکیوں کا کورس اُن کے لائق ہو۔ یہ بھی لازم ہے کہ تعلیم کی پوری اسکیم میں کوئی بات ایسی نئے جو مسلمانوں کے مذہب کے خلاف ہو۔ مثلاً کسی مجسمہ کی تعظیم کرانا یا غیر اسلامی طریق پر پیار تھا کرانا یا کوئی غیر اسلامی گیت گانا وغیرہ وغیرہ"۔

یہ تھی وار دھا تعلیمی اسکیم" کے متعلق سب کمیٹی کی رپورٹ اور اس کی سفارشات جس کو جمعیتہ مرکزیہ عمومیہ نے بلا کسی ترمیم کے منظور کیا اور قرار دیا کہ "اس اسکیم میں سب کمیٹی کی رائے کے موافق اصلاح و ترمیم ضروری ہے اور مسلمانوں کے لیئے کوئی تعلیمی اسکیم اُس وقت تک منظور نہیں کی جا سکتی جب تک وہ نقائص مذکورہ سے صاف نہ ہو۔

جمعیتہ علما کی اس تجویز سے سمجھا جا سکتا ہے کہ علماء کرام نے ربانی ہدایت کی روشنی میں جو طرز عمل انگریزی تعلیمی تحریک" کے بارے میں اختیار کیا تھا" جدید قومی تعلیمی تحریک" کے بارے میں بھی اُن کا وہی طرز عمل ہے۔

خیر! یہ بات تو ضمناً آگئی ورنہ عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ "ذمہ دار علماء کرام" نے جو روّیہ اب سے ساٹھ ستر برس پہلے "میکالے اسکیم" یا سر سید احمد خاں صاحب کی مخصوص تعلیمی پالیسی کے متعلق اختیار کیا تھا اُس میں جادۂ اعتدال سے انھوں نے سر مو تجاوز نہیں کیا، اور بعد کے واقعات اور اثرات و نتائج نے اُنہی کی رائے کی تصویب و تصدیق کی حتیٰ کہ جو طبقہ اُس وقت علماء کے مسلک کو جمود اور تنگ نظری پر مبنی کہہ رہا تھا خود اس کو رجعت کر کے اب اُس پالیسی کو اختیار کرنا پڑا جو علما نے اُس وقت اختیار کی تھی۔ ان سب چیزوں کے سامنے آجانے کے بعد بھی اُس رائے اور پالیسی کی وجہ سے علماء ہی کو مطعون کرنا صرف بے بصیرتی ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے

(باقی)

(بسلسلہ التعرف فی التصوف)

گزشتہ سے پیوستہ

ہندوستان میں اسلامی اقتدار اور حضرات چشتیہ

دودمان تغلق:۔

شمس سراج عفیف، مولف "تاریخ فیروز شاہی" ص۳۶ میں لکھتے ہیں "تغلق و ابوبکر و رجب تینوں بھائی علاء الدین کے زمانہ میں خراسان سے ہندوستان آئے۔ یہ لوگ نسلاً ترک، قوم قرونہ سے ہیں۔ جو سندھ اور ترکستان کے درمیان آباد تھی۔"

شیخ ابن بطوطہ (ص۳۱ ج۲) نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ تغلق تلاش معاش کے لیئے ترک وطن پر مجبور ہو کر سندھ آیا اور ایک تاجر کی گلہ بانی کرتا رہا۔ یہ علاء الدین کا عہد تھا۔ اور سلطان علاء الدین کا بھائی الماس خاں خطاب الغ خاں سندھ کا حاکم تھا تغلق گلہ بانی چھوڑ کر اُس کی پیادہ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ الغ خاں نے جوہر شریف اور مادۂ قابل دیکھ کر اس کی مربیانہ دستگیری شروع کی۔ اور جلد ہی اس کو امیر الخیل بنا دیا۔ بعد ازاں وہ علائی ملازمت میں آیا۔ اور شحنک بارگاہ (خاص محافظ فوج کا افسر) مقرر ہوا۔ بعدہٗ بالاستقلال ملتان جیسے مقام پر مغلوں کی روک تھام کے لیئے مامور رہا۔ اور اس کامیاب خدمت کے صلہ میں اُس کو غازی ملک کا خطاب ملا اور ملتان کے بجائے دیبال پور کا علاقہ اس کے سپرد ہوا جو ملتان سے زیادہ اہم تھا۔

سلطان قطب الدین غالباً علاء الدین سے بھی زیادہ اس کا مربی تھا۔ اس لیئے غازی ملک جہاں بھی اُن کا نام لیتا ہے نہایت احترام سے لیتا ہے۔ آخر رفتہ رفتہ وہ تخت و تاج علائی کا مالک ہوا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے اپنے بیٹے ملک فخر الدین جونا کو جو اس کی اولاد میں ارشد و اکبر تھا اور آثار جہانداری و جہانبانی اس کے ناصیہ سے ظاہر تھے الغ خاں کا خطاب دے کر اپنا ولی عہد بنایا۔

وفات برنی لکھتے ہیں کہ سلطان غیاث الدین کو جب لکھنوتی کی مہم پر خود جانے کی ضرورت پیش آئی تو اُس نے اپنے ولی عہد الغ خاں (محمد شاہ بن تغلق) کو وارنگل کی مہم سے جلد تر منگوا کر بحیثیت نائب دہلی چھوڑا اور خود لکھنوتی روانہ ہو گیا سلطان کی واپسی تک اُلغ خاں دہلی میں بیٹھا ہوا نہایت حسن انتظام اور خوش اسلوبی سے سلطنت کا کام انجام دیتا رہا (برنی ص۴۵۲ بعد) بعدہٗ جب سلطان غیاث الدین لکھنوتی کی مہم کے بعد یلغار کرتا ہوا دہلی کے قریب پہنچا تو الغ خاں نے افغان پور کے قریب ایک کوشک[1] بنوایا۔ کہ سلطان جریدہ آ رہا ہے۔ اولاً وہاں ٹھیرے اور وہ خود

[1] کوشک کی چھت گرنے سے سلطان کی موت واقع ہوئی لیکن بدنام کرنے والوں نے اس کوشک کے متعلق عجیب و غریب

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ ۵)

مع امراء استقبال کو جائے پھر سلطان شہر میں شان و شکوہ کے ساتھ داخل ہو۔ بادشاہ عصر کے وقت وہاں پہونچا الغ خاں امرائے کبار کو ساتھ لئے ہوئے پابوس ہوا۔ بادشاہ نے مع خواص کے ماحضر کھایا۔ لوگ ہاتھ دھونے کو باہر نکلے تھے کہ بجلی گری اور کوشک کی چھت آ رہی اور سلطان غیاث الدین مع پانچ سات آدمیوں کے دب کر مرگیا۔ ھ (برنی صفحہ ۴۵۲) یہ واقعہ ربیع الاول ۷۲۵ھ کا ہے۔ اسی سال سلطان المشائخ اور امیر خسرو کا انتقال بھی ہوا۔ مدت سلطنت چار سال و چند ماہ۔

با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

مولٰنا عبد القادر بدایونی اور فرشتہ کوشک کے گرنے اور سلطان کے فوت ہونے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

درمیان اہل ہند مشہور است کہ سلطان غیاث الدین تغلق باسلطان المشائخ چوں سوء مزاج داشت از راہ لکھنوتی پیغام بہ شیخ فرستاد کہ بعد از آنکہ من بدہلی رسم یا شیخ آنجا باشد یا من۔ حضرت شیخ فرمود "ہنوز دہلی دور است" وایں سخن از آں روز ضرب المثل گشتہ شہرت یافت۔

(ترجمہ) ہندوستان میں عام طور سے مشہور ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق شاہ نظام الاولیاء سے برہم رہتا تھا۔ جب ۷۲۴ھ میں لکھنوتی کی مہم سے فارغ ہوکر واپس آیا۔ تو راہ سے شیخ کی طرف پیغام بھیجا۔ کہ اب کے دہلی میں یا میں رہوں گا یا آپ! (قال اللہ تعالیٰ لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منہا الاذل) شیخ نے نہایت بے تکلفی سے فرمایا۔ "ابھی دلی دور ہے"۔ اس شہرۂ آفاق ضرب المثل ہیں

(بسلسلہ صفحہ گزشتہ) باتیں اختراع کیں۔ مقصد دراصل یہ تھا کہ کسی طرح سلطان محمد کو اپنے والد کے قتل عمد کا مجرم قرار دیا جاسکے۔ ابن بطوطہ صفحہ ۳۲ کا بیان ہے کہ یہ کوشک احمد بن ایاز امیر عمارت کی معرفت صرف تین روز میں اس ہنرمندی سے بنوایا گیا۔ کہ ایک خاص جگہ پر ہاتھی کھڑا کیا جائے تو اس کا بوجھ پڑتے ہی تمام مکان گر جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ سلطان اُس میں آکر ٹھیرا، خوان بچھا سب نے مل کر کھایا۔ جب فراغت ہوئی تو اُلغ خاں نے باپ کے سامنے بطور نذر ہاتھی پیش کرنا چاہا۔ ہاتھی کا پہونچنا تھا کہ مکان گرا۔ اور سلطان بمع اپنے فرزند عزیز محمود کے اس کے نیچے دب کر مرگیا ھ بعض نے لکھا ہے کہ چونکہ کوشک نو تعمیر شدہ اور وہ بھی تین روز کا بنا ہوا تھا۔ ہاتھیوں کی دوڑ دھوپ کی وجہ سے گر پڑا۔ مولٰنا بدایونی فرماتے ہیں کہ اس قسم کی بودا عمارت بنوانے سے کیا فائدہ۔ جو ہاتھیوں کے مظاہرے کا شکار ہوگئی۔ اور سلطان نیچے دب گیا۔ "صدر جہاں گجراتی سب سے زیادہ دور کی کوڑی لایا۔ لکھا ہے کہ چونکہ الغ خاں نے اس عمارت میں طلسم باندھا ہوا تھا اس لیئے طلسم کا ٹوٹنا تھا کہ چھت نیچے آرہی۔ ضیاء برنی نے جو سلطان محمد اور فیروز شاہ ہر دو کا مداح ہے اور ہر دو کا ہم عصر۔ پھر سلطان محمد شاہ کا خاص پروردہ نعمت (برنی صفحہ ۴۶۷) اور سترہ سال تین ماہ تک سلطان محمد شاہ کا ملازم بارگاہ رہا سفر ہو یا حضر (برنی صفحہ ۵۰۴) اور معاملات سیاسیہ میں مشیر خاص۔ پھر سفیر خاص تھا) (برنی صفحہ ۵۰۸ و صفحہ ۵۰۹ و صفحہ ۵۱۶ و صفحہ ۵۲۱) اور حاجی محمد قندھاری نے چھت گرنے کا سبب بجلی کو قرار دیا۔ اور یہی اقرب الی الصواب ہے۔ تفصیلات کے لیئے ملاحظہ ہو منتخب التواریخ بدایونی صفحہ ۲۲۴/۱ و فرشتہ صفحہ ۱۳۲/۱ ۱۲

(محمد نور الحق)

سلطان کی موت کا اشارہ تھا چنانچہ واقعہ کو شک پیش آیا (وہم مراد الحق فی اخراج الاعز الاذل)

وتغلق نامۂ امیر خسرو کہ آخریں تصنیف اوست بنام سلطان بموجب حکم او منظوم گشتہ۔ منتخب ص ۲۲۵/۱ وفرشتہ ص ۳۹۸/۲	حضرت امیر خسرو کا تغلق نامہ جو آپ کی آخری تصنیف ہے سلطان کے نام سے اسی کے حکم سے لکھا گیا ہ ص ۲۲۵/۱ و ص ۳۹۸/۲

سلطان عادل محمد شاہ بن تغلق غیاث الدین تغلق شاہ کی وفات کے بعد ۷۲۵ھ میں باتفاق امرا وارکان دولت "تغلق آباد" میں تخت نشین ہوا۔ چالیس روز تک غیاث الدین شہید کا سوگ منایا۔ ادھر دہلی کی تزئین وآئین بندی ہوتی رہی۔ چالیسویں دن بڑی شان وشوکت کے ساتھ تغلق آباد سے اندرون شہر آیا۔ داخلہ کے وقت زر وسیم کی اس قدر بے پناہ بارش برسائی گئی جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ یکسر قاصر ہے سلطان محمد کی تخت نشینی کا آغاز اس دھوم دھام سے ہوا کہ نہ اس سے پہلے کسی بادشاہ کو نصیب ہوا تھا نہ اسکے بعد کسی کو نصیب ہو سکا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو برنی ص ۴۵۶ بعد

سلطان نے اپنے عمزاد ملک فیروز کو اپنا نائب مقرر کیا۔

تاریخ کی سلطان سے بے انصافی خواجہ شیخ ضیاء الدین برنی، جو نہ فقط سلطان کے ہمعصر ہیں بلکہ اسکے پروردہ نعمت، درباری مورخ، ندیم خاص وسفیر ومشیر خاص سترہ سال وتین ماہ تک سفر وحضر میں ملازم بارگاہ رہے ہیں۔ سلطان کی تاریخ میں کچھ اس طرح از خود رفتہ اور مبہوت محض ہیں۔ کہ بارہا علی الاعلان کہا ہے کہ سلطان مجموعۂ اوصاف متضادہ، اعجوبہ آفرنش کردگار تھا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی دینداری کی، شجاعت وسخاوت، علم فضل وغیرہ اخلاق حسنہ کی تعریف وتوصیف کروں۔ یا اس کی خون آشامی اور سفاکی کی مذمت لکھوں۔ حیران ہوں، سراسیمہ ہوں۔ خوں ریزی اور ظلم ڈھانے "انا ربکم الاعلیٰ" کے دعوے میں اگر فرعون و نمرود کہوں تو اس کی اعلیٰ دینداری مانع آتی ہے۔ اگر اس کو اپنے وقت کا ابو یزید بسطامی کہوں تو اس کی سفاکی اور قساوت قلبی سد راہ ہے (برنی ص ۴۵۹) برنی نے سلطان کے تذکرہ میں عموماً آخر تک یہی رونا رویا ہے۔ شیخ برنی علاء الدین خلجی سے بھی بے انتہا ناراض ہے مگر اس کے عہد کے علماء ومشائخ وشعراء وغیرہ ماہرین علوم فنون کا تذکرہ اس نے خاص انداز سے کیا ہے لیکن سلطان محمد کے حالات میں اس کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ وہ زمانہ علم وفضل کے رو سے اتنا قحط زدہ ہو کہ تمام اہل علم وفضل اس کے عہد میں ایک ایک کر کے معدوم ہو گئے ہوں۔ چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر وغیرہ کو جو جیز مصر میں بیٹھے ہوئے نظر آتی

وہ محقق برنی کو سلطان کا ملازم بارگاہ ہوتے ہوئے نہیں سوجھتی۔ سچ ہے "نزدیکاں را بیش بود حیرانی"
(تصریحات ابن حجر آرہی ہیں)

تاریخ عمومی ہمیں بتلاتی ہے کہ سلطان نہ صرف سپاہی تھا بلکہ ایک جیّد عالم و باکمال فاضل بھی تھا بلکہ بالیقین سلطان موصوف ہندوستان کے تمام سلمان بادشاہوں میں سب سے زیادہ عالم تھا۔ کئی کتابیں اس کو ازبر تھیں۔ اس کی علمیت سے، اس کی بے پایاں فیاضیوں اور بے انداز عنایتوں سے توقع ہو سکتی ہے کہ اس کے دور میں ایک وسیع اور زبردست لٹریچر پیدا ہوا ہوگا اور جیسا کہ خود سلطان اپنی محیر العقول سیاسی تدابیر کا بانی اور مخترع ہے ایسا ہی اس نے ایک جدید وضع کے لٹریچر کی بھی پرورش کی ہوگی۔ برنی کا منصبی فرض تھا کہ وہ اس سے پردہ اٹھاتا۔ تاکہ کسی کو اس افترا پردازی کی جرات نہ ہوتی کہ "سلطان کے عہد کو لٹریچر کے لحاظ سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں"۔ بہت ممکن ہے کہ جلد آ جانے والے سیاسی انقلاب نے سب کچھ مٹا دیا ہو۔

ہمارے مشائخ کرام اور سلطان حضرت مولانا مہاجر عم فیضہم نے کتاب التمہید جلد دوم صفحہ ۳۲ میں سلطان کی متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

سلطان موصوف بہت بڑا انقلاب پسند تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انقلاب ہی تعلیم اسلام کی روح رواں ہے نیز اس کو علم تھا کہ تمام عالم میں انقلاب بپا کرنے سے اسلام کا مقصد[1] کیا ہے۔ وہ انقلاب اقتصادی اور اجتماعی کے من و عن سے بخوبی واقف تھا۔ بنا بریں چاہتا تھا کہ "ملتِ ہندیہ" کی اصلاح عمومی: انقلاب کے اصولوں پر ہونی چاہیئے۔ مگر ایک تو اس کے "نظریات انقلاب" بہت ہی اعلیٰ و ارفع تھے۔ دوسری طرف سوء اتفاق سے ارکین سلطنت ان نظریوں کو سمجھنے کے اہل نہ تھے۔ اس کی سیاسی تدابیر کے ادراک سے یکسر قاصر تھے۔ بنا بریں عموماً مخالفت کرتے تھے۔ سلطان اُن کی بے دماغی پر متاسف ہوتا اور سزا دیتا تھا۔ غرض اس طرح رائے عامہ سلطان کو سفاک اور ظالم کہتی تھی (ملاحظہ ہو تاریخ برنی صفحہ ۴۶۶ صفحہ ۴۸ بعد صفحہ ۵۰۰ - نور)

یہی وجہ ہے کہ سلطان کو اپنے اکثر نظریوں میں شکست کا سامنا ہوا۔ چونکہ اس کے سیاسی نظریات بہت دقیق اور گہرے تھے۔ اس لیئے مورخین نے بھی اُس کا مقصد نہیں سمجھا۔ اور طرح طرح کی خرافات جمع کر کے

[1] مساوات حقیقی قایم کر کے زیر دستوں کو زبردستوں کے چنگال ظلم و استبداد سے رہائی دینا۔ قیصریت اور کسرویت کو بیخ و بن سے اکھیڑ کر تمام امم و عالم میں قانون الٰہی کی ترویج و اشاعت۔ جو ہر گہ وہ کی دوا رجان ہے قیصریت و کسرویت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی توضیح ہم حکیم الہند امام ولی اللہ الدہلوی کے حالات میں بسط سے کریں گے۔ انشاء اللہ تعالٰے فانتظرہ ۱۲ محمد نور الحق غفرلہ العلوی

اس کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا"

کچھ آگے چل کر مولانا اسی کتاب میں فرماتے ہیں:۔

والمورخون عموماً ما ادركوا
مقصده، فيجمعون خرافاتٍ لايخلو
المجمع البشري منها ويزينونها في
انظار الناس لاثبات غلطات هذا
السلطان الذي لم يخرج من الهند
مثله ومن جاء بعده من السلاطين
كلهم عيالٌ عليه والعجب انه كيف
خرج مثل هذا السلطان من مثل مجتمع
الملة الهندية وانا لا ازال اعترف
بعظمة المجتمع العلائي. فالسلطانُ
انما اخذ العلوم من تلك الجماعة
ثم تمكن على ازمّة السلطنة الهندية
العظيمة. فادرك بفطانته ان هذا
القصر واهي الاساس وليس من البعيد
ان ياتي الطوفانُ الهوائيُ فيذهب
به هباءً. فلا يكفي هذا العلم الذي
ياخذونه من المشائخ، ويتقيّدون
برسومهم. ولا هذا الزهد و
التصوف، بل لابد من انقلاب
عظيم يشترك فيه الخاصّةُ
والعامّةُ. ويكون مطمح نظر

(ترجمہ) عام مورخین نے سلطان کے مقاصد کو
نہیں سمجھا وہ چند بے سروپا باتیں فراہم کرتے ہیں
جن سے کوئی انسانی اجتماع مبرا نہیں ہوسکتا پھر ان
خرافات کو بنا سنوار کر لوگوں کے سامنے اس لئے
پیش کرتے ہیں تاکہ اس سلطان کی غلطیاں ثابت
کریں جس کی نظیر ہندوستان نے آج تک پیدا
نہیں کی۔ اور بعد کے آنے والے تمام اکابر سلاطین نے
اسی کے نقش پا کا اتباع کیا اور کامیاب ہوئے مجھے
تعجب ہوتا ہے کہ خاک ہند اور ملت ہندیہ سے
ایسا عالی دماغ سلطان کیونکر پیدا ہوا۔ میں ہموارہ
سلطان علاء الدین خلجی کے دور، اور ان کی قایم کردہ
سپاہی و علمی جماعت کی عظمت کا معترف رہتا ہوں
سلطان محمد تغلق نے اسی جماعت سے علوم وفنون
رسمیہ سیکھے۔ فراغت کے بعد ہندوستان کی عظیم الشان
حکومت کی باگ ہاتھ میں لی اپنی خداداد ذہانت سے
سلطان معلوم کر گیا کہ اس محل کی بنیادیں کمزور ہیں۔
خطرہ ہے کہ کوئی طوفان آئے اور اس کو اڑالے جائے
بنا بریں یہ موجودہ علوم رسمیہ ناکافی ہیں۔ جو مشائخ زمانہ
سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ جن کا اثر یہ ہے کہ بس خاص
رسوم و عادات کی پابندی لازمی سمجھی جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس موجودہ
تصوف، اور ترک دنیا کے نکات دقیقہ بھی ناکافی ہیں بلکہ فوز و فلاح

الملة الاسلامية الهندية تبليغ الامانة
الاسلامية الى البلاد الصينية
والخطائية، وتكون لهم قوة
بحرية على سواحل الهند الجنوبي
ولا يكفي لمثل هذه الامور العظيمة
الذهب والفضة الموجودان في ايدي
الناس، فاستنبط اساس الاوراق المالية
التي نظم بها الاثر وباقتصادياتهم۔
والمورخون يضحكون منه ولا يقدرون
ان يطبقوا بين نظرياته، فينسبونه
الى نوع من الجنون، وكفى به
فخراً۔ وينسبون اليه انواع
الكفريات۔ حاشا لله انما
الغلط في التعبيرات۔ فالسلطان
كان عالماً بالعلوم العقلية و
النقلية ھ

کے لئے ایک انقلاب عظیم کی ضرورت ہے جس میں
عوام و خواص مساوی طور پر شریک ہوں۔
ملت ہندیہ اسلامیہ کا نصب العین صرف ایک نکتہ ہونا چاہیئے
وہ یہ کہ اسلام کی امانت کو سرزمین چین اور خطا تک پہنچا دیا
جائے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ ملت مسلمہ ہندیہ کے
پاس بحری قوت بھی ہو جس کا مرکز جنوبی ہند کے ساحل
ہوں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے عظیم الشان انقلاب اور مقصد کے
لیے ملت ہندیہ اسلامیہ کے پاس جس قدر سونا اور چاندی
موجود ہے ناکافی ہے۔ بنا بریں سلطان نے کرنسی نوٹوں کے اصول و
ضوابط اختراع کیے۔ یہ نوٹ وہی ہیں جن کے ذریعہ موجودہ یورپ
نے اپنے اقتصادیات کو بام آسمان تک پہونچایا ہوا ہے۔
مورخین سلطان کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ مگر خدا تعالیٰ
نے ان کو اتنی سمجھ نہیں دی کہ اس کے نظریوں کی
کوئی صحیح تاویل کر سکیں۔ وہ الٹا سلطان کو مجنون قرار دیتے
ہیں۔ حالانکہ یہ اسکے لیے باعث فخر ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں
بلکہ کئی ایک کفریات اسکے سر تھوپتے ہیں۔ خدا محفوظ رکھے۔
بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس کے مقاصد کی تعبیر میں غلطی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو ہر طرف غلط ہی غلط نظر آتا ہے ورنہ سلطان
علوم عقلیہ اور نقلیہ کا بہت بڑا عالم اور جامع تھا۔

تحصیل علوم و فنون تاریخ اس باب میں ہماری بہت کم رہنمائی کرتی ہے کہ سلطان نے کہاں پڑھا، کیا پڑھا، اور کن
کن اساتذہ سے پڑھا۔ البتہ تاریخ خواجہ برنی میں یہ تصریحات ذیل نظر آتی ہیں "شرائط تعظیم قتلغ خاں را ۔۔ کہ پیش او
در عنفوان شباب چیزے خواندہ بود، واو بر سلطان حق استاذی داشت۔ چناں محافظت نمودے و متابعت کردے
کہ ہیچ شاگردے ہیچ استاذے نکردہ باشد" ھ ص۵۰۶ و ص۵۰۵ استاذ کی قدر و منزلت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ تمام
جنوبی ہند کی حکومت سلطان نے قتلغ خاں کے حوالہ کر دی۔ وہ دولت آباد دکن میں ۔۔ جو سلطان کا دوسرا دار السلطنت تھا

نائب سلطان ہو کر حکومت کرنا اور سیاہ و سپید میں مختار محض تھا۔

قتلغ خاں کا خاندان دراصل غزنوی تھا۔ ہانسی میں آکر مقیم ہوا اور وہیں کا ہو رہا۔ سلطان قتلغ خاں کی انتہا تعظیم کرتا کہ بقول ابن بطوطہ جب قتلغ خاں بادشاہ کے دربار میں آتا تو وہ تعظیم کے لیئے کھڑا ہو جاتا اس لیئے وہ اشد ضرورت یا طلبی کے بغیر بادشاہ کے حضور میں نہ جاتا۔ تاکہ ناحق تکلیف نہ ہو۔

مزید براں بعض مورخین نے سلطان کے اساتذہ میں قاضی کمال الدین صدر جہاں (جو اہل علم کا اعلیٰ ترین منصب ہے) برادر قتلغ خاں کا نام بھی لیا ہے۔ کمال الدین علم و فضل میں قتلغ خاں سے فائق تر، او غیاث الدین تغلق ہی کے عہد سے صدر جہاں بن چکا تھا۔ بہر حال سلطان کے اساتذہ کا خاندان علم و فضل کی رو سے مشار الیہ خلائق تھا۔

"مزید براں سلطان محمد تغلق قاضی عضد الدین ایجی[1] را بدیار ہندوستان طلبیدہ و توشیح متن "مواقف" بنام خود التماس نمودہ بود و ہم مولانا معین الدین عمرانی را — کہ دانشمند عظیم و استاذ شہر بود — بہ قاضی عضد فرستاد تا بہند در آید ولے بادشاہ عصر وے او را نگذاشت کہ بر آید۔ لہذا قاضی فسخ عزیمت دیار ہند نمود" اخبار الاخیار ص ۱۶۶

سلطان فارسی زبان کا اچھا انشا پرداز تھا۔ اور سخن فہم ہونے کے ساتھ سخن سنج بھی تھا اساتذہ کے اشعار برمحل اپنے کلام میں تضمین کرتا "سکندر نامہ" اس کو ازبر تھا، مع ہذا، خوش تقریر شیریں بیان کہ سننے والے سیر نہ ہوتے تھے۔ پرگوئی کا یہ عالم کہ مضمون ختم ہونے نہ پاتا تھا۔ لکھتا تو نہایت پاکیزہ۔ غرض تقریر و تحریر ہر دو میں لاثانی تھا۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ عربی زبان میں اگرچہ روانی کے ساتھ تقریر نہیں کر سکتا تھا مگر اہل زبان کی تقریریں سمجھتا تھا۔ تاریخ کا شوقین، اور طب کا ماہر، اطبا سے مستعدانہ مباحثہ کرتا اور ملزم ٹھیراتا، سخت ترین امراض کا معالجہ کرتا تھا۔ فلسفہ کا عاشق تھا۔ دل و دماغ پر فلسفہ کا اس قدر اثر تھا کہ معقول کے خلاف کوئی بات نہ مانتا تھا شہزادگی ہی کے عہد سے اس کو فلسفیوں سے محبت تھی۔ سعد منطقی، عبید زاکانی شاعر، نجم انتشار، علیم

---

[1] قاضی القضاۃ عبد الرحمن بن احمد، المعروف بہ عضد الدین الصدیقی، الشافعی، الشیرازی۔ الایجی بکسر الہمزۃ۔ قریۃ قرب شیراز عقلیات کا امام۔ نقلیات کا ماہر۔ علوم عربیت کا فاضل۔ بڑا صاحب اقبال، او سرمایہ دار، کریم النفس سخی تھا۔ قاضی ناصر الدین بیضاوی کے شاگرد کا شاگرد۔ کرمان کا بادشاہ قاضی صاحب پر ناراض تھا اس لیئے اس نے قاضی صاحب کو قید خانہ میں ڈالدیا۔ اور وہ وہیں فوت ہوئے۔ سنہ وفات ابن سبکی نے ۷۵۶ھ لکھا ہے۔ اور ابن العماد نے شذرات میں ۷۵۳ھ۔ ومن انجب تلامذتہ السعد التفتازانی۔ قال التفتازانی لم یبق لنا سوی اقتفاء اثارہ۔ والکشف عن خبیات اسرارہ طبقات شافعیہ کبری ص ۱۰ ج ۶ و شذرات الذہب ص ۱۷۴ ج ۶ محمد نور الحق العلوی غفرلہ

سے بڑا ہی اُنس تھا۔ مولانا علیم الدین سرامد فلسفہ ہموارہ سلطان سے خلوت خاص میں ملتا رہتا تھا۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی "الدرر الکامنۃ" میں لکھتے ہیں۔

کان جواداً متواضعاً عالماً یحفظ کتاب الهدایۃ فی فقہ الحنفیۃ، و یشارک فی الحکمۃ وکان فی خدمتہ من الاطباء والحکماء والعلماء مالم یجتمع لغیرہ وکان یخطب لہ علی منابر الهند سلطان العالم اسکندر الزمان خلیفۃ اللہ فی ارضہ ھ منہ [۴۹]

(ترجمہ) سلطان محمد شاہ سخی، متواضع اور عالم تھا، فقہ حنفی کی کتاب "ہدایہ" اس کو ازبر تھی، فقہ کے علاوہ علوم حکمیہ میں بھی دسترس حاصل تھی اس کے دربار میں اس قدر اطبا اور حکما و علمائ مجتمع تھے جو کسی دوسرے کے یہاں دیکھنے یا سُننے میں نہیں آئے ہندوستان کے ممبروں پر بالفاظ ذیل اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا سلطان عالم سکندر زماں خدا کی سرزمین میں اُس کا نائب ھ منہ [۴۶]

شیخ ابن بطوطہ (ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم الطنجی) فرماتے ہیں ۔اُس کا دربار علما و فضلا کا مرکز و مجمع تھا غریب آتے تھے اور عزت میں عزیز تھے۔ پردیسی نوواردوں کے لیئے۔ پردیسی یا غریب کا لفظ استعمال کرنا منع تھا۔ وہ لوگ "اعزہ" کہلاتے تھے۔ سلطان کی سخاوت وعطا کے قصّے، اور اُس کی بے انتہا مہربانیوں کے واقعات کو لوگ مستحیلات سے سمجھیں تو اُن کی مرضی، مگر میں نے جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اُن کی تکذیب کیونکر کروں۔ اعزہ (پردیسیوں) پر اُس کے احسانات فی الواقع درجہ حیرت تک پہونچے ہوئے ہیں۔ ھ

طبیعت نہایت تیز تھی اور فہم نہایت دَرّاک۔ اسی لیئے کسی کی فہم کیاست کو خیال میں نہیں لاتا تھا۔ اور جو خود سوچتا دور کی سوچتا تھا۔ فراست میں اتنا بڑا ملکہ تھا کہ ایک ہی نگاہ میں آدمی کے علم وفضل، حسن و قبح کا اندازہ کرلیتا تھا سلطان کو عجیب وغریب اختراع کن طبیعت ارزانی ہوئی تھی۔ صلاح کاروں، تجربہ کار مشیروں کی اس کی دربار میں کمی نہ تھی اکثر مشورہ بھی کرتا لیکن جہاں داری کے کلیات و جزئیات جہانبانی کے چھوٹے بڑے مہمات کو اصحاب مشورہ کی صوابدید سے سرانجام نہیں دیتا تھا (کیونکہ وہ لوگ اس کی عالی پردازی تک پہونچنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ نور) بلکہ جو اُس کی رائے صائب میں مناسب نظر آتا وہی کر گزرتا تھا۔ اس کے زور طبع اور قوی حجت کے سامنے سب آمنا و صدقنا کہتے تھے (منہ [۲۶] بعد برنی) اپنی مذکورہ بالا طباعی، بلند خیالی عالی پروازی کے پیش نظر چاہتا کہ اور بھی ایسے ہی بلند خیال ہوں اور اُس کی بلند خیالی اور عالی ہمتی کے موافق کام کریں۔ اسی لیئے جو خیال بھی دل میں آتا لوگوں سے اس کی تعمیل کی توقع رکھتا اور جب وہ متعذر یا متعسر تجاویز پوری نہ ہوتیں

تو اس عدم امکان یا عدم حصول کو سرکشی، بے اعتنائی، نافرمانی سے تعبیر کرتا اور سخت سزا دیتا تھا ھ برنی ص۴۹۶

سخاوت و کرم

سخاوت اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ گو اس وقت اُس کی سخاوت کے واقعات افسانے معلوم ہوتے ہیں مگر اس قدر متواتر روایات تائید کرتی ہیں کہ شک و شبہ کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔ شب و روز اس کی سخاوت کا ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ پھر ہزاروں کیا، لاکھوں کروڑوں کی داد و دہش اس کے نزدیک کوئی بات نہ تھی اتنا دیتا کہ سائل مبہوت و ششدر رہ جاتا۔ سائل کو اس کی اولاد، اس کی نسل تک کو بے پروا کر دیتا تھا۔ لینے والے سیر ہو جاتے مگر وہ سیر نہ ہوتا۔ خراسان و عراق و ماوراء النہر و خوارزم و سیستان، و مصر و دمشق سے سائل آتے، اور مال و اسباب سے مالا مال ہوتے تھے اس کی نظر جہاں بخش میں زر و نقرہ، جواہر و مروارید سنگریزوں سے بھی کمتر تھے۔ مسافر سائلوں کو، نو وارد محتاجوں کو جاگیریں اور ولایتیں دینا اس کا معمولی مشغلہ تھا۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو تاریخ برنی ص۴۶۰ و ص۴۶۱، ص۴۶۲۔ نیز سفرنامہ ابن بطوطہ، فانہ لایدرک شاؤہ فیہ۔

شجاعت

صف شکنی میں سلطان محمد، اُس کا والد، اور اُس کا چچا ہند و خراسان میں ضرب المثل تھے۔ سپاہ گری سلطان کے رگ و ریشہ میں ساری تھی۔ شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، شہسواری اُس کے بائیں ہاتھ کے کرتب تھے۔ شجاع و دلیر ایسا کہ یکہ و تنہا لشکر پر ٹوٹ پڑتا تھا۔ درحقیقت ہونا بھی ایسا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ غازی ملک کا فرزند تھا اور مغلوں کی ہنگامہ آرائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے تھا۔ برنی فرماتے ہیں "فی الجملہ سلطان محمد اگر در سخاوت آمدے، صد حاتم را بسائلے بخشیدے۔ واگر در عزم جہانگیری پائے در رکاب نہادے خراسان و عراق در زلزلہ افتادے و ماوراء النہر و خوارزم در ہزاہزا شدے ھ ص۴۶۴

دینداری

مذہبی اعمال کا نہایت شد و مد سے پابند تھا۔ اعمال کے مقابلہ میں فلسفہ کو بھی سفسطہ سمجھتا تھا۔ اذان کی آواز سنتا تو کھڑا ہو جاتا اور تا ختم اذان برابر کھڑا رہتا۔ نماز ہائے پنجگانہ ادا کرتا۔ جمعہ اور جماعت میں بالالتزام حاضر ہوتا تھا، بعد از نماز صبح دیر تک اوراد و وظائف کی تلاوت کرتا، الغرض اوامر شرعی کا پابند اور نواہی سے مجتنب تھا۔ نہ کبھی شراب کو چھوا۔ اور نہ کبھی فسق و فجور کے پاس پھٹکا۔ مسلمانوں کو حکماً مذہبی احکام کی پابندی کی تاکید تھی۔ چنانچہ سات کس کو بے نمازی کے جرم میں قتل کیا گیا۔ نماز کے وقت ایک خاص گروہ بازاروں میں پھر کر لوگوں کو نماز کے لئے لاتا۔ اگر کوئی نماز کے وقت غافل پایا جاتا تو سزا کا مستحق ہوتا۔ تا آنکہ اس سے شاہی نوکر چاکر بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ ضروریات تعلیم کا خاص اہتمام و انتظام تھا۔ عوام کو حکم تھا کہ فرائض وضو فرائض نماز و شرائط اسلام سیکھیں پھر اُن کا اس بارہ میں امتحان لیا جاتا۔ اگر کوئی ناکام ہوتا تو سزا پاتا تھا۔ ھ ابن بطوطہ ص۱۵۱

محل سرا میں بھی جاتا تو خواجہ سرا آگے آگے ہوتے۔ اور سلطان کی آمد کی اطلاع دیتے۔ یہ اہتمام صرف اس لئے تھا کہ کسی نامحرم پر نظر نہ پڑے ﴿ برنی ص۴۶۲ وص۴۶۵ دینداری اور اتباع شریعت کے لئے سلطان نے تمام ٹیکس منسوخ قرار دیئے اور صرف زکوٰۃ و عشر وصول کرنے کا حکم دیا ﴿ ابن بطوطہ ص۵۱۱

دربارِ خلافت سے عقیدت

اس کی سلطنت کے آغاز (۷۲۵ھ) سے بہت پہلے ۶۵۶ھ میں بغداد کی خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جب خلافت عباسیہ[۱] پھر از سرِ نو مصر میں قایم ہوئی اور سلطان کو خلافت کی عقیدت کا خیال سر میں سمایا۔ تو خلیفہ کے ساتھ جس طرح فرطِ عقیدت کا اظہار کیا وہ نطاقِ بیان سے بالا تر ہے ۷۴۲ھ کے حوالی میں سلطان کو خیال آیا کہ بلا اجازت خلیفۂ وقت (عباسی) سلطنت اور حکومت شرعاً ناجائز ہے منشور خلافت کے بغیر جس قدر سلاطین اسلام گزرے یا آئینگے، وہ از روئے قواعد شرع متغلب ہیں۔ اس خیال آنے پر سلطان نے حنفی مذہب کی پیروی کرتے ہوئے نماز جمعہ و عیدین موقوف کردیں تا وقتیکہ خلیفہ کی طرف سے کوئی صریح اجازت نہ آئے۔ اس کے علاوہ سکّے سے اپنا نام دور کرکے اس کے بجائے خلیفہ کا نام جاری کرایا، پھر سلطان نے غائبانہ اپنی طرف سے، اور اپنے ارکین دولت کی طرف سے خلیفہ سے بیعت کی۔ ان امور سے فراغت کے بعد مصر میں خاص قاصد بھیجا۔ عرضداشت میں علاوہ اظہارِ عقیدت و اطاعت کے بہت سے امورِ ملکی کی اطلاع دی اور مشورے طلب کیئے۔ ۷۴۴ھ میں پہلی بار حاجی سعید مصری (منتخب) یا صرصری (برنی) سلطان کیلئے خلیفہ کی طرف سے "منشورِ نیابتِ خلافت"، اور لواء و خلعت لایا۔ سلطان نے امراء، ارکین دولت، سادات و مشائخ، علماء و اکابر کو لے کر، پا پیادہ اور پا برہنہ حاجی سعید کا شایان شان استقبال کیا۔ حاجی مذکور کے

---

[۱] ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں نے ابن علقمی بدطینت کی سازش سے بغداد پر آخری حملہ کرکے مستعصم باللہ آخری تاجدار عباسیہ کو قتل کرکے اس خلافت کا عراق سے خاتمہ کیا۔ جو (۵۲۴) سال تک قائم رہی، بعدہٗ تین سال تک خلافت قایم نہ ہو سکی ﴿ مراۃ الجنان یافعی ص۱۳۹ مصر میں اس وقت مالک بحریہ کی حکومت قایم تھی۔ اور اُن کا فرماں روا المنصور نور الدین علی پسر المعز عزالدین ایبک سریر آرا تھا۔ جس کی حکومت (۶۵۵) سے لے کر (۶۷۵) تک رہی ﴿ محاضرات ص۲۸۳۔ ۶۶۰ھ میں مستنصر باللہ احمد پسر الظاہر باللہ ولد الناصر العباسی مصر آیا۔ مصریوں نے اُسکے لئے مجلس عامہ منعقد کی۔ سب سے پہلے ملک ظاہر نے بعدہٗ اعیان دولت نے اُس سے بیعت کی۔ اور اپنے اُن بھائی خلیفۂ بغداد مستنصر کے نام پر اس کا لقب بھی مستنصر تجویز ہوا۔ مستنصر۔ منصور خلیفہ بغداد پسر الظاہر، بعد وفات والد خود ۱۳ رجب ۶۲۳ھ کو خلیفہ ہوا۔ اور ۶۴۰ھ کو فوت ﴿ محاضرات ص۴۷۹) بعد انتقال مستنصر خلیفۂ مصر نے لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائی اور خطبہ دیا۔ مستعصم باللہ خلفاء عباسیہ کا (۳۷) واں اور مستنصر (۳۸) واں خلیفہ ہے۔ بعد ازاں وہ بہت جلد تاتاریوں کے ہاتھ سے قتل ہو گیا ﴿ مراۃ الجنان ص۱۵۲ یوں خلافت کا مصر میں احیا ہوا۔ اور یہ تھی اُس وقت خلافت کی حقیقت سبحان من لایزول ملکہٗ ۱۲

محمد نور الحق

پاؤں پر بوسہ دیا۔ اور خود اس کی رکاب تھامے ہوئے ساتھ ساتھ چلا۔ منشور مذکور، اور خلعت وغیرہ کو سر پر اٹھا کر وہ تعظیم کی جو الفاظ و قلم کے احاطہ سے باہر ہے ۔ شہر میں جشن عام منایا گیا۔ اس کے بعد پہلے جمعہ میں خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس تاریخ سے از سرِ نو نماز جمعہ اور عیدین کی اجازت ہوئی۔

اس کے جواب میں سلطان نے حاجی رجب برقعی کو خلیفہ کی خدمت میں بے بہا خزانے دے کر مصر روانہ کیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اگر راستے زیادہ پُرامن ہوتے تو بعید نہ تھا کہ سلطان اپنے تمام تر خزانے مصر بھیج دیتا دربار خلافت سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ "بے فرمان خلیفہ آب نخوردے۔" برنی صفحہ ۴۹۳ خلیفہ عباسی را بندہ ترین ہمہ بندگان بود بے فرمان او دست دوا مورا و لوالامری نزدے۔ برنی صفحہ ۴۶ حاجی برقعی کے ارسال سے دو سال بعد شیخ الشیوخ مصر، حاجی برقعی کی معیت میں خلیفہ کا منشور خلافت، خلعت و لواء لیکر آیا۔ سلطان نے پیادہ پا کافی دور سے اُن کا استقبال کیا ہر دو کے پاؤں پر بوسے دیئے اور ان کے قدموں پر اپنی آنکھیں ملیں۔ پھر منشور خلافت کو سر پر اُٹھائے بارگاہ شاہی تک پاپیادہ آیا۔ اس دفعہ پھر سلطان نے اراکین و خواص دربار سے منشور خلیفہ کی بیعت لی۔ شیخ الشیوخ کی روانگی پر بے انداز زر و جواہر مصر روانہ کیئے۔

خلیفہ کے ساتھ والہانہ محبت و عقیدت کی یہ حالت تھی کہ خلیفہ کا نام سُن کر زندہ ہوتا۔ "منشور خلافت" کو سامنے رکھ کر حکمرانی کرتا۔ اور شاہی فیصلوں میں عموماً لکھتا کہ خلیفہ اسلام یوں حکم دیتا ہے۔

اس کے علاوہ دو تین مرتبہ اور بھی بہرائچ اور کنبایت میں ماسیر خلیفہ آئے۔ ایک بار مخدوم زادہ بغدادی بہرائچ اور کنبایت میں آیا سلطان نے پالم تک اُس کا استقبال کیا اور وہ بھی پاپیادہ چل کر۔ لکھوکھا روپیہ اسکی نذر کیا اور دربار کی طرف سے اس کو "مخدوم زادہ" کا خطاب دیا۔ جب مخدوم زادہ مذکور سلام کے لیئے دربار شاہی میں آتا تو سلطان تخت سے اُتر کر چند قدم چل کر استقبال کرتا اور اس کے سامنے جبین خاکِ نیاز پر جھکا کر تعظیم بجالاتا۔ سلطان جیسی عظیم المرتبت ہستی کے ان حالات کو دیکھ کر جن و انس انگشت حیرت بدنداں تھے۔ برنی صفحہ ۴۹ تا صفحہ ۴۹۶ و منتخب صفحہ ۲۳۲ وبعد۔

ارادت بامشائخ کرام

۷۴۲ھ میں حاکم ملتان ملک بہرام ایبہ کشلو خاں برادر خواندہ سلطان نے ملتانیوں کے بل بوتے پر علم بغاوت بلند کیا۔ اطلاع پاتے ہی فوراً سلطان دولت آباد سے دہلی آیا اور جرار فوج لے کر زود تر ملتان پہونچا۔ جنگ ہوئی مگر بہرام ایبہ پہلے ہی حملہ میں قتل ہوگیا۔ اُس کی فوج شکست کھا کر کچھ نذر تیغ و تفنگ ہوئی اور کچھ حوالہ بند و زنجیر۔ بعد ازاں سلطان نے چاہا کہ مارشل لا نافذ کر کے ملتانی باغیوں کو

قتل عام کرائے اور ان کو بغاوت کا مزہ چکھائے۔ حضرت شیخ رکن الدین نبیرۂ شیخ الشیوخ بہاء الدین ذکریا ملتانی باشندگان ملتان کی سفارش اور ان کی معافی تقصیرات کے لیئے دربار شاہی میں تشریف لائے اور سلطان سے معافی کی التجا کی۔ شیخ کی شفاعت پر سلطان نے تمام باغیوں کو یکسر معاف کر دیا۔ ھ برنی ص۴۷۹ و منتخب ص۲۲۶

(۲) سلطان علاء الدین خلجی کے حالات میں گزر چکا ہے۔ کہ سلطان محمد عادل، شیخ علاء الدین کا مرید و معتقد تھا۔ اس نے شیخ کے مزار پر عالیشان گنبد تعمیر کرایا تھا ھ اخبار الاخیار ص۱۰۸

(۳) مزید براں سلطان کو حضرت سید جلال الدین بخاری عرف مخدوم جہانیان متوفی ۷۸۵ھ سے خاص عقیدت تھی۔ سلطان نے اُن کو شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔ اور سیدون، سندھ کی خانقاہ محمدی بمع جاگیر اُن کے حوالہ کی ھ اخبار الاخیار ص۱۶۳

(۴) محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ شیخ قطب الدین منور (خلیفہ اعظم سلطان المشائخ) کو ایک دفعہ سلطان محمد تغلق نے دربار شاہی میں طلب کیا۔ جب شیخ قریب دربار آئے تو اس خیال سے کہ اُن کے لیئے کھڑا ہونا نہ پڑے اور ان سے احترام کے خیال کا قلع قمع ہو خود اُٹھ کر کمان ہاتھ میں لیئے نشانہ بازی کرنے لگا۔ لیکن شیخ پر نظر پڑتے ہی تمام کر و فر کافور ہوئی اور کامل تعظیم و احترام سے پیش آیا۔ مصافحہ کے لیئے بڑھا۔ شیخ نے اُس کا ہاتھ نہایت زور سے دبایا۔ چنانچہ سلطان پہلی ہی ملاقات میں سخت ترین معتقد ہو گیا ھ ص۱۰۱

(۵) سلطان کا ارادہ تھا کہ خراسان و ترکستان کی تسخیر کر کے اولادِ چنگیز کو ہمیشہ کے لیئے وہاں سے نکال دیا جائے جو آئے دن ہندوستان کے لیئے باعث زحمت بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ سلطان نے اس مقصد کے لیئے ایک دربار عام منعقد کیا۔ جس میں مولانا فخر الدین زرداری (از اعاظم خلفاء سلطان المشائخ) اور مولانا شمس الدین یحیی، اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کو خاص طور پر مدعو کیا بعدہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم اولاد چنگیز کو فنا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں آپ ہم سے اس کام میں موالات کریں۔ مولانا فخر الدین نے جواباً کہا کہ انشاء اللہ ہم سب حاضر ہیں۔ اخبار الاخیار ص۱۰۴

الغرض کشف اور حکومت ہر دو برسر صلح ہیں اور دونوں باہم مل کر ایسے اہم امور کا فیصلہ کرتے ہیں۔ حکومت کو باایں غرور و فورکشف کے سامنے سرنیاز خم کیئے بن آتی ہے۔ کیونکہ حکومت ہر چند منظم اور طاقتور، سخت گیر کیوں نہ ہو، اس کا اثر و اقتدار صرف ظاہری ہوتا ہے اور کشف کا قبضہ قلوب بنی نوع پر فالفرق ظاہر

ایذاء مشائخ اور سلطان

محدث دہلوی، شیخ صلاح الدین درویش (خلیفہ شیخ صدر الدین)

کے حالات میں لکھتے ہیں کہ آپ خواجہ نصیرالدین محمود کے ہمعصر اور ہمسایہ تھے۔ سلطان محمد تغلق خواجہ نصیرالدین کو اذیتیں پہونچاتا۔ مگر وہ کشادہ پیشانی سے سب کچھ اس لیئے برداشت کرتے کہ پیرومرشد نے اُن کو اس کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ سلطان الاولیا کے الفاظ یہ ہیں" ترا میان خلق می باید بود وقفائے وجفائے خلق می باید کشید و بذل وعطامی باید کرد"۔ لیکن شیخ صلاح الدین سلطان سے سخت کلامی کرتے۔ آپ ملتان سے دہلی آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کا مزار شیخ نصیرالدین کے مزار کے پاس ہے۔ انبار ص۳

(۲) شیخ نصیرالدین محمود اپنے عہد کے قابل احترام اور بلند پایہ ہستی تھے۔ مگر سلطان محمد شاہ عادل آپکو دق کیا کرتا تھا سفر میں ساتھ رہنے کی تکلیف دیتا۔ حد ہے کہ ایک مرتبہ اُسنے شیخ کو اپنا جامہ دار مقرر کیا۔ لیکن شیخ ان تمامتر تکالیف، اور دور از طبع امور کو کشادہ پیشانی سے برداشت کرتے اور اُف تک نہ کرتے تھے کیوں کہ سلطان المشائخ نے اُن کو اس بات کا خاص طور پر حکم دے رکھا تھا۔ اخبار الاخیار ص۹۱-۹۲ و فرشتہ ص$\frac{299}{2}$

اس کی حکمت اور نظریۂ تقاعد

ہمارے خیال میں اس ایذا کی حکمت جس کو مورخین کے زور قلم نے اور عوام کی اُس بے پناہ عقیدت نے جو اُن کو صوفیہ علیہ سے تھا۔ بہت زیادہ نمایاں کردیا ہے۔ یہ ہے کہ سلطان چونکہ زبردست مجاہد تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اُن تمام ممالک کی تسخیر کی جائے جہاں اب تک اسلام کی دعوت نہیں پہونچی یا جہاں سے "اسلام آباد ہند" پر حملوں کا آئے دن اندیشہ رہتا ہے اپنے وہ نظریۂ تقاعد کا یکسر خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ تصوّف کا غلو، اور تقاعد مذکور باہم لازم وملزوم ہیں۔ غالباً اسی لئے سلطان المشائخ نے خواجہ نصیرالدین کو ایسے تمام امور کے برداشت کرنے کی تلقین فرمائی تھی۔ نیز مولنا شمس الدین یحیی کے واقعہ سے بھی (جو ذیل میں مذکور ہوگا) اس کا مزید ثبوت بہم پہونچتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ سلطنت جو تصوّف کے سایہ میں قایم ہوئی۔ وہ تو شب وروز کفار سے جہاد کرنے میں منہمک رہے مگر تصوّف وروحانیت کا مشغلہ فقط نفس امّارہ سے برسر پیکار رہونا رہجائے۔ حضرت سلطان المشائخ نے ایک روز ایک محفل میں جس میں خواجہ نصیرالدین، مولنا حسام الدین، مولنا جمال الدین نصرت خانی، مولنا شرف الدین وغیرہ اکابر موجود تھے۔ فرمایا "اگر کسے صائم باشد، وشب قائم، وکار بیوہ زنے کردہ باشد۔ این مقدار ہر بیوہ زنے کہ ہست میتواند کرد۔ اما مشغولی کہ بندگان خدا تعالیٰ می کنند وبداں مشغولی بخدا تعالیٰ رسیدہ اند۔ جز ایں مشغولی ہست"

اخبار الاخیار ص$\frac{293}{2}$ فرشتہ ص۱۰۲

شاہ عبدالعزیز صاحب "بستان المحدثین" میں فرماتے ہیں "امام عبداللہ بن مبارک نے اپنی تمامتر عمر سفر میں

صرف کردی، ایک سال حج، ایک سال جہاد، ایک سال تجارت کرتے تھے تاآنکہ دُنیا سے رخصت ہوئے۔

حضرت فضیل بن عیاض نے کہا قسم بنام رب کعبہ! میں نے ابن مبارک کی نظیر نہیں دیکھی۔ ابن خلکان وغیرہ نے لکھا ہے کہ خواجہ فضیل بن عیاض سید الصوفیہ والمحدثین، آخری دور حیات میں سب کچھ چھوڑ کر کعبہ میں خلوت گزیں ہوگئے تھے۔ فضیل بن عیاض جیسی زبردست شخصیت کا گوشہ گیری پر قناعت کرلینا ابن مبارک جیسے مرد مجاہد کو نہ صرف تعجب انگیز معلوم ہوا۔ بلکہ اس سے یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ مبادا کہیں بعد میں اس کو غلط استعمال نہ کیا جائے اسپر آپ نے حضرت خواجہ کو ایک تاریخی خط لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔ اس خط میں امام نے اُن نتائج کی طرف اشارے کیے ہیں۔ جو مستقبل میں تحریک تقاعد سے پیدا ہوسکتے تھے۔ جن کو تکاسل، تقاعد، سہل انگاری، مطالعہ مستقبل سے غفلت سیاسیات عالم سے (باوجود ادعائے خلیفۃ اللہ ہونے کے) علماً وعملاً بے خبری، بلکہ نفرت، سرفروشی سے کنارہ کشی، بے حسی وغیرہ القاب سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جو آخر چل کر صحیح ثابت ہوئے۔

حافظ امام عماد الدین ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ (شذرات) سورۂ آل عمران کی آخری آیت کے تحت میں روایت کرتے ہیں "محمد بن ابراہیم نے کہا میں حج کرنے کے لیئے جب گھر سے نکلا تو امام عبداللہ بن مبارک سے آخری ملاقات کی آپ نے مجھے چند اشعار لکھوائے اور فرمایا کہ فضیل بن عیاض کو مکہ معظمہ میں جاکر سنا دینا۔ یہ ۱۷۰ھ اور بقول بعض ۱۷۹ھ کا واقعہ ہے۔

(۱) یا عابد الحرمین لو ابصرتنا
لعلمت انک فی العبادۃ تلعب

(ترجمہ) (۱) اے حرمین کے مجاورو! اگر کہیں تو ہمارے کارنامے دیکھ پاتا تو یقین کرلیتا کہ تیری عبادت حظ نفس ہے۔

(۲) من کان یخضب خدہ بدموعہ
فنحورنا بدمائنا تتخضب

(۲) تم سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا ہے کہ رو رو کر رخساروں کو آنسوؤں سے ترکرلو۔ مگر ہمیں دیکھیے کہ دشمن کا وار کھاکر سینے خون آلود ہیں۔

(۳) او کان یتعب خیلہ فی باطل
فخیولنا یوم الصبیحۃ تتعب

(۳) یا یہ کروگے کہ کبھی سجدہ ریائی کے لیے پیشانی زمین پر رکھدی۔ لیکن ہم جنگ کی صبح اپنے گھوڑوں کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔

(۴) ریح العبیر لکم، ونحن عبیرنا
رھج السنابک والغبار الاطیب

(۴) تمھیں عنبر کستوری، عطر وغیرہ کی خوشبو مبارک ہو۔ ہمارے لیئے تو جنگی گھوڑوں کی ٹاپوں کی مقدس خاک عبیر ہے۔

(۵) وَلَقَدْ آتَانَا مِنْ مَقَالِ نَبِيِّنَا قَوْلٌ صَحِيحٌ صَادِقٌ لَا يُكْذَبُ	(۵) نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث ہم تک پہونچی ہے۔ جس کی صحت میں ذرہ بھر شبہ نہیں۔
(۶) لَا يَسْتَوِي غُبَارُ خَيْلِ اللهِ فِي اَنْفِ امْرِءٍ وَدُخَانُ نَارٍ تَلْهَبُ	(۶) حضور نے فرمایا: ناممکن ہے کہ میدان جہاد کی گرد جس ناک میں گھسی ہو وہاں دوزخ کی بھڑکتی آگ کا دھواں گھس سکے
(۷) هٰذَا كِتَابُ اللهِ يَنْطِقُ بَيْنَنَا لَيْسَ الشَّهِيدُ بِمَيِّتٍ لَا يُكْذَبُ	(۷) یہ کتاب الٰہی ہم میں اور تم میں حکم ناطق ہے جس میں تصریح ہے کہ شہید کو مُردہ کہنا بھی ناجائز ہے۔

واضح ہے کہ امام نے ان اشعار میں تلّی اور مذہبی زندگی کا راز بتایا ہے کہ وہ قوت اور سرفروشی ہے نہ کہ محض خلوت گزینی۔

محمد مذکور فرماتے ہیں میں نے یہ خط خواجہ صاحب کو مسجد حرام میں دیا۔ آپ پڑھ کر بہت روئے اور فرمایا امام سچ فرماتے ہیں اور انھوں نے مجھے نصیحت کی ہے۔

فریضۂ تبلیغ و اشاعت اسلام اور سلطان محمد عادل

علاوہ مذکورۂ بالا اخلاق حسنہ اور اعمال سینہ کے سلطان محمد عادل کو تبلیغ اسلام اور اُس کی اشاعت کا خیال بھی رہتا تھا۔ اس کے لئے ہم صرف ایک واقعہ کے ذکر پر اکتفا کریں گے حضرت محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں نقل کیا ہے۔

نقل است کہ سلطان محمد تغلق اندر آنچہ تیغ سیاست وقہر بر خلائق، خصوصًا بر طائفہ صوفیہ آختہ بود، مولانا شمس الدین یحییٰ کہ وے از اعاظم خلفائے سلطان المشائخ است طلبید و گفت بمثل تو دانشمندے ایں جا چہ کند در کشمیر برو۔ و در بت خانہ ہائے آں دیار بنشیں۔ و خلق خدا را باسلام دعوت کن۔ مولنا از پیش سلطان برائے تہیا اسباب سفر بر آمد۔ فردائے آں روز بر سینہ او دنبلے بر آمدہ بیمار شد۔ و در ہمیں اثنا ازیں عالم رحلت کرد قبر او در چونزہ است ھ منہ	(ترجمہ) تاریخ میں مذکور ہے کہ چونکہ سلطان محمد شاہ نے تمام مخلوقات پر علی الخصوص مشائخ صوفیہ پر شمشیر سیاست بے نیام کی ہوئی تھی۔ اس نے ایک روز مولنا شمس الدین یحییٰ کو جو خلیفہ اعظم سلطان المشائخ کو بلا کر کہا کہ آپ جیسا دانشمند یہاں بیٹھ کر کیا کر رہا ہے کشمیر تشریف لے جائیے اور اس سرزمین کے بُت خانوں میں بیٹھ کر خلق خدا کو اسلام کی دعوت دیجئے۔ مولنا سلطان کا حکم سنکر سفر کی تیاری کیلئے گھر آئے اتفاقاً دوسرے روز آپکے سینہ میں پھوڑا نکل آیا جس سے آپ بیمار پڑ گئے اور اسی حالت میں آپکا انتقال ہوگیا۔ آپکا مزار چونترہ میں ہے۔

اختراع قوانین ملکیہ

قوانین سیاسیہ کی وضع اور اختراع میں جیسے اوپر مذکور ہوا سلطان کو ملکۂ خاص حاصل تھا۔ ارسطو اور نظام الملک طوسی اگر اسکے عہد میں زندہ ہوتے تو سلطان کی قوت اختراع اور غائر نظری کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہ۔ برنی ص ۴۶۲

اسلوب۔ زراعت سلطان نے عملی طور پر بہت سی اختراعات کی ہیں منجملہ اُن کے اُس نے زراعت کو ایک مستقل فن قرار دے کر اُس کے متعلق خود قوانین و ضوابط وضع کیئے۔ شب و روز زراعت و کاشتکاری کو کار آمد بنانے کے وسائل سوچتا۔ اور جو نکتہ سمجھ میں آتا اُس کو لکھ لیتا تھا اُس کا نام اصطلاحاً "اسلوب" تھا۔ خواجہ برنی لکھتے ہیں "ہر چہ در ازدیادِ زراعت در ضمیر و تصور سلطان می گذشت و در قلم می آمد آں را "اسلوب" نام مے شد۔ اگر آں اسالیب منصورہ واقع شدے، و خلق را از محالات ننمودے، از ازدیادِ زراعت و حیثیت زراعت جہاں پُراز نعمت ہائے گوناگوں گشتے، و در خزائن گنج ہا جمع آمدے" صفحہ ۴۹۸ برنی

افسوس کہ انقلاب زمانہ۔ اور مورخینِ عہد سلطان کی سہل انگاری، بلکہ سطحی فہم و کیاست نے اس متاع گراں کی تفصیلات دیکھنے سے ہمیں محروم کر دیا ہے جس کے اندر اس عالی دماغ شہنشاہ ہند کے ذہن رسا کے نتائج پنہاں ہیں۔ جس قدر سلطان فکر رسا اور دماغ فلک پیما رکھتا تھا۔ اسی قدر بشومیِ قسمت سے اراکین دربار، وقائع نگار اور عام رعایا کودن، اور بے حس تھے ہر اعلےٰ قانون کو ناممکن العمل قرار دے کر نافرمانی پر اُتر آنا ان خردماغوں کا مشغلہ شب و روز تھا۔ اس کا اثر اُس عہد کے مورخین پر بھی لازمی طور پر پڑا۔ محقق ضیاء الدین برنی جیسا زلہ ربا، مقرب بارگاہ شب و روز کے تطولات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والا "تاریخ محمد شاہی" میں از اول تا آخر اور کچھ لکھ ہی نہیں سکا۔ بجز اس کے کہ سلطان کو مجموعہ اوصاف متضادہ کہہ کر اپنی دانشمندی کا بخیہ چاک کرے۔

زرعی سکیم کے متعلق برنی نے یوں تشریح کی ہے کہ سکیم یہ تھی کہ ایک خاص محکمہ اس کام کیلئے بنایا گیا۔ اس محکمہ کا نام "دیوان امیر کوہی" تھا اس میں کئی عہدہ دار اور منصبدار تھے۔ ہر منصبدار کے زیر نگرانی علاقے کا رقبہ ۳۰×۳۰ کوس تھا۔ تجویز یہ تھی کہ اس رقبے میں ایک بالشت بھر زمین بھی بلا کاشت نہ رہے۔ اس کے علاوہ ہر سال زمین میں نئی جنس بوئی جاتی تاکہ زمین اور کاشتکار ہر دو مختلف اجناس پیدا کرنیکے اہل ہو جائیں ھ برنی صفحہ ۴۹۹۔ یہ سکیم نہایت محنت و جانفشانی کیساتھ خود سلطان نے قلمبند کی تھی۔

مالیات اس کے علاوہ سلطان کا خیال تھا کہ صیغہ مالیات کو بھی ایک مستقل فن قرار دیا جائے۔ چنانچہ برنی کے ان الفاظ سے تشریح ہوتا ہی "سوم اشتغال سلطان ہماں چند سال کہ از دولت آباد آمدہ بدہلی قیام نمود در وضع اسالیب بود یعنی تصورات ازدیاد مال و حشم و بسیارے زراعت۔ و وقوع آں بالطف و قہر آمیختہ از خلق نظر داشتے، و شب ہا و روز ہا در ترتیب اسالیب گذشتے و در اعمال آں جہد نمودے" صفحہ ۴۹۹ برنی

تذکار یہ ہے ادنیٰ تشریح، حضرت مولانا مہاجر کی اُس جملہ کی جو اوپر مذکور ہوا ہے یعنی "لم یخرج احد من الهند مثله ومن جاء بعده من السلاطين كلهم عيال عليه والعجب انه كيف خرج مثل هذا السلطان من مثل مجتمع الملك الهندية"

بوارق الغیب (۱۱) حصہ دوم

حدیث نمبر ۱۲۲

گزشتہ سے پیوستہ

سنن ابی داؤد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

(۱۵۸) میں بخار میں مبتلا تھا اور مسجد میں پڑا ہوا تھا کہ رسولخدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور پکار کر فرمایا

من احسّ الفتی الدوسی ثلث مرات فقال رجل یا رسول اللہ ھوذا یوعك فی جانب المسجد فاقبل یمشی حتی وصل الیّ فوضع یدہ علیّ الخ

(سنن ابی داؤد باب مایکرہ ذکرالرجل من اصابتہ امراتہ کتاب النکاح) (۲۱)

کسی نے دوسی جوان (ابوہریرہ) کو دیکھا؟ آپ نے یہ تین دفعہ ارشاد فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا حضرت! وہ یہ ہیں بخار میں مبتلا ہیں مسجد کے گوشہ میں ہیں، بس آپ میری طرف تشریف لائے اور قریب آکر دست مبارک میرے اوپر رکھ دیا۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ اس وقت تک بھی حضور کو "علم جمیع ما کان وما یکون" حاصل نہ تھا ورنہ حضرت ابوہریرہ کا پتہ چلانے کے لیئے آپ کو دوسروں سے دریافت کرنے اور دوسروں کو بتلانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اور یہ واقعہ بھی ۷ھ سے بعد ہی کا ہو سکتا ہے کیونکہ ۷ھ ہی میں حضرت ابوہریرہ مشرف باسلام ہوئے ہیں

حدیث نمبر ۱۲۳

جمادی الاولےٰ ۸ھ میں غزوہ موتہ پیش آیا اور اس کے واقعات میں سے یہ ہے کہ

(۱۵۹) "اہل یمن میں سے قبیلہ حمیر کا ایک شخص اسلامی لشکر کے ساتھ ہو لیا جس کے پاس ایک تلوار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اثناء راہ میں ہی کسی مسلمان نے ایک اونٹ ذبح کیا تو اس نے اس سے کھال کا ایک ٹکڑا مانگ کر اس کی ڈھال سی بنائی، جب جنگ شروع ہوئی تو لشکر کفر میں ایک رومی شخص دیکھا گیا جو سرنگ گھوڑے پر سوار تھا اور گھوڑے کی زین پر سونا جڑا ہوا تھا اسی طرح اس کے جو ہتھیار تھے ان پر بھی سونا جڑا ہوا تھا، اس رومی شخص نے کئی ایک مسلمانوں کو شہید کر دیا لیکن اتفاق سے وہ اس یمنی فوجی کی زد پر گیا اور اس نے اس کو قتل کر کے اس کے گھوڑے اور ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب مسلمانوں کی فتح پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا تو حضرت خالد بن الولید نے (جو اس وقت اسلامی فوج کے سپہ سالار تھے) اس یمنی شخص کو طلب کیا اور رومی مقتول کا کچھ سامان اس سے لے لیا ــــ عوف بن مالک کو (جو اس جنگ میں شریک تھے اور وہ یمنی شخص انہی کے ساتھ آیا تھا) جب واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے حضرت خالد سے آکر کہا کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حکم تھا کہ "میدان جنگ میں دشمن کے جس سپاہی کو جو قتل کرے وہی اس کے ساز و سامان کا مستحق ہے" تو پھر آپ نے اس یمنی سے کیوں کچھ

سامان لے لیا؟ حضرت خالد نے فرمایا کہ میری نظر میں وہ سامان بہت زیادہ اور بہت قیمتی تھا ـــــ عوف بن مالک نے کہا آپ وہ سامان اسی یمنی کو واپس فرما دیجیے ورنہ معاملہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے گا اور پھر آپ دیکھ لیں گے کہ کیا فیصلہ ہوتا ہے ـــــ حضرت خالد اس کے بعد بھی اپنی رائے پر قایم رہے اور اُس یمنی کو رومی مقتول کا تمام سازوسامان دینے سے انکار فرما دیا ـــــ یہاں تک کہ جب لشکر اسلام مدینہ واپس آیا تو عوف بن مالک نے یہ واقعہ حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے حضرت خالد کو حکم دیا کہ اس یمنی سے جو کچھ لیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے ـــــ عوف بن مالک جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ

فقلت یا خالد الم اوف لک؟ فقال صلی اللہ علیہ وسلم وما ذاک؟ فاخبرتہ فغضب وقال یا خالد لا ترد علیہ۔ الحدیث

میں نے خالد سے کہا لو! دیکھو! میں نے اپنا کہا کیسا پورا کر دکھایا؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ جملہ سنا تو دریافت فرمایا کہ یہ کیا قصہ ہے تو میں نے پورا واقعہ بہ تفصیل عرض کیا تو آپ کو سخت غصہ آیا اور آپ نے حضرت خالد کو حکم دیا کہ کچھ مت واپس کرو اور پھر آپ نے عوف کو تنبیہ فرمائی" (ملخصاً)

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "علم غیب کلی" یا "علم جمیع ماکان وما یکون" حاصل نہ تھا ورنہ آپکو پوری روداد پہلے سے خود ہی معلوم ہوتی اور اس صورت میں اپنا فیصلہ بدلنے کی آپکو ضرورت ہی نہ ہوتی

(یہ حدیث صحیح مسلم جلد دوم باب استحقاق القاتل سلب القتیل" میں ۸۲ اور سنن ابی داود کتاب الجہاد باب الامام یمنع القاتل السلب ان رائ" میں ۲۲۳ اور مسند احمد میں بھی مروی ہے بکمافی جمع الفوائد ۲۲۴ ۶/۲۲) ہم نے واقعہ کی یہ تفصیل ابوداوٗد کی روایت کے مطابق نقل کی ہے صحیح مسلم کی روایت میں بہ نسبت اسکے کچھ اختصار ہے مگر روایت کے جس جزء سے ہمارا استدلال ہے وہ ان سب روایات میں مشترک ہے]

حدیث نمبر ۱۲۴

ماہ رمضان ۸ھ (۱۶۰) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے ابھی آپ مقام "مرّ الظہران" ہی میں تھے کہ سردار قریش ابوسفیان بن حرب نے حاضر خدمت ہو کر اسلام قبول کر لیا آنحضرت صلی اللہ علیہ نے اپنے چچا حضرت عباس بن عبد المطلب کو اشارہ فرمایا کہ ابوسفیان کو ساتھ لے کر ایسی جگہ کھڑی ہو جایئے جہاں سے پورا اسلامی لشکر گزرے چنانچہ وہ ابوسفیان کے ساتھ ایسی ہی جگہ کھڑے ہو گئے،

لشکر اسلام کے دستے باری باری نکلتے تھے اور ابوسفیان حضرت عباس سے انکا تعارف حاصل کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت سعد بن عبادہ انصار کی ایک بڑی فوج کے ساتھ گذرے اور انھوں نے ابوسفیان کو مخاطب کرتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا

"ابوسفیان! آج جنگ اور قتال کا دن ہے آج کعبہ کی حرمت بھی توڑی جائیگی یعنی مکہ کے بسنے والے اور کعبہ کے سائے میں رہنے والے دشمنان اسلام کو بھی بیدریغ پامال کیا جائیگا"

اسکے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخصوص رفقاء (مہاجرین) کے ساتھ گزرے تو ابوسفیان نے بطور شکایت عرض کیا

"الم تعلم ما قال سعد بن عبادہ"
"قال ما قال"
"قال کذا و کذا"
"فقال کذب سعد ولکن ھذا یوم یعظم اللہ فیہ الکعبہ و یوم تکسی فیہ الکعبۃ الخ"

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سعد نے کیا کہا ہے؟"
"آپ نے فرمایا۔ انھوں نے کیا کہا ہے؟"
ابوسفیان نے کہا۔ انھوں نے ایسا ایسا کہا ہے"
حضور نے فرمایا سعد نے بالکل غلط کہا آج تو وہ دن ہے کہ کعبۃ اللہ کی عظمت کا پورا حق ادا کیا جائیگا اور اسپر غلاف چڑھایا جائیگا"

(صحیح بخاری باب این مرکز النبی صلے اللہ علیہ وسلم الرایۃ یوم الفتح)[۲۲۵]

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو "جمیع ماکان و مایکون کا علم تفصیلی محیط" حاصل نہ تھا ورنہ ابوسفیان کے اس کہنے پر کہ الم تعلم ما قال سعد؟ (کیا آپ کو معلوم نہیں کہ سعد نے کیا کہا ہے؟)، آپ کو یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ "ما قال سعد؟ (سعد نے کیا کہا ہے؟) بلکہ آپ ابوسفیان کی شکایت کے جواب میں پہلے ہی ان کو مطمئن کر دیتے۔

حدیث نمبر ۱۲۵

اور اسی سفر (غزوۃ الفتح) کی احادیث کے سلسلہ کی ایک روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں عبدالرحمن بن الازہر سے یہ مروی ہے کہ

قال رأیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عام الفتح وانا غلام شاب یسئل عن منزل خالد بن الولید[۲۶۱]

(کنز العمال ج ۳ ص ۱۰۴)[۲۲۶]

میں نے فتح مکہ کے سال (جبکہ میں جوان لڑکا تھا) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ خالد بن الولید کے ٹھکانے کا پتہ پوچھتے تھے۔

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو "علم غیب"

یا "علم جمیع ماکان و مایکون" حاصل نہ تھا۔

حدیث نمبر ۱۲۶

(۱۶۲) فتح مکہ سے فارغ ہو کر شوال ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن الولید کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ بنی جزیمہ کی طرف بھیجا وہاں پہونچکر حضرت خالد نے ان کو اسلام کی دعوت دی انھوں نے بجائے اس کے کہ صاف لفظوں میں "اسلمنا" کہتے "صبانا صبانا" کہنا شروع کیا جس کے معنی ہیں کہ "ہم نے دین تبدیل کر دیا" حضرت خالد نے سمجھا کہ یہ از راہ شرارت و استکبار لفظ اسلام سے گریز کرتے ہیں تو انھوں نے ان کی گرفتاری اور قتل کا حکم دے دیا حضرت عبداللہ بن عمر بھی اس دستہ میں بطور ایک فوجی سپاہی کے تھے انھوں نے حضرت خالد کی اس رائے سے اختلاف کیا اور بنی جزیمہ کے جو آدمی انکی یا ان کے مخصوص رفقا کے قبضہ میں تھے اُن کو قتل کرنے سے انکار کر دیا، پھر جب یہ دستہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ کی رپورٹ آنحضرت سے کی گئی

فرفع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدہ فقال اللھم انی ابرأ الیک مما صنع خالد مرتین (صحیح بخاری[۲۲۷] باب بعث النبی صلے اللہ علیہ وسلم الی بنی جزیمہ)

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اُٹھا کے خدا کے حضور میں عرض کیا کہ اے اللہ خالد نے جو حرکت کی میں اس سے بری اور بیزار ہوں اور یہ آپ نے دو دفعہ فرمایا۔

اور ابن اسحق نے امام باقر کی روایت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے پھر حضرت علی کو بھیجکر ان تمام مقتولین کی دیت ادا کی (کما فی فتح الباری[۲۲۸] پ ۱۷ ص ۵۹)

اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اُس وقت تک "علم غیب کلی" یا "علم جمیع ماکان و مایکون حاصل نہ تھا" ورنہ آپ حضرت خالد کو بوقت روانگی اس بارہ میں ہدایت فرما دیتے اور پھر تبری اور ادائیگی دیت کی ضرورت نہ ہوتی۔

حدیث نمبر ۱۲۷

(۱۶۳) فتح مکہ کی تکمیل کے بعد وہیں سے آپ نے غزوہ حنین کا قصد فرمایا چلتے چلتے آپ حنین کے قریب ہی ایک منزل پر اُترے اور انس بن ابی مرثد غنوی کو آپ نے حکم دیا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر اس پہاڑی کی گھاٹی کی طرف چلے جاؤ اور اس کے بالائی حصہ پر قیام کرو اور ہوشیار رہ کر چوکی دو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری

غفلت کی وجہ سے دشمن رات ہی میں ہم پر حملہ کر دے۔ اس موقع پر آنحضرت کے الفاظ یہ ہیں:۔ "ولا نغرن من قبلک اللیلۃ" (یعنی تمہاری غفلت سے دھوکہ میں ہم پر رات میں حملہ نہ ہو جائے) حضور کی ہدایت کے مطابق انس چلے گئے اور رات بھر وہیں رہ کر چوکیداری کی۔ صبح کو جب نماز فجر کے لیے حضرت اٹھے تو فجر کی سنتیں پڑھنے کے بعد لوگوں سے آپ نے دریافت فرمایا "ھل احسستم فارسکم"؟ (کیا تم لوگوں نے اپنے سوار انس بن ابی مرثد کو دیکھا؟) صحابہ نے عرض کیا "ما احسسناہ" (حضرت ہم نے نہیں دیکھا) اس کے بعد اقامت کہی گئی اور حضرت نماز فجر پڑھانے کے لیے کھڑے ہو گئے لیکن دوران نماز میں بھی آپ بار بار متجسسانہ نظروں سے اس گھاٹی کی طرف دیکھتے تھے۔ اس موقع پر حدیث کے الفاظ یہ ہیں "فثوب بالصلوٰۃ فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی وھو یلتفت الی الشعب حتی اذا قضی صلواتہ وسلم فقال ابشروا فقد جاء فارسکم" پھر جب نماز ہو گئی اور آپ نے سلام پھیر دیا تو فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو کہ تمہارا سوار آگیا۔ صحابہ کا بیان ہے کہ ہم نے جب نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہ درختوں کے درمیان سے آرہے ہیں۔

[سنن ابی داؤد کتاب الجہاد باب فی فصل الحرس فی سبیل اللہ" میں یہ روایت مفصلاً ہے ہم نے یہاں اس کا خلاصہ درج کیا ہے۔ اس کے تین جزوں سے ہمارا ادعا ثابت ہوتا ہے۔ ایک حضور کا ارشاد "لا نغرن من قبلک اللیلۃ" اس بات کی صریح دلیل ہے کہ حضور کو جمیع ماکان و مایکون کا علم حاصل نہ تھا ورنہ دشمن کے شبخون کے خطرہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بلکہ سرے سے کسی چوکیدار کی چوکی بانی کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

دوسرے صحابہ سے آپ کا صبح کو سوال کرنا "ھل احسستم فارسکم" ہمارے اس مدعا کی واضح دلیل ہے۔ پھر نماز میں متجسسانہ نظروں سے گھاٹی کی طرف آپ کا دیکھنا بھی ہمارے اس مدعا کو ثابت کرتا ہے کیونکہ آپ کو جمیع ماکان و مایکون کا علم حیطہ کا حاصل ہوتا تو نہ تو آپ کو صحابہ سے دریافت کرنے کی ضرورت ہوتی اور نہ آپ بحالت نماز فکرمندی کے ساتھ گھاٹی کی طرف نظر مبارک کرتے۔

حدیث نمبر ۱۲۸

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اسی غزوہ حنین کا واقعہ نقل کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ

لما استقبلنا وادی حنین انحدرنا	جب ہم وادی حنین کی طرف آئے تو تہامہ

من واد من اودیۃ تہامۃ اجوف خطوط انما نتحدر فیہ انحداراً فی عمایۃ الصبح وکان القوم قد کمنوا لنا فی شعابہ واجنابہ ومضائقہ قد جمعوا وتہیاؤا واعدّوا فواللہ ماراعنا ونحن منحطون الا الکتائب قد شدّت علینا شدّۃ رجل واحد وانہزم الناس راجعین لا یلوی احد علی احد وانحاز النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات الیمین ثم قال الیّ ایہا الناس (الحدیث)

(رواہ احمد والموصلی جمع الفوائد ص۶۶ ج۲ نمبر ۲۳)

کی وادیوں میں سے ایک کھوکھلی اور نیچے کی طرف آنے والی وادی میں ہم اترنے لگے (اور چونکہ ڈھال بہت زیادہ تھا) اور صبح کی اندھیری چھائی ہوئی تھی اس لیے ہم گویا اس میں رُڑھکتے چلے جاتے تھے اور مخالف فوج اس کی گھاٹیوں اور اس کے پہلوؤں اور تنگ کناروں میں بالکل تیار ہوکر ہماری تاک میں چھپی بیٹھی تھی ہم بالکل بےخطر اُترے چلے جارہے تھے کہ اپنی کمینگاہوں سے اچانک دشمن نے ہم پر یکبارگی حملہ کردیا. یہاں تک کہ اسلامی لشکر کے پیر اکھڑ گئے اور ایک دوسرے سے بے پروا ہوکر پیچھے لوٹنے لگے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی داہنی جانب سمٹ گئے پھر آپ نے آواز دی کہ لوگو! میری طرف آؤ ——— (آگے حدیث میں ہے کہ پھر مسلمانوں نے مڑکر شکست کو فتح سے بدل دیا اور دشمن کو شکست دے کر اُس کے مال و اسباب وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔)

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو جمیع ماکان و مایکون کا علم حاصل نہ تھا ورنہ آپ کو پہلے سے اس کی اطلاع ہوتی کہ دشمن کمینگاہوں میں چھپا ہوا ہے اور اس صورت میں آپ لشکر کو اس گھاٹی سے نہ اُتارتے یا کم از کم پہلے سے ہوشیار کردیتے کہ دشمن کو اچانک اور بے خبری میں حملے کا موقع نہ ملتا۔

حدیث نمبر ۱۲۹

(۱۶۵)

جب لشکر اسلام حنین میں ہوازن کو شکست دے کر مال غنیمت میں ان کے اموال و اسباب ان کے مویشی اور جنگی اسیروں کو قبضہ میں کرکے واپس ہوا تو ہوازن کی طرف سے ایک وفد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے اسلام قبول کیا اور ساتھ ہی یہ درخواست کی ہماری

قبیلہ کا جو مال و اسباب اسلامی لشکر نے حاصل کیا ہے وہ واپس کر دیا جائے اور ہمارے جو آدمی گرفتار ہو گئے ہیں وہ آزاد کر دیئے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دیکھتے ہو کہ یہ میری ذات واحد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ میرے ساتھ یہ سب ہی ہیں اور مال غنیمت حصہ بحصہ تقسیم ہو کر مجاہدین کے قبضہ میں پہونچ چکا ہے، اور میں نے تو تمہارے خیال سے تقسیم بھی بہت دیر سے کی (کہ شاید تم قبل از تقسیم پہنچ جاؤ اور مال غنیمت تم کو واپس دے دیا جائے مگر افسوس تم بہت دیر سے آئے) لہذا صاف بات یہ ہے کہ تم دو چیزوں میں سے ایک پسند کر لو یا تو اپنے اموال و اسباب واپس لے لو اور یا اسیروں کو آزاد کرا لو (جو قانون جنگ کے مطابق غلام بنائے جا چکے تھے) ان دونوں میں سے تم جس کو پسند کرو اسی کے بارہ میں میں مسلمانوں سے سفارش کر دوں گا ـــ چنانچہ انھوں نے عرض کیا تو پھر ہمارے اسیروں کو آزادی دلوا دی جائے۔ آپ نے نماز کے بعد مسلمانوں کے سامنے ان لوگوں کا معاملہ پیش فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ تمہارے بھائی ہی ہیں اب اپنے کیئے پر نادم ہو کر آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے اسیروں کو رہائی دیدی جائے اور میں خود بھی اسی کے حق میں ہوں اور سب سے پہلے اعلان کرتا ہوں کہ بنی ہاشم کے حصہ میں جو اسیر آئے ہیں میں اُن کو ان کے حوالہ کرتا ہوں بس تم میں سے جو لوگ بطیب خاطر اس کے لیئے آمادہ ہوں وہ اپنے حصہ کے غلاموں کو اسی طرح آزاد کر دیں اور جو اس طرح بلا عوض آزاد کرنا نہ چاہیں تو ان کے لیئے ہمارا وعدہ ہے کہ آئندہ اولیں موقع پر ان کو اس کا بدل دیدیا جائے گا۔ اس پر مجمع میں سے آوازیں آئیں

قد طیبنا ذالک یا رسول اللہ!

حضرت ہم بطیب خاطر ہوازن کے اسیروں کو آزاد کرتے ہیں۔

لیکن چونکہ یہ بات ایک عام مجمع کی تھی اور اس طرح متعین طور پر ہر شخص کی مرضی معلوم نہیں ہو سکتی تھی اس لیئے آپ نے فرمایا:-

انی لا ادری من اذن منکم ممن لم یاذن فارجعوا حتی یرفع الینا عرفاؤکم امرکم

۲۳۱
(صحیح بخاری کتاب الاحکام باب العرفاء للناس)

مجھے پتہ نہیں چلتا کہ آپ لوگوں میں سے کس کی مرضی ہے اور کس کی مرضی نہیں ہے لہذا اب یہاں سے آپ لوگ چلے جائیں پھر ہر قبیلے اور ٹولے کے چودھری اور مکھیا آپ کے

معاملہ کی رپورٹ پیش کریں۔

آگے حدیث میں ہے کہ اس پر مجلس منتشر ہو گئی اور پھر چودھریوں اور مکھیاوں نے اپنے اپنے قبیلہ اور ٹولے والوں سے بات چیت کر کے حضرت کے سامنے رپورٹ پیش کی کہ حضرت! سب لوگ حضور کی تجویز پر رضامند ہیں اور اپنے اپنے غلاموں باندیوں کو آزاد کرنے کے لیئے تیار ہیں"!

(یہ حدیث صحیح بخاری میں متعدد جگہ ہے کہیں مختصر ہے اور کہیں مفصل اور واقعہ کی تفصیل میں بعض اجزاء ہم نے فتح الباری [۲۳۲] پ ۸ ص ۴۶ سے بھی لیئے ہیں)

ہمارا استدلال صحیح بخاری کی روایت کے مذکورہ بالا الفاظ سے ہے جو صاف بتلا رہے ہیں کہ عام مجمع میں آپ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس کو یہ تجویز منظور ہے اور کس کو نہیں اور اسی واسطے آپ نے معاملہ کو "عرفاء" کے حوالہ کیا اور انھوں نے اپنے اپنے حلقہ میں تحقیقات کر کے رپورٹ پیش کی۔

حدیث نمبر ۱۳

کنز العمال میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے کہ

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حضرت ابوبکر داہنی جانب بیٹھتے تھے [۲۳۶]

فابصر ابوبکر العباس بن عبد المطلب یوما مقبلا فتنحی له عن مکانه ولم یره النبی صلی اللہ علیه وسلم فقال النبی صلی اللہ علیه وسلم ما نحاک یا ابا بکر فقال هذا عمک یا رسول اللہ فسر بذالک النبی صلی اللہ علیه وسلم حتی یری ذالک فی وجهه (رواہ ابن عساکر ولم ار فی سندہ من تکلم فیه کنز العمال [۲۳۷] ج ۶ ص ۲۳۷)

ایک دن ابوبکر نے عباس بن عبد المطلب کو آتا دیکھا تو ان کے لیئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو نہیں دیکھا تو آنحضرت نے ابوبکر سے دریافت کیا کہ تم کیوں اپنی جگہ سے ہٹ گئے؟ انھوں نے عرض کیا حضرت! یہ آپکے چچا تشریف لا رہے ہیں، تو آنحضرت کو ابوبکر رضی کے اس طرز عمل سے بڑی مسرت ہوئی۔

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "جمیع ما کان وما یکون کا علم محیط" حاصل نہ تھا ورنہ حضرت ابوبکر سے جگہ چھوڑنے کا سبب دریافت فرمانے کی آپ کو ضرورت نہ ہوتی۔

اور یہ واقعہ بھی بظاہر فتح مکہ کے بعد ہی کا ہے کیونکہ حضرت عباس کو اسلام لانے کے بعد بارگاہ نبوت میں حاضری کا موقع غزوہ فتح مکہ سے پہلے نہیں ملا جیسا کہ اہل سیر کا اس پر اتفاق ہے۔

(باقی)

چندہ سالانہ
قسم اول تین روپے
عہ
ممالک غیر سے
قسم اول سات شلنگ
پیشگی

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الفرقان

ماہنامہ — بریلی

جلد ۷	بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ	نمبر ۴

باہتمام مولوی محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر بریلی الکٹرک پریس بریلی میں چھپکر دفتر الفرقان بریلی سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمداً وسلاماً

نگاہِ اوّلیں

الفرقان کے طباعتی انتظام میں تبدیلی کی اطلاع ناظرین کرام کو گزشتہ نمبر میں دی جا چکی ہے۔ ابھی دوسرا انتظام مستقل اور مکمل نہیں ہو سکا ہے اسی وجہ سے گزشتہ پرچہ بہت ہی رواروی میں تیار ہوا اور اس کی چھپائی بہ حد ناقص ہوئی پروف کی تصحیح بھی بہت سرسری ہو سکی اور اس لئے چھپائی ناقص ہونے کے علاوہ اغلاط بھی اس پرچہ میں بہت زیادہ رہ گئیں خدا کرے یہ پرچہ ان نقائص سے محفوظ رہے۔

"ولی اللہ نمبر" کے لیے جو مضامین آ چکے ہیں ان میں سے چند کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اُن کے بعد جو مقالات آئے اُن میں ایک مقالہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کا خاص طور سے قابل ذکر ہے اس کا عنوان ہے "امام ولی اللہ دہلوی سے پہلے اسلامی ہند کی حالت اور اس کا تدریجی ارتقاء" اس مضمون میں ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے شاہ صاحبؒ کے دور تک کی مختصر مگر جامع تاریخ پیش کی گئی ہے جس سے اس کے حقیقی اسباب معلوم ہو جاتے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں پر پورا پورا اسلامی رنگ کیوں نہ چڑھ سکا اور انسان کے افکار و اعمال، اخلاق و معاشرت، طرز زندگی اور سیاست میں جو مکمل اور صالح انقلاب پیدا کرنا اسلام کا اصل منشا ہے وہ کیوں عام طور سے یہاں پیدا نہ ہو سکا۔ یہ مقالہ اگرچہ ۳۲ بتیس صفحات سے زیادہ کا نہیں ہے مگر ہندوستان میں اسلام کی تقریباً ۵ صدیوں پر اچھا بصیرت افروز و دیدہ کشا تبصرہ ہے —

پٹنہ کے مشہور کتب خانہ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک اجازت نامہ موجود ہے ہمارے دوست مولانا مسعود عالم صاحب کی عنایت سے اس کا فوٹو بھی ہم کو حاصل ہو گیا ہے جو انشاء اللہ نمبر میں شامل ہوگا۔ اس قسم کے اور نادر تبرکات کے لیے بھی ہماری کوشش جاری ہے اگر ناظرین کرام میں سے کسی اور صاحب کے علم میں اس قسم کی اور کوئی چیز کہیں ہو تو وہ ہم کو اطلاع دے کر ممنون فرمائیں۔

"ولی اللہ نمبر" کیلئے مولانا گیلانی کا مضمون ابھی تیار نہیں ہو سکا ہے لیکن وہ کیا لکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ

کریا لکھیں گے اس کا کچھ اندازہ اُن کے ایک تازہ گرامی نامہ سے ہوتا ہے۔ ہم اپنے ناظرین کو بھی مسرت میں شریک کرنے کے لیئے اسکی چند سطریں یہاں درج کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

ولی اللہ نمبر کی تیاری میں آپ کا اخلاص بحمد اللہ رنگ لا رہا ہے ...... میرے سامنے بھی ایک میدان آگیا ہے زوال حکومت کے بعد محکومی کے دور میں ہندوستان کا اسلام صرف محفوظ ہی نہیں رہا بلکہ نسبتاً اس میں زور پیدا ہوا۔ حالانکہ شیعہ، سکھ، مرہٹہ اور انگلش تحریکوں کے ساتھ صوفیائے مبتدعین کی مسلسل زد اسکے بعد اسلام پر پڑتی رہی جہاں تک میرا خیال ہے اس عہد میں جس نے لواء اسلام کو بلند رکھا بلکہ زیادہ بلند کر دیا وہ حضرت کی ذات ہے، خدا کرے مضمون ادا ہو جائے۔"

مولنا مودودی بھی "ولی اللہ نمبر" کے لیئے خاص اہتمام سے مقالہ تیار فرما رہے ہیں۔ آپنے اسی غرض سے حضرت شاہ صاحب رح کی اکثر تصانیف مکتبہ الفرقان ہی کی وساطت سے مہیا کرائی ہیں، ان دونوں مقالوں میں ابھی کچھ دیر ہے تاہم توقع ہے کہ ایک مہینہ میں یہ حاصل ہو جائینگے اور اگر یہ اندازہ غلط نہ ثابت ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ اب سے ۲ ماہ بعد شعبان میں "ولی اللہ نمبر" شایع ہو سکیگا اس وقت اسی اندازہ سے تیاری ہو رہی ہے۔

اس نمبر کی ضخامت غالباً تین سو صفحات سے زیادہ ہو گی الفرقان کے مستقل خریداروں کے علاوہ دوسرے حضرات کیلیئے اس کی قیمت ڈیڑھ روپیہ ہو گی۔ کاغذ کی بیحد گرانی کی وجہ سے اس وقت یہ نمبر صرف خریداروں کی تعداد کے مطابق ہی چھاپا جا سکے گا اور اگر زیادہ بھی چھاپا گیا تو غالباً بس سو پچاس لہذا جو حضرات اس کو حاصل کرنا چاہیں وہ اسی وقت مطلع فرما دیں ورنہ بہت ممکن ہے کہ بعد میں ہم اُن کو نہ دے سکیں۔

الفرقان کے نئے مستقل خریداروں یا صرف نمبر کے خریداروں کی فراہمی میں اس وقت جو کرم فرما احباب ہماری مدد کریں گے وہ "ولی اللہ نمبر" کی تیاری میں ہمارے خاص مددگار ہوں گے۔ کیونکہ نمبر کی تیاری کیلیئے اب دوستوں کی جس اعانت کے ہم خاص طور سے حاجتمند ہیں وہ یہی ہے اس نمبر کے لیئے جتنے کاغذ کی ضرورت ہے روپیہ مہیا نہ ہونے کی وجہ سے ابھی اس میں سے صرف ایک تہائی خریدا جا سکا ہے گویا تین سو ساڑھے تین سو روپیہ کا کاغذ اور خریدنا ہے کیا الفرقان کے قدیمی ہمدرد اور ولی اللہی سلسلہ سے تعلق وعقیدت رکھنے والے احباب اس سلسلہ میں ہماری مدد فرما کر "ولی اللہ نمبر" کی تیاری میں کوئی حصہ لیں گے؟

دفع بعض الشبہات علی السیاسیات من الآیات

(از حضرت اقدس حکیم الامت مولانا الشاہ اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم)

[اس مضمون گرامی کی ایک عجیب تقریب ہے حضرت ممدوح اپنے والا نامہ میں ارقام فرماتے ہیں]

کچھ ردی جمع ہوگئی تھی حسب معمول اسکو تلف کرنے کے قبل احتیاطاً دیکھا گیا تو اس میں ایک لفافہ آپ کے پتہ کا معہ ارسکے ٹکٹ کے نکلا واپسی بعینہ بدون ارسکے خرچ کیئے ہو نہیں سکتی تھی اور محض اطلاع کے لیئے اس کا صرف کرنا محض بے نتیجہ تھا جی میں آیا کہ کوئی مضمون بھیجدوں ایک دو روز گزرے تھے کہ یہ زبانی تقریر کی گئی تھی اُسی کو ضبط کر دیا۔ اگر اصل یا کسی عارض سے پسند نہ ہو تو کالعدم سمجھی جاوے، اشرف علی از تھانہ بھون

حامداً و مصلیاً۔ اس وقت عام طور سے علماء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ سیاسیات حاضرہ میں مسلمانوں کی قیادت کیوں نہیں کرتے اور اس کی بنا ایک غلط مقدمہ ہے وہ یہ کہ سیاسیات ایک حصہ ہے شریعت کا تو علماء شرائع کو ماہر سیاسیات ہونا ضروری ہے، سو خود اس مقدمہ میں معترضین کو ایک غلط ہو گیا ہے وہ یہ کہ سیاست کے دو حصے ہیں ایک سیاست کے احکام شرعیہ یہ بیشک شریعت کا جزو ہے اور کوئی عالم اس سے ناواقف نہیں ہوتا چاہئے چنانچہ ابواب فقہیہ میں سے کتاب السیر ایک مستقل اور مبسوط جزو ہے جس کے درس و تدریس پر دوام و التزام ہے اور دوسرا حصہ سیاست کا اس کی تدابیر تجربیہ ہیں جو ہر زمانہ میں حالات و واقعات اور آلات وغیرہ کے تغیر و تبدل سے بدلتی رہتی ہیں اور یہ حصہ شریعت کا جزو نہیں اور علماء کا اس میں ماہر ہونا ضروری نہیں۔ اگر اس میں کوئی عالم ماہر ہو تو اس کی مہارت کے دوسرے ذرائع ہیں جن کا حاصل تجربہ و مناسبت خاصہ ہے ـــ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فن طب میں سیاست بدنیہ یعنی اصلاح احوال بدن کی تدابیر مدون کی گئی ہیں اور مطب میں انہی تدابیر کی مشق کرائی جاتی ہے مگر علماء شرائع کے لیئے ان تدابیر میں ماہر ہونا کسی کے نزدیک بھی لازم نہیں اور نہ یہ عدم مہارت اُن کے حق میں نقص ہے البتہ اُن تدابیر کے جواز و عدم جواز شرعی کی تحقیق اُن کا فرض منصبی سمجھا جاتا ہے۔ پس جو معاملہ سیاست بدنیہ یعنی طب کے ساتھ بلانکیر کیا جاتا ہے کہ حاملان تدابیر طبیہ کی حد اجماعت سمجھی جاتی ہے اور

حاملان احکام شرعیہ یعنی اُن تدابیر کے جواز و عدم جواز کی تحقیق کی جدا جماعت سمجھی جاتی ہو، دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرایض پر مجبور نہیں کیا جاتا اور نہ ان فرایض سے بے خبری کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سیاست مدنیہ یعنی نظام ملکی کے ساتھ معاملہ کرنا لازم ہو کہ تدابیر نظام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور اُن تدابیر کے شرعی احکام کی جدا جماعت سمجھی جاوے اور دوسری جماعت کو پہلی جماعت کے فرائض پر مجبور نہ کیا جاوے اور نہ ان فرائض کے علم و عمل کے فقدان کو ان کے حق میں نقص سمجھا جاوے اور طریق عمل میں دونوں جماعتوں کے فرائض کو اس طرح جمع کیا جاوے کہ پہلی جماعت سے تدابیر کی تحقیق کریں اور دوسری جماعت سے احکام شرعیہ کی اس طرح جہاں نظام مذکور یہ فرض ہو جاوے خود دوسری جماعت بھی پہلی جماعت سے تدابیر دریافت کرے اور بہ شرط جواز شرعی ان پر عمل کرے اور پہلی جماعت دوسری جماعت سے جواز و عدم جواز کی تحقیق کرے اور بعد ثبوت جواز اُن پر عمل کرے۔ (کما سیأتی فی الاستدلال الآتی من استرشاد الملوک من الانبیاء علیہم السلام واطاعتہم لہم و ارشادھم الملوک وموافقتہم لہم فی النظام) یہ معنی ہیں دونوں جماعتوں سے کام لینے کے اور دونوں جماعتوں کے بالاتفاق کام کرنے کے۔

اور یہ مسئلہ یعنی عدم لزوم علم بالنظام لعلم الاحکام ہر چند کہ بدیہی جلی ہے اور اگر خفی بھی ہوتا تب بھی طبعی مثال سے تنبیہ کے بعد جلی ہو گیا اور اس بداہت کے سبب محتاج اثبات بالدلیل نہیں مگر میں تبرعاً بعض آیات سے اس کو اور موید کئے دیدیتا ہوں وہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں "الم تر الی الملأ من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ (الی قولہ تعالیٰ) فلما فصل طالوت بالجنود قال ان اللّٰہ مبتلیکم بنہر الخ" جس کے ترجمہ کا خلاصہ یہ ہو کہ "حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے (بہت) بعد (کما نقلہ اہل السیر قوم جالوت کے ظالمانہ تسلط سے تنگ آکر) بنی اسرائیل کے ممتاز لوگوں نے اپنے ایک نبی سے (جن کا مشہور نام شمویل ہے) عرض کیا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے ہم اس کے ساتھ (ملکر قوم جالوت سے) جہاد کریں انھوں نے (کچھ گفتگو کے بعد) جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا (اخیر قصہ میں ہے کہ) طالوت لشکر کو لے کر چلے اور فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارا ایک نہر سے امتحان کرنے والے ہیں (پھر جالوت کے قتل پر اور حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت و سلطنت عطا ہونے پر قصہ ختم ہو گیا)

ان آیتوں سے اثبات مدعا کی تقریر یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے باوجود ان میں ایک نبی کے موجود ہونے کے خواہ ان کا نام یوشع ہو کما قالہ قتادہ یا شمعون ہو کما قالہ السدی یا شمویل ہو کما علیہ الاکثر بہرحال اذ قالو

لنبی لهم" میں اُن کا نبی ہونا مصرح ہے، اُن نبی سے یہ نہیں کہا کہ آپ ہمارے قائد بنئے بلکہ اس مقصود کے لیئے ایک مستقل بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی سو اگر نبی کافی سمجھے جاتے تو ایسی درخواست کیوں کی جاتی! اور اگر شبہ ہو کہ یہ بنی اسرائیل کی غلطی تھی تو اس غلطی پر اون نبی نے متنبہ کیوں نہیں فرمایا کہ میں کافی ہوں بلکہ بادشاہ مقرر کرنے کا انتظام شروع کر دیا۔ اور اگر کوئی جسارت کر کے یہ کہنے لگے کہ اُن نبی سے بھی لغزش ہوگئی تو پھر اللہ تعالےٰ نے اس غلطی پر تنبیہ کیوں نہیں فرمائی بلکہ اس درخواست کو بلا نکیر قبول فرمالیا اس سے صاف معلوم ہوا کہ ہر نبی کے لیئے بھی سیاسیات میں تجربہ و مناسبت لوازم میں سے نہیں، تا بدیگراں از علما و مشائخ چہ رسد، پس مدعا بحمد اللہ باصرح واوضح وجوہ ثابت ہوگیا بلکہ مفسرین کی نقل سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے سنت اللہ زیادہ یہی رہی کہ کان قوام امرهم بالملوك وهم كانو يطيعون الانبياء كذا فى التفسير المظهرى وكثير من التفاسير وفى المظهرى ايضاً تحت قوله اتاه الله الملك ،، جمع الله تعالى له الامرين ولم يجتمعا قبل ذالك بل كان الملك فى سبط والنبوة فى سبط اه "

اور طالوت کے باب میں جو "بسطة فى العلم والجسم،، آیا ہے اس کی تفسیر میں "معرفة الامور السياسية وجسامة البدن،، منقول ہے كذا فى روح المعانى.

لیکن اس سنت کی اگر کثرت بھی نہ ہو تو ایک نبی کے تجربہ و مناسبت فی السیاستہ کی نفی بھی اثبات مدعا کے لیئے کافی ہے کیونکہ کسی نبی میں کسی نقص کا ہونا جائز نہیں اس سے ثابت ہوگیا کہ ایسے تجربہ و مناسبت کا نہ ہونا نقص نہیں وهو المطلوب ــــ اگر شبہ کیا جاوے کہ بعض اقوال پر طالوت بھی نبی ہیں کما فى التفسير المظهرى تحت قوله تعالىٰ بسطة فى العلم قيل اتاه الوحى حين اوتى الملك وفيه ايضاً تحت قوله تعالىٰ قال ان الله مبتليكم اما بوحى الله ان كان نبيًا واما بارشاد نبيهم" تو نبی کے ہوتے ہوئے غیر نبی کا انتخاب ثابت نہ ہوا ــــ جواب یہ ہے کہ ہمارا مُدعا اس پر موقوف نہیں بلکہ نبی موجود کے ہوتے ہوئے اُن سے یہ کام نہ لینا اثبات مُدعا کے لیئے کہ کمال نبوت کے لیئے کمال سیاسی لازم نہیں کافی ہے۔ اب ایک ضعیف سا استبعاد رہ گیا جس کا درجہ محض ایک وحشت عنوانیہ سے زیادہ نہیں، جس کا منشا ذہن میں عرف عامیانہ کا استیلاء ہے حقیقت حکیمانہ پر وہ یہ کہ امور سیاسیہ کا علم بوجہ اپنے آثار نافعہ کے کمال ہے تو اس کا فقدان نقص ہوگا پھر حضرات انبیاء و ورثۃ الانبیاء کے لیئے کیسے جائز ہو سکتا ہے جواب ظاہر ہے کہ اگر یہ نقص ہوتا تو انبیاء کے لیئے کیسے تجویز کیا جاتا اور لم اس کی یہ ہے کہ کمال اور نقص متناقض نہیں کہ کمال کا رفع نقص کے وضع کو مستلزم ہو بلکہ متضاد ہیں

کردونوں کا رفع اور درمیان میں واسطہ کا ہونا جائز ہے۔ چنانچہ بعثت عامہ کمال ہے مگر اس کا عدم بھی نقص نہیں ورنہ بجز حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے جمیع انبیا کا نقص لازم آوے گا نعوذ باللہ منہ۔ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو باوجود کمال جامعیت اور سیاست میں بھی ماہر ہیت کے غزوہ احزاب میں حفر خندق کی تدبیر حضرت سلمان فارسیؓ سے حاصل ہوئی (کما فی کتب الحدیث والسیر)[1] نیز قصہ تابیر میں حضور کا ارشاد "انتم اعلم بامر دنیاکم" ایسے ہی تجارب پر محمول ہے اور مراد اس کا یہ ہے کہ ایسے تجارب وتدابیر اپنی ذات میں دنیوی امور ہیں گو مباح ہوں اور عارض سے دینی ہوجاتے ہوں اس لئے ان کا نہ جاننا کسی درجہ میں بھی کمال مقصود میں قادح نہیں ولنختم المقالۃ علیٰ دعاء الوقایۃ عن الضلالۃ فی کل حالۃ ۱۲ ربیع ۲ ۵۹ھ

تذئیل

ازناچیز مدیر "الفرقان"

اس عاجز اور عاصی کو حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم کے ساتھ علمی اور دینی عقیدت کا جو تعلق ہے وہ بطور تشریح واضافہ بھی حضرت کی کسی تحریر پر کوئی لفظ لکھنے کی اجازت نہیں دیتا — لیکن حضرت کی یہ عادتِ کریمہ مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنی بعض تحریروں اور تصنیفوں پر خود اپنے خدام سے تنقیدی نظر کراتے ہیں اور پھر ان کی رائے پر غور بھی فرماتے ہیں حضرت کے اس طرز عمل کے پیش نظر ذیل کی چند سطریں لکھنے کی جسارت کی جارہی ہے — جو کچھ ان سطروں میں عرض کیا جارہا ہے اگر وہ حضرت کی منشا کے مطابق ہے اور راقم کے نزدیک ایسا ہی ہے تو یہ حضرت کے مقالہ کی تشریح ہے اور اگر حضرت کی منشا یہ نہیں ہے تو پھر یہ حضرت والا کے ایک حقیر ترین خادم کی اپنی رائے ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ سیاسی جدوجہد اور اس کی عملی تدابیر سے اشتغال علما پر فرض عین نہیں اور اس لئے اگر طبقہ علما کے کچھ افراد اس سے الگ رہ کر دین کی خدمت کے دوسرے شعبوں میں مصروف رہیں تو ان پر نکیر نہیں کی جاسکتی اور نہ ان کو "ادائیگی فرض سے کوتاہی" کا مجرم کہا جاسکتا ہے، غرض اس بارہ میں علما اور دوسرے مسلمانوں کے احکام وفرائض میں کوئی خاص فرق نہیں ہے،

ہمیں بھی شک نہیں کہ اگر مسلمانوں کی سیاست کو چلانے والے (سیاسی لیڈر) یا سیاسی جماعتیں علماء دین سے استصواب رائے کا التزام کریں اور اپنے عمل کو اُن کی دینی ہدایتوں کا قطعی طور پر پابند بنالیں

[1] فی حاشیۃ الکشمینی علی البخاری باب التحریض علی القتال علیٰ قولہ انہ خرج الی الخندق ولم یکن اتخاذ

جیسا کہ حضرت حکیم الامت نے تجویز فرمایا ہے تو پھر علما کی ذاتی جد وجہد اور عملی سیاسیات میں اُن کے براہ راست اشتغال کی چنداں ضرورت نہیں اور عملی سیاست سے اُن کے الگ رہتے ہوئے بھی دینی مقاصد کی تکمیل ہوسکتی ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت یہ صورت محض فرض ہی کی جاسکتی ہے، عمل اور واقعات کی دُنیا میں اس مفروضہ کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے مسلمانوں کے آج کل کے سیاسی لیڈر عموماً نہ صرف یہ کہ اپنی سیاسی جدوجہد کو علما کے دینی مشوروں سے بے نیاز سمجھتے ہیں بلکہ وہ سیاست میں مذہب اور حاملین مذہب کی دخل اندازی کے قائل ہی نہیں اور یہ صرف "قوم پرست" لیڈروں ہی کا حال نہیں ہے بلکہ ہمارے وہ "فرقہ پرور" لیڈر بھی جو دین ہی کا نام لے کر عوام مسلمانوں کو اپنے ساتھ بلاتے ہیں یہی ذہنیت رکھتے ہیں۔ گفتار اور زبانی دعووں سے قطع نظر کر کے اُن کی شخصی زندگی نہیں، قومی اور سیاسی سرگرمیوں ہی کو دیکھ لیا جائے وہ اس حقیقت پر صاف شہادت دیں گی — پھر یہ حال اس وقت صرف ہندوستان ہی کا نہیں ہے بلکہ جہاں خود مسلمانوں ہی کی آزاد یا نیم آزاد حکومتیں قایم ہیں وہاں بھی عموماً (باستثناء شاذ) یہی صورت ہے کہ سیاست کو مذہبی احکام سے قطعی آزاد فرض کر لیا گیا ہے بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں مذہب کو سیاست کی حدود سے قطعاً بے دخل کر دیا گیا ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان سب کے سامنے "قومی سیاست" کا یورپین تصور ہے جو مذہب سے صرف آزاد ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی سیادت کے خلاف بغاوت پر جس کی بنیاد ہے انھوں نے دیکھا ہے کہ یورپ نے نظام کلیسا سے آزاد ہو کر ہی موجودہ سیاسی تفوق حاصل کیا ہے اس لیئے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی سیاست کو مذہبی پابندیوں سے آزاد رکھے بغیر ترقی نہیں کر سکتے اور اس لیئے عملی سیاست میں دینی اصول ومقاصد کو ملحوظ رکھنے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کرتے

پس ایسی حالت میں اگر علما عملی سیاست سے اس اُمید پر بالکل کنارہ کش ہو جائیں کہ مسلمانوں کے سیاسی لیڈر ان سے استصواب کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھائیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ سیاسیات میں دینی مقاصد واحکام کی کوئی رعایت نہ ہوگی — آج بھی یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے کہ "محاکم شرعیہ" یا "نظارت امور شرعیہ" کے خالص دینی مطالبہ پر بجز علما کی جماعت (جمعیۃ العلماء) کے مسلمانوں کی کوئی سیاسی جماعت خاص زور نہیں دیتی — بلکہ بعض مشترک مجالس میں مسلمانوں کے مشہور سیاسی لیڈروں کو اس مطالبہ سے اختلاف کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔

اِدھر یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ریاست یا حکومت کی حدودِ عمل روز بروز وسیع ہوتی جا رہی ہیں، پہلے حکومتوں کو صرف اپنے محاصل اور قیام امن سے تعلق ہوتا تھا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کی حدود بڑھتی رہیں یہاں تک کہ اب انسانی زندگی کے اکثر اجتماعی شعبوں کی تشکیل حکومت ہی کے ہاتھوں سے ہوتی ہے "معاملات" تو سب ہی حکومت کے زیر قانون ہیں آئندہ تعلیم و تربیت بھی بچوں کو اسی طریقہ پر دلائی جا سکے گی جس کی حکومت منظوری دیدے گی ـــــ زیادہ "ترقی یافتہ" ممالک میں نکاح و طلاق حتیٰ کہ پیدائش اولاد پر بھی قانونی پابندیاں موجود ہیں ایسی صورت میں اگر علمانے عملی سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آئندہ نسل کی زندگی کا سارا نقشہ وہ دماغ تیار کریں گے جو اگر لادینی کے حامی نہ ہوں گے تو کم از کم ان کو دین سے کوئی دلچسپی بھی نہ ہوگی اور ان ہی کے ہاتھوں میں تنفیذی طاقت ہوگی ـــــ پس بحالات موجودہ تو سیاست میں علماء کا براہ راست حصہ لینا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر مذہب کی بقا کی بظاہر اب کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ اس سے میری مراد کانگریس یا مسلم لیگ کی شرکت نہیں ہے اور نہ میں سیاست کی ان راہوں کو اس مقصد کی تکمیل و تحصیل کے لیے کچھ مفید سمجھتا ہوں بلکہ میرا مقصد ہر وہ جدوجہد ہے جس سے ملک کے اقتدار اور تشکیل و تنفیذ قانون میں علماء دین کو بھی بلاواسطہ دخل حاصل ہو اور دینی مصالح و مقاصد کی زیادہ سے زیادہ رعایت کے بارہ میں وہ اپنا اثر ڈال سکیں میرے نزدیک علما کی سیاسی سرگرمیوں کا محور صرف یہی مقصد ہونا چاہیئے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر انھیں کوئی موثر طریق عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ اس وقت جو کچھ علما کی طرف سے عملی سیاست میں حصہ لیا جا رہا ہے میرے نزدیک مذکورہ بالا دینی مقصد کا کما حقہ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ـــــ نیز ضرورت وقت کے لحاظ سے وہ بہت کم بلکہ بے حد کم ہے۔

اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تمام علما کو دوسرے سارے کام چھوڑ کر سیاسی جدوجہد ہی میں لگ جانا چاہیئے اور جو حضرات دین کی دوسری نہایت مفید اور ضروری خدمات انجام دے رہے ہیں ان کو بھی ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیئے بلکہ میرا منشا یہ ہے کہ تعلیم اسلام و تبلیغ اسلام اور دوسری دینی خدمتوں کی طرح اس طرف بھی علما کے ایک معتدبہ طبقہ کو پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر خدا نخواستہ سیاسی اقتدار کلیتہً غلط ہاتھوں میں آگیا تو ہماری تعلیم و تبلیغ اور تزکیہ و اصلاح کی ساری کوششوں کو بھی بزور قانون بند کیا جا سکے گا جیسا کہ دوسرے بعض ممالک میں ماضی قریب ہی میں ہو چکا ہے۔

ماضی کے "فدائی" اور حال کے "جانباز"

(از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی۔ اے۔ ایڈیٹر "صدق" لکھنؤ)

"فدائی" کے لفظ میں کیا برائی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ لفظ میں نہ کوئی برائی نہ کوئی خرابی لفظی معنی فدا ہو جانے والے کے ہیں، ایسا شخص جو اپنی جان کو جان نہ سمجھے اور کسی کی چشم و ابرو کے اشارہ پر دریا میں کود پڑے آگ میں گھس جائے ریل کے آگے لیٹ جائے۔ پھانسی پر چڑھ جائے اصطلاح یہ باطنیوں یا اسمعیلیوں کی جتھہ قوم کا ہر فرد سپاہی ہوتا تھا اصطلاح میں "داعی" اور عام داعیوں کے اوپر جو چنے ہوئے اور چھٹے ہوئے سرفروش و جانباز ہوتے تھے، وہ فدائی کہلاتے تھے۔ سمع و طاعت کے مجسمے، نطق امیر کو پہنچتا کہ ہر حکم امیر کو جان نثار، مخالفین سلسلہ میں بیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار، قلب و جگر میں خنجر بھونک بھونک دیا۔ تبدیل ہیئت کے ساتھ بھیس بدل بدل کر مشاہیر علماء و مشائخ کے پاس شاگرد بن بن کر مرید بن بن کر پہنچے، اعتماد حاصل کیا، تقرب و رسوخ پیدا کیا اور ادھر موقع ملا کہ ادھر خنجر سے کام تمام کر دیا۔

داعیوں اور فدائیوں کی یہ "خدائی" ایک دو دن نہیں برسوں بلکہ کہنا چاہیے کہ صدیوں رہی ہے۔ تمام عراق قفقاز کے ساری علاقے گویا انھیں کے زیر نگیں، آج اس امیر کو ختم کر دیا۔ کل اس وزیر کو، ہمتیں بڑھی ہوئیں، حوصلے کھلے ہوئے۔ عالم۔ حاکم جس کسی کی بھی زبان مخالفت میں کھلی ہمیشہ کیلئے بند کر دی گئی سیکڑوں کنبے برباد ہو گئے۔ ہزارہا گھر بے چراغ ہو کر رہ گئے خفیہ پولیس کا نظام، جاسوسی کا انتظام وہ اعلیٰ درجہ کا کہ بڑی بڑی حکومتیں ٹکر لیتیں تو پس کر رہ جاتیں "حاکم اعلیٰ" الشیخ الجبال الرشید الدین سنان کی عظمت و جبروت کی کہانی تاریخ کی زبانی یوں سننے میں آتی ہے:۔

اکی فدائی زہر میں بجھے ہوئے خنجروں کے تیار کرنے اور استعمال کرنے دونوں میں ہر کمال تھی۔ بیت المقدس کا برائے نام تاجدار ہنری مسیحی جب ۱۱۹۴ء میں اس سے ملنے آیا تو شیخ نے اسکے سامنے اپنے فدائیوں کی جاں سپاری کا امتحان دینے کے لئے دو فدائیوں کو اشارہ کیا کہ محل کی بلند مناری سے کود پڑیں تعمیل معاً ہوئی اور دونوں کے جسم زمین پر گرتے گرتے قیمہ قیمہ ہو گئے"۔

ہٹی کی ہسٹری آف دی عربس" ص ۶۴۲

خاکساروں اور "جانبازوں" کی ہمت و جرات کے مظاہرے دنیا کے لئے نئے نہیں ہیں "حاکم اعلیٰ" اور "سالار" قسم کے لوگوں کی تنظیم دنیا پہلے بھی دیکھ چکی ہے، بیلچہ کی جگہ خنجر پہلے بھی اپنی دھاک دلوں پر بٹھا چکا ہے حسن بن صباح اور بابک خرمی کے پیرووں، چیلوں نے، وقت کی حکومتوں کا ناطقہ مدتوں بند رکھا ہے ——— اردو خوانوں میں کون ایسا بد قسمت ہے جو شرر مرحوم کی "فردوس بریں" "حسن بن صباح" اور "بابک خرمی" کی زیارت سے محروم ہے؟ اندھی پیروی، اطاعت اور حیرت انگیز تنظیم کے منظر دنیا پیشتر بارہا دیکھ چکی ہے، خون کی ہولیاں بار بار کھیلی جا چکی ہیں خون کی ندیاں بار بار بہ چکی ہیں۔ دیکھنے صرف یہ کہ جانبازیاں کس کے راستہ میں ہو رہی ہیں سجدوں کا مسجود کون ہے۔ اور پروانہ جان جو دے رہا ہے وہ قندیل کعبہ پر۔ یا چراغ بتکدہ پر! "صدق"

(بسلسلۂ "موعظۃ و ذکری")

کمزور طبقوں کے حقوق

[یعنی یتیموں، مسکینوں، معذوروں، مسافروں، بیوہ عورتوں، غلاموں قیدیوں، بیماروں وغیرہ آفت رسیدوں اور مصیبت زدوں کے حقوق اور ان کے بارہ میں اہل استطاعت کے فرائض]

اس بارہ میں بھی پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایات اس کثرت اور اتنی تفصیل سے ہیں کہ اگر ان سب کو علٰحدہ تفصیل وار جمع کیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے لیکن ناظرین کرام کو معلوم ہی کہ اس سلسلہ کا اصل موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا اثبات ہے اور اس مدعا پر ہمارا ایک استدلال چونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مطابق فطرت اور ضامن صلاح و فلاح تعلیمات سے بھی ہے اس لیے محض ذیلی طور پر ہمیں آپ کی ان ہدایات کا بھی صرف نمونہ پیش کرنا ہے اور اسی واسطے اجمال و اختصار ہمارے لیے ناگزیر ہے۔

قرآن پاک میں جس طرح ماں باپ یا اولاد کے ساتھ حسن سلوک، اور رعایت حقوق کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی طرح بلکہ اکثر و بیشتر اُسی کے ساتھ یتیموں، مسکینوں (ناداروں، مفلسوں اور حاجتمندوں) کی خبر گیری اور مددگاری کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں ارشاد فرمایا گیا

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً وبالوالدین احساناً وبذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب

اور خدا کی ہی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک رکھو نیز دوسرے قرابت داروں اور یتیموں، مسکینوں، عام

والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم۔	پڑوسیوں، اور مسافروں، اور غلاموں کے ساتھ نیکی کرو۔

اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت میں انسان کی نیکی اور مقبولیت اعمال کے لیے صحت ایمان اور درستگیٔ عقائد کے ساتھ ایک شرط یہ بھی لگائی گئی کہ وہ مال کی محبت و چاہت کے باوجود، حاجتمند قرابت داروں یتیموں، مسکینوں مسافروں اور سائلوں کو دیتا رہتا ہو اور غلاموں کے آزاد کرانے میں بے دریغ خرچ کرتا ہو۔ فرمایا گیا

ولکن البر من اٰمن باللہ والیوم الاخر والملئکۃ والکتٰب والنبین واٰتی المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ والیتٰمیٰ والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب۔ (الآیۃ)	اور لیکن اصل نیکی تو بس اس کی ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر اور فرشتوں اور کتب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان لایا اور جس نے اپنا مال اُس کی محبت کے باوجود اہل قرابت، اور یتیموں اور غریبوں مسکینوں اور مسافروں اور سائلوں کو دیا اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کیا۔

اور سورۂ "ذاریات" میں مستحق جنت مسلمانوں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہو کہ

والذین فی اموالھم حق للسائل والمحروم ط	اور وہ ہیں جن کے مالوں میں سائلوں اور قسمت رسیدوں و مصیبت زدوں کا بھی حصہ ہے

اور سورۂ دھر میں خدا کے نیک بندوں کی نشان یوں بیان کی گئی ہے کہ

ویطعمون الطعام علیٰ حبہ مسکینا ویتیما واسیرا۔ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا ۵	اور وہ کھانے کی ذاتی رغبت اور خواہش کے باوجود محتاجوں اور یتیموں اور اسیروں کو اپنا کھانا کھلادیتے ہیں (اور ساتھ ہی یہ کہکر انہیں مطمئن بھی کر دیتے ہیں کہ)

ہم تمھیں صرف اللہ کے واسطے یہ کھلا رہے ہیں نہ ہم تم سے اس کا کوئی بدلا چاہتے ہیں اور نہ تمہاری شکر گزاری ہمیں مطلوب ہے اور اس کے برعکس یتیموں، مسکینوں سے بے پروائی اور اُن کو دھتکارنا قرآن، کافری نشان بتلاتا ہے۔

ارأیت الذی یکذب بالدین ہ فذلک الذی یدع الیتیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین ط	کیا تونے اس کو دیکھا جو دین (یا یوم جزاء و سزا) کو جھٹلاتا ہے، پس یہی وہ ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا

ہے اور مسکینوں کے کھلانے کی (اوروں کو بھی) ترغیب نہیں دیتا۔

ایک دوسری جگہ بعض سخت قسم کے مجرموں سے خطاب کرکے کہا گیا ہے۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ط	نہیں ہرگز نہیں! بلکہ تم یتیموں کی خاطرداری نہیں کرتے ہو اور مساکین کو کھلانے کی آپس میں ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے ہو

ایک اور آیت میں فرمایا گیا:-

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ہ	خبردار! یتیم کو نہ دباؤ اور سائل کو نہ ڈانٹو!!

پھر قرآن پاک کی ان آیات کے علاوہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات (احادیث) میں بھی اس بارہ میں امت کو خاص ہدایات دی گئی ہیں اور صحاب خیر کو طرح طرح سے ان نیکیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے مثلاً یتیموں کی خدمت کی طرف ترغیب دلاتے ہوئے ایک دفعہ آپ نے اپنی دو انگلیاں قریب کرکے ارشاد فرمایا۔

انا وکافل الیتیم فی الجنۃ ھکذا واشار بالسبابۃ والوسطے (بخاری۔ ترمذی ابوداؤد)	میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنّت میں اس طرح قریب قریب ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:-

خیر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یحسن الیہ وشر بیت فی المسلمین بیت فیہ یتیم یساء الیہ (جمع الفوائد بحوالہ ابن ماجہ)	مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ احسان کیا جاتا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو

اور مسند احمد میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی قساوت قلب (سخت دلی) کی شکایت کی آپ نے اس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا کہ

امسح راس الیتیم واطعم المسکین	یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکینوں محتاجوں کو کھانا کھلایا کرو۔

آنحضرت کی اسی قسم کی تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ اسلام کے قرن اوّل میں گویا ہر مسلمان کسی نہ کسی یتیم کا کفیل اور والی تھا اور قریب قریب ہر اسلامی گھرانہ اپنی حیثیت اور استطاعت کے مطابق یتیم خانہ اور محتاج خانہ بنا ہوا تھا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بے والی وارث بیوہ عورتوں اور غریبوں محتاجوں کی خدمت اور ان کی خبرگیری کا ثواب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

الساعی علی الارملة والمسکین کا المجاهد فی سبیل اللہ وکالذی یصوم النهار ویقوم اللیل (بخاری)	بیوہ عورتوں اور غریب محتاجوں کیلئے دوڑ دھوپ کرنیوالا راہ خدا میں جہاد کرنیوالے کی طرح اور اس دائمی عبادت گذار کے برابر ہے جو دنکو روزہ رکھے اور رات نماز میں گزارے۔

ایک اور حدیث میں آپ نے کسی مصیبت زدہ اور حاجتمند کی مددگاری اور حاجت براری کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

من نفس عن مومن کربة من کرب الدنیا نفس اللہ عنه کربة من کرب یوم القیمة ومن یسر علی معسر یسر اللہ علیه فی الدنیا والآخرة ومن ستر مسلماً ستره اللہ فی الدنیا والاخرة واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیه۔ (مسلم، ترمذی، ابوداؤد جمع الفوائد)	جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کردے گا اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا اور اسے سہولت دیگا تو اللہ تعالےٰ دنیا و آخرت میں اس پر آسانی کرے گا۔ اور جو کسی مسلمان کی پردہ داری کرے گا اللہ تعالےٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ داری کرے گا۔

اور اللہ تعالےٰ بندہ کی مدد میں رہتا ہے جب تک کہ وہ بندہ اپنے دوسرے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے:۔

من مشی فی حاجة اخیه کان خیراً له من اعتکاف عشر سنین۔ (الحدیث) (الاوسط بضعف جمع الفوائد)	اور جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت میں چلے پھرے تو یہ اس کے لئے دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آپ نے مسلمانوں کو عام حکم دیا:۔

اطعموا الجائع وعودوا المریض و فکوا العانی۔	بھوکوں کو کھلاؤ، بیماروں کی خبر لو اور قیدیوں کو چھڑاؤ۔

اس حدیث میں مسلم وکافر کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل بھی یہی تھا

کہ غیر مسلم بھوکوں کو بھی آپ برابر کھلواتے تھے۔ علی ہذا غیر مسلم بیماروں کی خبر بھی لیتے تھے۔

جن لوگوں کی بیٹھک سر راہ رہتی تھی اُن کو آپ نے ہدایت فرمائی کہ اگر یہاں بیٹھتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ حضرت راستہ کا حق کیا ہے؟ آپ نے چند چیزیں فرمائیں اُن میں سے دو باتیں یہ بھی تھیں کہ

وتغیثوا الملهوف وتهدوا الضال

مصیبت زدوں کی مدد کرو اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتاؤ

اس میں بھی آپ نے مسلم و کافر کی کوئی قید نہیں لگائی اور ہر ملت کے مصیبت زدوں اور گم کردہ راہوں کی دستگیری اور رہنمائی کی ہدایت فرمائی۔

ایک اور حدیث میں اس سے زیادہ عموم کے ساتھ ارشاد فرمایا

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء

اے لوگو زمین میں رہنے بسنے والی سب مخلوق پر رحم کھاؤ آسمان کا رب تم پر رحم کرے گا۔

دوسری بعض احادیث میں آپ نے صراحت کے ساتھ جانوروں تک کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید فرمائی ہے اور اس کو کار ثواب بتلایا ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ آخر آپ قرآن کی زبان میں رحمۃ للعلمین ہیں۔

سنن ابی داؤد میں حضرت سہل بن الحنظلیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک اونٹ

مرّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلم ببعیرٍ قد لحق ظهرہ ببطنه فقال اتّقوا اللہ فی هذہ البهائم المعجمة فارکبوها صالحة وکلوها صالحة (جمع الفوائد)

پر ہوا جس کا پیٹ (بوجہ مسلسل بھوکوں کے) پیٹھ سے لگ گیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ ان بے زبان جانوروں کے بارے میں خدا سے ڈرو ان پر سواری کرو تو اچھی حالت میں کرو اور ان کو کھاؤ تو اچھی حالت میں کھاؤ۔

اور سنن ابی داؤد ہی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے وہاں ایک اونٹ تھا جو آپکو دیکھکر بلبلایا اور آبدیدہ ہو گیا آپ اس کے پاس گئے اور اسکی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا پھر آپ نے فرمایا یہ کسکا اونٹ ہے اسکا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ اونٹ میرا ہے آپ نے اُس سے فرمایا:

افلا تتقی اللہ فی هذہ البهیمة التی ملّکک اللہ ایاها فانه شکی الیّ انک تجیعه وتدئبه (جمع الفوائد)

اس جانور کے بارے میں جسکا خدا نے تم کو مالک بنا دیا ہے کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسکو بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔

صحیح بخاری نیز دیگر صحاح میں ہے آپ نے فرمایا کہ

بینا رجل یمشی بطریق اشتد علیہ العطش فوجد بئراً فنزل فیہا فشرب ثم خرج فاذا کلب یلہث یاکل الثریٰ من العطش فقال الرجل لقد بلغ ھذا الکلب من العطش مثل الذی کان بلغ منی فنزل البئر فملأ خفہ ثم امسکہ بفیہ حتی رقی فسقی الکلب فشکر اللہ لہ فغفر لہ فقالوا یارسول اللہ ان لنا فی البہائم اجراً؟ فقال فی کل کبد رطبۃ اجرٌ (جمع الفوائد)

ایک شخص راستہ میں چلا جارہا تھا اسے شدت کی پیاس لگی، اتفاقاً ایک کنواں مل گیا وہ اس میں اُترا جب پانی پی کر نکل آیا تو دیکھا کہ ایک کتا زبان نکالے ہوئے ہے اور پیاس کی وجہ سے کیچڑ کھا رہا ہے اس شخص نے اپنے دل میں کہا اس کو بھی ایسی ہی پیاس لگی ہے جیسی کہ مجھے لگی تھی یہ خیال کرکے وہ پھر کنوئیں میں اترا اور اپنے موزے میں پانی بھر کے اسکو دانتوں سے پکڑ کر اوپر چڑھا اور کتے کو پانی پلا دیا، اللہ نے اُس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کی مغفرت فرمادی — صحابہ نے یہ واقعہ سُن کر عرض کیا حضرت کیا جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے بھی ثواب ملتا ہے؟ فرمایا کہ ہاں ہر جاندار کے ساتھ سلوک کرنے میں ثواب ہے۔

اور مسند احمد میں "حضرت قرۃ بن ایاس" سے مروی ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ میں جب بکری ذبح کرتا ہوں تو اپنے دل میں اس کے لیئے رحم پاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا:-

والشاۃ ان رحمتہا رحمک اللہ (جمع الفوائد)

بکری پر بھی اگر تمہیں رحم آئے گا تو اللہ تعالیٰ تم پر رحم کریگا

اور معجم کبیر میں حضرت ابوامامہ سے مروی ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من رحم ولو ذبیحۃ عصفور رحمہ اللہ یوم القیمۃ (جمع الفوائد)

جو کوئی ذبح کی ہوئی چڑیا (گنجشک) پر بھی رحم کھائیگا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس پر رحم فرمائیگا۔

اسی اصول کے ماتحت شریعت اسلام میں اُن جانوروں کے قتل کو گناہ قرار دیا گیا ہے جو انسان کی غذا نہیں بنتے اور جو موذی بھی نہیں ہیں — اور غذا وغیرہ کی ضرورت سے جو جانور ذبح کیئے جاتے ہیں اُن کے متعلق بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ ان کو پانی وغیرہ پلا لیا جائے، چھُری ان کے سامنے تیز نہ کی جائے ذبح اس طرح کیا جائے کہ جلد سے جلد روح نکل جائے — یہ تمام احکام پوری تفصیل کے ساتھ کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ "رحمۃ للعالمین" صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں رحم کا کتنا دخل ہے اور آپ کی "رحمت" کتنی ہمہ گیر ہے۔

(باقی)

خاکسار تحریک پر ایک نظر

(از جناب مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔اے ایڈیٹر برہان دہلی)

کلکتہ کے بعض سنجیدہ طبقوں کی طرف سے "ندوۃ المصنفین دہلی" کے علماء سے خاکسار تحریک کے متعلق ایک سنجیدہ استفسار کیا گیا تھا، مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی اڈیٹر برہان نے اس کا جو سنجیدہ جواب دیا ہے ہم ادارہ برہان کے شکریہ کے ساتھ اس کو یہاں درج کرتے ہیں:۔

سب سے پہلی اور اصولی بات یہ ہے کہ دُنیا کی ہر تحریک کسی خاص نصب العین اور کسی خاص مقصد پر قایم ہوتی ہے۔ اور اس مقصد کی اچھائی اور بُرائی پر ہی اس تحریک کی اچھائی اور بُرائی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ خاکسار تحریک کا مقصد کیا ہے؟ آیا وہ کوئی خالص اسلامی مقصد ہے۔ یا وہ کوئی ایسا بین الاقوامی مقصد ہے جس کی افادیت مسلمانوں اور دوسری قوموں سب کے لیئے یکساں ہے۔ خاکسار تحریک پر جب ہم اس زاویہ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس عجیب و غریب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس تحریک کا اب تک کوئی خاص نصب العین متعین ہی نہیں ہو سکا ہے یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان لوگوں کی منزل مقصود کیا ہے؟ انھوں نے کس مقام کو اپنے سفر کا منتہا بنایا ہے؟ اور یہ کہاں پہنچنا چاہتے ہیں؟ ایک طرف اس تحریک کے بانی کا اعلان یہ ہے:۔

> ہم اس تحریک کے اندر کم از کم دس لاکھ سپاہیوں کی ایک پُر امن، پابند قانون قواعد داں، مطیع خدا، اور منکر ماسوا، بے غرض حکم ماننے والی خادم خلق، ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی، اچھوت، سب پر مشتمل ایک جماعت تیار کرنا چاہتے ہیں۔
>
> (قول فیصل نمبر ۲۱)

پھر ۲۱ نومبر ۳۹ء کے "الاصلاح" میں چھپیں لاکھ نئے خاکساروں کی بھرتی کے متعلق ایک سرکلر شائع کرتے ہوئے یہ اعلان کیا جاتا ہے۔

ان خاکساروں کی بھرتی بالحاظ مذہب و ملت ہو، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، اچھوت انگریز سب کے لیے کھلا دروازہ ہو"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاکسار تحریک خالص اسلامی تحریک نہیں بلکہ اس کی حیثیت کسی بین الاقوامی تحریک کی ہی، لیکن دوسری طرف جس چیز کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ خاکسار تحریک کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی صولت وسطوت کو تمام دنیا میں از سرِ نو قایم کر دینا ہے۔ ایک سنجیدہ و متین شخص جب ان دو متضاد باتوں پر غور کرتا ہے تو حیرت و استعجاب میں غرق ہو جاتا ہے، اور وہ نہیں سمجھ سکتا کہ آخر اس تحریک کا خصوصی مطمح نظر کیا ہے؟ آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں تو ل فیصل کا مذکورہ بالا اعلان ذرا غور سے پڑھیے، آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ چار سطریں ہی اپنے اندر کس قدر تضاد رکھتی ہیں۔ اس اعلان میں ایک طرف تو مشرقی صاحب خاکسار سپاہی کے لیے "مطیعِ خدا" "منکرِ ماسوا" ہونا شرط قرار دیتے ہیں۔ لیکن دوسری جانب وہ اس میں ہندوؤں اور عیسائیوں کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ گویا مشرقی صاحب کے نزدیک ایک ہندو یا عیسائی بھی "مطیع خدا" اور "منکر ماسوا" ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ایک ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ اسلام میں کسی شخص کو صحیح معنی میں اُس وقت تک مطیعِ خدا نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے اعمال کی بنیاد صحیح ایمان پر قایم نہ ہو۔ رہا "منکر ماسوا" تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو مشرقی صاحب کی مذاہب سے بے خبری کہا جائے یا اُن کا حد سے زیادہ بھولا پن، کہ وہ ہندوؤں اور پارسیوں اور عیسائیوں کو بھی "منکر ماسوا" قرار دیتے ہیں

مشرقی صاحب کے بیانات کا تضاد یہیں تک محدود نہیں ہے۔ اگر اُن کی کتاب "تذکرہ" "اشارات" اور اُن کے رسائل و اخبارات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ اس تحریک کے بانی کا دماغ یا تو کسی قطعی نصب العین کی تعیین و تشخیص سے یکسر معرا ہے۔ یا اگر کوئی نصب العین دماغ میں موجود ہے بھی تو اُس نے اب تک اُس کا اظہار نہیں کیا۔

پس ایسی حالت میں مشرقی صاحب کی آواز پر مسلمانوں کا اُن کے گرد و پیش جمع ہو جانا بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک شخص جنگل میں کھڑا ہو کر شور و غل مچاتا ہے لوگ نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مگر پھر بھی بے تحاشا اُس کی طرف دوڑے چلے جاتے ہیں۔ پھر جب وہاں پہونچتے ہیں تو انھیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیوانہ

اپنی دیوانگی کے جوش میں زور زور سے بڑبڑا رہا تھا، اور بے معنی الفاظ بک رہا تھا اب ان کو اپنی فضول جد و جہد پر سخت ندامت ہوتی ہی اور وہ اپنا سامنہ لیکر اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے ہیں۔

اور اگر تھوڑی دیر کے لیئے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ خاکسار تحریک کا مقصد واقعی اعلاء کلمۃ اللہ اور خلافت الٰہی کا قیام ہے۔ تو اب ہم کو اُن طُرقِ عمل کا جائزہ لینا چاہیئے۔ جو عموماً خاکساروں کو اختیار کرنے پڑتے ہیں ہر شخص کو معلوم ہے، تحریک میں داخل ہونیوالے کے لیئے یہ عہد کرنا ضروری ہے کہ وہ اپنے امیر کو حاکم علی الاطلاق مانیگا اور اُس کے ہر حکم کی تعمیل وہ بے چون وچرا کریگا۔ اس نوع کا عہد و پیمان اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے قرآن مجید میں جگہ جگہ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی دعوت دی گئی ہے۔ اور حدیث میں صاف لفظوں میں ہو "لاطاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق انما الطاعۃ فی المعروف"۔ کون مسلمان نہیں جانتا کہ آمر مطلق اور حاکم علی الاطلاق سوائے رب العالمین کے کوئی دوسری ذات نہیں ہوسکتی۔ بس سمجھ میں نہیں آتا کہ خاکسار تحریک کے علمبردار یہ کیسے نبوی اسلام کی شوکت و عظمت کا پرچم اُڑانے چلے ہیں کہ پہلے ہی قدم پر اُن کا رُخ کعبہ کی بجائے تبوالمہ کی طرف مُڑ گیا ہے۔ کیا کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیئے بھی تصوّر کرسکتا ہے کہ جس عمارت میں نمرود و فرعون اور ہامان و شدّاد کے مجسّمے جگہ جگہ نصب ہوں اُس سے مسجد کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی اطاعت مطلقہ کی دعوت اس چیز کی غمازی کرتی ہے کہ یہ تحریک اسلامی روح سے یکسر خالی ہے اور اس کا مقصد مسلمانوں کا تمکن فی الارض" نہیں بلکہ خود اپنا تمکن و تمرفع ہے، پھر روزمرہ کی زندگی میں خاکساروں کے جو اعمال و افعال دیکھے گئے ہیں اُن سے بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کی ذہنی اور جسمانی تربیت و تنظیم خالص اسلامی طریقہ پر نہیں ہو رہی ہی جس کی وجہ سے ان میں شعائر دین کے احترام کا جذبہ کامل پایا جائے۔

گزشتہ ماہِ رمضان میں جبکہ خاکسار لکھنؤ میں یو۔ پی گورنمنٹ کے خلاف مظاہرے کرنے کے لیے ہندوستان کے ہر گوشہ سے دہلی میں جمع ہو رہے تھے اور انھوں نے اپنا کیمپ دفتر "برہان" کے قریب ہی قایم کر رکھا تھا۔ اس زمانہ میں صرف ہم نے نہیں بلکہ دہلی کے سیکڑوں انسانوں نے دیکھا ہے کہ خاکسار روزہ کے دنوں میں صبح شام جوق در جوق ہوٹلوں میں پہونچتے تھے اور نہایت بے باکی کے ساتھ کھانا کھاتے اور چاء پیتے تھے۔ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ مسافر ہونے کی وجہ سے ان پر روزہ فرض نہیں تھا لیکن اگر انکے دلوں میں سلامی شعائر کا کچھ بھی احترام ہوتا تو یہ ہرگز شارع عام پر اس طرح بیباکی کے ساتھ کھانا کھانے اور بازاروں میں سگریٹ کے کش اُڑاتے ہوئے پھرنے کی جسارت نہ کرتے غرضکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہو کہ خاکسار تحریک خالص اسلامی تحریک نہیں ہے۔ اور

زبان سے تمکن فی الارض اور خلافت الٰہیہ کے قیام کے جو دعوے کئے جاتے ہیں وہ سراسر لغو اور بے بنیاد ہیں۔ اور اس بنا پر کوئی مسلمان ایک دقیقہ کے لئے بھی اس تحریک میں اس غرض سے شامل نہیں ہو سکتا کہ وہ اس تحریک کے ذریعہ دنیا میں سطوتِ حق کو قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

ہاں بے شک کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑا شخص کوئی تحریک لے کر اٹھتا ہے وہ لوگوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔ کسی مصلحت سے وہ خاص نصب العین ظاہر نہیں کرتا لیکن جب اس کے پاس لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو جاتا ہے اور وہ سب کسی ایک رشتہ وحدت میں منظم ہو جاتے ہیں تو وہ بیکایک ایک مفید انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ اس وقت تردد و تذبذب کی تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور اس کے مخالفین کو بھی اس شخص کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس تحریک کا قائد اپنے اخلاق و عادات اور کیرکٹر کے لحاظ سے دنیا کا کوئی غیر معمولی انسان ہو۔ اس کے برعکس خاکسار تحریک کے بانی کے اعمال و افعال کا جائزہ لیجئے تو یہاں بھی نہایت مایوس کن حالات نظر آتے ہیں جو شخص اتنی بڑی تحریک کا قائد ہونے کے باوجود ایک معمولی گورنمنٹ (یو۔پی) سے معافی مانگ لے، اپنی بات سے ہٹ جائے اور اس پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے گورنمنٹ آف انڈیا کو جنگ کے لیئے پچاس ہزار خاکساروں کو پیش کش دینے میں ذرا شرم محسوس نہ کرے۔ پھر دلّی میں گرفتار ہو تو پولیس کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ فق ہو جائے اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایسا متلون مزاج، تملق پسند، کمزور دل اور ڈرپوک انسان اس قابل ہے کہ اس سے نصب العین کی تعیین کرائے بغیر ہی ہزار در ہزار انسان اس کو اپنا قائد تسلیم کر لیں اور اطاعتِ مطلقہ کے عہد و پیمان کے لیئے اس کے ہاتھ پر بیعت کریں، اور اپنی موت و حیات کے لیئے اس کے فیصلہ کو ناطق قرار دیں۔

اس گزارش سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ خاکسار تحریک نہ تو اپنا کوئی ایسا متعین نصب العین رکھتی ہے جس کو اسلامی نصب العین کہا جائے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اسلامی یا غیر اسلامی اس کا کوئی اجتماعی نصب العین ہے ہی نہیں اور نہ اس تحریک کا بانی اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ مسلمان اس پر اعتماد کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور بے سوچے سمجھے اس کی پیروی کرنے لگیں۔

اب ہم اُن چند چیزوں کی طرف اشارے کرتے ہیں جو عموماً مسلمانوں کے لیے اس تحریک میں شمولیت کی داعی بنی ہوئی ہیں وہ چیزیں یہ ہیں

(۱) فوجی تنظیم (۲) جسمانی ورزش (۳) ایک خاص ڈسپلن (۴) خاکساروں کی غیر معمولی بہادری اور پامردی۔

اوّل الذکر تین چیزوں پر گفتگو کرنے سے قبل ایک مرتبہ پھر آپ کو یہ یاد کر لینا چاہیئے کہ اِس وقت آپکو خاکسار تحریک سے متعلق اپنے ذہن میں صرف یہ تصوّر قایم رکھنا چاہیے کہ وہ محض ایک تنظیمی یا معاشرتی تحریک ہی اب اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس پر غور کیجیے کہ تنظیم بجائے خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ اور اس لیئے جو کام محض تنظیم کے لیئے کیا جائے گا وہ کبھی کبھی نتیجۃً کامیاب نہیں ہوسکتا۔ مسلمانوں کی تنظیم کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اُن میں اسلامی ربط، اسلامی نظم، اور اسلامی وحدتِ خیال وعمل پائی جائے پس ہر وہ تنظیم جس کی مسلمانوں کو دعوت دی جائے انھیں سوچنا چاہیئے کہ اس پر عمل پیرا ہو کر وہ کس حد تک اپنے اسلامی مقاصد میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں؟ اس نقطۂ نظر سے ہم خاکساروں کا تنظیمی پروگرام دیکھتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں شامل ہو جانے سے مسلمانوں کو فائدہ بہت کم اور مضرت شدید پہونچ جائے گی۔ فائدہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اُن کو فوجی قواعد کی مشق ہو جائیگی اُن کے جسم ورزش کے اثر سے چست اور موزوں ہو جائیں گے لیکن روحانی، اخلاقی اور دینی اعتبار سے اُن کو جس ضررِ عظیم کے پہونچ جانے کا اندیشہ ہے شاید مسلمانوں کے لیئے اس وقت اس کا تصوّر بھی دُشوار ہے۔ ذرا سنجیدگی سے سوچیئے۔ آپ جو شخص اپنی رہنمائی میں لے کر چل رہا ہے وہ اپنے دینی عقائد اور ذاتی کیرکٹر کے لحاظ سے کس درجہ ناقابلِ اعتبار شخص ہے پھر وہ آپ سے صرف یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی تحریک سے تنظیم قایم کرنا چاہتا ہوں بلکہ علی الاعلان اور بڑے اصرار کے ساتھ وہ آپکے اسلام کا مذاق اُڑاتا ہے، اُس پر پھبتیاں کستا ہے، آیات میں کھلی تحریف کرتا ہے۔ احادیث کا منکر ہی اور دعویٰ یہ کرتا ہے کہ میں مصنوعی اور رسمی اسلام کو مٹا کر نبوی اسلام کو قائم کرنا چاہتا ہوں۔ ایسے شخص کی قیادت میں اگر آپ کسی تنظیمی تحریک کے ممبر ہوگئے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کا معاملہ صرف جسمانی اور فوجی تنظیم تک محدود رہے گا اور اس سے گزر کر وہ آپ کے ایمان، اخلاق، اور اسلامی خصائل تک نہیں پہونچیگا؟ پہونچیگا اور ضرور پہونچیگا۔ پس اگر آپ خاکسار تحریک میں شامل ہوتے ہیں تو زبان سے یہ کہہ کر اپنے نفس کو اور دوسروں کو فریب نہ دیجیے کہ آپ تنظیم کی خاطر اُس میں شریک ہو رہے ہیں بلکہ یقین کر لیجیے کہ آپ کے قائد کی بے راہ روی ایمان وعمل دونوں کے اعتبار سے

ایک دن آپ کو قعر ہلاکت میں گرا کر رہے گی۔

رہی چوتھی چیز یعنی خاکساروں کی دلیری و مردانگی اور ان کی جفاکشانہ زندگی تو اس کے جواب میں آپ کو اصولی اعتبار سے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خواہ کوئی عمل فی ذاتہ کتنا ہی اچھا اور لائق تحسین ہو لیکن اس کی بنیاد حسن نیت پاک ارادہ اور مقصد خیر پر نہیں ہے تو ضابطۂ اخلاق میں کبھی اس کی تعریف نہیں کی جائے گی اور اس کو فضائل میں شمار کرنے کے بجائے رذائل کی فہرست میں ہی شامل کیا جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے جس طرح ایک جہاد کرنے والی فوج میں جذبۂ ایثار و فداکاری، خاص ڈسپلن، اطاعت امیر کا جذبہ، اور وحدتِ خیال و عمل پائی جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح ڈاکوؤں اور لیٹروں کی منظم اور باقاعدہ جماعت میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، پھر دلیری و پامردی جماعتِ حقہ کی ہی خصوصیت نہیں، بعض اوقات باطل پرست بھی حق کے مقابلہ میں حیرت انگیز شجاعت و بسالت کا اظہار کرتے ہیں اس میں شک نہیں ان افعال کو علم الاخلاق کی روشنی میں شجاعت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ افعال شجاعانہ ضرور ہوتے ہیں، اور اس بنا پر وہ دیکھنے والوں اور سننے والوں کے دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے خوارج کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ فرقہ سرتاسر گمراہ ہونے کے باوجود اپنے خیالات و عقائد میں نہایت راسخ تھا۔ ان کے مرد تو مرد، عورتیں تک اس درجہ پختہ خیال اور دلیر تھیں کہ ان کو شدید سے شدید جسمانی اذیتیں پہونچائی گئیں، ان کے اعضا کاٹ کاٹ کر دوپہر کے وقت تپتے ہوئے ریت پر انھیں تڑپنے اور سسکنے کے لیئے کھلے میدانوں میں ڈال دیا گیا لیکن ایک لمحہ کے لیئے ان کے خیالات میں تذبذب پیدا نہیں ہوا اور یوں ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ حجاج ثقفی ایسا ظالم و جابر اموی گورنران پر طرح طرح کی سختیاں کرتا تھا، لیکن یہ پھر بھی اپنے اعمال و افکار سے باز نہیں آتے تھے۔ دور کیوں جایئے، ایران کے فرقہ بابیہ کو دیکھیئے ان کو کیسی کیسی سختیوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن یہ لوگ اپنے عقائد و خیالات سے تائب نہیں ہوئے۔

ان حالات میں آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے مستقل مزاج تھے اپنے خیالات میں نہایت مضبوط اور پختہ تھے لیکن یہ تو نہیں کر سکتے کہ ان کے استقلال کو دیکھ کر ان کے خیالات و عقائد کو بھی قبول کر لیں۔ بس اسی پر خاکساروں کی بہادری اور جانبازی کو قیاس کر لیجیئے۔ اس جماعت نے جس اندازکی

بلند شہر اور لاہور کے واقعات میں اپنے سینہ پر گولیاں کھائیں اور جان دی ہر شخص کو پورا حق ہے، اس حادثہ پر اظہار افسوس کرے نہ صرف اظہارِ افسوس کرے بلکہ اپنے دل میں اُس کی چبھن محسوس کرے۔ تاہم اس سے متجاوز ہو کر یہ نتیجہ نکالنا کہ اُنھوں نے جس تحریک کی خاطر یہ اقدام کیا ہے وہ بھی درست اور صحیح ہے، سراسر ایک خطرناک مغالطہ اور ہلاکت انگیز ذہنی عدم توازن ہے۔

جن لوگوں نے نفسیات اجتماع کا مطالعہ کیا ہے اُنھیں معلوم ہوگا، موسیو لیبان کے نظریہ کے مطابق کسی تحریک کے قائد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے زورِ تقریر یا زورِ تحریر سے اپنے پیرووں کے دل و دماغ کو اس درجہ مفلوج کر دے کہ وہ بے سوچے سمجھے اُس کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں۔ یہاں تک کہ اُنھیں اس راہ میں اپنی جانیں تلف کر دینے میں بھی دریغ نہ ہو۔ پس آج کل یہی حال خاکسار تحریک کا ہے۔ ایک آواز ہے جس کے پیچھے لوگ دوڑے چلے جا رہے ہیں، ایک حکم ہے جس کی تعمیل میں اپنے اپنے وطنوں اور گھروں کو خیرباد کہہ کر چند ہزار انسان سر سے کفن باندھ کر نکل پڑے ہیں۔ ایک نغمہ ہے جس کے زیر و بم پر سُننے والے رقص کر رہے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ اُنھیں کس چیز کی طرف بلایا جا رہا ہے اُنھیں شہد و انگبیں کا جو جام دیا گیا ہے، اُس میں کہیں زہر تو ملا ہوا نہیں ہے۔ اور اُنھیں جس راہ پر لے جایا جا رہا ہے کہیں اس کی انتہا ہلاکت و بربادی کے ہولناک غاروں پر تو نہیں ہوتی۔

جس طرح ایک مجاہد فی سبیل اللہ میدانِ جنگ میں اپنی جان دیتا ہے۔ اسی طرح دُنیا کی مصیبتوں سے ایک تنگ آیا ہوا انسان بھی دشنہ و خنجر سے اپنی زندگی ختم کر دیتا ہے مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک کے لئے فردوس و نعیم کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور خداوندی انعام و اکرام کا ہاتھ اُس کو حیاتِ جاوید کا خلعتِ زرّیں پہنا دیتا ہے اور اس کے برخلاف دوسرے کے لئے خودکشی کے جرم میں دائمی نکبت و خسران کی سزا تجویز کی جاتی ہے اور ایسا کرنے میں قدرت کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ اس شخص نے دنیوی مصائب سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا تھا، اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ جو شخص جذبات کی رَو میں بہہ کر عقل سے کام نہیں لیتا اور اپنے ہوش و حواس معطل کر کے بیٹھ جاتا ہے وہ یقیناً قانونِ "قدرت" کا مجرم ہے اور اس لیئے اُس کو سزا ملنی چاہیئے۔

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ خاکسار تحریک کے بنیادی اصول پر غور کریں اور اس کے بانی کی صحیح ذہنیت سے واقفیت بہم پہونچائیں۔ اُس کے اقوال و اعمال کو عقل و شریعت

کی روشنی میں پرکھنے اور جانچنے کی سعی کریں، اور اس تحریک کے تمام پہلوؤں کا تجزیہ کر کے یہ معلوم کریں کہ اس میں شامل ہونے سے آپ کو فائدہ کتنا ہوگا اور نقصان کس قدر؟ اور پھر اگر آپ کی تحقیق سے یہ ثابت ہو کہ فائدہ سرسری اور عارضی ہے اور نقصان شدید اور مستقل۔ تو آپ کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ نہ آپ خود اس میں شریک ہونگے اور نہ اپنے کسی بھائی کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دیں گے۔

مساجد میں خاکساروں کی پناہ گزینی

"خاکسار بہادروں" نے حکومت پنجاب سے مقابلہ کا ایک نیا نرالا طریقہ یہ نکالا ہے کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے باہر سڑکوں اور بازاروں میں مارچ کرتے ہیں لیکن جب پولیس انکو گرفتار کرنیکے لیے پہنچتی ہے تو یہ بہادر (جنکا "مطاع مطلق" امام ہمیشہ بیچارے "ملا" کو مسجد میں روپوشی اور خیراتی روٹی کھانیکا طعنہ دیا کرتا تھا) بھاگ کر کسی قریب کی مسجد میں روپوش ہو جاتے ہیں اور محلہ والوں کی روٹیوں ہی پر گزارا کرتے ہیں تاکہ پولیس مسجد کے احترام کے خیال سے وہاں ان کو گرفتار نہ کر سکے اور اگر پولیس والے ایسا کر بیٹھیں تو ان کو یہ شور کرنے کا موقع مل جائے کہ دیکھو مسلمانو ان پولیس والوں نے مسجد میں ہمیں گرفتار کر کے "مداخلت فی الدین" کر ڈالی۔ خاکساروں کے اس طرز عمل نے ایک نیا مسئلہ یہ پیدا کر دیا ہے کہ آیا اس طرح مساجد کو بطور پناہ گاہ کے استعمال کرنا درست ہے یا نہیں؟ اسکے جواب میں خاکساروں کے بعض حامیوں نے عجیب و غریب "علمی و فقہی" موشگافیاں فرمائی ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ نماز پنجگانہ، اذکار و اشغال اور نوافل و تلاوت قرآن پاک کے علاوہ مساجد دیگر مصالح اسلامیہ کیلیے بھی استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن خاکساروں کی ان حرکات کو "مصالح اسلامیہ" میں شمار کرنا اس مقدس عنوان کی بھی توہین کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ حکومت پنجاب کے ساتھ انکے اس ٹکراؤ میں "ادارۂ علیہ" کی کچھ مصالح ہوں یا علامہ مشرقی کے سمجھے اور بتلائے ہوئے اسلام کا کوئی فائدہ ہو۔۔۔ لیکن پوری بصیرت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام اور اس پر ایمان لانیوالی "امت مسلمہ" کا اسمیں کوئی فائدہ اور کوئی مصلحت نہیں ہے، بلکہ کھلی ہوئی مضرتیں ہیں۔

ذرا حاضر حواس ہو کر سوچیے کہ اگر "من دخلہ کان آمنا" کی غلط تاویل کر کے ایسے لوگوں کو جو "قانونی مجرم" ہوں یا حکومت سے خود متصادم ہو گئے ہوں اور قانون شکنی کر کے گرفتاری سے بچنے کے لئے مساجد کی پناہ لیتے ہوں مساجد کو پناہ گاہ بنانیکی اجازت مسلمانوں نے دیدی تو اس کا نتیجہ خدانخواستہ یہ ہوگا کہ بعض حالات میں مجبور ہو کر حکومت مساجد میں بھی گرفتاریاں شروع کر دیگی جس سے مسلمانوں کو سخت روحانی اذیت بھی ہوگی، اور اسمیں بلووں تک کے اندیشے ہونگے۔۔۔ پھر اسکے نتائج یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ حکومت مساجد کی تعمیر میں اور اسکی موقع و محل کیلیے سخت اور نامناسب رویہ اختیار کر لے۔

نیز پھر مسلمانوں کی دیکھا دیکھی سکھ اور ہندو بھی حکومت کو پریشان کرنیکے لیے اسی طرح اپنے گردواروں اور مندروں کو استعمال کرنے لگیں گے اور اسی طرح ہر حکومت کیلیے تمام فرقوں کی امن سوز سرگرمیوں کو روکنا مشکل ہو جائیگا۔۔۔ ان چیزوں پر غور کرنیکے بعد کوئی دانشمند بھی خاکساروں کی اس حرکت کی ہمت افزائی نہیں کر سکتا اور نہ شریعت اسلامیہ کے احکام میں اسکی گنجائش ہے۔ بس خاکسار صاحبان اگر حکومت کے احکام کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں تو انھیں بھاگ کر مساجد میں پناہ لینے کا کوئی موقعہ نہیں، یا تو دلیری سے گرفتار ہوں اور اگر اسکے لیے وہ تیار نہیں ہیں تو اپنے گھر بیٹھیں ۔۔۔ کہ ع "عاشقی شیوہ رندانِ بلاکش باشد"۔ قانون شکنی اور پھر جیل سے ڈرنا، حکومت سے تصادم کا اولوالعزمانہ تخیل اور مساجد میں روپوشی تو انتہائی مضحکہ خیز حرکت ہے۔۔۔ وما علینا الا البلاغ

۱ے جسوقت یہ سطریں لکھی گئی تھیں اسوقت یہ محض اندیشہ تھا مگر افسوس کہ بعد میں وقوع میں بھی آگیا اور حکومت نے مساجد میں بھی گرفتاریاں کرنا شروع کر دیں ۱۲

حکومت پنجاب سے خاکساروں کی موجودہ آویزش

عقل و انصاف اور اصول شریعت کی روشنی میں

پنجاب کے ایک مشہور مسلمان لیڈر کا جو حکومت کے بڑے معتمد اور اعلیٰ عہدیدار بھی تھے اور اسلئے آزادی پسند طبقوں میں انتہائی قسم کے "رجعت پسند" اور "خیر خواہ سرکار" سمجھے جاتے تھے، اب سے قریباً پانچ چھ برس پہلے انتقال ہوا، اخبارات نے ماتمی مقالے لکھے اسی سلسلے میں دلی کے ایک مشہور علمبردار حریت "اخبار" نے بھی (جس نے مرحوم کی زندگی میں ہمیشہ ان کو "غدار" اور "انگریز پرست" تک لکھا تھا) ایک دردناک ماتمی مقالہ لکھا جس میں مرحوم کے وہ فضائل و مناقب لکھے کہ اس سے زیادہ ان کا کوئی ہم مشرب اخبار بھی نہیں لکھ سکتا تھا حتےٰ کہ ان کو قوم کا نیک نیت و کامیاب لیڈر اور ملت مخلص خادم بھی لکھا

انھیں دنوں میں مراد آباد کے ریلوے اسٹیشن پر مولنا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سے اتفاقاً راقم الحروف کی ملاقات ہو گئی قارئین کرام میں سے بہت سے اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ شاہ صاحب موصوف ایک کامیاب ترین خطیب ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجے کے خوش طبع اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں مجھے فرمایا "ایک جگہ چار بزرگوں کا عرس ہونے والا ہے میں دعوت دیتا ہوں آپ بھی تشریف لائیگا۔ میں نے تعجب سے دریافت کیا کہ وہ کون چار بزرگ ہیں جن کے عرس میں شرکت کے لئے مجھے دعوت دی جا رہی ہے؟ پورے سکون و وقار کے ساتھ فرمایا حضرت یزید ابن معاویہ حضرت شمر ذی الجوشن حجاج ابن یوسف اور چوتھا نام پنجاب کے انہی متوفی لیڈر کا لیا اور فرمایا ان چاروں بزرگوں کا عرس دلی کے فلاں اخبار کے دفتر میں ہونے والا ہے —— میں نے چونکہ اس اخبار کا وہ ماتمی مقالہ دیکھا تھا اس لئے میں فوراً شاہ صاحب کا مطلب سمجھ گیا اور بیساختہ ہنسی آ گئی۔ فرمانے لگے عجیب دنیا ہے جو بڑے سے بڑا مجرم اور مہا پاپی مرجائے یہ اخبارات والے اس کو اگر "صلے اللہ علیہ وسلم" نہیں تو "رضی اللہ عنہ" تو

بنا ہی دیتے ہیں۔

شاہ صاحب نے تو ایک خاص شخص اور خاص واقعہ کے متعلق یہ اظہار خیال فرمایا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ عقل کی یہ گمراہی آج نہایت عمومیت حاصل کر چکی ہے اور صرف بے اصولے اخبار نویس ہی نہیں بعض اچھے خاصے سنجیدہ حضرات بھی اس رَو میں بہنے لگے ہیں ۔ خاکساروں کے موجودہ مسئلہ میں بھی اسی غلطی کا ظہور ہو رہا ہے ـــــ جو حضرات پہلے سے خاکسار تحریک کے حامی تھے اور اس "مشرقی فوج" کو حزب اللہ اور مجاہدین فی سبیل اللہ سمجھتے تھے اور روئے زمین پر اسلامی غلبے کی توقعات ان سے رکھتے تھے وہ اگر موجودہ مسئلہ میں بھی خاکساروں کی پوری پوری حمایت کریں تو بالکل بجا اور معقول ہے لیکن جو حضرات کل تک یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ جماعت قطعاً غلط رو جماعت ہے اور اسلام کے لیئے اس سے کسی بہتری کی توقع نہیں بلکہ اس کا فروغ اسلام کی تخریب کا باعث ہوگا وہ اگر آج صرف اس لیئے ان کی حمایت کرنے لگیں کہ کسی صوبے کی حکومت نے ان پر کچھ پابندیاں عائد کردی ہیں اور ان کی جماعتی سرگرمیوں کو خلاف قانون قرار دیدیا ہے یا پولیس سے تصادم کی وجہ سے ان میں سے کچھ مقتول یا زخمی ہوگئے ہیں تو ضرور قابل تعجب ہے۔ یہ اصول نہ عقلاً صحیح کہا جاسکتا ہے نہ شرعاً۔

مانا کہ مظلوم کی ہمدردی انسانیت کا مقتضا اور شریعت کا حکم ہے لیکن کیا حکومت کے معتوب سب مجرمین مظلوم کہے جاسکتے ہیں؟ اگر بلا رعایتِ اصول اور بلا امتیازِ حق و ناحق ہر مقتول و مجروح ہمدردی کا مستحق ہے تو پھر جو عام مجرمین آئے دن پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جاتے ہیں یا جن کو دوسری قسم کی سخت سزائیں دی جاتی ہیں کیوں ان سب کے ساتھ اس ہمدردی کا اظہار نہیں کیا جاتا؟ ـــــ بہرحال یہ نہایت غلط اصول ہے کہ جس کو بھی حکومت کی طرف سے کوئی سزا دی جائے یا جس پر حکومت کوئی پابندی عائد کرے وہی مظلوم اور ہمدردی کا مستحق ہو جائے۔

صحیح عادلانہ طریقہ یہ ہے کہ پارٹی بازی یا الیکشنی اغراض اور جماعتوں کی عداوت و محبت کے جذبات سے بالکل بالاتر ہو کر اصل معاملے پر غور کیا جائے پھر اگر سزایاب مجرم، مستحق سزا ٹھہرے تو اس کی کوئی حمایت نہ کی جائے اور اگر وہ بے قصور ثابت ہو اور زیادتی ارکانِ حکومت کی معلوم ہو تو ان کی حمایت و ہمدردی کی جائے۔

خاکساروں کے موجودہ قضیہ کی اصلیت :-

اب ذرا انصاف اور سکون قلب کے ساتھ خاکساروں کے موجودہ قضیہ کی اصلیت پر غور فرمایئے اس کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ حادثۂ لاہور سے تین چار روز پہلے ۱۵ مارچ کے "الاصلاح" میں خود علامہ مشرقی نے واقعات کی جو روئداد لکھی ہے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے بس وہی کافی ہے اور اس وقت میرے سامنے "الاصلاح" کا وہی پرچہ اور اس میں علامہ کا وہی مقالہ ہے اس میں اس حقیقت کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کی نیت خاکسار تحریک کے حق میں صرف اس وقت سے بدلی جبکہ علامہ صاحب نے موجودہ جنگ یورپ کی سلسلہ میں حکومت برطانیہ کے حضور میں پچاس ہزار خاکساروں کی پیش کش کی علامہ صاحب کا بیان ہے کہ سر سکندر کو اس پیش کش سے رنج پہلے ہوا کہ وہ خود حکومت برطانیہ کی اتنی یا اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتے تھے اور اس سے ان کی وفادارانہ یکتائی کو ٹھیس لگتی تھی ـــ علامہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں :-

> وزیر اعظم پنجاب نے ہماری ہلاکت قطعی فیصلہ صرف اسی پچاس ہزار سپاہیوں کی پیشکش کے بعد اور اسی کی وجہ سے کیا انھوں نے سمجھا کہ خاکسار تحریک کا لیڈر انگریز کو پچاس ہزار تربیت یافتہ اور قواعد داں سپاہی تیار اور بلا شرط دیتا ہے..... میں اگر بڑا زور لگاؤں گا تو........ پچاس ہزار سے زیادہ بھرتی کیونکر دیکھونگا الغرض اس نذرانے کے بعد میری کاسہ لیسی اور وفاداری کی قیمت دو کوڑی نہیں رہتی

پھر قریباً ایک ڈیڑھ کالم میں اس پچاس ہزار کی پیشکش کے سلسلہ میں اپنی نیک نیتی اور حکومت برطانیہ کے ساتھ اپنی صدق دلی اور از راہ رقابت سر سکندر کے بہکانے کی وجہ سے سرکار کی بے التفاتی اور ناقدری کا شکوہ آمیز تذکرہ کر کے پھر لکھتے ہیں۔

> جو بات ان تمام واقعات سے نمایاں ہوتی ہے یہ ہے کہ پچاس ہزار کی بھرتی کی پیشکش کے بعد وزیر اعظم پنجاب کی نیت خاکسار تحریک کے متعلق خطرناک طور پر بری ہو گئی تھی۔ دسمبر کی میری ملاقات میں بھی بعض اشارات سے مترشح ہوتا تھا کہ وزیر اعظم تحریک کی پیشکش کو رقیبانہ نظر سے دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ پنجاب میں بھرتی صرف اس کی وساطت سے ہو۔

علامہ کے ان بیانات سے بالکل واضح ہے کہ حکومت پنجاب اور خاکسار تحریک کے ٹکراؤ کی اصل بنیاد علامہ مشرقی کی وہ پچاس ہزاری پیشکش ہی جس کو بقول علامہ سر سکندر نے اپنے مفاد اور وفاداری کی شان یکتائی کے لئے مضر سمجھا گویا یہ سب کچھ شاخسانہ ہے حکومت برطانیہ کی کاسہ لیسی و وفاداری میں مسابقت کا

پھر جب علامہ کے بیان کئے ہوئے اس سبب سے یا کسی اور سبب سے حکومت پنجاب کی نگاہ خاکسار تحریک کی طرف سے بدلی تو سب سے پہلا قدم حکومت نے علامہ کے رسالہ "اکثریت یا خون" کی ضبطی کی شکل میں اُٹھایا ـــــ اس کے بعد تمام اُن جماعتوں پر جو فوجی قسم کی پنجاب میں تھیں (عام ازیں کہ ہندو ہوں یا سکھ، یا مسلمان، پھر خواہ خاکسار ہوں، یا احرار یا محمدی فوج کے سپاہی) سب پر سپاہیانہ قواعد اور بیلچہ و کلہاڑی وغیرہ کے متعلق کچھ پابندیاں عائد کر دیں۔

یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ خود علامہ کی روایت اور بیان کے مطابق سر سکندر حیات خاں نے اُنکی تحریک کے خلاف عملی قدم اُٹھانے سے پہلے علامہ کو یہ یقین دلانا چاہا تھا کہ فوجی قسم کی جماعتوں پر پابندیاں عائد کر کے وہ دراصل ہندوؤں اور سکھوں کی اُن نوخیز جماعتوں کی سرگرمیوں کو دبانا چاہتے ہیں جو خاکسار تحریک کی دیکھا دیکھی روز بروز پنجاب میں پیدا ہو رہی ہیں علامہ صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

> سکندر حیات خاں نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر تحریک کے متعلق تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ جنگ یورپ کی وجہ سے پنجاب میں ہندوؤں کی کثرت اور ان کی فرقہ وارانہ سرگرمیوں نے حکومت کا کام مشکل کر دیا ہے میں آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ آپ بیلچہ اور قواعد کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کر دیں تاکہ میں ان دلوں کو نیست و نابود کر سکوں، میں صرف تحریک کو محفوظ کرنے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ ہندو کسی معنوں میں آپ کی تحریک کی نقل کر کے اپنے آپ کو منظم کر لیں وہ آپ سے بہر صورت آگے بڑھ جائیں گے ان کے پاس روپیہ اور پریس ہے وہ مسلمانوں سے کئی قدم آگے ہیں وغیرہ وغیرہ،
>
> (الاصلاح ۱۵ مارچ صفحہ ۶ کالم ۲)

نیز الاصلاح کے اسی پرچہ کے صفحہ ۱۳ کالم ۳ میں علامہ صاحب ہی راوی ہیں کہ ۹ مارچ کو جب پشاور میں خاکساروں نے سر سکندر کو سلامی دی تو موصوف نے وہاں سلامی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں نے خاکساروں پر عارضی پابندیاں لگائی ہیں میں خاکساروں سے کبھی ٹکراؤ نہیں کرونگا

آپ مطمئن رہیں۔"

لیکن سر سکندر کے اس مکرر سہ کرر اطمینان دلانے کے باوجود جب صوبہ پنجاب کی تمام فوجی قسم کی جماعتوں پر پابندیاں عائد کی گئیں تو علامہ صاحب نے حکومت کے اس اقدام کو سر سکندر کی رقیبانہ بدنیتی پر محمول کرتے ہوئے اس کو براہ راست خاکسار تحریک سے ٹکراؤ قرار دیا اور ۱۵ مارچ کے الاصلاح میں حکومت پنجاب کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیا۔ اور خاکسار سپاہیوں کے نام یہ احکام جاری کیے۔

(۱) اگر حکومت پنجاب نے ٹکراؤ پیدا کر دیا تو ہندوستان کے پندرہ صوبوں کے صاحب السیادہ تیس ہزار خاکسار سپاہی بہ تفصیل ذیل ایک ہفتہ کے اندر اندر لاہور روانہ کر دیں (اس کے بعد صوبہ وار تفصیل درج ہے)

(۲) تمام سپاہی پُر امن رہیں نائب حاکم اعلیٰ محاذ لاہور کا حکم قطعی اور آخری ہوگا۔

(۳) ہندوستان کے تمام جانبازجن کی تعداد اس وقت تک ۱۳۰۰ ہے جلد از جلد پہنچتے جائیں لیکن اگر ٹکراؤ پیدا ہو گیا تو زیادہ سے زیادہ پانچ دن کے اندر اندر ہندوستان کے ہر گوشہ سے ہر جانباز پہونچ جائے اور سکندر کی چارپائی کے گرداگرد لاشوں کی سیج لگا دے"! الاصلاح ۱۵ مارچ ۴۰ء کالم ۳

جن حضرات نے الاصلاح وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے اُن کے علم میں ہوگا کہ علامہ صاحب نے ملک اور قوم کے خصوصی احوال کو قطعاً نظر انداز کر کے اپنے خاکساروں کی ذہنی تربیت خالص تشدد کے اصولوں پر کی ہے حتیٰ کہ لکھنؤ کے معرکہ میں جب سابق حکومت یو۔پی سے ان کا تصادم ہوا تو جن خاکساروں نے بیلچوں سے پولیس مینوں کو زخمی کر کے اپنی "بہادری" کا ثبوت دیا تھا علامہ صاحب نے اُن کو انعامات و خطابات کا مستحق قرار دیا اور الاصلاح کے کالموں میں امتیاز کے ساتھ اُن کے ان کارناموں کا ذکر کیا گیا۔

علامہ صاحب کی اس تربیت نے خاکساروں کا دماغ جس قدر خراب کر دیا ہے اُس کا اندازہ کرنا بھی ہر شخص کیلئے دشوار ہے۔

۱۵ مارچ کے الاصلاح والے اسی مقالہ میں جس میں علامہ صاحب نے حکومت پنجاب کے خلاف جنگ کا بگل بجایا ہے اور تیس ہزار خاکساروں اور ۱۳۰۰ جانبازوں کو لاہور پہونچکر سر سکندر کی چارپائی کے گرد لاشوں کی سیج لگا دینے کی ہدایت کی ہے اسی میں اُن کا یہ اعلان بھی موجود ہے کہ

خاکسار تحریک کوئی دھوتی پوش لالاؤں کی تحریک نہیں کہ سر سکندر بہادر کی جنبش قلم یا منتقمانہ آرزو سے مٹ جائے اور سب لالے رام رام کرتے ہوئے اور ہاتھ

جوڑتے ہوئے چوہوں کی طرح بلوں میں گھس جائیں۔"

پھر چند سطر کے بعد لکھتے ہیں :-

"ہماری تحریک میں زنانہ کانگریس کی طرح گرفتاریاں نہیں ہر سالار جانتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت کیونکر کرے اور حتی الوسع اپنے آپ کو گرفتار نہ ہونے دے خاکساروں کی غیرت کے منافی ہے کہ وہ اس طرح سالاروں کو جیل کے سپرد کر دیں۔"

اس طرح علامہ نے خاکساروں اور جانبازوں کو حکومت پنجاب سے مقابلہ کے لیے لاہور پہونچنے کا حکم دینے کے ساتھ "متشددانہ مزاحمت" کی بھی تلقین کی نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی صاحب کی پلائی ہوئی اس "شراب" سے مخمور خاکسار اور جانباز اُن کی ہدایت کے مطابق لاہور پہونچے اور حکومت پنجاب کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میدان میں نکلے، پولیس نے اُن کو روکنا چاہا ابتداءً سمجھایا پھر جبراً روکنا چاہا خاکساروں نے پولیس والوں پر بھی بیلچہ بازی شروع کر دی جس سے متعدد پولیس مین زخمی ہوئے اور پولیس کی طرف سے گولیاں چلائی گئیں جس سے بہت سے خاکسار مجروح اور مقتول ہوئے یہ قانونی بحث الگ رہی کہ پولیس والوں کے لیئے گولیاں چلانے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار تھا یا نہیں، اور پھر انھوں نے ضرورت اور حفاظت خود اختیاری کی حد سے بڑھ کر جوش انتقام میں بلاضرورت بھی گولیاں چلا کر خاکساروں کو ہلاک کیا یا نہیں لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خاکساروں نے پولیس والوں کی مزاحمت کی، اور تشدد کے ساتھ مزاحمت کی، اور جبکہ اُن کے امیر مطلق ہٹلر ہند علامہ صاحب کی تعلیم ہی اُن کے لیئے یہ تھی تو کوئی وجہ بھی نہ تھی کہ وہ متشددانہ مزاحمت کی پالیسی اختیار نہ کرتے۔ وہ تو تین سو تیرہ ۳۱۳ کا جتھا بنا کر معرکہ بدر کی یاد تازہ کرنے کے لیئے نکلے ہی تھے — پھر اس خطرناک تصادم کے بعد حکومت پنجاب نے سرے سے خاکسار جماعت ہی کو خلاف قانون قرار دیدیا — لیکن اس کے بعد بھی جب کبھی کسی ذمہ دار جماعت یا فرد نے سر سکندر سے کوئی گفتگو کی تو انھوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ اگر خاکسار اپنا رویہ درست کر کے فضا کی موجودہ ناہمواری کو درست کر دیں اور بیرونجات کے جو خاکسار لاہور آئے ہوئے ہیں ان کو اپنے اپنے مقام پہ واپس کر کے اپنی صلح جوئی کا پہلا عملی ثبوت دیں تو حکومت تحریک پر سے پابندی اٹھا سکتی ہے۔

یہ ہیں اس وقت تک کے واقعات اور معاملہ کی صحیح پوزیشن،

عقل وانصاف کا فیصلہ:-

اب اگر ایک شخص صرف عقل اور انسانیت کے عام اصولوں کو سامنے رکھ کر بھی فیصلہ کرے جب بھی ان غلط اندیشوں کی ان حرکتوں کی کسی طرح تائید وحمایت نہیں کر سکتا جنھوں نے طاقت اور سامان جنگ سے خالی ہاتھ ہونے اور دوہری حکومتوں کے شکنجہ میں جکڑ بند ہونے کے باوجود اپنے بے دماغ اور بدخود غلط لیڈر کے جوشیلے اور اشتعال انگیز الفاظ کے نشہ میں آکر تشدد کو اپنا شعار بنالیا ہے اور جو اپنی حماقت سے اس مغالطہ میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ ہم نے اپنے نظام سے ہندوستان میں ایک متوازی حکومت قایم کرلی ہے اور اب ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو نوجوان خاکساروں کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا ہوگا ان کو اندازہ ہوگا کہ علامہ صاحب کی غلط تربیت نے اُن کے دماغ کو کس قدر خراب کردیا ہے اور وہ کیسے کیسے عجیب وغریب خواب دیکھتے رہتے ہیں ـــ درحقیقت لاہور میں خاکساروں پر جو کچھ گذری اور جو گزر رہی ہے اس کی ذمہ داری خود ان کی غلط کاری و بے راہ روی پر اور اس سے زیادہ علامہ مشرقی کی غلط تربیت اور اشتعال انگیزی پر ہے کہ اولاً تو ماحول کی ناسازگاری کے باوجود اُن میں تشدد کی اسپرٹ پیدا کی، انھیں لاہور پہونچنے کا حکم دیا اور بصورت تصادم متشددانہ مزاحمت کی تلقین کی، سر سکندر کی چارپائی کے گرد (لاشوں کی) سیج لگا دینے کی بھی صریح الفاظ میں ہدایت کی۔ اور جب اُن کی اس غلط رہنمائی کی بدولت لاہور میں خون خرابہ ہوگیا اور خود بدولت کو بھی حراست میں لے لیا گیا تو صاف یہ کہکر الگ ہوگئے کہ جو کچھ ہوا میرے احکام کے خلاف ہوا۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہدیا کہ میں نے خاکساروں کو لاہور پہونچنے کا حکم ہی نہیں دیا تھا (للعجب)

بہرحال واقعات لاہور کی زیادہ تر ذمہ داری خود خاکساروں اور علامہ مشرقی پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اور کسی طرح بھی اس معاملہ میں انکی حمایت یا ہمت افزائی قرین عقل وانصاف نہیں کہی جا سکتی۔

شریعت اسلامیہ کا فیصلہ:-

یہاں تک کی ہماری بحث محض عقل اور انصاف کے عام اصولوں کے ماتحت تھی ـــ لیکن اگر "شریعت اسلامیہ" کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو قضیہ کے مفصلہ بالا پہلوؤں کے علاوہ بلکہ ان سے بھی پہلے اس پر غور کرنا ہوگا کہ یہ جماعت اسلام اور مقاصد ملت اسلامیہ کے لئے مفید ہے یا مضر؟ پس جو لوگ اپنے غلط معلومات کی بنا پر اس کو مفید سمجھتے ہوں یا اس بارہ میں کوئی خاص روشنی اپنے سامنے نہ رکھتے ہوں اُن سے اس وقت میرا مخاطبہ نہیں البتہ اتنا اُن سے بھی عرض کرونگا کہ وہ میری کتاب "خاکسار تحریک" ملاحظہ فرمالیں (میں اُمید کرتا ہوں کہ جو شخص بھی انصاف

اور سچائی کو پیش نظر رکھکر اسکو دیکھے گا اس پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوجائیگی کہ خاکسار تحریک مسلمانوں کے مذہب کیلئے بھی ایک سخت فتنہ اور انکی سیاست کیلئے زبردست خطرہ ہے) اور اسکے بعد یہ حضرات بھی میری اس مقالہ کے مخاطب ہو سکینگے کیونکہ اس مقالہ میں میرا خطاب صرف انہی حضرات سے ہے جو یہ جانتے ہیں کہ یہ تحریک اور یہ جماعت مسلمانوں کے مذہب اور انکی سیاست کیلئے ایک فتنہ اور مفسدہ ہے لیکن لاہور کے تازہ واقعات اور شہری فضا نے ان کی قوت فیصلہ کو ماؤف کر دیا ہے اور وہ لاہور کے اس قضیہ میں خاکساروں کی جنبہ داری کر رہے ہیں ــــ ان حضرات کو غور فرمانا چاہیئے کہ دین کو نقصان پہونچانیوالی کسی فتنہ انگیز تحریک یا جماعت کے خلاف کسی حکومت کی سخت گیری (اگرچہ وہ حفاظت دین کی نیت سے نہ ہو اور اگرچہ یہ سختی کرنیوالی وہ حکومت "اسلامی حکومت" بھی نہ ہو) اس تحریک یا جماعت کی اصل حیثیت نہیں بدلدیتی اور اس صورت میں بھی انکی حمایت "تعاون علی الاثم والعدوان" ہی ہوگی بالخصوص جبکہ وہ خود ہی اپنی غلط کاریوں سے حکومت کو اس سخت گیری پر مجبور بھی کر رہی ہو۔

رہا یہ کہ بہت سے خاکسار نیک نیتی اور اسلامی فوجی تنظیم کے صادق جذبہ سے اس تحریک میں شامل ہیں اس لیئے وہ ہماری حمایت اور ہمدردی کے مستحق ہیں ــــ تو یہ بھی مغالطہ اور محض سفسطہ ہے اگر ایک تحریک اور جماعت کا مخرب دین اور مقاصد اسلامیہ کے خلاف ہونا یقینی طور پر معلوم ہے تو کچھ سادہ لوحوں کا "نیک نیتی" سے اس میں شریک ہوجانا نتائج اور حکم شرعی کو نہیں بدلدیتا کون کہسکتا ہے کہ خوارج اور قرامطہ اور اسی قسم کی دوسری باطنی تحریکوں اور جماعتوں کے سب شرکاء بدنیت تھے؟ اور ان تحریکوں کو خلاف اسلام جانتے ہوئے انہیں شریک ہوگئے تھے حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے فتنوں کے حامی زیادہ تر ایسے سادہ لوح ہی ہوتے ہیں جو کسی مغالطہ کے شکار ہو کر اسکو ایک بہترین کام اور اعلیٰ درجہ کی نیکی سمجھ کر پھنس جاتے ہیں اور پھر اس راہ میں جو کچھ کرتے ہیں نیک نیتی سے اور اچھا ہی سمجھکر کرتے ہیں لیکن قرآن ایسے غلط کار احمقوں کو معاف نہیں کرتا، بلکہ اسکا صاف اعلان ہے کہ

"جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھنے والے احمق زیادہ خسارہ میں رہنے والے ہیں"

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا الذین ضل سعیھم فی الحیوٰۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا ۵

(کہف)

کہہ کیا ہم بتلادیں کون لوگ اپنے اعمال میں زیادہ خسارہ میں ہیں۔ وہ وہ لوگ ہیں جنکی کوشش اس دنیا میں (غلط راہوں میں صرف ہو کر) ضائع اور برباد ہوئی اور وہ اس گمان میں ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔

بہرحال اگر کوئی شخص اپنی غلط فہمی اور حماقت سے کسی مخرب دین فتنہ اور مخالف اسلام تحریک کو خدمت دین کا ذریعہ سمجھ کر اسمیں شریک ہوجائے اور پھر اس سلسلہ میں کسی حکومت کی داروگیر کا اسے نشانہ بننا پڑے تو صرف اس بنا پر وہ ہماری ہمدردی و حمایت کا مستحق نہیں ہوجاتا کہ وہ "نیک نیتی" سے اس فتنہ میں شریک ہوگیا ہے۔ ــــــــ (باقی بر صفحہ ۲۴)

جدید تعلیم ——— اور ——— علماء کا جرم عظیم

(۲)

اب تک ہم نے جو بحث کی ہمیں صرف اس الزام کی تردید کی ہے کہ

"مسلمانوں کے علما نے انکو "جدید تعلیم" یا "انگریزی تعلیم" سے روکا اور وہی مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے ذمہ دار ہیں"

اور موثق شہادتوں اور مسلم واقعات سے یہ بتلایا ہے کہ "علماء کرام" نے کسی وقت بھی "جدید تعلیم" یا "انگریزی تعلیم" سے نہیں روکا بلکہ تعلیم کے ساتھ جو دوسرا زہر انکے حلق سے اتار کر انکی روح ایمانی کو مسلوب یا مضمحل کرنیکی کوشش کیجا رہی تھی علماء کو اس سے اختلاف تھا اور اس اختلاف میں یقیناً وہی حق بجانب تھے۔

ہاں یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض اوقات اس اختلاف میں پورا اعتدال قایم نہیں رہ سکا اور بعض علما نے ضرورت سے زیادہ تشدد اور سخت گیری سے بھی کام لیا لیکن اگر عقل و انصاف سے کام لیا جائے تو اسکی وجہ سے بھی انکو مجرم نہیں گردانا جاسکتا۔ وہ انقلابی بحران کا وقت تھا چند ہی روز پہلے انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں کی جگہ لی تھی اور انگریزی اقتدار نے اسلامی اقتدار کو شکست دی تھی ایسے وقت میں مذہبی غیرت اور ملی جذبہ رکھنے والوں کے لئے انگریزوں اور انکے لائے ہوئے نظام تعلیم بلکہ انکی ہر چیز کی خلاف نفرت کا حد اعتدال سے تجاوز کرجانا ایک فطری بات تھی جسکی وجہ سے انکو ملامت نہیں کیجاسکتی۔

اب رہا یہ سوال کہ اچھا اگر علماء نے مسلمانوں کو "جدید تعلیم" سے نہیں روکا اور ہماری تعلیمی پسماندگی کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی تو پھر مسلمان تعلیمی میدان میں اس قدر پیچھے کیوں رہے؟

تو آئیے اس سوال کا جواب بھی سن لیجئے! درحقیقت یہ حادثہ کبریٰ بہت درد انگیز اور بڑا عبرت آموز ہے۔

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے اسباب

درحقیقت مسلمانوں بلکہ عام ہندوستانیوں کی تعلیمی پسماندگی کی سب سے زیادہ ذمہ داری اسی حکومت پر عائد ہوتی ہے جو سوسوا سو برس سے ہماری قسمتوں کی مالک ہے اور جسکے ہاتھ میں ملک کا عام نظم و نسق ہے۔

ہندوستان میں ہماری محکومیت کی تاریخ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار سے شروع ہوتی ہے اور چونکہ یہ محض ایک تجارتی کمپنی تھی اسلئے اسکے سامنے تو سوائے زرکشی کے کوئی اور مقصد تھا ہی نہیں بقول جسٹس سید محمود کمپنی کے مالک تو صرف یہ چاہتے تھے کہ

تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں اسلئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہ سمجھتے تھے

تاریخ التعلیم از جسٹس سید محمود صہ

دوسری وجہ یہ کہ ایک جگہ امریکہ میں تعلیم پھیلا کر اسکا نتیجہ بھگت چکے تھے کہ وہ ملک ہاتھ سے نکل گیا وہی خطرہ یہاں بھی دامنگیر تھا کہ کہیں "یہ سونے کی چڑیا بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے" اسلئے بجائے اسکے کہ یہاں تعلیم پھیلاتے جو تعلیم کے ذرائع تھے انکو بھی ختم کرنا شروع کیا کیونکہ بقول الکیس ہمنڈی کے

جب کوئی قوم یا ملک غلام بنایا جاتا ہے تو فاتح سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ تعلیم کو تباہ کردیتا ہے یا بہت بری

عله اس مضمون میں تعلیم کے متعلق حکومت اور ارباب حکومت کی جن کوتاہیوں کا ضمناً ذکر آیا ہے ان کا تعلق زیادہ تر ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت اور گورنمنٹ انگلشیہ کے ابتدائی دور سے ہے بعد میں حکومت کا طرز عمل بہت کچھ اصلاح پذیر ہوا۔

طرح سے انتظام کرتا ہی چونکہ علم اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ تعلیمی ہند ص ۸ و ۹

ورنہ یہاں پر کمپنی کی حکومت سے پہلے تعلیم و تعلم کی جو کیفیت تھی اسکو خود انگریزوں کی ہی زبان سے سنئے جان بیٹے کمیشنر عہد حکومت اسلامی میں قومی تعلیمات کی موجودگی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہی :۔

یہ بالکل ظاہر ہی کہ انگریزوں نے ہندوستان پر اپنا قبضہ جمایا تو اس زمانہ میں قومی تعلیم کا سلسلہ بہت کافی طور سے موجود تھا　تعلیمی ہند ص ۱

اور مسٹر لڈلو اپنی کتاب تاریخ برطانوی ہند میں لکھتا ہے :۔

مجھے یقین ہی کہ ہندوستان کے ہر گاؤں میں جو اپنی قدیم شان اور حیثیت کو قایم رکھے ہوئے تھا عام طور پر بچے لکھ پڑھ سکتے تھے اور حساب میں انکو خاص مہارت ہوتی تھی لیکن ہم نے بنگال کی طرح جہاں کسی سسٹم فنا کر دیا ہی۔ اس جگہ دیسی مدرسے بھی فنا ہو گئے ہیں۔　تعلیمی ہند ص ۲

اور پروفیسر ماکس ملر سرکاری کاغذات کی بنا پر لکھتا ہی

برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار دیسی مدارس تھے اسکے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوئے کہ آبادی کے ہر ۴۰۰ افراد کیلئے ایک مدرسہ قایم تھا۔　تعلیمی ہند ص ۳

ریونٹ وارڈ ۱۸۲۱ء میں بیان کرتا ہی کہ :۔

انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں سے بھرا ہوا ہی وہاں ہر ۳۱ لڑکوں پر ایک اسکول ہی۔　تعلیمی ہند ص ۳

کپتان الگزنڈر ہملٹن جو حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہی کہ :۔

شہر ٹھٹہ (سندھ) میں چار سو کالج مختلف علوم و فنون کے تھے.

غرضکہ انگریزی تسلط سے پہلے یہ کیفیت یہاں کی تھی۔ مگر ہندوستانیوں کو زیر اقتدار رکھنے کیلیے ضروری تھا کہ ان کو جاہل رکھا جائے چنانچہ اسی نظریہ کو ڈیوک آف ڈیون شائر صفائی کے ساتھ یوں بیان کرتا ہی۔ کہ

یہ غیر دانشمندانہ فعل ہی کہ ہندوستانی زیور علم سے آراستہ کیئے جائیں جدید تہذیب جدید ترقی جدید علم و ادب سے انھیں سیراب کیا جائے۔ اور پھر ان سے یہ بھی کہا جائے کہ ملکی معاملات میں حصہ لینے کا بجز اس صورت کے انھیں کبھی موقع نہیں ملیگا کہ وہ پہلے اپنے یورپین حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔ تعلیمی ہند ص ۴

مگر آخر کب تک عوام کے جذبات کو پامال کیا جاتا۔ اور اہل ملک کی تمناؤں کا خون کیا جاتا۔ کمپنی نے کچھ خطرات محسوس کیئے اور لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے ۱۸۱۱ء میں ایک طویل یادداشت لکھ کر کورٹ آف ڈائرکٹران کو بھیجی جس میں یہ دکھایا تھا کہ علم کا روز بروز زوال ہو رہا ہی۔ ہندو مسلمانوں کو مذہبی تعلیم نہ ہونے سے دروغ حلفی اور جعلسازی کے جرائم بڑھ رہے ہیں۔ اور سفارش کی کہ متعدد کالج قایم کیئے جائیں اور تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے اسی یادداشت کی وجہ سے ایک "تعلیمی کمیٹی"

مذکورہ کمیٹی جس میں مختلف حضرات کی شہادتیں ہوئیں اور سر تھامس ٹرٹن نے دار العوام میں کہا:۔

"ہندوستانیوں کو فائدہ کیا دوگے تم نے ان لوگوں کے ملک کو خراب اور انسانوں کو برباد کیا ....

.... بیشک اپنی ذاتی حفاظت کیلئے تم نے ان لوگوں کو دھوکہ دغا اور جہالت میں

مبتلا کردیا" تعلیمی ہند ص۵

بالآخر ۱۸۱۳ء میں اس کمیٹی کی سفارش پر پارلیمنٹ میں ایک قانون پاس کیا گیا جس میں سب سے پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا مسئلہ باقاعدہ پاس ہوا اور ہندوستان جیسے ملک کیلئے کہ جس کا ایک ایک صوبہ یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے ایک لاکھ روپیہ سالانہ تعلیم عامہ کیلئے منظور کیا گیا مگر حکام وقت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس ایک لاکھ کی رقم کو بھی دس سال تک استعمال نہیں کیا جس پر ۱۸۲۳ء میں آنریبل ایم الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے ایک متفقہ یادداشت گورنمنٹ میں پیش کی جس کے نتیجہ میں ۱۸۱۳ء کی منظور کردہ رقم کا استعمال شروع ہوا۔

مگر ابتک یہ جو کچھ ہوا فارسی اور سنسکرت میں ہو رہا تھا اسکے بعد یہ تحریک شروع ہوئی کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے ۱۸۲۹ء میں الگزنڈر ڈف نے چاہا کہ ایک ایسا اسکول قائم کیا جائے جسمیں ذریعہ تعلیم انگریزی ہو مگر حکومت نے اس کی اجازت نہ دی پھر ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے کی صدارت میں وہ مجلس بیٹھی جس کا ہم ذکر اوپر کر آئے ہیں اور بہت سی بحث و تمحیص کے بعد لارڈ میکالے ہی کے کاسٹنگ ووٹ سے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا طے ہوا۔

پادری صاحبان جو تبلیغ عیسائیت کیلئے بہت بےچین تھے اور سارے ملک کو عیسائی بنانیکا خواب دیکھا کرتے تھے اب انکو اچھا موقع مل گیا کہ تعلیم کے پردہ میں عیسائیت کی تبلیغ کریں کیونکہ انگریزی تعلیم کیلئے جو اسکول و کالج اب کھلے تو یہ پادری صاحبان ہی انمیں بطور اساتذہ مقرر ہوئے اور اپنے مشن کے پھیلانیکا یہ بہترین موقع انکو مل گیا اور انھوں نے ان تعلیمگاہوں سے تبلیغ عیسائیت کا کام لینا شروع کیا۔ یہ تھی وہ پہلی چیز جو مسلمانوں کو ان انگریزی اسکولوں اور کالجوں کی طرف آنے سے مانع ہوئی لیکن چونکہ ہندوؤں کے یہاں عقیدہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں بلکہ ہندو نام ہی ایک نسلی سوسائٹی کا ہے اس لیے انھوں نے اس کو زیادہ محسوس نہیں کیا اور شروع ہی سے اس تعلیمی تحریک سے انھوں نے پوری طرح تعاون کیا، پادری صاحبان خوش تھے کہ اگر اقلیت تعاون نہیں کرتی تو نہ کرے۔ اکثریت تو اسی رنگ میں رنگت ہی ہی۔ اس خوشی کا اندازہ کچھ اس تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ سے ہوگا جو دسمبر ۱۸۳۱ء میں ہشت سالہ رپورٹ کے نام سے شائع ہوئی تھی جس کا ایک اقتباس یہ ہے:۔

ہندو کالج کی حوصلہ افزائی کی طرف توجہ کرنا اس تعلیمی کمیٹی کے خاص مقاصد میں سے رہا ہے۔ اس سے جو نتائج حاصل ہوئے وہ امید سے زیادہ ہیں زبان انگریزی کی واقفیت میں ترقی کے ساتھ اخلاقی اثرات بھی نمایاں ہوئے اور اچھے خاندان اور قابلیت کے بہت سے نوجوانوں میں ہندو مذہب کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے بےچینی اور اپنے رسوم کی طرف سے بے اعتنائی کا علانیہ

اظہار کیا جارہا ہے غالبًا دوسری نسل میں کلکتہ کے ہندوؤں کے خیالات اور محسوسات میں بڑی مادی تبدیلی ہو جائے گی۔　　تاریخ التعلیم از سید محمود ص ۳۵

اسی طرح سر فریڈرک ہیلیڈی نے ۱۸۵۳ء میں اپنی شہادت میں بیان کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں نہیں۔　　مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۳۶

الغرض اس دور میں چونکہ انگریزی تعلیم گاہوں سے تبلیغ عیسائیت کا بھی کام لیا جارہا تھا اس لیئے مسلمان اُن سے تعلیمی فائدہ اُٹھانے کیلئے ابھی تیار نہ ہوئے تھے مگر جب ۱۸۳۵ء میں مرکزی گورنمنٹ نے صوبجاتی حکومتوں کو ہدایت کی کہ بجائے فارسی کے جو اس وقت تک مطابق معاہدہ کے سرکاری دفاتر کی زبان تھی اپنے اپنے صوبہ کی زبان جاری کریں اور پھر جب ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو لارڈ ہارڈنگ نے اس مضمون کا ریزولیشن جاری کیا کہ اب ملازمتوں میں انگریزی تعلیم یافتہ کو ترجیح دیجائے تو بیچارے مسلمان بھی انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہوئے۔ مگر جیسا کہ عرض کیا گیا اسکولوں اور کالجوں کی حالت یہ تھی کہ نام تو تھا انگریزی تعلیم پھیلانے کا مگر پادریوں کے کرتبوں سے یہ اڈے تھے عیسائیت کی تبلیغ کے اس لیئے سب سے پہلے مسلمانان کلکتہ نے اسکے خلاف احتجاج کیا* اور اس میں لکھا کہ سرکاری روپیہ عیسائی بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔ جس پر پالیمنٹ نے حکومت کی طرف سے غیر جانبداری کا اعلان کیا۔

مگر یہ غیر جانبداری کا اعلان برائے گفتن، ہی تھا۔.......... جیسا کہ سر چارلیس ٹریویلین آئی سی ایس کی شہادت سے پتہ چلتا ہے جو اُنھوں نے ۲۸ جون ۱۸۵۳ء کو دارالامراء کے سامنے دی تھی جسکے الفاظ یہ ہیں:۔

"گورنمنٹ کی دیگاہوں میں انجیل کا مضمون داخل نہیں ہے بعض لوگ اس قاعدہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے مذہب عیسوی کی صداقت کی ترقی کی مخالفت پائی جاتی ہے مگر یہ رائے بالکل غلط ہے جب سے ۱۸۳۵ء کے رزولیوشن کے مطابق سرکاری اداروں کے متعلق انگریزی کتب خانے قائم کیئے گئے تو ان میں انجیل رکھی گئی اور میرا خیال یہ ہے کہ انجیل کی شرح مصنفہ سنٹ اور دیگر شروح بھی رکھی جاتی ہیں جو کتابیں کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں انہیں انجیل کے حوالے ہیں جسکی وجہ سے طلبہ انجیل کو پڑھتے ہیں۔ اُستادوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے طلبہ سے انجیل کے مضامین پر گفتگو کریں بعض مضامین ایسے پڑھائے جاتے ہیں جنمیں مذہب عیسوی کے مضامین ہیں۔ اگر واقعی نتائج کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جن اچھے تعلیم یافتہ لوگوں نے مذہب عیسوی اختیار کیا ہے انکی تعداد ہندو کالج اور دوسرے گورنمنٹ کالجوں سے نکلی ہوئی اتنی ہی ہے جتنی کہ عیسائیوں کے کالجوں سے ہے۔"　　تاریخ تعلیم از سید محمود ص ۶۶-۶۷

مقصد یہ کہ اگرچہ انجیل کی تعلیم براہ راست نہیں دی جاتی مگر ایسے مضامین ضرور ہیں جو انجیل سے تعلق رکھنے والے ہیں جنکی وجہ سے

* پھر کچھ بعد ہندوؤں نے بھی کچھ محسوس کیا اور وہ بھی اس احتجاج میں شریک ہوگئے چنانچہ مدراس کے باشندوں نے جن میں ہر مذہب کے لوگ شریک تھے ۱۸۵۲ء میں ایک عرضداشت کے ذریعہ گورنر صاحب صوبہ مدراس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔*

نتائج وہی نکلتے ہیں جو انجیل کی تعلیم سے نکلتے پھر کیا ضرورت ہے کہ انجیل کو براہ راست داخلِ نصاب کر کے ہندوستانیوں کو بھڑکنے کا موقع دیا جائے کہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

یہ تھی ان انگریزی تعلیم گاہوں کی حالت اور یہی تھا وہ سبب جسکی وجہ سے مسلمان ان تعلیمی اداروں سے دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ نفرت کرتے تھے ــــ حالات اس رفتار سے گزر رہے تھے کہ مختلف اسباب و وجوہ کی بنا پر ۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ . . . .

. . . . اور باوجودیکہ اسمیں ہندوستان کی کل قومیں شریک تھیں مگر حکمران جماعت کے اُن افراد نے جو متنفری خیالات کے حامل تھے اور انکو اپنی تبلیغ عیسائیت میں مسلمانوں کی وجہ سے ناکامی ہوتی تھی۔ یہ خیال پھیلانا شروع کیا کہ اس ہنگامے کے بانی مسلمان اور صرف مسلمان ہیں جیسا کہ ہنری ہیرنگٹن ٹامس (جو بنگال کے سویلین تھے) کی کتاب

سے ظاہر ہے۔ اور وہ یہ ہے:۔

میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بانی اور اصلی محرک ہندو نہ تھے اور اب میں یہ دکھانے کی کوشش کرونگا کہ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا۔ ہندو اگر وہ اپنی مرضی اور ذرائع تک محدود ہوں تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے نہ کرنا چاہتے تھے . . . .

وہ مسلمان خلیفہ اول کے وقت سے موجودہ زمانہ تک یکسانیت کے ساتھ مغرور، غیر روادار اور ظالم رہے ہیں ہمیشہ انکا مقصد یہ رہا ہے کہ جس ذریعہ سے بھی ہو اسلامی حکومت قائم ہو اور عیسائیوں کے ساتھ نفرت کے خیالات کی نشو و نما ہو۔ مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہو سکتے اسلیئے کہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔　　　حکومت خود اختیاری ص۵۵ و ۵۶

یہ اور اسی قسم کے خیالات کا خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ کہ وہی زیادہ حوالۂ دار و رسن کیئے گئے انہیں کی جائدادیں ضبط ہوئیں وہی جلا وطن کیئے گئے انھیں سے جزیرہ انڈمین کو آباد کیا گیا۔ غرضکہ وہی ہر طرح تباہ و برباد کیئے گئے اور انہیں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا جیسا کہ سر آکلینڈ کالون صاحب لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ نے فرمایا:۔

غدر فرو ہو جانے یہاں ہی سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں (یعنی انگریزوں اور مسلمانوں) میں مصالحت کی اُمید جاتی رہی۔　　　روشن مستقبل ص۱۵۳

اسی انتقامی جذبہ کے ماتحت مسلمانوں کو ہر شعبہ سے خارج کیا جانے لگا۔

پہلے تو مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ہر میدان میں سب سے آگے تھے۔ ہر حیثیت سے سربلند تھے ہندوستان کی بسنے والی ساری قومیں مسلمانوں کو اپنا اُستاد مانتی تھیں جیسا کہ یہی ہنری ہرنگٹن ٹامس اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

غرض تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں نسبتاً ہندو ان کے سامنے طفل کتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ اسکے مسلمانوں ہیں کارگزاری کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے جسکی وجہ سے سرکاری ملازمتیں زیادہ ترانھیں کو ملتی ہیں اسطرح انکو سرکاری کاموں اور ملکی مصالح سے واقفیت کا موقع ملا اور انکی رائے کو وقعت حاصل ہوگئی۔ تعلیمی ہند ص۵۹

طامس آرنلڈ جنھوں نے ۵۶-۱۸۵۵ء میں صوبہ پنجاب کی سب سے پہلی تعلیمی رپورٹ مرتب کی تھی اپنی اس رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:-

بحیثیت معلمی کے میدان مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے نقشہ جات سے اسکولوں میں مسلمان بچوں کی بہت زیادہ بیشی ظاہر ہوتی ہے ہر امر بلاشبہ واضح ہے کہ معلمی کی پیشوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ تعلیمی ہند ص۶۰

بہرحال یا تو مسلمانوں کی حالت یہ تھی یا ہمارے انصاف پسند حکمرانوں کی مہربانی سے یہ حالت ہوگئی کہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ایسا ہوگا جسمیں بجز چپراسی یا چٹھی رساں یا دفتری کے مسلمانوں کو کوئی اور نوکری مل سکے۔ مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر بحوالہ روشن مستقبل ص۱۵۹

اوپر پڑھ چکے ہیں کہ ملازمت کیلئے انگریزی کو بمنزلہ شرط کے قرار دیا جاچکا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے باوجود شدید موانع وعوائق کے یہ دیکھ کر کہ اب رزق کے دروازے ان پر مسدود کیئے جارہے ہیں انگریزی پڑھنی شروع کردی تھی لیکن اس پر بھی مسلمانوں کو ملازمتیں ملنے میں سخت دشواریاں اور مشکلات پیش آتی تھیں بعض جگہ تو تعلیم یافتہ مسلمان کو ملازمت سے صاف طور پر روکدیا گیا تھا چنانچہ سر ولیم ہنٹر نے کلکتہ کے ایک فارسی اخبار مورخہ ۱۴ر جولائی ۱۸۶۹ء کے حوالہ سے لکھا ہے۔ کہ

اس خبر کی کوئی تردید نہیں کی گئی کہ سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا تھا کہ جو ملازمتیں خالی ہوئی ہیں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔

اس خبر کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ

مسلمان اب اس قدر گرگئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کرلیتے ہیں تب بھی انھیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کردیا جاتا ہے۔ ان کی بیکسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص۱۵۸ بحوالہ روشن مستقبل ص۱۵۹

اسی سلسلہ میں ہنٹر صاحب نے اڑیسہ کے مسلمانوں کی ایک عرضداشت بنام کمشنر صاحب اڑیسہ نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

بحیثیت وفادار رعایا حضور ملکہ معظمہ ہمیں سرکاری ملازمتیں پانیکا یکساں حق ہے اصل یہ ہے کہ اڑیسہ کے مسلمان اس قدر پیس دیئے گئے ہیں کہ ان کے ابھرنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی نسل کے علاوہ

شریف پیشہ کے اعتبار سے غریب سر پرستی سے محروم ہماری حالت اُن مچھلیوں کی مانند ہے جو پانی سے نکال کر باہر پھینکدی گئی ہوں۔ یہ مسلمانوں کی بدترین حالت ہے جو حضور کے سامنے اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ حضور ملکہ معظمہ کے قایم مقام ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ بلا لحاظ رنگ و ملت سب قوموں کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائیگا۔ سرکاری ملازمتوں سے خارج ہونے کے بعد ہم مفلسی اور مایوسی کے اس درجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ اگر بیس روپیہ ماہوار کی نوکری بھی مرحمت ہو جائے تو ہم دنیا کے سب سے دور دراز مقامات تک سفر کرنے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر چڑھ جانے اور سائبیریا کے سنسان بیابانوں میں بھٹکتے پھرنے کو بھی خوشی سے تیار ہیں۔

مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر ص ۱۷۵ و ۱۷۶ بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۵۹ و ۱۶۰

حقیقت یہ ہے کہ بقول آنریبل امبکا چرن موجمدار گورنمنٹ نے "اپنی عملداری کے ابتدائی زمانہ میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کو بڑھایا" اسلئے کہ بقول آنریبل مسٹر چارلس گرانٹ ڈائرکٹر کمپنی کے "ہندو اس قدر کمزور دل ہیں کہ انہیں سیاسی آزادی حاصل کرنیکی قابلیت پیدا ہونیکی ہرگز اُمید نہیں ہے"۔ بخلاف اس کے حکومت کو یہ خوف لاحق تھا کہ ہمارے ہاتھوں سے حکومت لینے کی صلاحیت مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ہیں ہے اسلئے ان کو پیسا گیا اور خوب پیسا گیا ایک طرف ان کو اقتصادی اور معاشی ماردی گئی اور دوسری طرف ان کو تعلیم سے محروم رکھنے کی کوشش کی گئی یہاں تک کہ جب اس کا خوف لاحق ہوا کہ کہیں یہی درد حد سے گزر کر دوا کی صورت نہ اختیار کرلے تو مسلمانوں کے سروں پر بھی شفقت کا ہاتھ پھیرا جانے لگا ۱۲ر جون ۱۸۷۱ء کو وایسرائے نے ایک طویل رزولیوشن جاری کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

مسلمان ان مضامین کے خلاف نہیں ہیں جو گورنمنٹ نے درسگاہوں میں جاری کیئے ہیں بلکہ اس نظام کے خلاف ہیں جسکے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے۔ تاریخ التعلیم از سید محمود ص ۱۵۱

اسی طرح مدراس گورنمنٹ نے ۱۸۷۳ء ہی میں اس امر کا اعتراف کیا کہ

موجودہ طرز تعلیم کا قالب ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا تھا اور مسلمانوں کو اس بارہ میں اس قدر گھاٹے میں رکھا گیا تھا کہ اسکولوں میں مسلمانوں کا کم تعداد میں ہونا حیرت انگیز امر نہیں ہے بلکہ ان حالات میں انکا وجود ہی حیرت انگیز ہے۔ "تاریخ التعلیم از سید محمود ص ۱۵۵

مسٹر جیمس اوکینلی جو مسلمان باغیوں کی تحقیقات کیلئے مقرر ہوئے تھے اور جنکی تحقیقات کے نتیجہ میں بہت سے مسلمانوں کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی وہ بھی .... فرماتے ہیں:۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمینانی بے بنیاد ہے سالہا سال سے مسلمانوں کو نظرانداز کیا جارہا ہے یا انھیں ایسی رعایا سمجھا جاتا ہے جنکی اطاعت بہت مشتبہ ہے انکی تعلیم کی طرف سے غفلت

کی جارہی ہے حتیٰ کہ انکے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھیں دوسرے
کاموں میں صرف کیا جاتا ہے ہمیں اُمید ہے کہ موجودہ غفلت کے بعد ایک عاقلانہ اور فیاضانہ
حکمت عملی اختیار کی جائیگی۔ کلکتہ ریویو اکتوبر ۱۸۷۰ء قسط ۱۹۵ بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۶۶

کیا ایسی کھلی شہادتوں کے بعد بھی یہ امر تحقیق طلب سمجھا جاتا ہے کہ مسلمان تعلیمی میدان میں دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گئے؟ مسلمان جو مثل دوسری اقوام کے تعلیمی ٹیکس ادا کرتے تھے اُن کو مختلف تدبیروں سے نظام تعلیم سے علیحدہ ہی نہیں کیا گیا تھا بلکہ مسلمانوں کے روساء نے مسلمانوں کی تعلیم کیلئے جو اوقاف کیئے تھے اور بقول مسٹر جیمس گرانٹ ان کا تخمینہ صوبہ بنگال کے رقبہ کے چوتھائی سے کم نہ تھا ۱۸۲۸ء میں انگریزی حکومت نے ان کو ضبط کرلیا منجملہ ان کے حاجی محمد محسن صاحب کا وقف ہگلی جو مرحوم نے ۱۸۰۶ء میں مسلمانوں کی اسلامی تعلیم کیلئے کیا تھا۔ واقف کے منشاء کے خلاف اسلامی درسگاہ کو انگریزی کالج میں حکومت وقت نے تبدیل کردیا اور مسلمانوں کو اسکی انتظام سے عملاً بیدخل کردیا۔

بہرحال مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو پست سے پست تر کردینے کے بعد "فیاضانہ اور عاقلانہ" تدبیر شروع کی گئی اور گورنمنٹ ہند نے اگست ۱۸۷۱ء کو مختلف صوبوں کے گورنروں کے نام احکام جاری کیئے اور گورنر صاحبان نے اپنے اپنے صوبے کے مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کے لیئے سرکلر جاری کیئے یہی زمانہ تھا کہ جناب سرسید احمد صاحب مرحوم نے بھی مسلمانوں میں اشاعتِ تعلیم کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا مگر موصوف سے اس بارہ میں جو اصولی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے حاملانِ دین کو ان سے اور انکی مخصوص تعلیمی پالیسی سے اختلاف کرنا پڑا وہ ہم بہ تفصیل پہلے عرض کرچکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت کو بھی یوروپین تہذیب و معاشرت سے بدلدینا چاہا بلکہ بقول مولانا حالی مرحوم موصوف انگریزی تعلیم سے انگریزی معاشرت کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔ نیز اسی کے ساتھ اسلام میں بھی انہوں نے اپنی رائے کے مطابق "اصلاح" فرمانی شروع کی اور اپنی ان ساری کوششوں کو تعلیمی تحریک کے ساتھ اس طرح ممزوج و مدغم کردیا کہ مخلصین ملت کیلئے ان سے اختلاف کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ایک دوسری غلطی انکی یہ تھی کہ وہ انگریزی اسکول کیلئے کم از کم ایک جنٹلمین یوروپین ہیڈ ماسٹر کا وجود لازمی و ضروری قرار دیتے تھے جیسا کہ موصوف اپنی ایک لمبی تجویز میں جسکا ذکر آگے آئیگا ارشاد فرماتے ہیں کہ

"ہمکو کسی اسکول کے قائم کرنیکا ارادہ نہ کرنا چاہیئے جبتک کہ انٹرنس تک کی تعلیم کا انتظام نہ ہو اور جسمیں ایک نہایت عمدہ اور پورا لائق جنٹلمین یوروپین ہیڈ ماسٹر مقرر نہو" رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۸ء

اور مسلمان اس سے پہلے عیسائیوں سے تعلیم دلانیکا نہایت تلخ تجربہ کرچکے تھے اور پادریوں کی تبلیغی کوششیں جو تعلیم کے پردہ میں انھوں نے کیں ابھی وہ انکے حافظہ سے محو نہیں ہوئی تھیں اور اب بھی انکے کانوں میں یہ آواز آرہی تھی کہ

خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن دکھلایا ہے کہ سلطنت ہندوستان انگلستان کے زیر نگیں ہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیئے اور اس میں کسی طرح تساہل نہ کرنا چاہیئے　　تقریر مسٹر مینگلس در دار العوام مندرجہ حکومت خود اختیاری ص۹۶

اسلیئے اگر وہ اُن جنٹلمین یورپین ہیڈ ماسٹر سے بدکتے ہوں تو تعجب کیا ہے۔

مس میو مصنفہ مدر انڈیا بھی فرماتی ہیں:۔

عیسائی مبلغوں کے طرز عمل سے مسلمان انگریزی تعلیم کو مذہب عیسوی کی تعلیم کا مرادف سمجھتے تھے اور بمقابلہ ہندوؤں کے وہ اپنے بچوں کو پادریوں کے زیر اثر رکھنے پر رضی نہ تھے انکے غرور اور ان کی مذہبی وفاداری کو اس سے اشتعال ہوتا تھا اس لیئے وہ اس تحریک سے علیٰحدہ رہے" مادر ہند ص۲۸۹ بحوالہ حکومت خود اختیاری ص۹۶

بہر حال یورپین اساتذہ کے تقرر پر بجید اصرار سر سید صاحب کی دوسری سنگین غلطی تھی جسنے قوم کے ایک خاص حصہ کو انکی تحریک سے متنفر کر دیا تھا اسکے علاوہ ایک سنگین تر غلطی انسے یہ ہوئی کہ وہ ہمہ تن اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس طرح متوجہ ہوئے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی طرف سے انھوں نے صرف بے التفاتی ہی نہیں کی بلکہ اسکو اعلیٰ تعلیم کیلیئے رکاوٹ خیال کرنے لگے اور وہ اکثر اپنی تقریروں میں کہا کرتے تھے کہ "میری مثال تو اس نیلگر کی سی ہے جسکو صرف ایک ہی قسم کا رنگنا آتا تھا اور وہ سارے کپڑوں کو ایک ہی رنگ میں رنگا کرتا تھا اسی طرح میں بھی قوم کو صرف اعلےٰ تعلیم کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہوں"۔

ظاہر ہے کہ اس مفلس ملک میں اعلیٰ تعلیم کے کثیر اخراجات کی برداشت قوم کے ہر ہر فرد میں کہاں ہو سکتی تھی خصوصاً مسلمانوں کی اس مفلوک الحالی میں جس کا کچھ تھوڑا سا حال ناظرین اوپر پڑھ چکے ہیں مگر موصوف کو اعلیٰ تعلیم سے شغف تھا اور اس قدر تھا کہ وہ اس پر ابتدائی و ثانوی تعلیم کو نثار کرنے کو تیار رہتے تھے اسلیئے کہ موصوف کے خیال میں قومی عزت حاصل کرنیکا ذریعہ صرف اعلیٰ تعلیم و تربیت ہی تھی۔ اسی خیال سے موصوف نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس لکھنؤ منعقدہ دسمبر ۱۸۸۶ء میں ایک تجویز پیش فرمائی کہ اول علیگڈھ کالج کو مکمل کر لیا جائے پھر دوسرے تعلیمی کام چھیڑے جائیں اس سلسلہ میں جو تقریر موصوف نے فرمائی اسکا اقتباس حسب ذیل ہے:۔

(۱) ان مسلمان بچوں کی انگریزی تعلیم کے لیئے چھوٹے چھوٹے اسکول جنمیں نالائق ماسٹر ہوتے ہیں ورنہ عمدہ تعلیم بچونکی تعلیم میں نقصان پہونچانیوالے اور مسلمانوں کی مجموعی قوت کو متفرق کرنیوالے ہیں۔

(۲) قوم میں اس قدر مقدور نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا بھی بندوبست کرے اور ادنیٰ تعلیم کا بھی بندوبست کرے اور اس سبب سے جبکہ وہ ادنیٰ تعلیم کی انتظام پر متوجہ ہوتی ہے تو مجبوری اسکو اعلیٰ تعلیم کی انتظام کا موقع نہیں رہتا۔

(۳) جو لوگ غربا میں ادنےٰ درجہ کی تعلیم کی رواج کے خواہاں ہیں انکا سب سے اول فرض یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ لوگوں کے پیدا کرنیکی کوشش کریں ادنیٰ درجہ کی تعلیم پھر غریب لوگوں میں رفتہ رفتہ از خود پھیل جائیگی۔

(۴) بہت سے بزرگوں نے جابجا پرائمری اپر پرائمری۔ مڈل اور بعض مقاموں میں انٹرنس تک اسکول قائم کئے ہیں یہ بات تو نہایت خوشی کی ہے کہ تھوڑے عرصہ میں ہماری قوم کو اپنی قوم کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا ہے اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے اس بات کی آواز آتی ہے کہ قوم کے لئے کچھ کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر اس کوشش میں کچھ نقص ہو تو اس سے چشم پوشی بھی مناسب نہیں ہے۔ ایسا کرنے سے انھوں نے اس مقدم امر سے جسکو ہمیں نے مقدم قرار دیا ہے یعنی مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی سے بالکل غفلت کی ہے۔

(۵) تعلیم دو قسم کی ہے ایک اعلیٰ درجہ کی جو ایک محدود گروہ کو نصیب ہوگی دوسری عام تعلیم جس سے عوام اور غربا بھی فائدہ اٹھا سکیں بالعموم مسلمان پچھلی قسم کی تعلیم کے خواہشمند ہیں مگر اس سے قوم آسمان کے تاروں کی طرح بلند نہیں ہو سکتی

(۶) ہمکو کسی اسکول کے قائم کرنیکا ارادہ نہ کرنا چاہیئے جبتک کہ انٹرنس تک کی تعلیم کا انتظام نہ ہو اور جسمیں ایک نہایت عمدہ اور پورا لائق جنٹلمین یورپین ہیڈ ماسٹر مقرر نہ ہو اس درجہ سے کمتر کا اسکول قائم کر کے بچوں کو اسمیں پھنسانا قومی نقصان کا باعث ہے۔

(۷) اسی طرح ہمکو کالج کے قایم کرنیکا ارادہ نہیں کرنا چاہیئے جسمیں کم سے کم تین یورپین پروفیسر اور پورے جنٹلمین مقرر نہ کر سکیں قوم کی ایسی حالت نہیں ہے کہ ہر جگہ ایسے اسکول اور کالج قایم کر سکے اسلئے جبتک ایک جگہ پورا نہ ہولے تب تک دوسری جگہ قایم نہ کیا جائے مسلمان بچوں کو صرف تعلیم ہی دینا کافی نہیں ہے انکی تربیت اور انہیں قومی روح پھونکنی ان کی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۸ء بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۲۵، ۲۲۶

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی یہ تجویز بڑی کثرت رائے سے خارج ہوگئی اور اخبارات میں عام طور پر یہ چرچا ہوا کہ مسلمانوں نے اول تو برادران وطن سے پچاس سال بعد تعلیم کی طرف توجہ کی اور اب جبکہ تعلیم کی طرف توجہ ہوئی ہے تو ہمارے ناخدائے تعلیم اسکول و کالج نہیں کھولنے دیتے اور اپنے کالج کا معیار اتنا اعلیٰ رکھتے ہیں جو غربا اور عوام کے قطعاً حسب حال نہیں۔ اس پر سرسید صاحب نے ناراض ہو کر ۲ر جولائی ۱۸۸۹ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے:۔

"افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دوستوں کے ابتک وہی پرانے خیالات ہیں وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے لڑکوں سے بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مردوں کی فاتحہ کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ افسوس کہ ان کو تعلیم کی بھی ابھی قدر نہیں ہوئی ہے۔

تھوڑی تنخواہ کے ٹیچر اور پروفیسر کیا تعلیم دے سکتے ہیں انھوں نے کبھی چار روپیہ سے زیادہ تنخواہ کا میانجی دیکھا ہی نہیں، بلا شبہ ایک میانجی کو پانچسو روپیہ اور سات سو روپیہ ملنا انکو متعجب کرتا ہوگا۔ اگر ہمارے بعد مدرسۃ العلوم کا یہی حال ہونا ہے جس کی دوراندیشی ہمارے دوست کرتے ہیں تو ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ قبل اسکے کہ مدرسۃ العلوم کا یہ حال ہو ایک شدید بھونچال آوے اور ہمارا پیارا مدرسۃ العلوم زمین میں دھنس جاوے۔ آمین" انسٹیٹیوٹ گزٹ

مورخہ ۲ر جولائی ۱۸۸۹ء صفحہ ۲۳۵" بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۲۴

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مفلوک الحالی ہرگز اسکی اجازت نہیں دیتی تھی کہ سرسید کے خیال کی مطابق اسکول و کالج کا اسٹاف رکھ سکیں تاہم موصوف اپنے خیال میں مستحکم رہے اور باوجودیکہ ایک مرتبہ وہ اپنی تجویز کا حشر دیکھ چکے تھے مگر پھر بھی ۱۸۹۴ء میں جبکہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علیگڑھ میں ہوا اسی تجویز کو دوسرے لفظوں میں پیش کیا جس کا نتیجہ سید طفیل احمد صاحب علیگ مصنف روشن مستقبل کی زبان سے سنیے

"اُس تجویز کی مخالفت اب ۱۸۹۴ء میں سرسید کے خاص معتقدین نے بڑی شد و مد سے کی اور سید نثار حسین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ نہر نے یہاں تک کہا کہ سرسید ایک طرف تو چھوٹے اسکولوں کے قایم ہونے کے مخالف ہیں دوسری طرف غریب مسلمانوں کی جیب میں محمڈن کالج کے بیش بہا تعلیم کی خریداری کیلئے ایک پیسہ نہیں اب بجز اس کے صورت نہیں کہ غریبوں کے بچوں کو جہاز میں بھر کر بدوؤں کی آبادی میں اُتار دیا جائے مگر باوجود ان مخالفتوں کے نواب محسن الملک اور مسٹر تھیوڈر ماریسن کی تائیدوں سے سرسید کا رزولیوشن پاس ہو گیا لیکن پاس ہونیکا یہ نتیجہ تو ہوا نہیں کہ علی گڑھ کالج کو بہت سا روپیہ مل جاتا بلکہ ہوا یہ کہ جگہ جگہ علی گڑھ کالج اور کانفرنس کی شاخوں کے طور پر اسکول قایم کرنیکا جو شوق مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا وہ ٹھنڈا ہو گیا (روشن مستقبل صفحہ ۲۲۵)

کیا علما کو ہدف ملامت بنانیوالے سُن رہے ہیں کہ سید نثار حسین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ نہر جو یقیناً "ملا پارٹی" کے رکن نہیں ہے ہونگے انکا الزام سرسید پر ہے یا علما پر یہ چھوٹے اسکولوں کی مخالفت کون کر رہا ہے اور یہ کس کے طرز عمل سے مسلمانوں کے دلوں کا شوق ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ مگر اللہ رے! پروپیگنڈا کی طاقت، "گناہ" تو خود کریں اور الزام رکھدیں "بیچارے" علما پر

پھر یہ بھی قابل غور تھا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں جو قومیں یا جو افراد سرمایہ دار ہیں انکو تو تعلیم حاصل کرنیکا موقع ملتا ہے مگر جو قومیں یا جو افراد مفلوک الحال ہیں وہ اس سے محروم ہیں۔ ذیل کا نقشہ ملاحظہ ہو:-

اقوام	تعلیمی تناسب فی ہزار		فی ہزار جاہل	
	مرد	عورت	مرد	عورت
پارسی	۷۸۹	۶۷۲	۳۱۱	۳۲۸
بدھ	۴۸۴	۹۶	۵۱۶	۹۰۴
عیسائی	۳۱۰	۱۸۰	۶۹۱	۸۲۰
جینی	۵۱۴	۷۶	۴۸۶	۹۲۴
ہندو	۱۱۵	۱۴	۸۸۵	۹۸۶
سکھ	۹۴	۱۴	۹۰۶	۹۸۶
مسلمان	۸۱	۷	۹۱۹	۹۹۳

تعلیمی ہند صفحہ ۲۸

غور کیجیے کہ پارسی جو ملک میں بہت قلیل التعداد ہیں انکا تعلیمی تناسب مردوں میں ۹۰۸، فی ہزار اور عورتوں میں ۷۴۳ ہے مگر مسلمان جو ملک کی آبادی میں دوسرے درجہ پر ہیں انکا تعلیمی تناسب ۱۴۰ اور ۱۵ فی ہزار ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ پارسی چونکہ سرمایہ دار ہیں اسلیے گراں بہا تعلیم میں انکا کافی حصہ ہے مگر مسلمان جو اگرچہ کسی زمانہ میں دولت و ثروت کے مالک ہی نہیں بلکہ اس ملک کے حکمران تھے .... ایسے بنادیے گئے کہ اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنا ہی ان کیلیے دشوار ہے چہ جائیکہ ایسی گراں قیمت تعلیم حاصل کرنا اگر حکومت کیطرف سے تعلیم کا انتظام مفت ہوتا اور مسلمان اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تو پھر یہ چیز قابل غور ہوتی کہ وہ کونسی قوت ہے جو انکو تعلیم سے روک رہی ہے؟ مسلمانوں کے عام قابل عبرت افلاس اور تعلیم کی گرانی کو ایک ساتھ سامنے رکھ دینے کے بعد تو یہ سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

ہمارے ملک کے عوام (بالخصوص ہم مسلمانوں) کی حالت تو یہ ہے کہ "آذوقہ بھی میسر نہیں" اور تعلیم و تہذیب پھیلانے والی حکومت کی ثروت کا حال نقشہ ذیل سے معلوم کیجیے:

صرفہ تعلیم ابتدائی فی کس ۱۹۱۱ء

نام ملک	صرفہ تعلیم ابتدائی فی کس	نام ملک	صرفہ تعلیم ابتدائی فی کس
امریکہ	عـ۵	سوئیڈن	للعہ ۳/
انگلستان	ہعہ ۴/	بلجیم	للعہ
سوئزرلینڈ	عـ۵ ۴/	ناروے	۱۳ ہے
آسٹریلیا	ہلے ۴/	فرانس	ہے ۱/
کناڈا	ہعہ ۴/	آسٹریا	۵ع/
اسکاٹلینڈ	ہعہ ۴/	ہسپانیہ	۱۳ ۰/
جرمنی	صـ ۲/	روس	۷ ۰/
آئرلینڈ	للعہ ۱۳/	ہندوستان	۱/
نذرلینڈ	للعہ ۱۲/	.	.

دیکھا آپنے ہماری مہربان گورنمنٹ حاتم کی قبر پر کس طرح لات مار رہی ہے اور ہندوستانیوں میں علم کی روشنی پھیلانے کیلیے کس قدر کثیر رقم خرچ کر رہی ہے مگر پھر بھی ہمارے مہربانوں کے نزدیک گردن زدنی علماء ہی ہیں کہ انہی کی وجہ سے مسلمان جاہل ہے۔

پھر اسکے ساتھ ہی یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ غیر ممالک میں جہاں کی آبادی ہندوستان کی آبادی سے بہت کم ہے یونیورسٹیوں کی تعداد

ہندوستان کے لحاظ سے کمین یادہ ہو نقشہ ملاحظہ ہو:۔

نام ممالک	آبادی	یونیورسٹی
انگلینڈ	۴۱۰۰۰۰۰۰	۱۸
امریکہ	۸۵۸۰۰۰۰۰	۱۳۴
فرانس	۳۹۰۰۰۰۰۰	۱۵
جرمنی	۶۴۵۰۰۰۰۰	۲۲
اٹلی	۳۲۰۰۰۰۰۰	۱۱
	۲۶۲۳۰۰۰۰۰	۲۱۰

ان پانچ ملکوں کی آبادی آپکے سامنے ہے جو ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے بقدر آٹھ کروڑ کے کم ہو مگر پھر بھی یونیورسٹیوں کی تعداد ۲۱۰ ہی اور آپکے ہندوستان کی آبادی پینتیس کروڑ نفوس پر مشتمل ہو مگر کیا یہاں پر یونیورسٹیوں کی تعداد ان پانچ ممالک کی یونیورسٹیوں کی تعداد کے بقدر بیسویں کے بھی ہو؟

ان اعداد شمار کو سامنے رکھنے کے بعد ہر شخص سمجھ سکتا ہو کہ مسلمانوں بلکہ عموماً ہندوستانیوں کی تعلیمی پسماندگی کے اصلی اسباب کیا ہیں اور انکی "جہالت" کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہو۔

اس ساری بحث کے بعد ان دوستوں سے جو ہر مجلس میں اُٹھتے بیٹھتے "علما" کے اس "جرم" کو دہرانے کے عادی ہو گئے ہیں کہ "انھوں نے ہی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا اور یہی مُلّا نے ہماری تعلیمی پسماندگی کے ذمہ دار ہیں" ہم یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اچھا اگر بالفرض علما نے روکا بھی تھا تو کس چیز سے روکا تھا؟ کس نعمت" اور "رحمت" سے روکا تھا بس اسی "تعلیم" سے نا جس سے آپکو کلرکی یا اُس سے کچھ اوپر نیچے کی ملازمتیں مل سکتی تھیں لیکن اگر بالفرض آپکی قوم میں "سو فی صدی یا پچاس فیصدی انگریزی تعلیم یافتہ ہو جاتے تو کیا ملک میں اتنی ملازمتیں تھیں۔ اب جبکہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کی تعداد دہ فیصدی بھی نہیں ہو "بیکاری" کا کیا حال ہو؟ کیا اخبارات میں روز یہ خبریں نہیں پڑھتے ہیں کہ فلاں جگہ پندرہ روپیہ کی جگہ خالی ہوئی اور جب اخبار میں اشتہار دیا گیا تو اتنے سو "تعلیم یافتوں" کی درخواستیں آئیں جسمیں اتنی بی۔ اے اور ایم۔ اے حضرات کی تھیں ــــ علما اگر نہ روکتے تو شاید بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی یہ حالت ہو گئی ہوتی اور جس مصیبت اور تکلیف کا سامنا آج ہو رہا ہے اب سے چالیس پچاس برس پہلے ہی اُس میں ابتلا ہو گیا ہوتا ــــ تو کیا بیچارے علما کا یہ جرم ہو کہ انکی ایک کوشش نے آپکی کسی تکلیف کو چالیس پچاس برس کیلئے موخر کر دیا ــــ

خیر یہ تو تھی "اس تعلیم" کی دُنیوی برکت۔ رہے دینی نتائج تو خود ہمارے مخاطب سید گوہر صاحب چونکہ اس سے واقف

اور اسکے معترف ہیں اس لئے اسکے عرض کرنیکی حاجت نہیں تاہم ڈاکٹر ہنٹر کا ایک قول نقل کئے بغیر آگے نہیں بڑھا جا
ہمارے انگریزی اسکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے
مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو،" (مسلمانان ہند صفحہ ۱۲ بحوالہ روشن مستقبل صفحہ ۲۹۹ وصفحہ ۴۰۰)

اچھا ایک تازہ ترین شہادت اور بھی ملاحظہ فرماتے جائیے۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے ترجمان اخبار "منشور" دہلی کے
اڈیٹر جناب حسن ریاض صاحب جو یقیناً ملا پارٹی کے رکن نہیں ہیں ۹ جون کے مقالہ افتتاحیہ میں مسلم قوم کی
اہم ضروریات کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

گزشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں اسکا نتیجہ یہ
ہوا ہے کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں وہ اسلامی کلچر، اخلاق اور اسلامی تصورات سے بالکل
نابلد ہیں۔" (اخبار "منشور" دہلی مجریہ ۹ جون صفحہ ۳ کالم ۴)

چشم بصیرت سے دیکھئے یہ کسی "مولوی" "ملا" کا فتویٰ نہیں ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی شہادت اور مسلم لیگ کے سرکاری اخبار
کا بیان ہے کہ انگریزی تعلیمی اداروں اسکولوں اور کالجوں نے مسلمانوں کو اپنے دین اور تعلیمات مذہب سے قطعاً
نابلد کر دیا بلکہ انکے اثر سے ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان اپنے آبائی دین و مذہب کو غلط سمجھنے لگے اور اس پر انکا یقین
باقی نہیں رہا —— پھر کیا غلط کہا ہے بیچارے اکبر نے:-

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

پس جب صورت حال یہ ہے تو اگر بالفرض علما نے اپنی قوم کو اس "برکت" سے محرومی کا مشورہ دیا بھی ہو تو کیا کوئی
بہت بڑا جرم کیا جو قابل بخشش ہی نہیں؟ مالکم لا تبصرون؟

اصل سوال کے متعلق جو کچھ مجھے لکھنا تھا لکھ چکا اور الحمدللہ بقدر کافی لکھ چکا۔ آخر میں جی چاہتا ہے کہ متکلم اسلام
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدیر "ترجمان القرآن" لاہور کے ایک مقالہ کے اقتباس اور ترجمان حکمت لسان العصر حضرت
اکبر الہ آبادی مرحوم کی ایک نظم پر اپنے اس مضمون کو ختم کردوں۔

محترم مولانا مودودی یورپ کی مادی ترقی اور الحاد و بے دینی کا حال لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لئے مدرسوں اور
کالجوں میں بھیجے گئے اسلامی تعلیم سے کورے اسلامی تہذیب میں خام۔ انگریزی حکومت سے مرعوب
فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں
قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ انکی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور انکی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا۔

کیونکہ ان آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمنّا و صدقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا آئمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔

اسلام میں مذہب کا تصوّر یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا یہ تصوّر ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور یہاں اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ وہاں سارا نظام شریعت وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور یہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے وہاں حیات اخروی کا اعتقاد پوری اسلامی اخلاقیات کا سنگ بنیاد ہے۔ اور یہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ وہاں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں یہاں وہ محض عہد جاہلیت کی رسوم ہیں جنکا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔

اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے۔ رسولِ خدا شارح قانون اور انسان صرف متبع قانون مگر یہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنیوالی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی اسلام کا رُخ (INTERNATIONAL) بین الملیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبہ مقصود (NATIONALISM) ہے معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاشی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا رستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے رستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعداد ازواج، قوانین نکاح وطلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کیساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ انمیں تنقید کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اسکو صحت اور راستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کی ساتھ اسلام کی اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچکر دیکھا۔ اور جس مسئلہ میں دونوں کے

درمیان اختلاف پایا ہمیں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام کو بر سر غلط سمجھا۔ اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہونچایا مگر ان کے مذہب اور انکی تہذیب کو جو نقصان پہونچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدہ سے نہیں ہو سکتی

ترجمان القرآن جلد ۵ عدد ۱

یہ ہے جدید تعلیم کے فائدہ او نقصان کے متعلق ایک صاحب بصیرت اور حکیم کا تبصرہ اور تذکرہ ہاں سنئے ذرا!

نظم

حضرت لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد　　اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم　　کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش!

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ　　ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو　　قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو　　سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے سیکھو انکے انداز و طریق　　ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم　　ایشیا کے شیشۂ تقوی کو کردو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا　　جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش جادو نظر　　یاں جوانی کی امنگ اور انکو عاشق کی تلاش!

ان کی چتون سحر آگیں ان کی باتیں دلربا　　چال ان کی فتنہ خیز ان کی نگاہیں برق پاش

یہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب　　اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا　　دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا　　دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال　　حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

بوارق الغیب حصہ دوم

حدیث نمبر ۱۳۱

گزشتہ سے پیوستہ

اور ۹ ہجری میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ایلا کا واقعہ پیش آیا کہ آپ نے بعض ازواج مطہرات کی بعض چیزوں سے ناراض ہو کر کچھ دنوں کے لیئے اُن سے علحدگی اختیار فرمائی بلکہ اس علحدگی پر قسم کھالی قریبًا ایک مہینے کے بعد آیت تخییر (یاایھا النبیّ قل لازواجک ان کنتن تردن الحیٰوۃ الدنیا الآیہ) نازل ہوئی جس میں آپکو حکم ہوا کہ اپنی ازواج کو آپ اختیار دیدیجیے کہ اگر وہ دُنیا کا عیش و راحت چاہتی ہوں تو آپ سے آزادی (طلاق) حاصل کرلیں، اور اگر انھیں اللہ و رسول کی رضامندی اور آخرت کی بہبودی مطلوب ہو تو پھر دنیوی تکالیف اور تنگی ترشی پر صبر کریں ——

آپ اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لیکر سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس پہنچے اور آپنے اُن سے اس طرح بات چیت شروع کی

(۱۶۷) انی ذاکر لک امرا فلا علیک ان لا تعجلی حتی تستامری ابویک قالت وقد علم ان ابویّ لم یکونا لیامرانی بفراقہ قالت ثم قال ان اللہ قال جل ثناءہ "یاایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا" الی قولہ اجرا عظیما قالت فقلت ففی ای ھذا استامر ابویّ فانی ارید اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ الحدیث

(صحیح بخاری کتاب الطلاق باب من خیر نساءہ ص ۲۳۴ — وصحیح مسلم ص ۴۷۹ ج ۱) ۲۳۵

میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، بس تمہارا اہیں کوئی نقصان نہیں ہو کہ تم اسکے جواب میں جلدی نہ کرنا یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ نہ کرلو (حضرت صدیقہ فرماتی ہیں کہ آپنے یہ اسلیۓ فرمایا کہ آپکو یقین تھا کہ میرے ماں باپ کبھی بھی مجھے آپسے جدا ہونیکا مشورہ نہ دیں گے) پھر اس تمہید کے بعد آنحضرت نے خدا کا وہ حکم اُن کو سنایا کہ اگر عیش دنیا چاہتی ہو تو مجھ سے جدائی حاصل کرلو ورنہ جس حال میں خدا رکھتا ہے صبر و شکر کے ساتھ رہو) — حضرت عائشہ نے سنکر عرض کیا حضرت اس میں بھی کیا بات ہے کہ میں ابّا اماں سے مشورہ کروں، میں پوری خوش دلی کے ساتھ اللہ و رسول اور فلاح اخروی کو اختیار کرتی ہوں۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک جمیع ماکان وما یکون کا علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ پیشبندی اور احتیاط کے طور پر حضرت عائشہ کو یہ مشورہ دینے کی آپ کو ضرورت نہ ہوتی کہ تم اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر کوئی عاجلانہ فیصلہ نہ کرلینا بلکہ اس صورت میں آپ کو پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ عائشہ خود ہی فیصلہ کرینگی کما لا یخفیٰ

حدیث نمبر ۱۳۲

اور اسی ایلا کے واقعہ سے متعلق کنز العمال میں بحوالہ مصنف عبدالرزاق و مسند عبد بن حمید، و ابن سعد

وابن جریر وابن المنذر وغیرہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ

وکان اقسم ان لا یدخل علیہن شہراً (۱۶۸) من شدۃ موجدتہ علیہن حتی عاتبہ اللہ عزوجل فی ذالک الحدیث
کنز العمال صفحہ ۲۳۶ ج ۷

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مہینہ تک اپنی ازواج مطہرات سے مکمل علیحدگی کی قسم کھا لی تھی کیونکہ اُن پر آپ کو سخت غصہ تھا یہاں تک کہ اس معاملہ میں آپ پر حق تعالےٰ نے عتاب فرمایا۔"

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ اقدام حق تعالےٰ کو پسند نہ ہوا اور ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ بات اللہ تعالےٰ کے نزدیک غیر مرضی ہے تو آپ ہرگز ایسا نہ کرتے۔

حدیث نمبر ۱۳۳

اور اسی ۹ سنہ ہجری میں غزوۂ تبوک پیش آیا جس وقت کہ اُس کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں حضرت ابو موسیٰ اشعری اپنے چند اشعری رفیقوں کے ساتھ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سواریوں (اونٹوں) کے لیے درخواست کی اتفاق سے اُس وقت آپ کسی وجہ سے غضبناک تھے اسی حالت میں آپ نے قسم کھا کر فرمایا "واللہ لا احملکم" (خدا کی قسم میں تم کو سواری نہیں دونگا) کچھ دیر کے بعد کہیں سے کچھ اونٹ آگئے آپ نے ان اشعریوں کو پھر خود ہی طلب فرمایا اور ان میں سے پانچ چھ اونٹ اُن کو عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا۔

"واللہ ان شاء اللہ لا احلف علی یمین فاری غیرھا خیراً منھا الا اتیت الذی ھو خیر وتحللتھا" (۱۶۹) صحیح بخاری باب الیمین فی ما لا یملک وفی المعصیۃ وفی الغضب صفحہ ۲۳۳ وصحیح مسلم صفحہ ۴۷ ج ۲)

قسم خدا کی اگر میں کسی چیز پر قسم کھا لوں پھر مجھے اس کے خلاف کرنے میں بھلائی اور بہتری معلوم ہو تو انشاء اللہ میں وہی کرونگا اور قسم کا کفارہ ادا کردونگا

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "جمیع ماکان و مایکون" کا علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ آپ پہلے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے قسم کھا کر انکار نہ فرماتے ـــــ نیز جس کو علم کلی اور علم محیط حاصل ہو اسکے متعلق یہ ممکن بلکہ متصور ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے کسی چیز کی قسم کھالے اور پھر اسکے خلاف میں اُس کو بہتری اور بھلائی معلوم ہو یہ حال تو اسی کا ہو سکتا ہے جس کا علم حوادث کو محیط نہ ہو۔

حدیث نمبر ۱۳۴

کنز العمال میں بحوالہ ابن عابد و ابن عساکر غزوۂ تبوک ہی کے بارہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

فلما ازف خروج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا (ای المنافقون) الاستیذان وشکوا شدۃ الحرّ وخافوا الفتنۃ ان غزوا ویحلفون باللہ علی الکذب فجعل رسول اللہ صلی اللہ وسلم یاذن لھم لا یدری ما فی انفسھم الحدیث (کنز العمال ص ۲۳۹ ج ۲۴۹ (۱۷)) [170]

جب تبوک کیلئے آنحضرت کی روانگی کا وقت قریب آیا تو ان منافقوں نے بڑی کثرت سے رخصتیں مانگنی شروع کیں، اور گرمی کی شدت کی شکایتیں کیں اور کہا کہ اگر ہم نے غزوہ میں شرکت کی تو اندیشہ ہے کہ ہم فتنہ میں پڑجائیں اور اس جھوٹ پر خدا کی قسمیں کھائیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اجازت دینے لگے آپ ان کے دلوں کی باتوں کو نہ جانتے تھے۔

اس روایت کا آخری خط کشیدہ فقرہ اس کی صریح دلیل ہے کہ آپ کو اس وقت تک "علم غیب" یا "جمیع ماکان وما یکون" کا علم محیط حاصل نہ تھا۔

حدیث نمبر ۱۳۵

اسی غزوۂ تبوک کی احادیث میں سے ایک حدیث یہ ہے کہ جب آپ تبوک تشریف لے گئے تو قبیلہ جہینہ کے لوگ بھی ایک مقام پر پہونچکر آپ سے مل گئے۔

فقال لھم من اھل ذی المروۃ فقالوا بنی رفاعۃ من جھینۃ فقال قد اقطعتھا لبنی رفاعۃ الحدیث (سنن ابی داوٗد باب فی اقطاع الارضین ص ۲۴۰) [171]

تو آپ نے ان سے اثنار گفتگو میں دریافت کیا بستی "ذی المروۃ" والے کون ہیں؟ انھوں نے عرض کیا کہ وہ جہینہ ہی کی ایک شاخ بنو رفاعہ ہیں تو آپ نے "ذی المروۃ" کا علاقہ بطور جاگیر کے ان بنی رفاعہ ہی کو عطا فرمادیا۔

اس حدیث میں جہینہ کے لوگوں سے آپ کا یہ سوال کہ "ذی المروۃ" والے کون ہیں؟ اسکی صریح دلیل ہے کہ حضور کو جمیع ماکان وما یکون کا علم محیط حاصل نہ تھا ورنہ ان سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

حدیث نمبر ۱۳۶

اور اسی غزوہ تبوک کے واقعات میں سے ایک یہ بھی ہو کہ مجاہدین کے کھانے پینے کا سامان ختم ہو چلا اور لوگ بھوک سے پریشان ہونے لگے تو بعض حضرات نے آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر حضور اجازت دیں تو ہم اونٹوں کو ذبح کریں اور کھائیں آپ نے ارشاد فرمایا۔

افعلوا فجاء عمر فقال یا رسول اللہ ان فعلت قل الظہر ولکن ادعھم بفضل ازوادھم ثم ادع اللہ لھم علیھا بالبرکۃ فقال نعم۔ الحدیث (۱۴۲)

ہاں ایسا ہی کر و اتنے میں حضرت عمر آگئے اور عرض کیا کہ حضرت! اگر ایسا کیا گیا تو سواریاں کم رہجائینگی (اور ہم گھروں سے بہت دور ہیں لہذا یہ مناسب ہو گا کہ) حضرت سب لوگوں سے ان کا بچا کھچا کھانے کا سامان منگوالیں اور پھر خدا سے برکت کی دعا فرمائیں" — آنحضرت نے اس رائے کو قبول فرمالیا اور ایسا ہی کیا گیا حضور کی دعا سے حق تعالیٰ نے اتنی برکت عطا فرمائی کہ سب لوگوں نے خوب کھایا اور اپنے ساتھ کے تمام برتن بھر لیے۔ (صحیح مسلم جمع الفوائد ص ۱۹۵ ج ۲)

اس حدیث سے بھی صاف معلوم ہوا کہ جمیع ما کان و ما یکون، کا علم محیط آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت بھی حاصل نہ تھا ورنہ آپ پہلے ہی اونٹوں کو ذبح کرکے کھانے کی اجازت نہ دیتے اور جو طریقہ آپ نے حضرت عمر کے مشورہ کے بعد اختیار فرمایا شروع ہی میں آپ اس کو اختیار فرماتے۔

حدیث نمبر ۱۳۷

اسی ۹ھ ہی میں جبکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کیلئے تیاری فرما رہے تھے۔ تہا مسجد ضرار بنانیوالے منافقین کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ ہم نے بیماروں اور معذوروں کیلئے نیز بارش اور جاڑے کی راتوں کیلئے اپنے محلہ و قبیلہ کی ایک مسجد بنائی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ ایک دن حضور تشریف لائیں اور اسمیں نماز پڑھائیں اور برکت کی دعا فرمائیں۔ حضور نے ارشاد فرمایا:۔

انی علی جناح سفر ولو قد منا ان شاء اللہ اتیناکم فصلینا لکم فیہ" (۱۴۳)

میں اس وقت سفر کیلئے پا بر کاب ہوں اور اگر ہم واپس آئے تو انشاء اللہ تمہارے یہاں پہونچکر اس مسجد میں نماز پڑھینگے۔

اس کے بعد جب آنحضرت کی تبوک سے واپسی ہوئی اور مدینہ کے قریب موضع ذی اوان میں آپ نے مقام فرمایا تو یہ لوگ پھر خدمت میں پہونچے اور مسجد کو متبرک فرمانے کی درخواست کی

فدعا بقمیصہ لیلبسہ ویاتیہم فنزل علیہ القرآن واخبرہ اللہ تعالےٰ خبر مسجد الضرار وما ھموا بہ

پس آپ نے اپنا کرتا طلب فرمایا تاکہ اس کو پہن کر اُن کے یہاں جائیں، اسی اثناء میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں اس مسجد ضرار کی حقیقت اور اس کے سیاہ باطن بانیوں کی ناپاک غرض وغایت بیان فرمائی گئی۔

تو آپ نے چند صحابہ کو بلا کر حکم دیا کہ جاکر اس مسجد کو ابھی گرا دو چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

(حکاہ البغوی فی المعالم[۲۴۲] والخازن فی اللباب[۲۴۳] والعماد بن کثیر فی تفسیرہ[۲۴۴])

حدیث نمبر ۱۳۸

اور علامہ سیوطی نے درمنثور میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کی تخریج سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہو کہ مسجد قبا کے بننے کے بعد کچھ منافقین نے سازش کرکے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی اور جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے سرغنہ یخدج سے دریافت کیا کہ اس سے تمہارا کیا مقصد ہی تو اس نے کہا

یا رسول اللہ واللہ ما اردت الا الحسنی وھو کاذب فصدقہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وارادان یعذرہ فانزل اللہ والذین اتخذوا مسجداً ضراراً وکفراً الاٰیۃ[۲۴۵]

درمنثور صفحہ ۲۷۶ ج ۳

یا رسول اللہ میرا مقصد اس مسجد کی تعمیر سے سوائے نیکی اور ثواب کے اور کچھ نہیں ہے — اور فی الحقیقت وہ اس قسم میں جھوٹا تھا — مگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سچا سمجھا اور اس کو معذور قرار دینے کا ارادہ فرمایا تو ان بانیوں کی مذمت میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں اُن کے عزائم مشئومہ کو بے نقاب کیا گیا۔

حدیث نمبر ۱۳۹

اور حافظ سیوطی نے درمنثور ہی میں اس مسجد ضرار کے متعلق حضرت سعید بن جبیر کی ایک روایت

ابن المنذر کی تخریج سے اور نقل کی ہے جس کے آخر میں ہے کہ جب ان بد باطن منافقین نے مسجد قبا کے مقابلہ میں اپنی مسجد تیار کر لی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ درخواست بھیجی کہ حضور یہاں تشریف لاکر اُس میں نماز پڑھا دیں۔

فلما جاء الرسول قام لياتيهم (١٤٥) اوھم لیاتیھم فانزل اللہ والذین اتخذوا مسجداً ضراراً الی قولہ ولا یزال بنیانہم الذی بنوا ریبۃً فی قلوبہم الی آخر الآیۃ (در منثور صـ۲۸۶/۳ ۲۴۶)

پس جب اُن کا قاصد یا نمائندہ یہ پیغام لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُن کے یہاں جانیکے لیئے آپ کھڑے ہوگئے، یا یہ کہ آپ نے اُن کے یہاں آنے کا قصد فرمایا تو فوراً یہ آیت نازل ہوئی والذین اتخذوا مسجداً ضراراً الآیۃ۔

ان تینوں روایتوں سے صاف ظاہر ہی کہ ابتداءً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو ان منافقین کی سیاہ باطنی اور بدنیتی کا علم نہ تھا اور اسی بنا پر آپ کا یہ ارادہ ہوا تھا کہ ان کی اس مسجد میں بھی نماز پڑھی جائے لیکن بعد میں وحی کے ذریعہ آپ کو حقیقت حال کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنا ارادہ فسخ فرما دیا، اور عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک سے واپسی پر پیش آیا تھا۔

حدیث نمبر ۱۴۰ تا ۱۴۳

غزوۂ تبوک سے واپسی پر مسجد ضرار اور مسجد قبا کے متعلق جو آیات نازل ہوئیں اُن میں سے ایک آیت مسجد قبا کے بارہ میں یہ بھی تھی فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَتَطَهَّرُوا (اس میں (مسجد قبا میں) ایسے لوگ (نماز پڑھتے) ہیں جو پاکیزگی کو محبوب رکھتے ہیں۔)

کنز العمال میں مسند احمد و مصنف ابن ابی شیبہ کی تخریج سے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے اہل قبا سے دریافت فرمایا۔

یا اھل قباء ان اللہ قد اثنی علیکم (١٤٦) فی الطھور خیراً فلخبرونی؟ الحدیث (کنز العمال صـ۲۴۹/۱ ۲۴۷)

اے قبا والو اللہ تعالیٰ نے طہارت و پاکیزگی کے بارہ میں تمہاری اچھی ثنا کی ہے پس مجھے بتلاؤ (کہ تمہاری یہ خاص پاکیزگی کیا ہی؟)

اور اسی مضمون کی ایک حدیث مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابو امامہ کی روایت سے بھی مروی ہی۔ اس کے الفاظ یہ ہیں. آنحضرت نے اہل قبا سے فرمایا۔

ماھذا الطھور الذی قد خصصتم به فی ھذہ الاٰیته ؟ کنز العمال ج۵ ص۲۴۹ (۱۷۸)	یہ کیا خاص پاکیزگی ہے جس کو اس آیت میں تمہاری خصوصیت بتلایا گیا ہے ؟

اور اسی مضمون کی ایک حدیث جمع الفوائد ج۱ ص۳۴ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بحوالہ رزین مروی ہے۔

نیز مسند احمد (۱۷۹) اور معجم طبرانی کی تخریج سے حضرت عویمر کی روایت سے بھی اہل قباء سے آنحضرت کا یہ دریافت فرمانا جمع الفوائد ہی میں مروی ہے (جمع الفوائد ج۱ ص۳۴)

حدیث نمبر ۱۴۴

اور غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد (ذی قعدہ ۹ھ میں) عبداللہ بن ابی بن سلول (مشہور رأس المنافقین) کا انتقال ہوا اس کے لڑکے عبداللہ جو مخلص مومن تھے خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ حضور میرے باپ کی نماز جنازہ پڑھا دیں جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے ارادہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو حضرت عمر نے بڑھ کر آپ کو روکنا چاہا اور عرض کیا کہ حضرت یہ بدبخت تو ہمیشہ سے اسلام اور مسلمانوں کا دشمن رہا ہے فلاں دن اس نے یہ کہا اور فلاں دن اس نے ہمارے خلاف یہ سازش کی اور وہ تو منافق ہے اور اللہ تعالےٰ نے منافقین کے حق میں دعائے مغفرت کرنے سے بھی آپ کو منع فرمایا ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

انما خیرنی اللہ فقال استغفر لھم اولا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم، فقال سازیدہ (۱۸۰) علی سبعین قال فصلی علیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصلینا معہ ثم انزل علیہ ولا تصل علی احد منھم مات ابداً ولا تقم علی قبرہ انھم کفروا باللہ ورسولہ وماتوا وھم فاسقون۔ (صحیح بخاری ج۲ ص۲۵۱ باب قولہ ولا تصل علی احد منھم مات ابداً الخ تفسیر سورہ برات وصحیح مسلم ج۲ ص۲۵۲)	اللہ تعالےٰ نے تو مجھے اختیار دیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ اُن کے لیئے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ان کے لیئے ستر دفعہ مغفرت کی دُعا کروگے تو اللہ اُن کی مغفرت نہ کرے گا (آنحضرت نے اس کے بعد فرمایا کہ) تو میں ستر دفعہ سے زیادہ انکے لیئے بخشش مانگوں گا"۔ اس کے بعد آپ نے اُس کی نماز جنازہ پڑھائی (راوی ابن عمر کہتے ہیں کہ) اور ہم سب نے بھی آپ کے ساتھ پڑھی پھر آپ پر یہ صاف صریح آیت نازل ہوئی کہ ان منافقوں

میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز جنازہ نہ پڑھیں اور اس کی قبر پر بھی نہ کھڑے ہوں۔ الخ

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالےٰ کی مرضی منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے کے حق میں نہ تھی پس اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک بھی جمیع ماکان وما یکون کا علم محیط حاصل ہوتا تو آپ حضرت عمر کی رائے کے مطابق اُس راس المنافقین کے جنازہ کی نماز نہ پڑھتے اور اللہ تعالےٰ کی منشا جو بعد میں آیت کے نزول کے بعد آپ کو معلوم ہوئی وہ پہلے سے معلوم ہوتی۔

حدیث نمبر ۱۴۵

(۱۸۱) سیر کے مشہور واقعات میں سے ہے کہ ۹ھ میں جب سورہ براۃ میں مشرکین مکہ کے متعلق کچھ جدید اور اہم احکام نازل ہوئے تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اُن کے باضابطہ اعلان کیلیے اپنا نمائندہ خصوصی بنا کر نیز امیر حج کا منصب عطا فرما کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ بھیجا لیکن بعد میں آپ کو یا تو از خود خیال ہوا یا جیسا کہ بعض روایات میں ہے حضرت جبریل نے آپ کو آگاہ کیا کہ اس قسم کے بین الاقوامی معاہدات کے متعلق کوئی خاص اعلان یا تو آپ بذات خود فرمائیں یا آپ کا کوئی قریبی عزیز، چنانچہ آپ نے بعد میں حضرت علی کو روانہ کیا جو راستہ میں حضرت ابوبکر سے جاملے اور پھر حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق اُن خاص احکام کا اعلان حضرت علی ہی نے کیا۔

(اس واقعہ سے متعلق تفصیلی روایات فتح الباری اوائل تفسیر سورہ براۃ میں ملاحظہ ہوں)

ہمارا مدعا اس واقعہ سے بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک بھی جمیع ماکان وما یکون کا علم محیط حاصل ہوتا تو شروع ہی میں آپ یہ کام حضرت علی کے متعلق فرماتے ــــ اور عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ واقعہ شروع ذی حجہ ۹ھ ہجری میں پیش آیا والتفصیل فی الفتح

(باقی)

چندہ سالانہ

قسم اول

تین روپے

ممالک غیر سے

قسم اول

سات شلنگ

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

الفرقان

بریلی

جلد ۷	بابت ماہ جمادی الاولےٰ ۱۳۵۹ھ	نمبر ۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حمداً و سلاماً

نگاہِ اوّلیں

جنگ یورپ میں دنیا کیلئے سبق :-

غافل اور ناعاقبت اندیش انسان خدا کی قدرت اور اسکی قہر کی بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھتا ہے لیکن ان پر کچھ غور نہیں کرتا اور اُن سے کوئی سبق نہیں لیتا، انسان کی اسی غفلت شعاری کا شکوہ قرآن حکیم اس طرح کرتا ہے

وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

اور خدا کی کتنی ہی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں جن پر برابر اُن کا گزر ہوتا ہے اور وہ ان پر کچھ دھیان نہیں کرتے۔

...... أَفَأَمِنُوْا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ (یوسف)

کیا وہ اس سے بالکل نڈر اور مطمئن ہیں کہ عذاب الٰہی کی کوئی زبردست آفت ان پر چھا جائے یا اچانک ان پر قیامت طاری ہو جائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

یورپ میں اس وقت آگ اور خون کی جو قیامت برپا ہو رہی ہے اُس میں خدا کی قدرت کی کیسی نشانیاں اور اُس کی شان قہاری وجلالی کے کیسے مظاہر ہیں؟ کاش سب انسان اس پر غور کرتے اور سبق لیتے۔

قوموں پر خدا کا عذاب صرف "صیحہ" اور "رجفہ" اور زلزلے اور طوفانوں ہی کی شکل میں نہیں آتا ہے بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا کسی قوم کے ہاتھ میں عذاب کا کوڑا دے دیتا ہے بلکہ کسی قوم کو مجسم عذاب بنا کر ان پر مسلط کر دیتا ہے جن کو وہ سزا دینا چاہتا ہے ـــــ چنانچہ بنی اسرائیل نے جب خدا کو بالکل

بھلا کر زمین پر فساد برپا کرنا شروع کیا تو خدا تعالیٰ نے ان پر عمالقہ جیسی جنگجو اور جبّار قوم کو مسلط کر دیا جنھوں نے اسرائیلیوں کو تباہ و برباد کر کے رکھدیا۔ اسی واقعہ کو قرآن پاک اس طرح بیان کرتا ہے:۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل)

پھر یہ ضروری نہیں کہ جس قوم کے ہاتھ میں قدرت عذاب کا کوڑا دے یا جس کو کسی دوسری قوم پر مسلط کیا جائے وہ اللہ کے نزدیک بہتر اور صالح ہی ہو، بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس سے سزا دلوائی جائے وہ معتوب قوم سے بھی اضل اور ارذل ہو، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ "شریف مجرموں" کے بھنگیوں سے ٹھوکریں لگوائی جاتی ہیں" پس خوش نصیب ہیں وہ جو دوسروں پر گزرنے والے ان حوادث و واقعات میں خدا کی قدرت کا مطالعہ کرتے اور اپنے لئے سبق حاصل کرتے ہیں"۔ السعید من وعظ بغیرہ"

یوں تو خدا کی زمین کے ہر حصہ میں خدا سے بغاوت کی جا رہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس بغاوت اور خدا فراموشی میں امامت اور پیشوائی کا منصب یورپ کو حاصل ہے انہیں سے بہت سے خدائی طاقتوں، بلکہ سرے سے "خدا" ہی کے منکر ہو گئے اور مادّی طاقت و قوت ہی کو اُنھوں نے سب کچھ سمجھ لیا اسی پر توکل و اعتماد کیا اور اسی کو خوف و رجا (بیم و اُمید) کا مرکز بنالیا اُنھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ طاقت بس ہماری ہی طاقت ہے، اور ہم ہی دُنیا کی قسمتوں کے مالک ہیں کیونکہ بحر و بر کے بڑے حصہ پر ہمارا قبضہ ہے ہمارے پاس بڑا زبردست اور بے نظیر جنگی بیڑا ہے۔ بے شمار توپیں اور بندوقیں لاتعداد مشین گنیں اور ہزارہا ہوائی جہاز ہیں —— اسی ساز و سامان کے غرور نے اُن میں خدا فراموشی بلکہ خدا سے بغاوت کو پیدا کیا، اور انھوں نے سمجھا کہ اب ہم کو کوئی طاقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی

یہ حالات خود ہی بتلا رہے تھے کہ عنقریب خدائے ذوالجلال کی طرف سے یورپ میں ضرور کچھ ایسے ہولناک حالات ظہور میں آئینگے جن سے ان مغروروں کے غرور کو توڑا جائیگا۔ کیونکہ حق تعالےٰ کی یہ ازلی اور دائمی سنت ہے کہ جب دنیا میں ایسے بدمست نمود حاصل کر لیتے ہیں اور انکا عدوان وطغیان حد سے گزر جاتا ہے تو اُنکی بےپناہ قاہرانہ قدرتیں دُنیا کو درسِ عبرت دینے اور بدمستوں کی بدمستی اُتارنے کیلئے ظاہر ہوتی ہیں اور بسا اوقات پُرانے نظام کو لپیٹ کر نئی بساط بچھادی جاتی ہے اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر کر دیئے جاتے ہیں تاکہ یہ حقیقت مٹنے نہ پائے کہ اس دنیا میں ہمیشہ کی بالاتری و بالادستی کسی کیلئے نہیں تلک الایام نداولہا بین الناس

اگر ایسا نہ ہو تو ظاہر ہے دُنیا یہ کیسے سمجھے کہ ملک کا حقیقی مالک کوئی اور ہے جو اپنی خاص مشیت کے ماتحت پھیرا بدلتا رہتا ہے:
قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ

ہاں توجنھوں نے اپنی توپوں، بندوقوں، مشین گنوں، ہوائی جہازوں، ٹینکوں اور آبدوزوں کو سب کچھ سمجھا تھا اور جو خدائی کی مالکیت کو اپنی انھیں ایجادات و مصنوعات سے وابستہ سمجھتے تھے انکو ایک فریق نے تو اپنے ان دیوتاؤں کی دیا دیکھ لی ——— اور انہی قوتوں کا پرستار دوسرا فریق جو آج بظاہر فتح حاصل کر رہا ہے یقین ہے کہ اسی قانون قدرت کے مطابق وہ بھی ایک دن بدیر یا سویر یہی نتائج دیکھ لے گا اور کیا عجب کہ اسی ہنگامہ کا انجام اُس کے لیے تصویر کا دوسرا رُخ پیش کر دے۔

ایک دہری اور ناخداشناس ان سب واقعات کو دیکھتا ہے اور دیکھتا رہے گا اور اس کے سوا کوئی سبق حاصل نہ کرے گا کہ جب کو دنیا میں زندہ رہنا ہو وہ دوسروں کی موت و ہلاکت کا زیادہ سے زیادہ سامان تیار کر لے، ——— لیکن ایک مومن اور خداشناس انہی واقعات سے یہ سبق لے گا کہ اپنی بڑی سے بڑی طاقت پر بھروسہ کر کے کمزوروں کو ستانا اون کے حقوق غصب کرنا اور اُن سے بے انصافی کرنا وہ جرائم ہیں جنکی پاداش بھگتنی ہی پڑتی ہے، اور یقیناً دنیا کی ساری طاقتوں سے اوپر کوئی اور بھی قدرت والا ہے جس کے سامنے سب عاجز اور لاچار ہیں اور دنیا میں توازن قایم رکھنے کیلئے جب اُس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے تو وہ کمزوروں سے طاقتوروں کو اور زبردستوں سے زیردستوں کو گروا دیتا ہے، ——— لیکن یہ جو کچھ ہوتا ہے عموماً اسباب ہی کے ماتحت ہوتا ہے، جس برسر اقتدار طاقت کو وہ نیچا کرنا چاہتا ہے اُس میں وہن، جمود اور تعیش و تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور جس گری ہوئی قوم کو وہ اوپر لانا چاہتا ہے اُس میں حرکت و عمل کا ذوق، موت سے کھیلنے کا شوق، شدائد کے مقابلہ کی جرأت اور ناقابلِ شکست عزم پیدا ہو جاتا ہے پھر اسی تبدیلی سے وہ نتائج پیدا ہوتے ہیں جو دنیا کے لیے بالکل خلاف توقع اور حیرت میں ڈال دینے والے ہوتے ہیں۔

مسلمانو! کبھی سوچو!

اگر ہٹلر و مسولینی کو اپنی قوم کے ناموس اور اپنے غلط اصولوں کی برتری کا عجیب عشق ہے انگریزوں کو اپنی قوم اور اپنے ملک کی عزت کی فکر اور اپنے مقبوضات کی حفاظت کا جس قدر خیال ہے اور اس کیلئے جیسی زبردست قربانیاں وہ دے رہے ہیں اور دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں کیا خدا کے نام اور اس کے دین مقدس کی سربلندی، اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اصولوں کی بالاتری کیلئے ہم اُس کا عشر عشیر بھی کر رہے ہیں یا کرنے کو تیار ہیں ——— حالانکہ کہا گیا تھا کہ

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

رعایتی للعہ غیر مجلد رعایتی ۱۲ہ

مکمل رسائل میں سے جن مسائل کو ان کی تفصیل کے ساتھ حل کر کے اس موضوع پر ایک نہایت مبسوط کتاب (تحقیقی) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وہ محققانہ کتاب جس میں جہاد کے موضوع پر

عبرت کی باتیں:-

(۱)

ہندوستان سے باہر نہیں اسی بر اعظم کے اندر، ملک راجپوتانہ کے علاقہ میواڑ (اودے پور) میں پہاڑیوں کے درمیان شری ناتھ جی کے نام کا ایک مندر ہے۔ بستی کا نام ناتھ دوارا ہے۔ سب ہندوؤں کا نہیں، صرف فرقہ وشنو اور وشنوؤں میں بھی اُن کی ایک چھوٹی سی ٹکڑی پشٹی مرگیہ والوں کی عقیدت کا مرکز خود اس فرقہ ہی کو وجود میں آئے کچھ ایسا بہت زمانہ نہیں ہوا ہے، کُل سولھویں صدی مسیحی کی تو بات ہے، اور پھر تیرتھ بنتا قائم ہوتے ہوتے تو ۲ صدیاں اور لگ گئیں۔ میلا اٹھارھویں صدی سے چلنا شروع ہوا۔ ۳۰ ہزار درشن کرنے والوں کا سالانہ اوسط ہے۔ اور طرح طرح کے چڑھاووں سے، نیز وقف کی جائدادوں سے آمدنی، اب تو خیر کچھ گھٹ گئی ہے لیکن کچھ روز قبل تک تخمینہ ۳ لاکھ سالانہ کا تھا! راستہ دشوار گزار، لیکن زائروں کا تانتا بندھا ہوا،

دیوتا جی کے معمولات بالکل ہم آپ جیسے انسانوں جیسے ہیں، دن میں کئی کئی بار پوشاک بدلی جاتی ہے، کھانا کھلایا جاتا ہے، بڑے تکلف و اہتمام کے ساتھ۔ سونا، جاگنا، نہانا، دھونا، کھانا پینا، درشن دینا، سب گوشت پوست کے بنے ہوئے زندہ انسانوں کی طرح۔ صبح تڑکے پجاری گھنٹی بجا کر بیدار کرتا ہے، بھجن شروع ہوتے ہیں، دروازہ کھلتا ہے، اہل حاجت درشن کے لیئے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ دوپہر کو دیوتا جی کا وقت خواب ہوتا ہے، پھاٹک بند ہو جاتا ہے، شام کو پھر کھلتا ہے، دن اور رات دونوں وقت کھانے بہت سے برتنوں میں لاکر مورتی کے آگے چُن دیئے جاتے ہیں۔ اور کچھ دیر بعد وہی کھانا پجاریوں اور جاتریوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے بھنڈار (لنگر) کی مقدار اور کھانے کے تکلفات کا اندازہ اس سے کیجیئے، کہ ایک ایک ہزار بلکہ دو دو ہزار روپیہ روزانہ تک کی رقم کھانے کی مد میں اُٹھتی ہے! (سارے معلومات کے لیئے ملاحظہ ہو روزنامہ ہندو، مدراس ۱۲ جنوری ۱۹۴۰ء) —— یہ حال ہندوستان کے صرف ایک تیرتھ کا ہوا، جو نہ مرجع عام ہے، اور نہ کچھ ایسا پرانا ہی ہے۔ اسی سے قیاس کیجیئے کہ پراگ (الہ آباد) اور ہردوار اور اجودھیا اور رامیشورم اور دوارکا اور متھرا اور کاشی (بنارس) کے بڑے بڑے اور مشہور استھانوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔ کیسا جم غفیر لگتا ہوگا، کیسی بے شمار دولت لُٹتی ہوگی، شرک اور بت پرستی کی ہر رسم کس بڑے پیمانہ پر ادا ہوتی ہوگی!

غیروں کو اُن کے حال پر چھوڑیئے۔ اپنے ہاں سوچیے اور دیکھیے کہ کیا کچھ کم ہو رہا ہے! اکیلے استھانوں کے مقابلہ میں آپ کے ہاں کے بڑے بڑے مشہور "ہستانے" اور آپ کے ہاں کی زرق برق درگاہیں مزارات، اُن کے کلسدار گنبد اور آپ کے ہاں کے عرسوں اور میلوں کے جمگھٹے، کہیں کی گیارھویں اور کہیں کی بارھویں، کہیں کی سترھویں اور کہیں کی نوچندی، آپ کے ہاں کی قبروں پر چڑھے ہوئے چڑھاوے اور چادریں، اور طرح طرح کی "منتوں" اور "نیازوں" کے پیسے اور روپے حلوے اور توشے ارنگ رنگ کے پھول اور مٹھائیاں، اور غسل کا پانی اور بے حساب اور اَن گنت "تبرکات"! کس چیز میں آپ غیروں سے ہیٹے اور پیچھے ہیں؟ ——— سوچیے اور پھر سوچیے کہ ہونا چاہیئے کیا تھا آپ کو، اور ہیں آپ کیا؟

(صدق لکھنؤ ۲۴ جلد ۵)

(۲)

رسالہ "نگار لکھنؤ" کے اڈیٹر نیاز فتحپوری اور انکی خصوصیات سے کم لوگ ناواقف ہوں گے، اسلامیات کے ساتھ اُن کا تمسخر یا اُن کے ساتھ شیطان کا تمسخر بھی اکثر حضرات کو معلومات ہوگا، ایک مرتبہ آپ ملت کے دباؤ سے مجبور ہوکر اپنی ان حرکات سے بزدلانہ اور منافقانہ توبہ بھی کرچکے ہیں، اور اس کے بعد اگرچہ یہ توبہ توڑی بھی جاچکی ہو لیکن ادھر کچھ عرصہ سے آپ نے مذہب اور مذہبیات کو اپنے دائرہ بحث سے خارج ہی کر دیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ انکے اس طرز عمل نے اُن کے کاروبار پر بُرا اثر ڈالا اور جو دشمنان اسلام نگار کو صرف اسی لیئے خریدتے تھے کہ اسلام کے خلاف استعمال کرنے کے لیئے ایک مسلمان کہلانے والے کے قلم کے تیار کیئے ہوئے کچھ اسلحہ اُس سے ملیں اُنھوں نے اُس کی خریداری سے سبکدوشی کرلی اس لیئے اب انھوں نے اسلام کو پھر تختہ مشق بنانا شروع کیا ہے اور جون کے نگار میں ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے اپنی اس "تحقیق" کا اعلان کیا ہے کہ

"کلام مجید کو میں نہ کلام الٰہی سمجھتا ہوں نہ الہام ربانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں"

اگرچہ ایسا خیال رکھنے والے دنیا میں کروروں موجود ہیں لیکن وہ علانیہ اپنے کو نامسلمان کہتے ہیں، لیکن یہ منافق یا مرتد اس اعلان کے باوجود اپنے کو ابھی تک مسلمان ہی کہتا ہے اور بدقسمتی سے مسلمان سوسائٹی ہی کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ افسوس اس دور الحاد میں مسلمان اتنا بے بس ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اس قدر سخت بغاوت کرنے والے کو اسلامی برادری سے خارج کرنا بھی اس کے بس میں نہیں، چہ جائے کہ کیفر کردار کو پہونچانا۔

لے اس اجمال کی تشریح "نگار" کے اُس اشتہار کے مضمون سے معلوم ہوسکتی ہے جو کبھی کبھی تیج وغیرہ ہندو اخبارات میں شایع ہوتا ہے ۱۲

"قوم" کی "خدمت" اور مذہب سے بغاوت

اس وقت مسلمانوں میں "قومی کام کرنے والے حضرات" دو قسم کے ہیں ایک وہ جن کو دین و شریعت سے قولاً و عملاً کوئی دلچسپی نہیں، وہ مسلمانوں کو دنیا کی دوسری قوموں کی طرح بس ایک قوم سمجھتے ہیں اور اسی خالص قومی نقطۂ نظر سے وہ مسلمانوں کے قومی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو اسلام سے قطعاً بے بہرہ ہیں، وہ اسلام کی ضروری اور بنیادی تعلیمات پر بھی یقین نہیں رکھتے بلکہ نظام شرعی کی پابندی (یعنی عملاً پکا مسلمان ہونا) اُن کے نزدیک "دقیانوسیت" اور قابل صد تنفر چیز ہے — اور ہم صاف کہتے ہیں کہ شرعی اور حقیقی معنے میں ایسے حضرات کو مسلمان بھی نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ وہ قومی مسلمان ہیں یعنی مسلمان کہلانے والی قوم کے ایک فرد ہیں اور اس لیے قانونِ وقت ان کو مسلمان مانتا ہے اور مردم شماری کے رجسٹروں میں ان کو مسلمان لکھا جاتا ہے۔

دوسری قسم کے "قومی کارکن" وہ ہیں جو دین و شریعت سے بھی واسطہ رکھتے ہیں، بلکہ جو کچھ کرتے ہیں اکثر دین و مذہب ہی کے نام پر کرتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو اپنی عملی سرگرمیوں میں دینی ہدایات اور شرعی احکام کی پیروی و پابندی ضروری نہیں سمجھتے یا عملاً اس کا اہتمام نہیں کرتے۔

پہلی قسم کے لوگوں سے تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ "لکم دینکم ولی دین"، ہاں دوسری قسم کے حضرات سے کچھ عرض کیا جاسکتا ہے اور اس وقت وہی ہمارے مخاطب ہیں۔

مسلمان قوم کا قوام دین و شریعت سے ہے اور اس سے بڑا کوئی شیطانی فریب نہیں کہ اسلام یا مسلمانوں کی خدمت کے سلسلہ میں "حدود اللہ" اور "احکام الٰہیہ" کی پامالی کو روا رکھا جائے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین بالکل مکمل ہے ہماری محدود اور نارسا عقلوں کا حق نہیں کہ اپنی اختراع کی ہوئی مصلحتوں کی آڑ لے کر ان آسمانی احکام میں کوئی ادنیٰ ترمیم کرسکیں۔ بالخصوص جو احکام اجتہادی نہیں بلکہ منصوص ہیں، اُن سے بے اعتنائی یا کسی "مصلحت" کے لیے اُن کی خلاف ورزی تو اسلامی نقطۂ نظر سے

انتہائی درجہ کی گمراہی ہی ہے اور پھر اس معصیت کیشی کو اسلام یا مسلمانوں کیلئے مفید بتلانا اور اس کو اپنی مذہبی اور قومی سرگرمیوں کا جزو بنانا تو درحقیقت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو ناقص و نامکمل قرار دے کر اُس سے "خاموش بغاوت" کرنے کے ہم معنی ہے اعاذنا اللہ من ذالک

ممکن ہے کہ یہ اجمالی گذارش اُن حضرات کو اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے کے لیئے متوجہ نہ کرسکے جنھیں اس طرف خاص طور سے متوجہ کرنا مقصود ہے اس لیئے چند خاص نظائر بھی پیش کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

(۱)

چند روز ہوئے آگرہ کا ایک رسالہ "معلومات اسلام" نظر سے گزرا، اس کی لوح پر جلی قلم سے لکھا ہوا تھا "نو مسلم تبلیغی جماعت آگرہ کا باتصویر جریدہ" اسکے نکالنے والے ایک صاحب ہیں جن کے نام کے ساتھ "مہاشے" اور "مبلغ اسلام" لکھا جاتا ہے — ٹائٹل پیج اُلٹنے کے بعد دیکھا تو پہلے صفحہ پر چند تصویریں تھیں جن میں ایک تصویر خود ان "مبلغ اسلام" صاحب کی بھی تھی جس میں دکھلایا گیا ہے کہ آپ مغنیانہ انداز میں بیٹھے ہوئے ستار بجا رہے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ گا رہے ہیں ——— تصویر کے نیچے لکھا ہوا ہے

"نو مسلم اچھوتوں میں تبلیغ کرتے وقت مہاشے ..... مبلغ اسلام"

ایمان والوں اور اسلام کا درد رکھنے والے مسلمانوں کے لیئے کس قدر المناک اور تکلیف دہ ہے یہ نظارہ، اس کا اندازہ کرنا بھی اُن لوگوں کیلئے دشوار ہے جو دین مقدس اور نفسانی تفریحات کے بُعد کو بھی نہیں سمجھ سکتے !

اللہ اکبر! پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم تو یہ ارشاد فرمائیں کہ

امرنی ربی بمحق المعازف والمزامیر (احمد)	میرے پروردگار نے معازف و مزامیر کے مٹا دینے کا مجھے حکم دیا ہے،

دوسری روایت میں ہے :-

ان اللہ بعثنی رحمۃ للعالمین و امرنی ان احاق المزامیر والکنارات (مسند احمد)	اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہان کے لیئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ مزامیر اور رباب میں آگ لگا دوں۔

ارمان لئے ہوئے دین کی تبلیغ کے مدعی ستار و سارنگی سے "اسلام" کے وعظ کہیں، لیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیًا منسیًا۔

اگر ان مبلغ اسلام صاحب کی نیت درحقیقت خدمت اسلام کی ہے تو ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام آپ کی اس تبلیغ سے بے نیاز بلکہ اس طریقۂ تبلیغ سے سخت بیزار ہے، جن مذاہب میں خود کوئی روح نہ ہو ان کی طرف لوگوں کو کھینچنے کیلئے تو ضرور ان شیطانی آلات کی ضرورت ہے لیکن "دین اللہ" کی تبلیغ کے لئے یہ طریقہ اختیار کرنا، خدا کی معصیت اور تعلیمات دین سے بغاوت کے علاوہ اس دین کو انہی بے روح مذاہب کی صف میں کھڑا کر دینا ہے جو اپنی مقبولیت میں ستار و سارنگی اور ساز و نغمہ کے محتاج ہیں، اور اس سے بڑھکر دین پر کوئی ضرب نہیں لگائی جا سکتی۔

(۲)

کچھ عرصہ گزرا مسلمانوں کی ایک مشہور انجمن کے ایک ذمہ دار بزرگ سے میں نے عرض کیا کہ آپ کی جماعت کے رضاکار بعض مقامات پر بینڈ باجہ استعمال کرتے ہیں جسکے ناجائز اور معصیت ہونے میں کوئی شبہ نہیں آپ اس طرف توجہ فرمائیں اور دیگر زعمائے جماعت کو بھی اس طرف توجہ دلائیں۔

ان بزرگ نے فرمایا ہاں یہ تو ٹھیک ہو لیکن والنٹیروں کی تنظیم کے لئے فی زمانا بینڈ ناگزیدہ ہے اب اس کے بغیر فوجی تنظیم ہو ہی نہیں سکتی آج کوئی ملک ایسا نہیں جس کی فوج بینڈ نہ استعمال کرتی ہو۔ مصطفےٰ کمال کی فوج بھی بینڈ استعمال کرتی ہو۔ رضا شاہ کی فوج استعمال کرتی ہے حتیٰ کہ ابن سعود جو ایک مذہبی شخص ہے اس کی فوج بھی بینڈ استعمال کرتی ہے۔

اسی جماعت کے ایک کارکن صاحب کو جو اگرچہ کوئی علمی اور مذہبی ذمہ داری نہیں رکھتے لیکن جماعت کے حلقۂ اثر میں اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں کہتے سنا گیا کہ رضاکاروں کے بینڈ باجہ کے لئے چندہ دینا کار ثواب ہے کیونکہ آج کل۔ ایک فوجی آلہ ہے۔

ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہو کہ "قومی اور سیاسی" کاموں میں شرعی احکام کی ان حضرات کے نزدیک کیا وقعت باقی رہ گئی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جن معصیتوں کے خلاف اعلان جنگ فرمایا اور جنکو مٹا دینا اپنے پروگرام کا جزو بنایا آج یہ "خدام اسلام" اور "خدام قوم" مسلمان قوم کی فلاح اور خیر انہی معصیات میں دیکھتے ہیں ــــ فلیبک علی الاسلام من کان باکیا۔

(۳)

ایک فاضل دوست جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ تصویر کشی کو (بشمول فوٹو) ناجائز اور معصیت ہی سمجھتے ہیں اُن کے متعلق مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنی فلاں چیز مصوّر شایع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اتفاقاً اسی عرصہ میں ملاقات بھی ہوگئی، میں نے دریافت کیا کہ تصویر کے حکم شرعی کے بارہ میں کیا آپ کی رائے عام علماء سے الگ ہے؟ فرمایا نہیں، شرعی حکم سر وآنکھوں پر، مگر اس زمانہ میں بغیر فوٹو کے پروپیگنڈا مکمل نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے فلاں فلاں گمراہ اور گمراہ کن سیاسی و مذہبی جماعتیں تصاویر کے ذریعہ سے اپنے کاموں کا کتنا زبردست پروپیگنڈا کر رہی ہیں، اُن کا کامیاب مقابلہ بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی وہی اوزار استعمال کریں"۔

گویا اب کسی حرام فعل کے ارتکاب کیلئے اتنی وجہ کافی ہے کہ کوئی غلط رَو جماعت اُس کو استعمال کرتی اور اس سے فائدہ اُٹھاتی ہو۔

درحقیقت مادہ پرستان یورپ کے سیاسی استیلا نے ہمارے ذہنوں پر اتنا اثر ڈالا ہے کہ ہمارے اندر جو مذہبی خیال رکھنے والے ہیں وہ بھی قومی کاموں میں مادی منفعت کے مقابلہ میں شرعی احکام اور دینی ہدایات کو کوئی خاص وقعت نہیں دیتے، اگر ٹرکی وغیرہ کے احوال کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "دینداروں" میں "لادینی" کا آغاز اسی نقطہ سے ہوتا ہے اور "خدا پرستوں" میں "مادہ پرستی" اولاً اسی راہ سے آتی ہے۔

(۴)

یہ حقیقت ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں بھی شرعی احکام کے تحت ہونی چاہئیں اور سیاست کو دینی ہدایات سے آزاد سمجھنا یقیناً لادینی کا ایک شعبہ ہے۔ دوسرے طبقوں کی رائے اس بارہ میں خواہ کچھ ہو لیکن جو حاملان مذہب اور رہنمایان دین سیاسی کاموں میں سرگرمی سے حصّہ لیتے ہیں اُن کا تو یہی راسخ عقیدہ اور زبردست دعوےٰ ہے، اور ہونا بھی چاہیے لیکن افسوس ہے کہ عمل اُن کا بھی اس بارہ میں دوسروں سے کچھ زیادہ ممتاز نہیں۔ ان حضرات کی سیاسی مجالس کو دیکھنے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں دین کی پوری حکومت ہے۔ مجالس خاصہ وعامہ کی تشکیل اور طریقہ کار میں مغرب کے جدید طور طریقوں کا تتبع تو ایک بلا ہے جس کو اب بہت سے حضرات ناگزیر سمجھنے لگے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ایسے منکرات بھی ہوتے ہیں جن کو نہ تو ناگزیر کہا جا سکتا ہے اور نہ اُن سے کسی قسم کا

کوئی "فائدہ" ہی ہوتا ہے بلکہ صرف ہماری غفلت یا تصلب فی الدین کی کمی ان کے لیئے موقع بہم پہونچا دیتی ہے — مثلاً ان مجالس میں بھی کبھی کبھی فوٹو لیئے جاتے ہیں اور قدرت کے باوجود بسا اوقات اس رسم بد کو نہیں روکا جاتا "انقلابیت" کی نمائش کرنے والے بعض شاعروں کو نظم خوانی کا موقع دیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان کی نظموں میں مذہب بلکہ خدائے مذہب کے خلاف بھی بغاوت کا اظہار ہوتا ہے (جو آج کل کے "انقلاب پسندی" کے مدعی آوارہ شاعروں کا عام عارضہ ہے) لیکن نہ تو اُن کو اس پر روکا ٹوکا جاتا ہے اور نہ بعد میں اس کی اصلاح یا تلافی کی کوئی فکر کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی اس قسم کی بعض جزئی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی قومی کاموں اور سیاسی سرگرمیوں میں عملاً دینی ہدایات کا کماحقہ لحاظ نہیں رکھا جاتا — یہ صحیح ہے کہ ہمارا ماحول بہت بگڑ چکا ہے اور آج دینی ہدایات کی پوری پابندی بڑے زبردست عزم کو چاہتی ہے لیکن اگر رہنمایان مذہب میں بھی یہ عزم نہ ہوگا اور وہ بھی ہوا کے رُخ پر ہی چلنا اپنا اصول بنالیں گے تو پھر دینی ہدایات پر عمل کرنے کیلئے آخر کون مخلوق آئیگی۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

دورِ حاضر کی دو قابلِ دید کتابیں

دین و دانش ——— اور ——— دین و آئین

مصنفہ مولنا سید محمود علی صاحب پروفیسر کالج کپورتھلہ۔ جن میں سائنس جدید کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کا حکیمانہ اصول سے موازنہ کیا گیا ہے، اور جن کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو ہر زمانہ کا ساتھ دے سکتا ہے اور جو اپنے اصول و احکام کے ذریعہ غیر معقول عقائد، بیجا تعصّب، نفرت، باہمی اوہام پرستی اور رجعت پسندی کی جڑیں کاٹ دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل علم اور ارباب فکر ان کتابوں کے مطالعہ سے محروم نہ رہیں۔ دونوں کتابوں کی قیمت تین تین روپے

دین و دانش میں اسلامی عقائد اور اسلامی عبادات کو عقل اور فلسفۂ جدید کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اور دین و آئین میں اسلامی قوانین اسلامی شریعت کی برتری اور صحت، دنیا کے تمام دوسرے قوانین اور نظامہائے زندگی کے مقابلہ میں نہایت روشن دلائل و براہین سے ثابت کی گئی ہے۔

"موعظۃ و ذکریٰ"

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات

(بندوں کے باہمی حقوق اور معاشری تعلقات کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو ہم نے چند حصّوں میں تقسیم کیا تھا ان میں سے پہلی قسم "حقوق و فرائض کی تعلیمات" کا کچھ نمونہ ہم پیش کر چکے ہیں، دوسری قسم "اخلاق" کے متعلق آپکی چند زریں ہدایات آج کی صحبت میں پیش کی جاتی ہیں)

آپکی اخلاقی تعلیمات مثبت بھی ہیں اور منفی بھی یعنی جس طرح آپ نے اخلاق حسنہ کے اختیار کرنے اور انپر عمل پیرا ہونے کی مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے اسی طرح اخلاق رذیلہ کو ترک کرنے اور اُن سے مجتنب رہنے پر بھی آپ نے بہت زیادہ زور دیا ہے دونوں قسم کی تعلیمات کا مختصر نمونہ ذیل میں ملاحظہ ہو:۔

رحم رحم (یعنی کسی پر ترس کھا کر اس کے ساتھ نیکی کرنے) کی اہمیت اور بے رحمی و قساوت کی شناعت معلوم کرنے کیلئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ ارشاد کافی ہے۔

من لا یرحم لا یرحم (بخاری)	جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

عفو و درگزر اس کے متعلق قرآن حکیم میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے اور کیسے عجیب انداز میں کی گئی ہے۔

وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ (سورۂ نور)	اور معافی دینی چاہیئے اور درگزر کرنا چاہیئے کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ (شوریٰ)	اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی سے دیا جا سکتا ہے (لیکن) جو (وسیع الظرف اس پر بھی معاف کردے

اور صلح کر لے تو اُس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔

حدیث میں ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک دن جناب موسیٰ علیہ السلام نے درگاہ خداوندی میں عرض کیا:۔

یا رب من اعزّ عبادک عندک قال من اذا قدر غفر (مشکوٰۃ)

الہٰی تیرے بندوں میں کون تجھے زیادہ پیارا ہے؟ ارشاد ہوا جو قصوروار پر قابو پاکر اُس کو معافی دیدے۔

اس کے برعکس جو شخص اس صفت خیر سے محروم ہو اور بہر حال انتقام ہی لے اُس کے متعلق فرمایا:۔

من اعتذر الی اخیہ فلم یعذرہ او لم یقبل عذرہ کان علیہ مثل خطیئۃ صاحب مکس (مشکوٰۃ)

جس نے اپنے بھائی سے معذرت کی اور اُس نے اس کی معذرت قبول نہ کی تو اس کو بیجا ٹکس وصول کرنیوالے کے برابر گناہ ہوگا۔

احسان خدا کی مخلوق کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کے متعلق سیکڑوں ہدایات قرآن پاک اور احادیث نبوی میں فرمائی گئی ہیں مثلاً سورہ بقرہ ہی میں ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اور احسان کرو خدا احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے:۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

اور تم (خلق خدا کے ساتھ) احسان کرو جیسا خدا نے تم پر احسان کیا ہے۔

پھر یہ ہدایت بھی ہے کہ یہ احسان بالکل بے غرضی کے ساتھ ہو نہ تو دل میں بدلہ کی آرزو ہو اور نہ احسان جتلایا جائے۔ نہ کبھی طعنہ دے کر یا احسان کے دباؤ سے کسی دوسرے طور پر اسے تکلیف پہنچائی جائے چنانچہ فرمایا گیا۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ

اور زیادہ بدلہ کے حاصل کرنے کے لئے احسان نہ کرو

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى

اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور اذیت پہنچاکر رائیگاں کرو

سخاوت اور فیاضی یہ بھی احسان ہی کا ایک شعبہ مگر اہم شعبہ ہے جس پر قرآن پاک اور احادیث میں خصوصیت سے

زور دیا گیا ہے اور اس کی بہت تاکید کی گئی ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا انفقوا مما رزقنٰکم من قبل ان یاتی یوم لا بیعٌ فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ (بقرہ)

اے ایمان والو! (مصارفِ خیر میں) خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے اُس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید فروخت ہوگی اور نہ کسی کی دوستی یا سفارش ہی کام آئے گی۔

دوسری جگہ ارشاد ہے

الذین ینفقون اموالھم فی سبیل اللّٰہ ثم لا یتبعون ما انفقوا منًّا ولا اذیً لھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون ہ (بقرہ)

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کیے پیچھے نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ طعنہ دیتے ہیں ان کا اجر و ثواب ان کے رب پاس ہی انکو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے

اس کے برعکس جو لوگ راہِ خدا میں اپنی خداداد دولت خرچ نہیں کرتے اُن کے متعلق ارشاد ہے:-

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اٰتٰھم اللّٰہ من فضلہ ھو خیرًا لھم بل ھو شرٌ لھم سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیٰمۃ،

جو لوگ اس دولت سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں جو خدا نے ان کو اپنے فضل و کرم سے دی ہی بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اُن کے حق میں بہتر ہو بلکہ اس میں ان کی بڑی سراسر برائی ہو قیامت کے دن ان کے گلے میں اسی کا طوق ڈالا جائیگا جسمیں انھوں نے بخل کیا ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

یا ابن اٰدم ان تبذل البذل خیرٌ لک وان تمسک شرٌ لک (مشکوٰۃ)

اے آدم کے بیٹے! تیرا خرچ کرنا تیرے لیے بہتر ہے اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے بُرا ہے۔

واضح رہے کہ یہ سخاوت اور فیاضی اُسی وقت محمود ہو جبکہ مصرف اور محل میں ہو، ورنہ خدا کی دی ہوئی دولت کا بے محل اور بے جا خرچ کرنا تو کفرانِ نعمت اور قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے جس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:- ولا تبذر تبذیرًا ط اور مال کو بیجا نہ لٹاؤ (فضول خرچی نہ کرو) اور فرمایا گیا:-

اِنَّ المُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا ط

فضول مال اڑانیوالے شیطانوں کے بھائی برادر ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا اور کفرانِ نعمت کرنے والا ہے۔

رفق ولطف یعنی نرم مزاجی اور شیریں گفتاری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف تھا، اور آپ نے اپنی امت کو بھی اس کی بڑی تاکید فرمائی ایک مرتبہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ نے ایک شخص کی بدکلامی کا جواب سختی سے دیا تو آپ نے فرمایا

یاعائشہ علیک بالرفق وایاک والعنف والفحش۔
اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی و بدکلامی سے اپنے کو الگ علٰحدہ رکھو۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ رفیق یحب الرفق ویعطی علیہ ما لا یعطی علی العنف،
اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

من اعطی حظہ من الرفق فقد اعطی حظہ من الخیر ومن حرم حظہ من الرفق فقد حرم حظہ من الخیر۔ واثقل شیئ فی میزان المومن یوم القیمۃ حسن الخلق وان اللہ یبغض الفاحش البذی (کنز العمال)
جس شخص کو نرم خوئی سے حصہ ملا اُسکو بھلائی کا حصہ مل گیا اور جو نرم خوئی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہ گیا، اور قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں سب سے زیادہ وزنی چیز اُسکی خوش خلقی ہوگی اور اللہ تعالیٰ فحش گو بدزبان کو سخت ناپسند کرتا ہے۔

حلم یعنی تحمل و بُردباری یہ بھی انسان کے بہترین اور اعلیٰ اوصاف میں سے ہے جس سے بہت سے شر و فساد دبتے ہیں اور بہت سی برائیوں کا انسداد ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک نے جہاں اُن خوش بختوں کا ذکر کیا ہے جنکے لیے جنت آراستہ کی گئی ہے وہاں حلیم و بُردباروں کو بھی خصوصیت سے شمار کرایا ہے فرمایا گیا

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس
جو غصہ کو پی جانیوالے ہیں اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں

حدیث میں ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

من کف غضبہ کف اللہ عنہ عذابہ (کنز)
جسنے اپنا غصہ روکا اللہ تعالےٰ اس سے اپنا عذاب روکے گا۔

فروتنی وخاکساری یہ بھی انسان کے اچھے اور اعلیٰ اوصاف میں سے ہے قرآن پاک نے متواضعین کی مدح وثنا ان بلند کلمات میں کی ہے۔

وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونًا الآیۃ
رحمت والے خدا کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں۔

اس کے برعکس اترانے والوں اور اکڑ کر چلنے والوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:۔

ان اللہ لا یحب کل مختال فخور ط	اللہ تعالیٰ اترانے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ان اللہ اوحی الیّ ان تواضعوا حتیٰ لا یفخر احد علیٰ احد ولا یبغی احد علیٰ احد (مشکوٰۃ)	تحقیق اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تواضع و فروتنی اختیار کرو یہاں تک کہ کوئی کسی کے مقابلہ میں فخر نہ کرے۔ اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

من تواضع للہ رفعہ اللہ (ایضاً)	جس نے اللہ کیلئے فروتنی اختیار کی خدا اُسے بلند کریگا

عزت نفس اور خودداری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات میں جس طرح فروتنی وخاکساری کی ہدایت کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے اُسی طرح باوقاری اور خودداری پر بھی زور دیا گیا ہے اور بے شک جس طرح فروتنی وخاکساری ایک محمود خصلت ہے اسی طرح عزت نفس اور خودداری بھی ایک بلند کیرکٹر انسان کیلئے ضروری وصف ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان تملق پیشگی وچاپلوسی سے بالاتر رہے، اور اپنی اغراض کے لئے دنائت اور اخلاقی پستی کا مظاہرہ نہ کرے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا اضطراری ضروریات کے "سوال" سے سخت ممانعت فرمائی ہے کیونکہ وہ عزت نفس اور خودداری کے منافی ہے اور اس کی وجہ سے انسان دوسروں کی نظر میں بہت گرجاتا ہے۔ اور قرآن پاک میں اصحاب صفہ کا امتیازی وصف "تعفف" بیان فرمایا گیا ہے جس کا مطلب "خوددارانہ زندگی" ہے (سورۂ بقرہ ۲۷۶)

اسلام کے قلعے

(نمبر ۲)

(از جناب مولٰنا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی استاذ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ربیع الاول کے "الفرقان" میں "اسلامی قلعوں" کے عنوان سے عربی مدارس کی اہمیت اور ضرورت پر کچھ عرض کیا گیا تھا، لیکن کسی ادارہ کے قیام و بقا کے لیئے یہی کافی نہیں کہ اس کے بنیادی مقاصد نہایت اہم اور ضروری ہیں، اس کے سابقہ خدمات نہایت شاندار ہیں اور مستقبل میں اس کے بڑے اچھے ارادے اور نیک نیتیں ہیں۔ یہ زمانہ تنازع للبقاء کا ہے۔ اور تنازع بھی صرف مادی و جسمانی نہیں بلکہ ذہنی، اجتماعی اور خلاقی تنازع بھی، خیالات و افکار، نظریات و رجحانات، نقطہائے نظر، حلقہائے فکر، مختلف اخلاقی فلسفے مختلف اجتماعی مسلک، مختلف سیاسی نظریئے، مسلسل آویزش اور مقابلہ میں ہیں، زندگی میں اپنی شایان شان جگہ حاصل کرنے کے لیئے زندہ اشخاص کو بھی اور با مقصد اداروں کو بھی سخت کشمکش اور جد و جہد کی ضرورت ہے، اور "بقاء اصلح" کا قانون ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی جاری ہے۔

عربی مدارس کے وہ بلند مقاصد جن کو ہم نے اپنے پہلے مضمون میں اختصار سے بیان کیا ہے اور جن کو اس سے زائد اختصار کے ساتھ دو لفظوں میں "نیابت انبیاء" سے ادا کیا جا سکتا ہے کچھ پیغمبروں ہی کی سی جد و جہد اور قربانی چاہتے ہیں، حدیث العلماء ورثۃ الانبیاء کو اشد الناس بلاءً الانبیاء ثم الامثل فالامثل کو ساتھ ملا کر پڑھیے۔ اشخاص کے فرائض اداروں میں شریک ہو کر ختم نہیں ہوتے بلکہ کچھ بڑھ جاتے ہیں، ادارہ نام ہے منتشر اشخاص کی ہیئت اجتماعیہ کا، اس واسطے جو فرائض اشخاص کے ہیں وہ ان کے مجموعہ کے بھی ہیں۔

مدارس کے کچھ فرائض اندرونی ہیں کچھ بیرونی، اندرونی سے مراد وہ کام ہیں جو مدارس عربیہ کے اصحاب اور معلمین کو مدرسہ کے اندر انجام دینے چاہئیں، بیرونی سے مراد وہ خدمات ہیں جن کا تعلق مدارس کی چار دیواری سے باہر کی دنیا سے ہے، ہم سب سے پہلے مدارس کے داخلی فرائض سے بحث کرتے ہیں اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے ان کو ترتیب سے ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ذہنی تشکیل۔ اہل علم جانتے ہیں کہ "اسلام" ایک مخصوص "عقلیت" ہے جو خاص تعلیم و تربیت خاص ماحول اور اہتمام سے پیدا ہوتی ہے، یہ ضروری نہیں کہ مسلمان قومیت کا ہر فرد اسلامی ذہن بھی رکھتا ہو، جن لوگوں کی اسلام کی ذہنی تاریخ پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی عہدوں میں مسلمان جسم میں جاہلی دماغ ترکیب پاگیا ہے اور اب تو یہ ذہنی امتزاج اور عقلی پیوندبندی بہت عام ہے، ہم کو یہ خطرہ ہے کہ زندگی سے متعلق غیر اسلامی تصورات اور سیاست و معاشرت کے غیر اسلامی نظریات، جن کے اثر سے اس وقت بر و بحر اور علم کلام کے الفاظ میں "شواہق جبال" کے رہنے والے محفوظ نہیں ہیں، حمل و نقل، نشر و اشاعت کے وسائل، پروپیگنڈے کے جدید طریقوں اور اختلاط و اجتماع کے امکانات کی کثرت کی وجہ سے مدارس کی محفوظ دنیا میں پہونچ رہے ہیں اور دینی نظام اور مذہب کے مستقبل کیلئے یہ سب سے بڑا خطرہ ہی۔

ذہنی تشکیل سے ہماری مراد اس کا وسیع مفہوم ہے۔ اس سلسلہ میں عقائد بھی آتے ہیں حقائق بھی اور طرز فکر اور نقطۂ نظر بھی۔

یہ ضروری ہے کہ اہل سنت کے متفق علیہ عقائد طالب علم کے دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اُتار دیئے جائیں کہ پھر ان کے نکلنے کا خطرہ نہ رہے، اس کا دماغ الحاد کے ادنیٰ شائبہ اور انحراف سے محفوظ کردیا جائے اس کو اسلامی عقائد پر راسخ اور غیر متزلزل یقین ہو۔ اس کی قوت و استحکام مدارس کی کامیابی مستقبل کی تعمیر اور "امت مسلمہ" کی فلاح عقائد کی اسی پختگی اور یقین کے اسی استحکام پر منحصر ہے، زندگی اور اس سے بڑھکر فتح و تسخیر کے لیے یقین محکم سے زیادہ کوئی چیز اہم اور شک و تذبذب سے زیادہ کوئی مرض مہلک اور خطرناک نہیں، یہی وہ "ایمان" ہے جو اسلامی جسم کا خون زندگی اور روح ہے۔ اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر اُمت کے پورے قصر کی تعمیر ہے۔

اسلامی حقائق میں سے ہم صرف چند حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، پہلی حقیقت۔ کہ محمد رسول اللہ کا بتایا ہوا راستہ انسانیت کی منزل مقصود کا تنہا راستہ ہی۔ انسانوں کا قافلہ دشت میں بھٹکا ہوا اور ناپیداکنار سمندر میں راستہ بھولا ہوا اور روشنی کا مینار صرف اسلام ہے۔ انسانیت نزع کے عالم میں ہے اور آبحیات صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جام میں ہے، اخلاق و معاشرت مذہب و سیاست کا جو نظام آپ نے پیش کیا زندگی کا وہی تنہا نظام ہے۔ اس نظام کا ہر مقابل نظام ضلالت و گمراہی اور حماقت و سفاہت ہی۔ غیر اسلامی نظام زندگی کی غلطی اور خرابی کا یقین بھی اسی قوت کا ہونا چاہیئے جس قوت کا یقین اسلامی نظام کی درستگی اور برتری کا ہے "لا الٰہ" کی نفی میں بھی وہی شدت و قوت ہونی چاہیئے جو "الا اللہ"

کے اثبات میں ضروری ہے۔ اسلامی نظام پر ایمان لانے اور اس کے الہامی ماننے کا تقاضا ہی یہی ہے کہ ہر متوازی نظام کا انکار کیا جائے وماذا بعد الحق الا الضلال

ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایمان کے اعلان کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا تھا۔

کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء　(اے منکرین حق) ہم تمہارے منکر ہیں اور ہمارے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا ہوگیا ہے۔" (ممتحنہ)

کفرنا بکم کے اس جملہ میں بت شکنی کی وہی روح کام کر رہی ہے اور توحید خالص کی وہی سطوت وجلال اور وہی جذب واستغراق ہے جو آپ پر اس وقت طاری ہوگا جب آپ اپنے گرز سے آزر کے بت خانہ میں بتوں کو توڑ رہے تھے بلکہ زبانی یہ جملہ اس ضرب سے بڑھا ہوا ہے۔ اس ضرب میں آپ نے قوم کے باطل معبودوں کو توڑا تھا لیکن اس ایک ضرب میں آپ نے ان کے تمام باطل دیوتاؤں اور ذہنی وروحانی بتوں کو پاش پاش کردیا، اہل ذوق، اس جملہ کی گہرائی اور وسعت تک پہونچ سکتے ہیں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نے تمہارے عقائد اور بتوں کا انکار کیا بلکہ فرمایا ہم سراسر تمہارے منکر ہیں، اس میں ان کا پورا نظام زندگی اور پورا فلسفہ حیات آگیا۔

عوام کے مقابلہ میں علماء کو یہ امتیاز ہونا چاہیئے کہ وہ اسلامی نظام سے دوسرے نظاموں کا تقابل کرکے اسلامی نظام کی برتری کو علمی حیثیت سے بھی سمجھتے ہوں اور اس علم وتحقیق سے ان کے ایمان، اسلامی نظام کی محبت وترجیح اور غیر اسلامی نظاموں کی نفرت میں اور اضافہ ہونا چاہیئے۔

اس علم ونظر سے بڑھ کر ان کو دنیا میں اس نظام کو قائم کرنے کا جذبہ اور ولولہ ہو اور وہ اس کے پرجوش داعی اور مبلغ ہوں اور ان میں اس کے لیئے قربانی اور ایثار کا جذبہ ہو۔ بات بڑی ہے لیکن حق ہے کہ ان کو اس کا ایسا جذبہ اور اس کی ایسی سچی لگن ہو جیسے اس شخص کو ہوتی ہے جو یہ دیکھ رہا ہو، کہ گھر میں آگ لگی ہوئی ہے سب بے خبر ہیں، اور پانی صرف اسی کے پاس ہے، اور صرف اسی صورت میں کسی انقلاب وصلاح کی امید ہوسکتی ہے، کم سے کم ان کو اس نظام کی تبلیغ وقیام کا اتنا جوش اور اس کے لیئے قربانی کا اتنا جذبہ تو ضرور ہونا چاہیئے جتنا باطل نظاموں کے حامیوں اور مبلغوں کو ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بار بار کہنے کی ہے کہ اسلام کے نظام کی محافظ اور صحیح ہمدرد صرف علماء اور صرف اہل دین کی جماعت ہے اور اسلامی تاریخ میں اس کا تجربہ بار بار ہوا، بادشاہوں، شاہی خاندانوں، اور

حکومت کے دعویداروں کی جنگوں اور آویزشوں میں لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان جنگوں کی تہہ میں بعض اوقات اصول اور زندگی کے فلسفوں کی باہم آویزش اور کشمکش کام کر رہی تھی، ایک فلسفہ یہ تھا کہ مذہب کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہو زندگی اور معاشرت مذہب کے تابع ہو، مذہبی قوانین و احکام اور خدا کے حدود و تعزیرات نافذ ہوں مادیت و بہیمیت مغلوب ہو، عیش و عشرت اور اسراف کم ہو، اخلاقی اصلاح ہو، شخصی آزادی کے حدود مقرر ہوں، مذہب میں کسی قسم کا مسخ و تحریف نہ ہو، اس فلسفہ کے داعی اور حامی امّت کا دیندار طبقہ اور علماء دین تھے دوسرا فلسفہ زندگی یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ آزاد ہو، زندگی اور معاشرت مذہب و اخلاق کے پابند نہوں، کسریٰ و قیصر کے طرز کی سلطنت ہو دنیا سے زیادہ سے زیادہ تمتع اور لطف اندوزی کا موقع ملے، بادشاہ کی آزادی غیر محدود اور رعیت صرف اخلاقی طور پر آزاد (یعنی محرمات و منکرات کے ارتکاب میں اس سے کوئی تعرض نہ ہو اور اس پر کسی قسم کی اخلاقی پابندی نہ ہو) اور ہر طرح سے غلام ہو، معاشرت و اجتماع کی ہر قسم کی غیر اسلامی تشکیل اور مذہب میں ہر زمانہ کے مطابق ترمیم اور غیر مقید تجدّد ہو سکتا ہو اس فلسفہ کے حامی دُنیا دار امراء و سلاطین اور مسلمانوں کا غیر تربیت یافتہ طبقہ تھا، یہ دونوں فلسفے خلافت راشدہ کے بعد سے اس وقت تک موجود ہیں، اور آخرالذکر فلسفہ اور نظام حیات کے حامیوں کی ہر زمانہ میں اکثریت رہی ہے۔

اس حقیقت پر بھی علماء کی نظر ہر وقت رہنی چاہیئے کہ مسلمانوں کی کامل اور صحیح قیادت کے اہل صرف وہی ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی متوازن متناسب ترقی صرف انھیں کی رہنمائی میں ہو سکتی ہے خلفاء راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دور حکومت اس بات کا بہترین شاہد ہے، دین و سیاست کی فصل و تفریق اور اہل دین و اہل سیاست کی تقسیم کا جاہلی نظریہ اور علما کی قطعی سیاسی و دُنیاوی نااہلیت کا خیال مسیحی ذہنی ورثہ کے علاوہ مخالف دین جماعتوں اور اشخاص کے پروپگینڈے کا نتیجہ ہے، علماء کو اپنے فہم و تدبر اپنے ایثار و قربانی اپنی قوت عمل اپنے اخلاص و للہیت اور اپنی سیرت کی پختگی اور استقامت سے غیر دینی عناصر کو پیچھے ہٹا کر مسلمانوں کی زندگی پر غلبہ اور نفوذ حاصل کر لینا چاہیئے قوت عمل اور ایثار میں مسلمانوں کی دوسری جماعت ان کی حریف نہیں ہو سکتی اس لیئے ان کو جماعتی اقتدار اور عصبیت جاہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ اسلامی نظام کی حفاظت اور اسلام کے قدیم اور مستند معیار زندگی کو قایم کرنے کے لیئے اور اس کے شباب رفتہ کو واپس لانے کے لیئے اپنی قربانیاں پیش کرنی چاہئیں اور اس مقصد سے میدان میں آنا چاہیئے، اس مقابلہ کے لیئے جس علمی و ذہنی تیاری اور تربیت کی ضرورت ہے، مدارس کو اس سے ہرگز غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی

کوشش کرنی چاہیئے کہ زندگی کے کسی اہم اور مؤثر شعبہ میں غیر دیندار اور غیر علما کی رہنمائی کی ضرورت نہ پیش آئے اور حتی الامکان علماء نظرانداز اور فراموش نہ ہونے پائیں اور ان کی رہنمائی اور امداد سے استغنا نہ پیدا ہونے پائے غیر دیندار جماعتوں اور ملحدوں نے انھیں نازک رستوں سے اُمت کے دماغوں پر استیلاء اور ان کی روزمرہ زندگی پر نفوذ حاصل کیا اسی بنا پر امام غزالی نے اپنے زمانہ کے علماء اور طلبا کو جو غیر ضروری علوم میں مشغول ہیں یہ کہکر فن طب کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے اسلامی شہروں میں غیر مسلم، یہودی، اور نصرانی طبیب ہیں اور مسلمان ان کے محتاج اور ان سے متاثر ہوتے ہیں [۱]

اس سلسلہ میں جن جدید علوم والسنہ کی ضرورت ہو علماء کو بلا تامل ان کی طرف توجہ کرنی چاہیے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سب تمامتر دین کی خدمت وحفاظت اور مذہب کے فروغ کے لیے ہو اس وقت یہ جہاد ہوگا اور یہ تیاری واعدوا لهم ما استطعتم من قوة میں داخل ہوگی۔

ان عقائد وحقائق کے علاوہ طریق فکر، طریق بحث، مباحث ومسائل میں نقطۂ نگاہ زندگی کا مقصد ومعیار اور روح خالص اسلامی ہونی چاہیئے ان کے نزدیک آخرت دنیا پر مقدم ہو، مادیت کا غلبہ ان پر نہ ہونے پائے۔ ہر چیز میں نیت خدا کی رضا اور اس کے نام کی بلندی ہو، یہ "متاع کارواں" ہے اور اس کی گم شدگی سے جماعت علماء کا امتیاز جاتا رہے گا۔

(۲) **سیرت کی تعمیر**:- زندگی کی کشمکش میں ایمان ویقین کے بعد سب سے ضروری چیز پختہ سیرت اور بلند اخلاق ہیں، قومیں اور جماعتیں انھیں دونوں بنیادوں پر دوسری قوموں اور جماعتوں پر فتح پاتی ہیں۔ خود مسلمانوں نے قرن اول میں اپنی معاصر وحریف قوموں پر جو تعداد میں، اسلحہ میں، مادی سازوسامان میں ان سے کہیں بڑھی ہوئی تھیں، ایمان واخلاق ہی کی خصوصیتوں کی بنا پر فتح پائی۔ آج بھی اشخاص اور جماعتوں کے پرواز کے لیے یہی دو بازو ہیں، بڑے سے بڑا علم حسن سیرت کے بغیر ناکافی بلکہ اپنے اور دوسروں کیلئے فتنہ اور مضر ہے۔ اہل علم ونظر کے سامنے خصوصًا ایسے زمانہ میں جس میں علم بڑھتا جارہا ہے اور سیرت واخلاق میں روزافزوں انحطاط ہے اور جبکہ غیر مذہبی درسگاہوں کے طلباء وفضلاء کے اخلاق اپنی درسگاہوں کے لیے، اداروں کے لیے سوسائٹی اور خاندانوں کے لیے وبال جان بنتے جارہے ہیں اس حقیقت کی زیادہ

---

[۱] احیاء العلوم

توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں، طلبہ کو مستقبل قریب میں زندگی کے جس معرکہ اور جماعتوں اور اصولوں کی جس رزم آرائی میں شرکت کرنی ہے اس میں اپنے اصولوں کی دعوت و تبلیغ کے لیے، اپنے مذہب و جماعت کے وقار کے لیے جس قدر بے داغ سیرت، اعلیٰ کیرکٹر، بلند ہمت، استغنار، خود داری اور نزاہت کی ضرورت ہے کسی چیز کی نہیں، ان ہتھیاروں سے وہ زندگی کا بڑا سے بڑا معرکہ فتح کرسکتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اس میں ہمارے مدارس کے فضلار غیر مذہبی لوگوں سے زیادہ کامیاب ہوسکتے ہیں اس لیے کہ ہمارا مشاہدہ اور بار بار کا تجربہ ہے کہ گہری مذہبیت اور اچھی صحبت و تربیت کے بغیر اعلےٰ اور مستحکم سیرت نہیں پیدا ہوتی اور اس کا سامان اس عام مذہبی و اخلاقی تنزل کے زمانہ میں بھی جتنا عربی مدارس میں ہے دوسری جگہ ناپید ہے۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کے بھی اظہار کی ضرورت ہے کہ علماء کی دینی سطح عوام کی سطح سے بلند ہونی چاہیئے تب ہی وہ مؤثر ہوسکتے ہیں، عوام میں دینداری پیدا کرنے کے لیے ان میں مذہب کا رنگ اس کا ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے اور ان کے عقائد و اعمال و رسوم کی اصلاح کے لیے گہرے اور شوخ مذہبی رنگ، جذب و شوق اور تجدیدی و اصلاحی رنگ کی ضرورت ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ، اور ان کا مقصد آفرینش ہے، اس میں ان کو تساہل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر اور یا ایھا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط کے مصداق اگر علماء نہوں تو کون ہوسکتا ہے اس بارہ میں ان کو حضرت مجدد سرہندیؒ حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیئے جن کی توجہ اور ہمت سے ہندوستان میں عظیم الشان دینی انقلاب رونما ہوا جو دوسرے اسلامی ممالک کے لیے قابل رشک ہے۔

(باقی)

خواتینِ اسلام کی بیداری

(از جناب مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔اے ایڈیٹر برہان دہلی)

آج ہر طرف ایک شور و غل بپا ہے کہ اب مسلمان خواتین کی حالت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی اُن میں جہالت اور رسوم پرستی مفقود ہوتی جاتی ہے اور اُس کی بجائے علم و ادب کی روشنی، روشن دماغی اور آزاد خیالی کی حرارت پیدا ہو رہی ہے۔ اس حالت کی تبدیلی پر بظاہر مرد بھی خوش ہیں اور عورتیں بھی مسرور، لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا، اس پر کوئی غور نہیں کرتا کہ مسلمان خواتین کی بیداری واقعی اور اصلی بیداری ہے، یا یہ ہلاکت و تباہی کا پیغام ہے! کوئی پوچھے آج کل مسلمان خواتین کی بیداری کی پہچان کیا ہے؟ تو اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے سیاسی جلسوں کے پلیٹ فارموں پر نظر نہیں آتی تھیں، سیرگاہوں میں اُنھیں کوئی بے حجاب و بے نقاب مصروف گلشن خرامی نہیں دیکھ سکتا تھا، تھیٹروں اور سینماؤں میں وہ انبوہ در انبوہ نظر نہ آتی تھیں، احباب و اغیار کی محفلوں میں انھیں بیباکانہ لب کشائی کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ کالجوں اور اسکولوں میں اُن کی چہل پہل نہ تھی۔ اخباروں میں اُن کے فوٹو شایع نہ ہوتے تھے ادبی رسالوں میں اُن کی قلمی شوخ نگاریاں پڑھنے والوں کے دل و دماغ پر برق پاشی نہ کرتی تھیں وہ صرف گھر کی ملکہ ہو کر رہنا جانتی تھیں .... اُنھیں اپنے کمالاتِ نسوانی کی جلوہ گاہ بنانے کے لیئے گھر سے باہر کسی اور میدان کی جستجو نہ تھی۔ لیکن آج حالات نے پلٹا کھایا ہے، زمانہ آزادی کا ہے مذہب اور اخلاق کی قید و بندی کوئی برداشت نہیں کر سکتا ہے تو عورتیں ہی کیوں گھروں میں بند ہو کر رہیں وہ بھی آخر مردوں کی طرح انسان ہیں انھیں بھی حق ہے کہ گلزار ہست و بود کا ایک ایک پھول بہ نظرِ عمیق دیکھیں اُس کی مست کُن بو سے قوتِ شامہ کی تواضع کریں اور ہاں عالم ہمہ تن ایک میکدۂ شعر و موسیقی ہے عورتوں کو بھی فطرتاً یہ حق ہونا چاہئے کہ اُس کے نغمہائے ساحرہ نواز سے کیف و سرور حاصل کریں۔ ان خیالات کی پختگی کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ "دورِ جمود و جہل" خواب پریشاں ہو کر نگاہوں سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اور بیداری کا اثر جتنا جتنا غالب ہوتا جاتا ہے عہدِ حریت و آزادی کے اثرات زیادہ نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ آج مسلمان عورت کو تنگ خیالی و تنگ نظری کا طعنہ

کون دے سکتا ہے! اب پلیٹ فارموں پر اُن کی "دھواں دھار" تقریریں ہوتی ہیں، اور پسِ پردہ نہیں بلکہ کھلے اسٹیج پر سب کے سامنے کالجوں کی رونق اُن کے دَم سے ہے۔ کلبوں میں اُن کی خوش اخلاقی اور خوش تقریری کے چرچے ہیں۔ سینماؤں اور تھیٹروں کے دیکھنے کا کیا ذکر، انگلینڈ کے سابق وزیرِ اعظم کی لڑکی یا بہو فلم ایکٹریس ہوسکتی ہے تو شریف گھرانوں کی تعلیم یافتہ مسلمان خواتین اس فخر سے کیوں محروم رہیں، ناچ گھروں میں اُنھیں دیکھا جاسکتا ہے۔ پارکوں میں وہ نہایت بیباکی اور دیدہ دلیری کے ساتھ خرام کرتی ہوئی نظر آسکتی ہیں۔ فوٹو اُن کے چھپتے ہیں، مشاعروں میں شوخ غزلیں وہ سُناتی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ آج مسلمان خواتین موجودہ تہذیب و تمدّن کی اُن تمام نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو رہی ہیں جو اب تک صرف خواتینِ فرنگ کا حصّہ تھیں یا کچھ تھوڑا بہت اُن کا اثر ہندو خواتین میں بھی پایا جاتا تھا۔ سُن لیا آپ نے! یہ ہے خواتینِ اسلام کی بیداری!

اس میں شبہ نہیں اس دورِ تفریح میں بھی ایسی نیک دل مسلمان خواتین کی کمی نہیں ہے جو واقعی "آئیڈیل مسلم خاتون" کہی جاسکتی ہیں۔ اور جنھیں صحیح معنیٰ میں بیدار دل و بیدار مغز کہا جاسکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے ان غریبوں کو مسلمان خواتین کی نمائندگی حاصل نہیں۔ وہ گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہیں اور اُنھیں مسلم سوسائٹی میں کوئی وقیع درجہ میسر نہیں۔ جب کبھی مسلمان خواتین کی بیداری کا ذکر کیا جاتا ہے تو مثال میں وہ خواتین پیش کی جاتی ہیں جو مسلمان ہونے کے باوجود جدید تہذیب و تمدّن کی خصوصیات سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہو رہی ہیں اور جن کے حُسنِ بے حجاب کا شہرہ ہندوستان کی حدود سے گزر کر امریکہ و یورپ تک پہونچ چکا ہے۔ اس بنا پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کے نزدیک مسلمان خواتین کی بیداری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ اسلامی وضع قطع، اسلامی آدابِ معاشرت، اور اسلامی طریق بود و ماند چھوڑ کر مغربیت کے رنگ میں رنگی جارہی ہیں، اور ان کا میدانِ عمل درونِ خانہ کے بجائے بیرونِ در بنتا جارہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلم خواتین کی یہ حالت کیا واقعی اُن کی بیداری کی دلیل ہے۔ کیا دراصل اُن کی اِس تبدیلی پر ہمیں خوش ہونا چاہیئے جیسا کہ عموماً آج کل کے مردانہ اور زنانہ جلسوں میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یا یہ صورتِ حال پوری قوم کی روحانی و اخلاقی موت کی نشانی ہے اور اس لیئے اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

بعض لوگ عورتوں کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا عورتیں مردوں سے کم ہیں جو ایک چیز مرد کے لیے تو جائز ہو اور عورت کے لیئے ناجائز اس قسم کے اصحاب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے نزدیک ضابطۂ اخلاق و مذہب کی پابندی کے لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شریعت اسلام نے جن بُری باتوں کو مرد کے لیئے ممنوع قرار دیا ہے وہ عورتوں کے لیئے بھی ممنوع ہیں، اور جو افعالِ حسنہ مرد کے لیئے مستحسن سمجھے گئے ہیں وہ عورتوں کیلیئے بھی مستحسن ہیں، جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، شراب خواری، زناکاری، غداری و بے وفائی کی حرمت میں مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ مرد کے لیئے جس طرح اجنبی عورت پر بُری نگاہ ڈالنا حرام ہے۔ عورت کے لیئے بھی جائز نہیں کہ وہ کسی اجنبی مرد کو بُری نیت سے دیکھے۔ یہی حال تعلیم اور معاشرت کا ہے۔ جدید تعلیم اپنے مخصوص ماحول اور نصاب کے ساتھ جس طرح مردوں کے لیئے مضر ہے۔ عورتوں کے لیئے بھی اتنی ہی بلکہ اُس سے زیادہ نقصان رساں ہے۔ اسی طرح مغربی معاشرت مردوں اور عورتوں دونوں کیلئے تباہ کن ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ کپڑا زیادہ اُجلا اور صاف ہوتا ہے تو ایک معمولی سا دھبّہ بھی اُس میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر اس کی حیثیت کو بگاڑ دیتا ہے عورت فطرۃً آئینہ تمثال ہے اور غالباً اسی بنا پر زبان نبوت نے اُس کو قواریر (آبگینے) کہا ہے۔ اور انگریزی میں اُسے "صنفِ لطیف" (Fair Sex) کہا جاتا ہے۔ اس لیئے اگر اُس میں ذرا سی بھی بداخلاقی اور بدتمیزی پیدا ہوتی ہے تو وہ مردوں سے زیادہ اس کو بدنما کر دیتی ہے اُس کی اصلی شرافت و نجابت کو مسخ کر کے طبقۂ ارذل میں شامل کر دیتی ہے۔

پس اگر کوئی مصلح یہ کہتا ہے کہ جدید تعلیم اور جدید تہذیب مسلمان عورتوں کیلئے زہر ہلاہل ہے تو اُس کے معنے یہ ہرگز نہیں ہو سکتے کہ یہ چیزیں عورتوں کے لیئے ممنوع اور مردوں کے لیئے جائز ہیں اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہو سکتا ہے کہ عورتیں مردوں سے کم مرتبہ اور اُن سے فروتر ہیں۔ اس عام ممانعت میں مرد و عورت کے فرق و امتیاز مراتب کا سوال اُٹھانا سراسر بے محل و بے موقع ہے۔

جہاں تک اصل تعلیم کا تعلق ہے اس سے کوئی سلیم الفطرت انسان انکار نہیں کر سکتا کہ وہ مرد و عورت دونوں کیلئے ضروری اور لازمی ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہے وہ اس ضرورت سے کس طرح انکار کر سکتا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیم تعلیم کے مقصد کے ماتحت ہو جس سے پاکیزہ اخلاق پیدا ہوں، اچھے بُرے کی تمیز ہو

زندگی کو کامیاب طریقہ سے بسر کرنے کی راہیں معلوم ہوں۔ اور جس سے ایک انسان حقیقی انسانیت کے مرتبہ عظمیٰ سے شرف اندوز ہو سکے جو تعلیم اس مقصد کے حاصل کرنے کا قوی ذریعہ بن سکتی ہے وہی سچی اور اصلی تعلیم ہے اور اس کے استحسان و وجوب میں مرد و عورت کا کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں چونکہ تعلیم کا تعلق انسانی زندگی کے وظائف و اعمال سے ہے اس لیے تعلیم شروع کرنے سے قبل یہ معلوم کر لینا ضروری ہوگا کہ طبعی قویٰ، فطری استعداد، اور اسباب ممکنہ و حاصلہ کے اعتبار سے مرد کے وظائفِ زندگی کیا ہیں، اور عورت کے کیا! اگر آپ ان وظائف زندگی میں فرق و امتیاز نہیں کرتے تو اُس کے صاف معنیٰ یہ ہیں کہ آپ مرد کے مرد اور عورت کے عورت ہونے سے انکار کر رہے ہیں، یہ انکار آپ کی فطرت ناشناسی کی کھلی دلیل ہے اور اب اس انکار کی بنیاد پر آپ کے جتنے مطالبات اور دعاوی ہوں گے وہ سب غلط اور بے بنیاد قرار دیئے جائیں گے۔ عورت اور مرد کا صنفی اختلاف و تباین تو بڑی چیز ہے آپ ایک صنف کے تمام افراد کے لیئے یکساں حکم نہیں لگاتے بہتیرے بچے جو طبعًا صنعت و حرفت کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اُن سے لٹریچر میں اعلیٰ مہارت و قابلیت کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح جو بچے فطرۃً لٹریچر کا ذوق رکھتے ہیں اُن کو سائنس اور کیمیا کی اعلیٰ تعلیم دلانا وقت کو بیکار او ضایع کرنا ہے۔ پس جب آپ خود مردوں کی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کو نظرانداز نہیں کر سکتے تو مرد و عورت کے صنفی اختلاف کو کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں

اسلام کا طرۂ امتیاز یہ ہی ہے کہ اُس نے کسی حالت میں بھی فطرت کی صحیح صلاحیتوں اور اُن کے باہمی اختلاف کو ناقابل اعتنا قرار نہیں دیا۔ اسلامی نقطۂ نظر کے ماتحت تعلیم جس طرح مرد کے لیئے ضروری ہے اسی طرح عورت کیلیئے بھی لیکن دونوں کی تعلیم کا مقصد جدا جدا ہے۔ مرد کی تعلیم کا مقصد ہے کہ وہ اپنے فرائض و وظائف زندگی سے واقفیت بہم پہنچائے۔ اور نہ صرف واقفیت بلکہ اُس میں اخلاق اور کیرکٹر کی ایسی مضبوطی پیدا ہو جائے کہ وہ بے تکلف اچھے اعمال کو اختیار اور بُرے اعمال کو ترک کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وظائف و فرائض زندگی سے آگاہ ہو اور اُن کو صحیح طور پر بجا لانے کی اخلاقی قوت اُس میں پیدا ہو جائے اس مرحلہ پر ضروری ہے کہ آپ پہلے عورت کے فرائض و وظائف حیات کی تحقیق و تنقیح کریں اور پھر اس کی روشنی میں اُن کے لیئے ایک مکمل نصاب تعلیم و طریقۂ تعلیم کی تعیین کر دیں۔ یہ حقیقت فراموش نہ ہونی چاہیئے کہ نصاب تعلیم کی تعیین بھی ایک نہایت ضروری امر ہے، ورنہ اندیشہ ہے کہ طریقۂ تعلیم کے ناقابلِ اطمینان ہونیکے باعث

تعلیم پر ایسے نتائج مرتب ہو جائیں جو تعلیم کے مقاصد کے سراسر خلاف ہوں اور بجائے کعبہ کی طرف رہنمائی کرنے کے ترکستان کی سمت لے جائیں۔

تھوڑی دیر کیلئے سنجیدگی اور متانت سے اس مختصر گزارش پر غور کیجئے اور پھر بتائیے کہ آج جو کچھ ہو رہا ہے کیا واقعی وہ مسلمان خواتین کی بیداری سے تعبیر کیئے جانے کا مستحق ہے۔ مرد کی تعلیم کا کمال یہ ہے کہ وہ بجا طور پر مردانہ اوصاف و شمائل سے آراستہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح عورت کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ بالکل صحیح معنی میں مکمل عورت ہو۔ لیکن آج ہماری بچیوں کو انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے۔ کیا وہ اُن کی تکمیل نسائیت کر سکتی ہے؟ نتائج ہمارے سامنے ہیں، ہر شخص دیکھ رہا ہے کہ مخصوص ماحول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے جو اثرات لڑکیوں پر مترتب ہو رہے ہیں وہ اسلامیت اور مشرقیت تو کجا خود اُن کے جوہر نسائیت کو بُری طرح پامال کر رہے ہیں۔ شاید لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ عورت و مرد کی اجتماعی زندگی کا دارومدار صنفی جذب و انجذاب پر ہے، اور یہ جذب و انجذاب اُسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ صنفی اختلاف و تباین کے مطابق دونوں کو ایک مخلوط سوسائٹی میں منضم نہ کیا جائے۔ ورنہ اگر مقناطیس لوہے سے الگ اور دور نہیں ہے تو پھر نہ مقناطیس کی قوت جذب کا اظہار ہو سکتا ہے اور نہ لوہے کی قوتِ انجذاب کا۔ آج یورپ خانگی زندگی کے اعتبار سے جو برباد و تباہ حال ہے غور کیا جائے تو اُس کا اہم سبب یہی ہے کہ اُس نے اس نفسیاتی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اب وہاں عورت اور مرد دونوں اس طرح ملے جلے رہتے ہیں کہ دونوں صنفوں کا باہمی جذب و انجذاب بالکل فنا ہو کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں اب مردوں کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہوتا جاتا ہے جو شادی کو انتہائی نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس طبقہ کا خیال ہے کہ شادی تو مرد کی عورت سے ہوتی ہے۔ اور جب عورتیں عورتیں ہی نہ رہیں تو پھر مرد شادی کس سے کریں۔ عورتوں کی آزادی مفرط کے باعث یورپ کے فلاسفہ عجیب و غریب قسم کی خیال آرائیاں کر رہے ہیں۔ ایک فلسفی نے اپنا خیال ظاہر کیا ہے کہ اب وہ زمانہ جلد آئے گا جبکہ مردوں میں زنانہ اوصاف پیدا ہو جائیں گے یہاں تک کہ داڑھیاں بھی اُن کی بجائے عورتوں کے نکلا کریں گی۔ بہر حال انگریزی میں جو آئے دن معاشرتی ناول اور کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اُن کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ تحریک آزادی نسواں کے ماتحت عورتوں کی آزادیِ مفرط کس طرح یورپ کے لیئے وبال جان بنی ہوئی ہے۔

عربی کا ایک مقولہ ہے السعید من وعظ بغیرہ۔ خوش نصیب وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔ تو کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کے ارباب فکر زہر اور تریاق میں امتیاز پیدا کریں۔ آخر یہ کیا غضب ہے کہ مسلمان خواتین غلط تعلیم، غلط تربیت، اور غلط طریقہ معاشرت کے اثر سے ہلاکت و بربادی کی طرف تیزی سے دوڑ رہی ہیں۔ اور اپنے ساتھ تمام قوم کی قومی نجابت و شرافت کو غرق کیے دیتی ہیں لیکن پھر بھی آپ کی آنکھ نہیں کھلتی، اور آپ ان کی اس تبدیلی کو بیداری سے ہی تعبیر کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مذہب کا سچا درد رکھنے والے حضرات پورے جوش و خروش سے اُٹھیں زنانہ تعلیم کا پورا نظام غیر اسلامی سیادت کے پنجہ سے نکال کر اپنے قبضہ میں لیں۔ مغرب زدہ خواتین کا جواب اَن پڑھ اور جاہل خواتین نہیں ہو سکتیں، بلکہ اُن کا صحیح جواب وہ ہی خواتین اسلام ہو سکتی ہیں جو اعلےٰ تعلیم کے ساتھ اسلامی وضع قطع اور اسلامی طرز معاشرت کی پابند ہوں۔ فھل من مدکر!

مسلمان عورت!

(جناب صاحبزادہ ابونعیم نشتر جالندھری)

عجب انقلاب آج دُنیا میں آیا — کہ ہر شے کی گویا پلٹ دی ہے کایا
نحوست کا ابر سیہ بن کے چھایا — مسلماں کے سر پر فرنگی کا سایا

یہ اندھیر کیسا عجب ہی عجب ہے
ستم ہی ستم ہے غضب ہی غضب ہے

کھلے مُنہ ارے کون یہ جا رہی ہے — گلستاں کی تازہ ہوا کھا رہی ہے
نگاہوں سے کیا تیر برسا رہی ہے — یونہی راہگیروں کو تڑپا رہی ہے

خدا جانے بلبل ہے یہ کس چمن کی
ہے شمعِ شب، فروز کس انجمن کی

تراشے ہوئے بال سُرخی لبوں پر — چمکتے ہیں رُخسار مثلِ گُلِ تر
لگایا ہے چہرے پہ اس طرح پوڈر — کہ ہے اصل سے بھی کہیں نقل بڑھ کر

نئے رنگ کا گوُن کیا ضو فشاں ہے
پری قاف کی ہے کہ حورِ جناں ہے

یہ ہے کون اس درجہ آزاد لڑکی — بلا کی ہے چتون، قیامت کی شوخی
نئی روشنی کی ہے دلدادہ اتنی — اسے کہیئے تہذیبِ حاضر کی پتلی

مسیحی گھرانے کی اُمید ہوگی
سپہرِ ولایت کی ناہید ہوگی

وہ آئی گرجتی برستی کڑکتی! — سراپا جہنم کی صورت دہکتی

تب و تاب قہر و غضب سے بھڑکتی لرزتی اچھلتی لپکتی بھڑکی

کہا اک مسیحی کی امید ہوں میں؟

سپہرِ ولایت کی ناہید ہوں میں!

میں ہندی ہوں۔ ہندوستاں میرا مسکن مسلماں ہوں اک خدا کی پجارن

میں بلبل ہوں اسلام ہے میرا گلشن میں وہ شمع ہوں۔ ہو حرم جس سے روشن

یہ برقع کا پردہ ہے بے جا تکلف

نہیں دینِ فطرت میں زیبا تکلف

لباس! اس کے بارے میں سب جانتے ہیں جو حکم شریعت ہے پہچانتے ہیں

اسے ملک کا بس نشاں مانتے ہیں کب ایمان کا جزو گردانتے ہیں

یہ اک قید ہے۔ اس سے آزاد ہوں میں

جہانِ طریقت میں آباد ہوں میں"

یہ سنکر مجھے غصہ آیا۔ ہنسی بھی کہ بہنیں ہماری ہیں کیسی انوکھی

نہیں جانتیں دین کے جو مبادی مگر ٹھان لیتی ہیں بحث و نظر کی

بھلا جو شریعت سے ناآشنا ہوں

طریقت کی راہوں سے کیا آشنا ہوں

خبر بھی ہے کچھ۔ کس کو کہتے ہیں عورت؟ ہے اس باب میں کیا بیانِ شریعت

طریقت میں عورت کو کیا ہے ہدایت؟ یونہی رٹ لیا ہے شریعت طریقت

وہ عورت ہے ہر کوئی جس کو چھپائے

نظر غیر کی جس پہ پڑنے نہ پائے

ہے عورت تو عورت ہے سر سے قدم تک چھپانی کی ہے اس کی ہر چیز بے شک

دکھاتی یہی ہے شریعت کی عینک یہی ہاں یہی ہے طریقت کا مسلک

حیا۔ پردہ ہیں تاج و اورنگِ عورت

جو ہو شمع محفل۔ وہ ہے ننگِ عورت

یہ آئینہ لے کر ذرا دیکھ چہرا عمل کا بھی شرمندہ ہے قول تیرا؟
تو ہے باغ اسلام میں نغمہ پیرا؟ چراغِ حرم بن کے ہے خانہ آرا؟
خود انصاف سے کہہ مسلمان ہے تو؟
مسلمان کیسا بلکہ انسان ہے تو؟

لباس اِک نشاں ملک کا ہے۔ بجا ہے غلط ہو کہ یہ جزو ایمان کا ہے
مگر سن کہ اسلام کیا کہ رہا ہے جو ہو ستر عورت تو بیشک روا ہے
ترا ستر عورت ہے کیا ستر عورت
نمائش ہے عورت کی یا ستر عورت

نوا تلخ تر ہے۔ یہ میں جانتا ہوں مگر ذوقِ نغمہ کو پہچانتا ہوں
یہ نشتر زنی فرض ہے۔ جانتا ہوں خطا چشم پوشی کو گردانتا ہوں
صداقت یہی ہے۔ حقیقت یہی ہے
غرض قوم و ملت کی خدمت یہی ہے

یہ تہذیب چھوڑ۔ اس سے اب دُور ہو جا نگاہوں سے مردوں کی مستور ہو جا
ہو شمع حرم۔ پیکرِ نور ہو جا بنا گھر کو قصرِ جناں۔ حور ہو جا
مسلمان عورت کی یہ زندگی ہے
کلامِ خدا ہے۔ حدیثِ نبیؐ ہے

کہاں حضرتِ فاطمہؓ کی قناعت جنابِ خدیجہؓ کے ایماں کی عظمت
کہاں حضرتِ عائشہؓ کی فضیلت کہاں حضرتِ خولہ کی وہ شجاعت
یہ حال پیمبر کے پیغام کی ہیں
یہ دیواریں ایوانِ اسلام کی ہیں

اُٹھ اے مُسلمہ! اُٹھ کہ منزل یہی ہے ترے بحرِ ہستی کا ساحل یہی ہے
زمانہ ہے کھیتی تو حاصل یہی ہے یہی کنجِ خلوت ہے۔ محفل یہی ہے
اسی راہ میں اُٹھ کے قربان ہو جا
مسلمان ہو جا! مسلمان ہو جا

جو تو ہو مسلماں۔ جہاں ہو مسلماں   تو فرماں روا۔ خلق ہو زیر فرماں

تو نیز داں کی ہو اور تیرا ہو یزداں   تری شان و شوکت پہ دنیا ہو حیراں

زمانے میں تیرا نشاں پرفشاں ہو

ترا سکّہ اقلیمِ دل میں رواں ہو

مسلمان ہونے کا گُر کیا ہی؟ سُن لے   خدا نے بنائے ہیں خود یہ طریقے

سلاسل سے آزاد ہو ماسوا کے   فقط رشتہ قائم ہو حبل المتیں سے

وہ حبل المتیں کیا ہی؟ قرآن تیرا

یہ ہی دین تیرا۔ یہ ایمان تیرا

یہی زندگی کا نظامِ عمل ہے   یہ اگلے صحیفوں کا نعم البدل ہی

جو نکتہ ہے دُنیا کا۔ اس کا یہ حل ہے   یہی عاقبت کے شجر کا بھی پھل ہی

کلامِ خُدا پر عمل جو کرے گا

فلاحِ دو عالم سے دامن بھرے گا

(مسلمہ جالندھر)

پردہ

(تالیف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

"پردہ" آج کل ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن گیا ہی اور علم کے بعض جاہل مدعیوں کے جاہلانہ دعووں نے بہت سوں کو اس شک میں ڈالدیا ہے کہ اسلام میں آیا پردہ کا حکم ہی بھی یا نہیں، اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے مولانا مودودی کو آپ نے اس مسئلہ پر یہ مبسوط محققانہ کتاب لکھ کر وقت کی ایک بڑی دینی ضرورت کو پورا کردیا۔ اس کا نام تو "پردہ" ہے لیکن درحقیقت اس میں "نسائیات" سے متعلق پیدا شدہ تمام مسائل اور اسلامی نظام معاشرت کی پوری تشریح کی گئی ہے اور ساتھ ہی مغربی نظام معاشرت پر قوانین فطرت کے لحاظ سے زبردست تنقید بھی کی گئی ہے اور بلاشبہ حکیمانہ بحث و تحقیق کا حق ادا کردیا گیا ہی جو لوگ پردہ اور صنف نازک سے متعلق دوسری اسی قسم کے مسائل کو واقعی سمجھنا چاہیں اور اسلامی مسائل کو کتاب و سنت اور عقل و فطرت کی روشنی میں دیکھنا چاہیں وہ اس سے اطمینان حاصل کرسکتے ہیں کتابت طباعت کاغذ نہایت اعلیٰ ڈھائی سو صفحات قیمت غیر مجلد ۱۲؎ مجلد ۱؎ ملنے کا پتہ "مکتبہ الفرقان بریلی"

زندگی کے مصائب کا کس طرح مقابلہ کیا جائے

از

ڈاکٹر میر ولی الدین منشی فاضل ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لنڈن) بیرسٹر ایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

اگر غم را چو آتش دود بودے　　جہاں تاریک بودے جاودانہ!
درین گیتی سراسر گر بگردی　　خردمندے نیابی شادمانہ! (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سر تا پا احتیاج ہے لہذا انسان غم کا پتلا ہے، لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ" رفع احتیاج ہی کیلئے وہ شب و روز حیران و سرگردان رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا اور درد کی دوا چاہتا ہے، ! احتیاج کا سلسلہ لا متناہی ہوتا ہے، ایک احتیاج کی تشفی ہوتی ہے۔ تو دس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم دائم برابر جاری رہتا ہے، لہذا کلیۂ یہ قرار پاتا ہے۔

عالم ہمہ درد ست و دوامی خواہد　　از خوانِ کرم برگ و نوامی خواہد!
کس بیحاجت نمی تواند دیدن　　درویش غذا شہ اشتہامی خواہد!

(سحابی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثناء الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے، جس کسی سے پوچھئے "میاں دل چیست"؟ جواب ملیگا درون سینہ سوزے و تفے!" اگر پوچھا جائے "تن چیست"؟ کہے گا۔ "غم و رنج و بلا را ہدفے" کسی اگلے سوال کا انتظار کیے بغیر خود کہہ اٹھے گا "القصہ بہ قصد جان ما بستہ صفے" "مرگ از طرفے و زندگی از طرفے،

دل چیست؟ درون سینہ سوزے و تفے　　تن چیست؟ غم و رنج و بلا را ہدفے
القصہ بہ قصد جانِ ما بستہ صفے　　مرگ از طرفے و زندگی از طرفے

(مومن یزدی)

مرض غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن یہ کلیہ بھی مسلمہ ہے، کہ ہر مرض کا علاج ہے، غم کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہی، کچھ دیر کے لیئے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجیئے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیئے اور دوسروں کے لیئے بھی کامیابی کے ساتھ

استعمال کیا ہے، میں پندرانہ نصیحت کیلئے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقل روشن کو متوجہ کروں گا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں، اور آپ ان کے استعمال پہ راضی ہوجائیں تو شفا یابی متیقن ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں، غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہی، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے، اس علاج کے مختلف اجزا ہیں، پہلا جزو

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین ہی، اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیر مطلق ہے، خیر محض ہے نیز وہ ہمہ تواں یا قادر مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شی کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدء، خدا ہے، اس لیئے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے! اگر معاذ اللہ خدا خیر محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا، یا اگر خیر مطلق ہونے کے باوجود قادر مطلق نہ ہوتا، تو سمجھا جاسکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیر مطلق و قادر مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے نہ نقل کے، بتائے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے، اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہرچہ بینی محض خیر و حکمت است — گر ترا از و رحمت و گر زحمت است
زانکہ نامد فعل باطل از حکیم — فعل حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہل عقل کیلئے دی ہے، اہل عشق جن کی صفت "یومنون بالغیب" ہی مبدء کائنات کو خیر محض مانتے ہیں، اور اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انھیں راسخ یقین ہوتا ہے، علاج غم کیلئے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں، کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے، زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی اللہ مستی و خودگزینی کی وجہ سے آپ بیک جست قنوطیت، یاس، غم و اندوہ کی غلامی سے آزاد ہوجائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیئے رنج و الم میں گرفتار رکھے گی!

اقبال کی تہدید بھول نہ جائے!

سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار — غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

جب ہم یہ یقین کرلیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ

تعاون کرنا چاہیئے اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنیکے لیئے اُٹھ کھڑے ہوجائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہوجاتا ہی اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی وکامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے مذہبی زندگی کے تجربات کا جو میں آپ پر فاش کررہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں، جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہونے میں باقی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں' عادت کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے، اور سیرت ہی تو قسمت ہے'! انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے جب اُس کو اس امر کی یافت ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے! اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے'! آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بیوقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہوسکتی ہے؟ اور خدا ظالم بنکر لائق عبادت کیسے ہوسکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت واستعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہوسکتا ہے، اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑے گی، اور اسی کو تمام مصائب وآلام کا مبدأ قرار دینا پڑے گا، ما اصابک من حسنۃ فمن اللہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک!

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد جرأت کے ساتھ یقین کرلو کہ دُنیا اچھی' زندگی اچھی اور اس کے واقعات وتجربات اچھے، نقص کجی، یا شر کہیں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کیوقت قضا وقدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو، کہ تم پر ظلم ہورہا ہے، اور تم قابل رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگو گے' اور اپنے کو بے خطا وبے قصور قرار دو گے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و

بے قصور سمجھنا جبکہ وہی تمام سوء کا مبدء رہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے! ایسی صورت میں کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند نہیں ہوجاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو، اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے، اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہوجائے! اقبال ایسے ہی بدبخت سے مخاطب ہو کر کہتا ہے :-

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ	جامِ تو فریادی بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا!	سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا!
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات	لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو	شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن	ہست در میدان سپر انداختن
گر نسازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیا موجودات را	می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست	ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی ست

یقین کی اساس قائم ہونے کے باوجود عمل کی منزلہ عمارت اٹھائی جانی چاہیئے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا، کہ یقین درست کرنا چاہیئے، یقین کی زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جاسکتا ہے،

۲- **عمل**، مبدء غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کرسکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہوسکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہوجاتیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کرسکتا، عمل کے دو ہی نتائج ہوسکتے ہیں

کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دُنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے، ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

ناکامی سے یہ مایوس ہو کر نالہ و فریاد، سینہ کوبی، اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند تیقنات و عقائد ہیں، ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائے گی،

مجاہد زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جدال و قتال اس کے نزدیک "جہادِ اصغر" ہے، اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالآخر کامیاب ہوگا، اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیئے جہاد کرتا ہے اس لیئے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے، کان حقا علینا نصر المومنین اس کے وعدے اور یقین کی وجہ سے "احساسِ کمتری" یکلخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابل مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، ! وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثر حقیقی سمجھتا ہے اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سر عبودیت خم کرتا ہے، ذل و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے، کفیٰ باللہ وکیلا، اس کا ماٹو ہے، فاتخذہ وکیلا اس کا اصولِ عمل، قل اللہ ثم ذرھم اس کا طریقۂ کار! حسبی اللہ اس کا راحت جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موحد ہوتا ہے، اور لا الٰہ الا اللہ کا قائل و مصدق و عامل!

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ "شکر" کرتا ہے، کیونکہ وہ اس رازسے واقف ہے (جو ایک مسلمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے) کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے، اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے، ! لئن شکرتم لازیدنکم کا قطعی وعدہ اسکو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے، اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن یہ محض بمنزلہ اسباب و آلات و ادواتِ نعمت

ہوتے ہیں، قاسم و مجری و موجد و فاعل و مسبب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیئے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمھیں تمھارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے، تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لیکر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے، منعم حقیقی اللہ ہے "المعاطی اللہ" ۔ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ" اس ادراک سے نعمت زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے، اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے، !

اَلنِّعْمَةُ وَحْشِيَّةٌ فَقَيِّدُوْهَا بِالشُّكْرِ　　　نعمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اسکو باندھو

تفسیر ہے باری تعالےٰ کے اس قول کی کہ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ،

موحد جب اپنی جدوجہد میں ناکام ہوتا ہے، تو یاس و حزن، خوف الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں ؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے، جو دفع غم کے لیئے اکسیر ہے اور جس کو "بصیرت محمدیہ" نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے ؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں مبدل ہو جاتی ہیں۔ ذرا نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس قانون پر غور کرو مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کونسا اور پہلو ذہن اختیار بھی کرسکتا ہے ؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں مصیبت کے مقابلہ اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں تشتت و پریشانی کو بڑھاتے ہیں "گلہ و شکوہ" نامردی کی صریح علامت ہے۔ "کلبیت" استہزاء و استخفاف غم کی دارو نہیں، بلاؤں کے نزول کیوقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالےٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں، مستغنی کر دیتے ہیں، اب بار غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے، اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پاتا ہے،

خود بلا و ابتلا کی ماہیت کے متعلق مجاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے، اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے، لیکن در اصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعات زندگی کے ذریعہ معلم حقیقی ہمیں ہر روز سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں بھی ایک حکمت

اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دُنیا کی کوئی اور شئی ہمیں نہ یہ درس حکمت دے سکتی ہی اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کرسکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہو اگر تم اسکی تحقیق کرو، اور جو شخص کہ اس شئی میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہی، وہ واقعات کی محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کیلئے ایک صبا رفتار مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہونچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمھیں بالکل ہی مغلوب کرلے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جذبے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے، تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کرے گا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوئی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائے گا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے ان اللّٰہ یُحِبُّ الصّٰابِرِیْن، دردمند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ ان اللّٰہ مع الصّٰابرینؔ اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کر دیتا ہے' وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لے آنے کے لیے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سربازار ۹۹ تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی' جب سوواں تازیانہ لگا، تو اُس نے آہ کرنی شروع کی! پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانہ پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے سبب مار کھائی ہے، وہ ۹۹ تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیئے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا!۔ ؎

باور دبساز چوں وفائے تو منم		در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق بکشتہ شوی		شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم	(جامی)

صبر پہ استقامت پیدا ہو جائے، تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطاست" واز عطا نالیدن خطاست"، البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا الا ولیاء کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے اور نہ جزع و فزع کا، ؎

ستم کشان محبت دم از فغاں بستند،		گرہ ز جبہ کشادند بر زباں بستند!

سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہی، اس کے سوا کچھ نہیں، ؎

تسلیم نمی شوی ازاں غم گینی — تسلیم شو ہر انچہ آید پیش

رضا بالعطا اور حفظ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے، اور فرح و سرور کے دروازے کھلجاتے ہیں، بلکہ حق تعالےٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو، کہ اُن کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہی؟

آنانکہ رضائے حق سبحاں می جویند — در راہِ رضائے او بسرمی پویند!

ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید — حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند!

قال علیہ السلام، اِنَّ لِلّٰہِ رِجَالاً یَرْضٰی بِرِضَائِھِمْ وَ یَغْضِبُ بِغَضَبِھِمْ کَمَا اَنَّھُمْ یَرْضَوا بِرِضَائِہٖ وَ یَغْضَبُوا بِغَضَبِہٖ ؎

ہر چہ خواہی آں کند گر ہر چہ خواہد آں کنی — انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی!

اے درد تو بھی کیا نعمت ہے. تیری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا!

دردہ قدح درد کہ آں می باید — در دیگہ زتست بیشتر می باید

تلخ است عجب ولیک بے خوش خارست — ہر چند ہمے خورم دگرے باید (معارف)

بوارق الغیب (۱۴) حصہ دوم　　حدیث نمبر ۱۴۶　　گزشتہ سے پیوستہ

سنہ ۱۰ھ کے اواخر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کئی ہزار اصحاب کرام کے ساتھ حج کیلئے مکہ معظمہ کا سفر فرمایا۔ اور اپنی قربانی کے جانور مدینہ طیبہ ہی سے ساتھ لیئے مکہ معظمہ پہونچکر آپ پر منکشف ہوا کہ اہل جاہلیت کے اس خیال باطل کی تردید کیلئے کہ "شہر حج میں عمرہ بہت بڑا گناہ ہے" انھیں دنوں میں پہلے مستقل عمرہ ادا کیا جائے، اور اس کے بعد از سر نو حج کا احرام باندھکر حج کیا جائے ــــــ لیکن چونکہ احرام حج کے ساتھ آپ قربانی کے جانور بھی ہمراہ لیکر آئے تھے (اور ایسی صورت میں حج کی ادائگی سے پہلے احرام کو فسخ نہیں کیا جا سکتا) اس لیئے آپ بذات خود تو اس تجویز پر عمل کرنے سے مجبور تھے اس واسطے آپنے اپنے اُن اصحاب کو جو اپنی قربانیاں ساتھ نہ لائے تھے حکم دیا کہ وہ پہلے عمرہ ادا کر کے احرام سے باہر آجائیں اور پھر حج کیلئے یہیں سے مستقل احرام باندھ لیں بعض صحابہ نے خیال کیا کہ یہ حج تو کم درجہ کا ہوگا کیونکہ اس صورت میں عمرہ کے اختتام اور حج کے احرام کے درمیان بیویوں سے لطف اندوزی اور دوسرے لذائذ و مرغوبات کے استعمال کا کافی موقع مل جائے گا، اور احرام کے استمرار کی صورت میں نفس اور نفسانی خواہشات پر جو پابندیاں رہتیں اُن سے اس عرصہ کیلئے آزادی حاصل ہو جائے گی۔ نیز چونکہ آنحضرت خود ایسا نہیں کر رہے تھے اس واسطے بھی صحابہ کو کچھ تردد تھا کیونکہ ان کی انتہائی آرزو یہی تھی کہ وہ بالکل اسی طرح حج ادا کریں جس طرح آنحضرت ادا فرمائیں۔ اور ہر ہر ادا میں موافقت و یگانگت کا شرف اُن کو حاصل ہو۔ بہرحال ان وجوہ سے آنحضرت کی اس نئی تجویز پر عمل کرنے میں بعض لوگوں کو کچھ پس و پیش سا لاحق ہوا۔ جب حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو ان خیالات و وساوس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت[۱۸۲] ما اھدیت ولولا ان معی الھدی لاحللت (صحیح بخاری کتاب المناسک باب تقضی الحائض المناسک کلھا الا الطواف[۲۵۴] و صحیح مسلم[۲۵۵] صفحہ ۳۹۲ و صفحہ ۳۹۶ جلد اول)

(ایام حج میں عمرہ کر کے جاہلی خیال کو پامال کرنیکے متعلق) جو بات اب مجھے بعد میں معلوم ہوئی اگر وہ پہلے سے معلوم ہو جاتی تو میں بھی قربانی ساتھ نہ لاتا اور اگر قربانی کے یہ جانور میری ساتھ نہ ہوتے تو ضرور میں بھی عمرہ کر کے اپنے اس احرام کو ختم کر دیتا۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک بھی آپکو "علم غیب" یا علم جمیع ماکان و مایکون حاصل نہ تھا ورنہ جو چیز بعد میں آپ پر منکشف ہوئی وہ پہلے سے ہی معلوم ہوتی اور آپ قربانی کے جانور ساتھ نہ لاتے بلکہ مدینہ ہی کر تمتع کا ارادہ فرما کر چلتے۔

[۱] اگر ایک ہی سفر میں شہر حج ہی میں عمرہ و حج اسطرح کیا جائے کہ پہلے صرف عمرہ کا احرام باندھا جائے اور عمرہ کر کے احرام سے باہر ہو جائیں پھر از سر نو حج کا احرام باندھ کر حج ادا کیا جائے جیسا کہ آنحضرت نے اپنے اُن صحابہ کو کرنے کا حکم دیا تھا جو ہدی (قربانی کے جانور) ساتھ نہ لائے تھے تو اسکو تمتع کہتے ہیں اور تفصیل کتب فقہ

علامہ بدرالدین عینی حنفی حدیث کے ان الفاظ کے معنے بیان کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

اے لو عرفت فی اول الحال ما عرفت آخراً من جواز العمرۃ فی اشہر الحج "لما احدث" اے لکنت متمتعاً لمخالفۃ اھل الجاھلیۃ عمدۃ القاری ص ۲۹۲ ج ۹	یعنی اگر شروع میں مجھے وہ بات معلوم ہوجاتی جو اب آخر میں میرے علم میں آئی (یعنی اشہر حج میں عمرہ کا جواز) تو میں اپنے ساتھ ہدی نہ لاتا یعنی میں بھی اہل جاہلیت کی عملی مخالفت کیلئے تمتع ہی کو اختیار کرتا۔

علامہ زرقانی اس حدیث کے انہی الفاظ کی شرح کرتے ہوئے "شرح مواہب" میں فرماتے ہیں:۔

اے لو عن لی ھذا الرأی الذی رأیتہ آخراً وامرتکم بہ فی اول الرای لما سقت الھدی (زرقانی ص ۲۵۷ ج ۸)	یعنی یہ رائے جو اب بعد میں ہوئی اور جس کا میں تم کو حکم دے رہا ہوں اگر شروع میں مجھ پر ظاہر ہوجاتی تو میں بھی ہدی ساتھ نہ لاتا۔

اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اشعۃ اللمعات میں اس حدیث کے اسی ٹکڑے کا مطلب بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

اگر پیش ازیں میدانستم برآمدن از احرام بر شما شاق خواہد آمد من نیز سوق ہدی نے کردم ومن نے دانستم کہ حکم الٰہی چنیں خواہد بود۔ (اشعۃ اللمعات ص ۲۵۸ ج ۲)	اگر اس سے پہلے مجھے معلوم ہوجاتا کہ تم پر احرام سے نکلنا شاق گزریگا تو میں بھی قربانی ساتھ نہ لاتا اور مجھ کو معلوم نہ تھا کہ حکم الٰہی ایسا ہو جائیگا۔

شارحین حدیث کی ان تشریحات سے ہمارا مدعا اور زیادہ واضح ہوجاتا ہے یہ سب حضرات بھی اس پر متفق ہیں کہ اہل جاہلیت کی عملی مخالفت کیلئے بعد میں آپ پر جو منکشف ہوا (وحیاً یا رائاً) وہ پہلے سے آپ کو معلوم نہ تھا اور یہ جب ہی متصور ہے کہ آپ کو "علم غیب" اور "ماکان ومایکون کا علم محیط" حاصل نہ ہو۔

حدیث نمبر ۱۴۷

یہ روایت جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے یہاں اوپر ہم نے ذکر کی جس میں آپ کے اس ارشاد "لو استقبلت الخ" کے مخاطب صحابہ کرام ہیں) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ لیکن یہی واقعہ صحیحین ہی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور اس کی مسلم والی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی بات آپنے حضرت صدیقہ سے علیحدہ بھی کہی تھی اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن عائشۃ[۱۸۶] انہا قالت قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاربع مضین من ذی الحجۃ او خمس فدخل علی وھو غضبان فقلت من اغضبک یا رسول اللہ ادخلہ اللہ النار قال اوما شعرت انی امرت الناس بامر فاذاھم یترددون ... ولو انی استقبلت من امری ما استدبرت ما سقت الھدی

(صحیح مسلم صفحہ ۳۹۰ ج ۱[۲۵۹]) (وفی البخاری فی کتاب التمنی[۲۶۰] عن عائشۃ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو استقبلت من امری ما استدبرت ما سقت الھدی)

حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ذی الحجہ کی چوتھی یا پانچویں تاریخ کو مکہ معظمہ وارد ہوئے تو آپ میرے پاس اس حال میں تشریف لائے کہ آپ غضبناک تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! حضور کو کس کی حرکت نے غصہ دلایا؟ خدا اُسے جہنم واصل کرے آپ نے فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں میں نے لوگوں کو ایک بات کا حکم دیا تھا (یعنی حج کی احرام کو عمرہ میں تبدیل کر دینے کا) تو وہ پس وپیش کرتے ہیں۔ اور اگر پہلے سے مجھے وہ بات معلوم ہوتی جو اب معلوم ہوئی تو میں خود ہدی ساتھ نہ لاتا (اور ایسا ہی کرتا)

حدیث نمبر ۱۴۸

اسی حجۃ الوداع کے واقعات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے ایک یہ حدیث بھی مروی ہے :۔

ان رسول اللہ[۱۸۷] صلی اللہ علیہ وسلم خرج من عندھا مسرورا ثم رجع کئیبا فقال انی دخلت الکعبۃ ولو استقبلت من امری ما استدبرت ما دخلتہا انی اخاف ان اکون قد اشققت علی امتی

(رواہ الترمذی وابوداؤد جمع الفوائد صفحہ ۱۶۳ ج ۱[۲۶۱] ورواہ ایضا احمد وابن ماجہ والحاکم فی المستدرک کنز العمال صفحہ ۲۴۱ ج ۲[۲۶۲])

ایک دن (اس حج کے دوران ہی میں) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس سے خوش وخرم باہر نکلے پھر کچھ دیر بعد آپ رنجیدہ ہو کر واپس تشریف لائے اور بتلایا کہ میں کعبہ کے اندر داخل ہوا تھا اور اگر مجھے پہلے سے وہ خیال ہوتا جو اب بعد میں پیدا ہوا تو میں داخل نہ ہوا ہوتا، مجھے خوف ہے کہ میں نے اپنے اس فعل سے اُمت پر بار نہ ڈالدیا ہو،

اس حدیث سے بھی ہمارا مدعا بالکل ظاہر ہے کیونکہ اسمیں آپنے داخلہ کعبہ پر جن الفاظ کے ساتھ اور جس انداز میں اظہار تاسف کیا ہے اور اسکی جو وجہ بتلائی ہے وہ صاف اس امر پر دال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک "علم غیب" اور جمیع ماکان ومایکون کا علم محیط حاصل نہ تھا۔

حدیث نمبر ۱۴۹

اور اسی حجۃ الوداع کے واقعات میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بھی مروی ہے؛

قالت اراد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ینفر فرأی صفیۃ علی باب خبائہا کئیبۃ لانہا حاضت فقال عقری حلقی! (لغۃ قریش) انک لحابستنا. ثم قال اکنت افضت یوم النحر؟ یعنی الطواف قالت نعم قال فانفری اذاً.

(صحیح بخاری ۲۶۳ باب قول النبی صلے اللہ علیہ وسلم تربت یمینک و عقری حلقی" وصحیح مسلم ص ۲۶۲ ۴۲۶ ج۱)

فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے (حج سے فارغ ہوکر مکہ معظمہ سے) کوچ کرنیکا ارادہ فرمایا تو جناب صفیہؓ کو دیکھا کہ اپنے خیمہ کے دروازہ پر غمزدہ اداس سی کھڑی ہیں کیونکہ ان کے ایام شروع ہوگئے تھے آپ نے دیکھ کر فرمایا "عقری حلقی" پھر آپ نے فرمایا تم ہمیں روکنے والی ہو پھر فرمایا کیا تم نے دسویں تاریخ کو طواف افاضہ کرلیا تھا؟ اُنھوں نے کہا ہاں حضور نے رشاد فرمایا تو اب کوچ کرو (کیونکہ حج کے فرضی ارکان سب ادا ہوچکے)

اس حدیث سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک (یعنی حجۃ الوداع سے فارغ ہوکر کوچ کرنے کے وقت تک) "جمیع ماکان ومایکون کا علم محیط" حاصل نہ تھا ورنہ آپ نہ تو انک لحابستنا فرماتے اور نہ آپ کو یہ دریافت فرمانے کی ضرورت ہوتی کہ "اکنت افضت یوم النحر؟" (کیا تم نے نحر کے دن طواف افاضہ کرلیا تھا؟)

حدیث نمبر ۱۵۰

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے:-

قال حکت لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حلۃ انمار صوف سوداء فجعل حاشیتہا بیضاء فخرج فیہا الی اصحابہ فضرب بیدہ علی فخذہ فقال الا ترون الی ہذہ ما احسنہا فقال اعرابی بابی انت وامی یا رسول اللہ ہبہا لی وکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لا یسأل شیئاً ابداً فیقول لا فقال نعم فاعطاہ الجبۃ ودعا بمعوزین لہ فلبسہا وامر بمثلہا فحیکت لہ فتوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہی

فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے سیاہ اون کا ایک جوڑا تیار کیا تو آپ نے اسکی کناری سفید لگائی اور اسکو پہن کر باہر تشریف لائے اور ران پر ہاتھ مار کر فرمایا دیکھنا یہ جوڑا کیا اچھا معلوم ہوتا ہے ایک اعرابی نے عرض کیا حضور! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں یہ تو مجھے مرحمت فرما دیجیے (اور آنحضرت کی عادت کریمہ تھی کہ جب آپ سے کوئی چیز مانگی جاتی تو آپ "نا" نہیں فرماتے تھے) تو آپ نے اس اعرابی سے فرمایا ہاں لو، اور وہ جبہ اسکو عطا فرمادیا اور اسی جیسا اور تیار کرنیکا حکم دیا سہل کہتے ہیں کہ میں نے حسب الحکم اسکے لیے تانا ہی

فی المحاکمۃ"

(رواہ ابن جریر کنز العمال ص۴۲ ج۴ نمبر ۱۲۶۹)

انتا ہی کیا تھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے اور وہ تانا گاڑھ (کپڑا بننے کی جگہ) ہی میں تھا (یعنی اُس کی تیاری سے پہلے حضور اس دُنیا سے رحلت فرماکر آغوشِ رحمت میں چلے گئے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس وقت آپ نے سہل کو دوبارہ ویسا ہی جوڑا تیار کرنے کا حکم دیا تھا اُس وقت آپ کو معلوم نہ تھا کہ میری وفات کا وقت اس قدر قریب آگیا ہے ورنہ آپ اپنے لیئے اُس کی تیاری کا حکم نہ دیتے، اور ظاہر ہے کہ یہ حکم آپ نے وفات شریف سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے دیا ہوگا کیونکہ حضرت سہل کا بیان ہے کہ میں نے حسب الارشاد اس کی تیاری شروع کردی تھی لیکن اُس کی تکمیل سے پہلے ہی حضرت واصل بحق ہوگئے تو زیادہ سے زیادہ وفات شریف سے بس مہینے دو مہینے پہلے کا یہ واقعہ ہوگا گویا ۱۱ سنہ ہجری محرم یا صفر کے مہینے کا۔ واللہ اعلم

نیز وفات شریف سے ایک مہینے پہلے والی حضرت جابر کی حدیث بروایت صحیح مسلم (جس میں حضرت نے وفات مقدسہ سے صرف ایک مہینے پہلے وقت قیامت کے سوال کے جواب میں اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی)، اور خاص مرض الوفات کی بعض احادیث صحیحین اور دیگر کتب صحاح کے حوالہ سے اس حصہ کے ابتداء میں ہم درج کرچکے ہیں۔

نمبر ۱ سے یہاں تک جو ۸۰ حدیثیں درج ہوئی ہیں وہ ہجری سنین کے حساب سے ہیں، ان میں ہجرت کے پہلے سال سے لے کر آنحضرت کی وفات مقدسہ کے سال (۱۱ سنہ ہجری) تک کے تمام سالوں کی حدیثیں ہیں جن سے ہر سال کے متعلق یہ ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس سال تک بھی "علم غیب" یا "علم جمیع ماکان ومایکون" حاصل نہ تھا — اور ہم عرض کرچکے ہیں کہ ان احادیث کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف اُن لوگوں پر مستقل حجت قایم کرنا ہے جو دعوےٰ کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس دُنیا میں تشریف لانے سے بھی پہلے شکم مادر ہی میں "علم غیب" یا "علم ماکان ومایکون" عطا فرمادیا گیا تھا۔ یا جو عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور کو شب معراج میں "تمام ماکان ومایکون کا علم محیط" حاصل ہوگیا تھا — مگر جو چالاک لوگ دلائل کی گرفت سے بچنے کیلئے ختم نزول قرآن کے ساتھ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو علم ماکان ومایکون کے عطا کیئے جانے کے مدعی ہیں اُن پر

صرف پہلی انہی حدیثوں سے حجت قایم ہوتی ہے جس کی تقریر و توضیح ہم پہلے کر چکے ہیں۔

بہر حال یہاں تک ڈیڑھ سو ۱۵۰ حدیثیں ہوئیں جن میں سے اکثر بحمداللہ صحاح کی ہیں اور جو خارج صحاح کی ہیں اُن میں بھی کوئی ایسی نہیں جس میں نکارت شدیدہ ہو

حوالہ جات کے بارہ میں میرا اصول یہ رہا ہے کہ صحیحین کی احادیث کو اکثر خود صحیحین ہی سے لیا ہے اور صحیحین ہی کے باب یا صفحہ کا حوالہ دیا ہے، ماسوا صحیحین کے جو سنن اربعہ یا موطا یا مسند احمد کے حوالے ہیں وہ اکثر "جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد" (تالیف محمد بن محمد بن سلیمان المغربی المالکی) سے لیئے گئے ہیں اور اسی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، اور جہاں کہیں ان اصل کتابوں کا حوالہ ہے وہاں حدیث کو اصل کتاب ہی سے لیا گیا ہے۔ جن کتابوں کی احادیث کے لیئے "کنز العمال" یا "در منثور" کا حوالہ دیا گیا ہے وہاں سمجھ لینا چاہیئے کہ اُن احادیث کو کنز العمال یا در منثور ہی سے لیا گیا ہے۔

بہر حال جس حدیث کیلئے جس کتاب کے باب یا صفحہ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ حدیث عموماً اسی کتاب سے لی گئی ہے اور حوالہ کا نمبر بھی صرف اُسی کتاب پر لگایا گیا ہے۔ ورنہ اگر ہم فاضل بریلوی مولوی احمد رضا خاں صاحب کے اس اصول پر چلتے کہ ایک مخرّج جتنی بھی کتب حدیث کا حوالہ دے وہ اُن سب کتابوں کو علحدہ علحدہ شمار کر کے اپنے حوالوں کی گنتی بڑھاتے ہیں اور اس طرح ایک ایک حوالہ کو دس دس بیس بیس۲۰ حوالے بنا لیتے ہیں۔ پس اگر ہم بھی یہی طرز عمل اختیار کرتے) تو یقین ہے کہ حوالہ جات کی تعداد سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں پر پہونچ چکی ہوتی جیسا کہ ناظرین کرام خود بھی حساب لگا سکتے ہیں۔

اب ہم اس "حصہ احادیث نبوی" کو یہیں ختم کرتے ہیں اگرچہ ابھی اس پر اضافہ کی کافی گنجائش ہے۔ اور قریباً ایکسو حدیثیں میری اُس "یادداشت" میں بھی ابھی باقی ہیں جو اس کتاب کی پہلی ترتیب کے وقت صرف "کنز العمال" اور "جمع الفوائد" کا مطالعہ کر کے تیار کی گئی تھی لیکن ناظرین کے اُکتا جانے کے خیال سے کتاب کو مزید طول دینا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے اور پھر ڈیڑھ سو کی تعداد بھی بجائے خود کچھ کم تعداد نہیں ہے۔ جو حدیثیں چھوڑ دی گئی ہیں اُن میں ایک کافی تعداد اُن روایات کی ہے جن میں غزوات کے موقع پر مخبروں اور جاسوسوں کو بھیجنے اور پھر اطلاعات حاصل کر کے ان کو خدمت نبوی میں پہونچانے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ کسی "عالم غیب اور دانائے کل" کو ان تدبیروں کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی، اس کے علاوہ اور بھی مختلف مضامین کی بہت سی ایسی حدیثیں ابھی باقی ہیں جن سے ہمارا مدعا نہایت وضاحت سے ثابت ہوتا ہے لیکن اب بقصد اختصار انہی ڈیڑھ سو حدیثوں پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اور اصل تو یہ ہے کہ قرآن و حدیث پر نظر رکھنے والوں کیلئے یہ مسئلہ (کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ کسی مخلوق کو بھی "علم غیب کلی" یا "علم جمیع ماکان ومایکون" حاصل نہیں) اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لیئے استدلال کیا معنی کسی "تنبیہ" اور "تذکیر" کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن دنیا کے عجائبات میں سے یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اس پر قائم رکھنے اور اس کا یقین دلانے کے لیئے آج اس پر بھی مستقل تصنیفوں کی ضرورت ہو رہی ہے، اور ان کے دین کے تحفظ کی خاطر اس قسم کے مسائل کی طرف توجہ کرنا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔

صدق النبی صلے اللہ علیہ وسلم لتتبعن سنن من کان قبلکم شبرا بشبر و ذراعا بذراع (بخاری مسلم)

پھر آخری تنبیہ

کتاب کے اس حصّہ کو ختم کرتے ہوئے بھی ہم پھر اس "آخری تنبیہ" کا اعادہ کر دینا چاہتے ہیں کہ ہماری اس بحث کا تمامتر تعلق صرف اہل بدعت کے خانہ ساز عقیدہ "علم غیب کلی" یا "علم جمیع ماکان ومایکون" ہی سے ہے، اور خدا شاہد ہے کہ اس سے ہمارا مقصد صرف اس غالیانہ عقیدہ کی تردید اور مسلک حق کی توضیح ہے ——— اس کو اس پر محمول کرنا کہ معاذ اللہ ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے علم شریف کی تنقیص مقصود ہے انتہائی بے ایمانی اور اعلیٰ درجہ کی شیطنت ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد کمال علمی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا درجہ ہے ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اللہ تعالیٰ نے جو علوم و معارف آپ کو عطا فرمائے وہ بحیثیت مجموعی کسی دوسرے رسول اور کسی دوسرے نبی، اور کسی مقرب ترین فرشتے کو بھی عطا نہیں ہوئے آپ ہی وہ ہیں جن کے متعلق خدا کی مقدس کتاب نے شہادت دی،

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ط (نساء)	اللہ نے آپ کو وہ علوم سکھائے جو آپ کو پہلے سے حاصل نہ تھے اور اللہ کا آپ پر بڑا فضل ہے

آپ ہی وہ ہیں جن کے متعلق کتاب الٰہی کا بیان ہے:۔

فَاَوْحٰیٓ اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ط　　　خدا نے اپنے بندے کے دل میں ڈالدیا جو ڈالدیا۔

آپ ہی معارف الٰہیہ کے آخری معلم ہیں اور علوم ربانیہ کے آخری مبلغ لیکن باایں ہمہ آپ کے علوم کو علوم الٰہیہ سے وہی نسبت ہے جو ایک مخلوق کی کسی صفت کو خالق کی صفت سے ہو سکتی ہے۔ نیز آپ کے علم کی اس غیر معمولی بلکہ بے نظیر وسعت کی وجہ سے "جمیع ماکان ومایکون" کا عالم بھی آپ کو نہیں کہا جاسکتا کیونکہ نصوص قرآنی اور احادیث نبوی اس کے خلاف ناطق ہیں جیسا کہ معلوم ہو چکا ___ پس ان سے روگردانی اور بیتابی کرکے آپ کو "عالم الغیب" یا "عالم جمیع ماکان ومایکون" ماننا، محبت نہیں، بلکہ معصیت، اور موجب قربت نہیں خطرناک بغاوت ہے۔ رسول اللہ روحی وقلبی فداہ صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لاتطروني كما اطرات النصارىٰ عيسى بن مريم انما انا عبد الله ورسوله فقولوا عبد الله ورسوله

(صحیحین)

تم مجھ کو حد سے نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسےٰ بن مریم کو بڑھایا میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول تو مجھے خدا کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔

کتاب "بوارق الغیب" کا حصۂ دوم بعون اللہ تعالیٰ ختم ہوا۔ اب انشاء اللہ حصۂ سوم شروع ہوگا جس میں اسی "مسئلۂ علم غیب" کے متعلق اہل سنت کے مسلک حق کی تائید میں حضرات صحابہ وتابعین اور امت کے دیگر واجب الاحترام طبقات، ائمہ مجتہدین، محدثین، مفسرین متکلمین اور علماء وعرفا کے ارشادات پیش کیے جائیں گے واللہ الموفق وھو المستعان۔

الفقیر عباد اللہ محمد منظور النعمانی عفاعنہ مولاہ

دفتر "الفرقان"

بریلی

"خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں"

اس عنوان کے تحت میرا جو مبسوط مقالہ شعبان و رمضان کے "الفرقان" میں شایع ہوا تھا اور جو بعد میں محترمی مولٰنا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی اُستاذ تفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مقدمہ کے اضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں بھی شایع ہوا اسکے اثرات و نتائج کا اجمالی تذکرہ کبھی پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ اور اب تک کہ اس کی اشاعت پر چھ مہینے سے زیادہ گزر چکے ہیں اسکی تاثیرات کے بارہ میں خوش کن خبریں آتی ہی رہتی ہیں ـــــ حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اُس نے میری دُعا قبول فرمائی اور میری اس محنت کو ٹھکانے لگایا ـــــ لیکن اُس کی کثرت اشاعت کے متعلق جو آرزو تھی اور جس کی تکمیل دوستوں کے تعاون پر موقوف تھی افسوس ہے کہ وہ کسی درجہ میں بھی پوری نہ ہوسکی!

ناظرین کرام کو یاد ہوگا ذی الحجہ کے "الفرقان" میں اعلان کیا گیا تھا کہ اپنے کافی اضافات اور مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک تفصیلی تبصرہ کے ساتھ ہم اس کتاب کو ایک لاکھ شایع کرنا چاہتے ہیں"

ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا گیا تھا کہ اس کتاب کی اس اشاعت سے کوئی مالی نفع حاصل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسکی قیمت صرف بقدر لاگت رکھی جائیگی اور پورا حساب لگا کر یہ بھی بتلا دیا گیا تھا کہ پیش نظر جدید اضافات کے بعد یہ کتاب چھوٹے خوشنما سائز کے قریباً تین سو صفحات پر انشاء اللہ آجائیگی اور اگر ایک ہی دفعہ کم از کم ۱۰ ہزار چھاپی جائے تو بہترین کتابت طباعت اور عمدہ قسم کا سفید چکنا کاغذ لگانے کے باوجود ۲۵ روپیہ فی سیکڑہ یعنی ۴ر فی نسخے سے زیادہ انشاء اللہ لاگت نہ آئے گی اور یہی اس کی قیمت رکھدی جائے گی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی تصریح کردی گئی تھی کہ یہ منصوبہ صرف اُس صورت میں پورا ہوسکتا ہے جبکہ کم از کم دس ہزار کی خریداری کا ہمیں پہلے سے اطمینان ہوجائے اور اسی لیئے ہم نے اُن حضرات سے جو اس کام کی ضرورت و اہمیت کو سمجھتے ہوں اور اس میں حصہ لینا چاہتے ہوں یہ اپیل کی تھی کہ وہ ہم کو اطلاع دیدیں کہ اپنی ذات یا اپنی کوشش سے اس کتاب کے وہ کس قدر نسخے منگوا سکینگے؟

اُمید تھی کہ اگر دس ہزار نہیں تو پانچ سات ہزار کے آرڈر آجائیں گے۔ لیکن یہ معلوم کرکے شاید آپ حضرات

کو بھی تعجب اور افسوس ہوگا کہ پورے ایکہزار کی مانگ بھی نہیں آئی ــــــ ایسی صورت میں اگرچہ یہ ممکن تھا کہ جدید ایڈیشن ہزار ڈیڑھ ہزار ہی چھاپ لیا جاتا لیکن اس صورت میں اس کی لاگت کسی طرح ۸ر سے کم نہ ہوگی، اور ہم چاہتے ہیں کہ اُسکی لاگت کم سے کم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ اشاعت ہوسکے

اِسی لیئے آج پھر اُس اپیل کا اعادہ کیا جاتا ہے

پس جو حضرات اس کام میں حصّہ لے سکیں خواہ اس طور پر کہ بطور خود اس کتاب کے سو پچاس ۵۰ یا کم و بیش نسخے خرید سکیں یا اپنی کوشش سے اُس کے لیئے خریدار پیدا کرسکیں وہ اپنے ارادہ اور تخمینہ سے مطلع فرمائیں۔

اب فیصلہ یہ ہے کہ اگر صرف چار ہزار کی خریداری کی اطلاعات بھی ہمارے پاس آگئیں تو انشاء اللہ اُس کا جدید ایڈیشن ہم ہر صورت پانچہزار ہی تیار کرالیں گے۔

مگر اب چونکہ کاغذ کا نرخ پہلے کے اعتبار سے بہت زیادہ چڑھ چکا ہے نیز پانچ ہزار اور دس ہزار کی چھپائی کے نرخ میں بھی کافی فرق پڑ جاتا ہے اس لیئے اس صورت میں لاگت غالباً پینتیس ۳۵ روپیہ فی سیکڑہ (یعنی قریباً ۶ر فی نسخہ) سے کم نہ ہوسکے گی۔

پس اس سلسلہ میں جو صاحب کوئی اطلاع دینا چاہیں وہ اس پرچہ کی اشاعت سے پندرہ دن کے اندر اندر اطلاع دے کر ممنون فرمائیں تاکہ ہم جلد کسی فیصلہ پر پہونچ سکیں اور آئندہ اشاعت میں اُس کا اعلان کیا جاسکے۔

اگر صرف چالیس مخلص اور باہمّت دوست بھی سو سو نسخوں ہی کی ذمہ داری لے لیں تو چار ہزار کی تعداد پوری ہوسکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ "الفرقان" کے دیکھنے والوں میں ایسے چالیس حضرات ضرور موجود ہوں گے صرف توجہ ہمّت اور عزم کی ضرورت ہے ــــ خدا کرے میری یہ اُمید غلط نہ ہو۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ اس کتاب کی اس اشاعت سے مالی نفع قطعاً مقصود نہیں ہے، غرض صرف یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے فتنہ کی حقیقت کو سمجھ لیں جو اپنی خطرناکی اور مضرتوں کے لحاظ سے اسلامی تاریخ کا عظیم ترین فتنہ ہے مگر چالاک فتنہ گروں نے اس کو اسلامی دُنیا کے سامنے "ایک برکت" اور "سراپا خیر" بنا کر پیش کیا ہے۔

بالخصوص اس عرصہ میں (مارچ سے) اس تحریک کا جو نیا دور شروع ہوا ہے اس نے اس تحریک کے غلط اور خوفناک پہلوؤں پر اور زیادہ پردہ ڈالدیا ہے اور ناواقف مسلمانوں میں اس جماعت کی ہمدردی بڑھتی جارہی ہے ــ اس لیئے اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی اشاعت کی ضرورت اب پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ اس جدید ایڈیشن میں اس تحریک کے نوپیدا حالات پر بھی پوری روشنی ڈالی جائے گی اور اس جماعت کے متعلق بہت سی نئی اور حیرت انگیز باتیں انشاء اللہ ناظرین کرام کو معلوم ہونگی۔ واللہ المستعان

چند وقیع رائیں:-

کتاب "خاکسار تحریک" کے متعلق اخبارات اور نجی خطوط میں جو رائیں اب تک آچکی ہیں اگر اُن سب کو جمع کیا جائے تو ایک اچھی کتاب بن سکتی ہے، یہاں ہم صرف دو چار خاص رائیں نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین کرام کو معلوم ہو کہ اس کتاب کو خواص اہل علم نے بھی کس نظر سے دیکھا ہے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی۔ اے اڈیٹر صدق لکھنؤ کی رائے گرامی

یکم اپریل کے "صدق" میں نئی کتابوں کے زیر عنوان اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ ارقام فرماتے ہیں:-

خاکسار تحریک:- از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، ایڈیٹر "الفرقان" ضخامت ۱۲۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت ۸ پتہ:- دفتر رسالہ "الفرقان" بریلی

عقائد "مشرقی" اور تحریک خاکسار کی موافقت و مخالفت میں اتنا زائد لکھا جا چکا ہے کہ اب کچھ کہنے سننے کی گنجایش بہت کم نظر آتی ہے لیکن حقیقتاً جو کچھ لکھا گیا اس کا بیشتر حصہ مناظرانہ و مجادلانہ ہے۔ اس لیئے دو ایک رسالوں کو مستثنٰے کرنے کے بعد ایک طالب حق و جویائے حقیقت کیلیئے اب تک طلب و جستجو کی پیاس بجھانے کا کہنا چاہیئے کہ کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کو اس ضرورت کا احساس ہوا، اور اُنھوں نے بحمد اللہ اس کام کو کر بھی ڈالا موصوف ایک زندہ جذبہ دینی کے ساتھ ساتھ دماغ بھی بیدار رکھتے ہیں، اور متانت بیان و سلاست زبان ان کے قلم کے جوہر ہیں اور رسالہ میں یہ خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں۔

شروع میں ۱۶ صفحہ کا مقدمہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے۔ یہ مقدمہ بجائے خود قابل دید ہے۔ اس میں تحریک کی تاریخ اور نفسیت پر ماہرانہ تبصرہ آگیا ہی، اور اس کی مقبولیت کے اسباب کی گہری تحلیل و تجزی بڑی حد تک موجود ہے۔ دلچسپ بھی اور محققانہ بھی۔ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہی۔ مباحث کی نوعیت اور مسائل کی تفصیل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باریک چھپے ہوئے پورے چار کالموں میں تو صرف فہرست مضامین آئی ہے۔ فاضل مصنف نے کمال ایجاز و سلیقہ مندی سے کل ۱۲۰ صفحات کی ضخامت میں بحث کے سارے پہلو سمیٹ لیئے ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی گوشہ اُن کی نظر سے چھوٹنے پایا ہے۔ بانیِ تحریک کے عقائد اور نفس تحریک سے ان کے تعلق کی وضاحت، خصوصاً قابل داد ہے۔ تحریک کے موافقین و مخالفین جو بھی تحریک سے متعلق مبصرانہ رائے قایم کرنے کے آرزومند ہوں، سب کے لیئے کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور کُل آٹھ آنہ کی قیمت میں ایسا سودا ہر عقبار سے ارزاں ہی

مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے ایڈیٹر "برہان" دہلی کی رائے:۔

خاکسار تحریک عہد حاضر میں مسلمانان ہند کیلئے سب سے بڑا فتنہ ہے، اس کی ظاہری ٹیپ ٹاپ ایسی دلفریب ہے کہ بعض سادہ لوح اور حقیقت حال سے بے خبر مسلمان بُری طرح اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مولٰنا نعمانی نے اسی کی قلعی کھولنے کے لیے یہ کتاب تصنیف کی ہے جس میں سیاسی و مذہبی دونوں پہلوؤں سے اس تحریک کی رکاکت و مضرت پر تفصیلی اور مدلل بحث کی ہے اور خود بانی تحریک کے اقوال و افعال اور اُسکی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ اس تحریک کی بنیاد مفسطہ، مکروفریب، جھوٹ، دروغ گوئیوں اور تہمت تراشیوں پر قائم ہے جو نوجوان اس تحریک کے ورزشی اور نام نہاد تنظیمی پروگرام سے مرعوب ہیں انھیں اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ خاکسار تحریک گو بظاہر جسموں کو موزوں اور مضبوط بنانا چاہتی ہے مگر در اصل وہ اسلامی روح کو در پردہ کس طرح مضمحل کر کے اس میں زہریلے جراثیم پیدا کر رہی ہے۔ خاکسار تحریک کے اس شور و غل کے زمانہ میں ہر مسلمان کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری اور از بس مفید ہوگا۔

مولٰنا محمد عثمان صاحب فارقلیط ایڈیٹر اخبار "زمزم" لاہور کی رائے:۔

موصوف زمزم مجریہ ۱۵ر مارچ میں "انتقادات" کے زیر عنوان اپنے ایک طویل تبصرہ کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہمارے فاضل محترم مولٰنا محمد منظور صاحب نعمانی نے تحریک خاکساریت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالکر اور حالات کا پورا جائزہ لیکر مندرجہ صدر کتاب حال ہی میں شائع فرمائی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ خاکساریت کے خلاف اس قدر مہذب اور متین انداز میں اس قدر مدلل اور برہن طریقہ پر اور اس قدر بسط و تفصیل کے ساتھ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتاب میں جذبات سے نہیں بلکہ واقعات سے کام لیا گیا ہے اور خواہشات سے اپیل نہیں بلکہ اس سرچشمے کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے نفسیات کی سوتیں اُبلتی ہیں۔ کتاب تجارتی غرض سے نہیں بلکہ اصلاح کی غرض سے شائع کیگئی ہے مصنف نے اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں تک اس کتاب کو ایک لاکھ کی تعداد میں پہونچایا جائے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ کتاب کو بکثرت خریدیں اور اسے مناسب حلقوں میں پہونچاکر عند اللہ ماجور ہوں۔

مولٰنا سعید احمد صاحب ایڈیٹر اخبار "احرار" احرار مجریہ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۰ء میں بذیل "انتقادات" تحریر فرماتے ہیں:۔

مولٰنا محمد منظور نعمانی مدیر" الفرقان" بریلی نے "فتنۂ خاکساری" پر "خاکسار تحریک" کے عنوان سے جو کتاب تالیف فرمائی ہے یہ اسی گرمیٔ عمل کا نتیجہ ہے جو مستقبل قریب ہی میں برق خاطف بن کر "خاکساریت" اور مشرقیت کے خرمن کو جلا ڈالنے کا عزم لیکر اٹھی ہے۔ مولف کتاب نے جس خلوص وللہیت اور جن پاکیزہ مقاصد کے پیش نظر "خاکسار تحریک" کی تالیف فرمائی ہے اس کا اندازہ "عرض اولین"، "مقدمہ ضروریہ" اور خطبہ سے لگایا جاسکتا ہے مولف نے "خاکساریت" کے ابطال پر جو کچھ بھی استدلال کیا ہے وہ قریب قریب تمام علامہ مشرقی کی رسوائے عالم کتاب "تذکرہ" خاکساری لٹریچر اور اخبار "الاصلاح" کے اقتباسات پر مبنی ہے۔ مولف موصوف نے کتاب میں سب سے اہم خصوصیت یہ پیدا کی ہے کہ "خاکساریت" کے صرف مذہبی مضرات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی سیاسی تباہ کاریاں بھی اس اچھوتے انداز میں واضح کردی ہیں کہ ہر اردو خواں تھوڑے سے غور وفکر کے بعد اس فتنہ کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہوسکتا ہے۔ کتاب کے شروع میں مولٰنا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ایک فاضلانہ مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے ناظرین کتاب کی خصوصی توجہات کا داعی ہے کتاب کے آخر میں حضرت مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کا وہ خاکساریت شکن مجاہدانہ تبصرہ ہے جس کی گونج سے "قصر مشرقیت" برابر لرزتا رہتا ہے اور بالآخر ایک دن پاش پاش ہونیوالا ہے۔ بہرحال کتاب "خاکسار تحریک" ہر مسلمان کے مطالعہ کیلئے نہایت ضروری ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ ہے اور کاغذ چکنا استعمال کیا گیا ہے۔

مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار اسلام ہند اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"خاکساریت پر اس سے بہتر کوئی تحریر نہیں دیکھی گئی کاش مسلمان اس کی قدر کریں"

حضرت مولٰنا اعزاز علی صاحب مدظلہ استاذ ادب وفقہ دارالعلوم دیوبند ایک طویل تحریر کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"میں اس کتاب کو دیکھ کر اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ اگر عنایت اللہ صاحب مشرقی اس رسالہ کا مطالعہ من اولہا الی آخرہا کرینگے تو خواہ زبان سے اقرار نکریں مگر دل ہی دل میں ضرور کہیں گے کہ مصنف رسالہ نے اس میں ایک لفظ بھی ضرورت سے زائد یا واقعہ کے خلاف نہیں لکھا ہے۔

میں مصنف رسالہ کی اسلامی حمیت کی داد کیا دوں جو صرف اس لیئے ہی کہ

خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کا دین محفوظ رہے۔ کیونکہ مصنّف نہ اس کی داد کے ہم سے خواہاں نہ وہ ہماری استطاعت ہیں، ہاں ہیں اپنے دوستوں سے خصوصًا اور اسلامی جذبات رکھنے والوں سے عمومًا عرض کرتا ہوں کہ کیا یہ بھی دشوار ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت میں آپ حضرات سعی کریں۔ کم ازکم اس قدر تو ہو کہ ہندوستان کے ہر گاؤں اور ہر قصبہ میں یہ رسالہ پہنچ جائے"۔

سالاروں اور خاکساروں کے خطوط:۔

عام خاکساروں کی یہ اطلاعات تو بکثرت آئیں کہ اس کتاب (خاکسار تحریک) کے مطالعہ نے اُن پر خاکساریت کی حقیقت کھول دی اور وہ اس تحریک سے بیزار ہو کر علحدہ ہوگئے خود خاکساروں کے قلم کے لکھے ہوئے بھی ایسے بہت سے خطوط آئے جن سب کو قلت گنجائش کی وجہ سے درج نہیں کیا جاسکتا۔ اُن میں سے صرف چند خطوط (بطور مشتے نمونہ از خروارے) یہاں درج کیے جاتے ہیں:۔

ملک محمد ممنون حسن خاں بی۔ اے سالار شہر شاہجہانپور لکھتے ہیں:۔

"میں قومی اور مذہبی جوش کے فوری جذبہ کے ماتحت چند ماہ سے خاکسار تحریک میں شریک ہوگیا تھا اور مجھ کو حاکم اعلیٰ صوبہ یو۔پی نے شاہجہانپور کا سالار ضلع بھی مقرر کر دیا تھا لیکن کچھ عرصہ سے اس تحریک کی خامیوں سے میں برداشتہ خاطر ہو رہا تھا اتفاق سے ابھی حال میں جناب کی کتاب "خاکسار تحریک مذہب وسیاست کی روشنی میں" دستیاب ہوگئی جس کو پڑھکر میرے شبہات پایۂ یقین کو پہونچ گئے اور مجھکو کافی طور سے اندازہ ہوگیا کہ تحریک خاکسار کہاں تک مسلمانوں کے واسطے مفید ثابت ہوسکتی ہے لہذا میں نے اس سے علحدگی کا مصمم ارادہ کرلیا بلکہ استعفا بھی لکھ کر صوبہ کو روانہ کردیا ہے اور اب آپ کو بھی بطور اطلاع عریضہ ہذا ارسال کر رہا ہوں۔

حقیر ملک محمد ممنون حسن خاں بی۔ اے قلعہ شاہجہانپور

(باقی)

الفرقان کا ولی اللہ نمبر انشاء اللہ حسب اعلان شعبان میں شایع ہوگا جو مضامین ابتک آچکے ہیں انہی کے پیش نظر کہا جاسکتا ہی کہ خدا نے چاہا تو یہ نمبر اردو لٹریچر میں ایک قابل یادگار اور نادر اضافہ ہوگا تین سو سے زائد صفحات کی توقع ہی، جن آمدہ مضامین کا پہلے تذکرہ کیا جاچکا ہی اُن کے بعد جو اہم مضامین اور آے ہیں ان کا ذکر انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں کیا جائیگا۔ (مینجر)

سلسلۂ رد بدعت کی قابل دید کتابیں

براہین قاطعہ:۔ میلاد، عرس، فاتحہ مروجہ، تیجہ وسوں وغیرہ بدعات مروجہ کی تردید میں حضرت مولنا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی مشہور ومبسوط کتاب ہے جسمیں اہل بدعت کے تمام شبہات کے تفصیلی جوابات بھی دیئے گئے ہیں قیمت عہ رعایتی ۱۲ر

طریقہ مولد:۔ میلاد کا صحیح طریقہ اسمیں بتلایا گیا ہے۔ قیمت ۱ر

فتاوی میلاد شریف:۔ اسمیں مروجہ میلاد کے متعلق اکابر علماء ہندوستان کے مدلل اور مستند فتاوی درج ہیں قیمت ۲ر رعایتی ۱۰ر

تحریری مناظرہ:۔ تبرک وبدعت کے رد میں مختصر اور بہت مفید رسالہ ہے قیمت ۲ر رعایتی ۱۰ر

تنشیط الاذان:۔ اذان خطبہ کے اندرون مسجد مشروع ہونے کے ثبوت میں حضرت مولنا خلیل احمد صاحب کا لاجواب رسالہ بہت کمیاب ہے قیمت رعایتی ۱۰ر

النفائس المرغوبہ:۔ دعاء ثانیہ کی بدعت منکرہ ہونیکا ثبوت از حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مدظلہ قیمت ۸ر رعایتی ۷ر

دلیل الخیرات:۔ تجہیز وتکفین و ایصال ثواب کی مروجہ بدعات کا رد ایضاً از حضرت مفتی صاحب مدظلہ قیمت ۱۰ر رعایتی ۹ر

الشہاب الثاقب:۔ مولوی احمد رضا خانصاحب بریلوی کے رد میں حضرت مولنا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث کا بہترین اور لاجواب رسالہ ہے قیمت ۸ر رعایتی ۶ر

الکلام نمبر ۲:۔ اسمیں صفات باری تعالےٰ اور مسئلہ تقدیر کے متعلق اسلام کے نظریہ کو عقلی ونقلی براہین سے حق ثابت کیا گیا ہے قیمت ۴ر رعایتی ۳ر

التصدیقات:۔ بریلوی خرافات کے رد میں حضرت مولنا خلیل احمد صاحب کا قابل دید رسالہ ہے علماء دیوبند کے عقائد حقہ کا مدلل بیان اور علماء حرمین شریفین وعلماء مصر وشام کی تائیدات قیمت ۶ر رعایتی ۵ر

تزکیۃ الخواطر:۔ خانصاحب بریلوی کی جعلی تکفیری فتوے "حسام الحرمین" اور ان کی مایۂ ناز کتاب تمہید ایمان پر لاجواب تنقید کرکے انکی ابلہ فریبیوں کا پردہ چاک کر دیا گیا ہے قیمت ۳ر رعایتی ۲ر

اسکات المعتدی:۔ ابن شیر خدا کی مناظرانہ قابلیت کا شاہکار اسمیں قریباً ڈیڑھ سو مناظرانہ سوالات کیے گئے ہیں ضرور ملاحظہ فرمایئے قیمت ۴ر رعایتی ۳ر

اصلاح الرسوم:۔ حضرت مولنا اشرف علی صاحب تھانوی مدظلہ کی مشہور اور بیحد مفید کتاب جدید الطبع قیمت ۸ر رعایتی ۶ر

مسائل اربعین محشی:۔ بدعات اور رسوم مروجہ کی تردید وتنقیح میں حضرت شاہ اسحق صاحب دہلوی کا یہ ایک قابل دید رسالہ ہے اسمیں ۴۰ مباحث ہیں ہر مسئلہ کا ثبوت قرآن وحدیث اور کتب معتبرہ فقہ سے دیا گیا ہے قیمت ۴ر رعایتی ۳ر

مأۃ مسائل:۔ حضرت شاہ اسحق صاحب کی بے نظیر تصنیف سو اختلافی مسئلوں کا فیصلہ قیمت ۶ر رعایتی ۵ر ترجمہ اردو ۱۲ر

ایضاح الحق الصریح (مع ترجمہ اردو) حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رح کی عدیم النظیر تصنیف جو عرصہ سے نایاب تھی قیمت ۱۲ر رعایتی ۱۰ر

تقویۃ الایمان کلاں عہ رعایتی ۱۲ر **صراط مستقیم** قیمت عہ رعایتی ۱۴ر

تفسیر بیان القرآن جدید مکمل بارہ جلد

حضرت حکیم الامت مولنا تھانوی دامت برکاتہم کے نظر ثانی اور اصلاح وترمیم اور کافی اضافات کے بعد یہ تفسیر دوبارہ شایع ہوئی ہے اپنی شہرت اور بے نظیر مقبولیت کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں پھر حضرت حکیم الامت کا نام نامی بجائے خود کافی ضمانت ہے اس ایڈیشن میں حضرت مدظلہ کی بیش قیمت اور جلیل القدر کتاب مسائل السلوک من کلام الملک جو علیحدہ ۵ روپیے کو ملتی ہے مکمل اس تفسیر کے حاشیہ پر چڑھا دی گئی ہے پہلے جبکہ یہ اتنی مکمل بھی نہ تھی اور نہ کوئی اور کتاب اس کے حاشیہ پر تھی اسکی قیمت بیس روپے تھی اس مکمل ایڈیشن کی قیمت سولہ روپے ہے اور ہمارے یہاں سے اس وقت آپ پندرہ روپے میں منگوا سکتے ہیں۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر وپبلشر نے بریلی الکٹرک پریس بریلی میں چھپوا کر دفتر الفرقان بریلی سے شایع کیا)

چندہ سالانہ
قسم اول
تین روپے
(۳ ٹے)

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان بریلی

ممالک غیر سے
قسم اول
سات شلنگ
پیشگی

جلد ۱۰ | بابت ماہ جمادی الاخرہ سنہ ۱۳۵۹ھ | نمبر ۶

آپ کے فائدے کی خاص بات

"مکتبۂ الفرقان" کی طرف سے ماہ شعبان و رمضان کے لیئے خاص اور غیر معمولی رعایت کا جو اعلان ہمیشہ ہوا کرتا ہے امسال بھی وہ آئندہ اشاعت میں پوری تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا اور اس کے مطابق رعایتی فہرست بھی شایع ہوگی لیکن اگر آپ اس کی اشاعت سے پہلے بھی فرمایش بھیجیں گے تو بھی یکم شعبان سے آپ کے ساتھ وہی رعایت کی جائے گی، اُمید ہے کہ سال میں ایک ہی مرتبہ آنے والے اس زرّیں موقع سے فائدہ اُٹھا کر "الفرقان" کو بھی آپ فائدہ پہنچائینگے۔

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے بریلی الکٹرک پریس بریلی میں چھپوا کر دفتر الفرقان بریلی سے شایع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

گزشتہ تین مہینے!

مولوی عطاء اللہ صاحب کی رخصت اور میری علالت

صفر و ربیع الاوّل کے مشترک پرچہ میں "نگاہِ اوّلیں" ہی کے ذیل میں لکھا گیا تھا کہ
"الفرقان" کی اشاعت کو پابند وقت کرنے کیلئے بارہا کوشش کی گئی اور اکثر
ایسا ہوا کہ جب کامیابی قریب نظر آئی تو اچانک کوئی ایسی مشکل پیش آگئی کہ
جس نے ساری کوشش کو بیکار کر دیا۔"

معلوم ہوتا ہے غریب "الفرقان" کیلئے قضا و قدر کا یہ مستقل فیصلہ ہے اُس وقت جو مشکل پیش آئی تھی اُس کا اجمالی تذکرہ اُسی پرچہ میں کر دیا گیا تھا اُس کے بعد کے تین مہینوں کی مختصر روداد یہ ہے:-

صفر و ربیع الاوّل کے اُس مشترک پرچہ کی تیاری سے فراغت کے بعد سوچا تھا کہ جس طرح بھی ہو ایک ایک مہینے میں دو دو پرچے نکال کر زیادہ سے زیادہ جمادی الاخریٰ تک نظام اشاعت کو درست کر دیا جائے۔ اور پھر ہر مہینے کا پرچہ کم از کم اُس مہینے کے اندر نکلنے لگے، اسی حساب سے پوری تیز رفتاری سے کام کیا جا رہا تھا کہ اچانک ۸ رجون کو مولوی محمد عطاء اللہ صاحب قاسمی بہاری (ناظم الفرقان) کے مکان سے ان کے جوان بھائی کے انتقال کی خبر آئی[1] اور وہ فوراً ہی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہاں پہونچنے کے چند دنوں بعد ان کی بڑی بہن اُن کے سامنے ہی رحلت کر گئیں[2]۔ انکے علاوہ اور بھی بعض جزوی حوادث ایسے پیش آئے جنکی وجہ سے وہ اب تک کہ اگست ختم ہو رہا ہے واپس نہیں آسکے اور حالات اس قسم کے ہیں کہ اب اُن کی واپسی کی اُس

---

[1] اللّٰہم اغفرلہ وارحمہ ۱۲　　[2] اللّٰہم اغفرلہما وارحمہما ۱۲

بھی ٹوٹتی جا رہی ہے۔

موصوف کے اس طرح اچانک چلے جانے کے بعد "الفرقان" کی تیاری اور ترتیب کے علاوہ "دفتر الفرقان" اور "مکتبہ الفرقان" کی نظامت یا منیجری کا بار بھی بلا شرکتِ غیرے مجھ پر ہی پڑ گیا بلکہ چپراسگری کا بھی (کیونکہ عدم گنجائش کی وجہ سے ایک عرصہ سے دفتر الفرقان میں چپراسی بھی نہیں ہے) اور "دفتر" اور "مکتبہ" کا یہ کام ایسا ہے کہ اس کے جھمیلوں سے کسی دوسرے کام کے لیئے چند لمحوں کی فرصت نکالنا بھی مشکل ہے خصوصاً اس لیئے کہ ایک مدت سے ان کاموں کی عادت بھی نہیں رہی ہے ــــ لیکن بہرحال یہ مصیبت آپڑی تو اس کو جھیلنا ہی پڑا اور ان دفتری کاموں کے ساتھ ساتھ بعونہ تعالےٰ رسالہ کی تیاری اور ترتیب کا کام بھی اچھی خاصی رفتار سے ہوتا رہا۔ ربیع الثانی کے پرچہ کی تیاری میں تو ضرور کچھ دیر لگی لیکن اس کے بعد جمادی الاولےٰ اور جمادی الآخری کے پرچے بہت جلدی مرتب کر لیئے گئے اور جولائی کے آخری ہفتہ میں ان دونوں رسالوں کی کتابت بھی مکمل ہو گئی صرف جمادی الاخریٰ کے ابتدائی ۸ صفحے کتابت سے رہ گئے تھے ۲۵ جولائی کو دونوں رسالوں کی تیار شدہ کاپیاں لے کر طباعت کے انتظام کے لیئے میں خود دہلی گیا ــــ یہاں سے ایک معمولی سی تکلیف پاؤں میں لے کر گیا تھا، لیکن وہاں پہونچتے ہی اُس نے شدت اختیار کر لی اور ایسی شدت کہ میں نقل و حرکت کے لائق بھی نہیں رہا، مجبوراً رسالہ کی طباعت کا انتظام کیئے بغیر ہی واپس آنا پڑا، یہاں آکر تکلیف برابر بڑھتی گئی اور زخم نے خطرناک صورت اختیار کر لی تا آنکہ دوسری اگست کو آپریشن ہوا آج اس آپریشن کو چوبیسواں دن ہے اور تکلیف کے اس سلسلہ کو شروع ہوئے پورا ایک مہینہ گزر چکا ہے زخم اب بفضلہ تعالےٰ قریب قریب اچھا ہو چکا ہے اور کل سے لکڑی کے سہارے دو چار قدم چل بھی لیتا ہوں اور آج پہلے دن رسالہ کے واسطے یہ سطور لکھنے کیلئے قلم ہاتھ میں لیا ہوں والحمد للہ علیٰ کل حال،

اس ایک مہینے میں چونکہ رسالہ کا کچھ کام نہ ہو سکا اس لیئے وہ سوچا ہوا سارا پروگرام غلط ہو گیا اور قضاء قدر کے فیصلہ نے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ سچ کہا کہنے والے نے۔

مَا کُلُّ مَا یَتَمَنَّی الْمَرْءُ یُدْرِکُہٗ
وَتَجْرِی الرِّیَاحُ بِمَا لَا تَشْتَہِی السُّفُنُ

اگر یہ اتفاقی حوادث پیش نہ آجاتے تو جمادی الاخری کا یہ پرچہ جمادی الاخری ہی میں ناظرین کے پاس پہونچ چکا ہوتا جو اب غالباً آخر رجب یا شروع شعبان میں پہونچ سکے گا۔

وہ تو خدا بھلا کرے میرے قدیمی کرمفرما دوست مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی اور مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کا ان حضرات کی کوششوں سے کسی طرح جمادی الاولیٰ کا پرچہ تیار ہوکر روانہ ہوگیا، ورنہ اگر ان حضرات کی عنایات نہ ہوتیں تو وہ بھی کہیں شعبان میں شایع ہو سکتا۔

البتہ اس پرچہ کے پروف کی تصحیح نہیں ہوسکی جس کی وجہ سے اس میں بعض بہت ہی فاحش غلطیاں بھی رہ گئیں جن میں سے بعض یہاں درج بھی کی جاتی ہیں تاکہ ناظرین کرام تصحیح کرسکیں۔

جمادی الاولیٰ کے پرچہ کی چند فاحش غلطیاں:-

مثلاً صفحہ ۹ سطر ۱۳ میں "ناگزیر" کے بجائے "ناگزیدہ" اور صفحہ ۲۳ سطر ۱۱ میں "ہدفے" کی جگہ "ہدنے" اور صفحہ ۴۰ سطر ۱۲ میں "وگر می باید" کی جگہ "وگرہی باید" چھپ گیا ہے۔ اور مثلاً صفحہ ۴۴ پر حدیث نمبر ۱۵۰ کو پورے ایک جملہ "ودعا بمعوذین فلبسہما" کا ترجمہ ہی رہ گیا ہے (اگرچہ اسکی وجہ سے حدیث کے مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ جملہ معترضہ سا ہے) نیز اسی حدیث کے ترجمہ میں صفحہ ۴۵ کی پہلی سطر میں "تنہائی" کا لفظ زیادہ چھپ گیا ہے اور صفحہ ۴۸ کے ختم پر میرے نام سے پہلے "فقیر" کی جگہ "فغیر" چھپ گیا ہے جو محض مہمل ہے۔ اور صفحہ ۴۹ سطر ۱۲ میں تو اثبات و نفی کا فرق ہوگیا ہے، اصل عبارت اس طرح تھی "ہر فی نسخہ سے زیادہ انشاءاللہ لاگت نہ آئیگی" اور اسکے بجائے چھپ گیا ہے "لاگت آئیگی"۔

یہ چند موٹی موٹی غلطیاں ہیں جو ایک سرسری نظر میں سامنے آگئیں انکے علاوہ معمولی قسم کی اور بھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں لیکن عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ سب کچھ میری علالت کی وجہ سے ہوا یہی غنیمت ہے کہ دوستوں کی توجہ اور محنت سے کسی طرح پرچہ تیار ہوکر روانہ ہوگیا ورنہ اگر میں اپنی صحت کا انتظار کرتا تو ابتک وہ چھپ بھی نہ سکا ہوتا۔

خود یہ پرچہ جمادی الاخریٰ کا جو آپ کے زیر نظر ہے اس کی ابتدائی ۸ صفحے کے علاوہ باقی ۴۸ صفحے میری علالت کے دوران ہی میں چھپے ہیں، اور اس لیئے اس کی تصحیح بھی میں نہیں کرسکا ہوں لیکن الحمدللہ اُن میں ایسی فاحش غلطیاں نہیں ہیں۔

"دُنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا"۔

اس عنوان کے ماتحت استاذی المحترم حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی کا جو مضمون عرصہ دراز سے مسلسل شایع ہو رہا تھا اور قریباً ڈیڑھ سال سے اس کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، اب بحمداللہ اس اشاعت سے پھر وہ سلسلہ شروع ہو رہا ہے، چونکہ اس انقطاع کے متعلق خود حضرت مولانا نے کافی معذرت فرمائی ہے، اس لیئے اس بارہ میں مجھے کچھ عرض کرنیکی ضرورت نہیں رہی ہاں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ آئندہ یہ سلسلہ بلا انقطاع جاری رہ سکے۔

"ولی اللہ نمبر"

ربیع الثانی کے پرچہ میں "ولی اللہ نمبر"، کی اشاعت کیلئے شعبان کا اعلان کیا گیا تھا مگر مذکورہ صدر حوادث بالخصوص میری طویل علالت نے سارا پروگرام ہی درہم برہم کر دیا اس لیئے اب بجائے شعبان کی وہ انشاء اللہ آخر رمضان تک تیار ہو سکے گا، اور توقع ہے کہ اس کے ملاحظہ سے ناظرین کی اُس ساری کوفت کی تلافی ہو جائیگی جو رسالہ کی اشاعتی بدنظمی اور دوسری کوتاہیوں کی وجہ سے اس تمام سال میں ان کو اُٹھانی پڑی ہے۔

اس نمبر کے جن مضامین کا پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے ان کے علاوہ تین اہم مضمون اس عرصہ میں اور موصول ہوئے ہیں ایک مولٰنا محمد یوسف صاحب بنوّری کا جس کا عنوان ہے "امام ولی اللہ اور حنفیت" دوسرا مولٰنا سعید احمد صاحب اکبر آبادی (ایم۔ اے) اڈیٹر رسالہ "برہان دہلی" کا جس کا عنوان ہے "انقلابی یا مجدد؟"، اور تیسرا مولٰنا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی کا جس کا عنوان ہے "شاہ صاحب کا ایک علمی ماخذ"۔

ان کے علاوہ اب باہر سے آنے والے صرف دو تین خاص مقالوں کا اور انتظار ہے جو انشاء اللہ آخر رجب تک آجائینگے۔

شاہ صاحبؒ کی کوئی خاص قابل یادگار اور نادر نشانی،

اگر کسی صاحب کے علم میں کہیں ہو تو براہ کرم وہ مطلع فرمائیں تاکہ اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی سعی کی جائے یا اگر وہ فوٹو کے قابل ہو تو اس کا فوٹو حاصل کر کے نمبر میں شامل کیا جا سکے جو صاحب اس سلسلہ میں کوئی اطلاع دینگے یا کسی قسم کی مدد فرمائیں گے ان کا تذکرہ شکریہ کے ساتھ نمبر میں بھی کیا جائے گا۔

نمبر کے مضامین کی پوری فہرست مع مختصر تعارف کے انشاء اللہ رجب کے پرچہ میں درج کیجائیگی اور اب نمبر سے پہلے صرف وہی ایک پرچہ شایع ہوگا، ناظرین کرام بھی دعا فرمائیں کہ حق تعالےٰ ان سب ارادوں کو پورا کرا دے۔ وما ھو علیہ بعزیز۔

بے دین کی بزدلانہ چالبازی

در کفر ہم ثابت نئی زنّار را رسوا مکن

رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر نیاز صاحب فتح پوری نے جون کے نگار میں "قرآن پاک" کے "کلام الٰہی" اور "الہام ربّانی" ہونے سے صاف انکار کرکے اپنے مرتد یا منافق ہونے کا جو اعلان کیا تھا، ملّت کے ہر طبقہ کی طرف سے جب اس پر پھٹکار پڑی اور "نگار" کے مقاطعہ کی تحریک جا بجا شروع ہوئی اور "نگار خانہ" کے کاروبار کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تو نیاز صاحب نے کمال "دلاوری" کے ساتھ (غالباً "نگار" کے مسلمان خریداروں کو بھی راضی رکھنے کے لیے) اگست کے پرچہ میں اصل مبحث سے کترا کر مسئلہ خلق قرآن سے متعلق اہلسنت و معتزلہ کی قدیم کلامی مباحث کے دامن میں پناہ لینے کی بزدلانہ کوشش کی ہے اور صفحہ ۵ و ۶ پر علمار کرام کو مخاطب کرکے دس سوال بھی کیے ہیں جن میں سے بعض تو اس قدر جاہلانہ ہیں کہ عربی زبان اور اسلامی علوم سے قطعاً ناواقف اور نابلد سوامی دیانند یا اُن کے چیلوں کے زبان و قلم سے نکلنے چاہیئے تھے پاگل چکے ہیں اور بعض جو قابل توجہ ہیں اُن کا تعلق اشاعرہ اور معتزلہ کے اُس مشہور اور قدیم اختلاف سے ہے جس کا تفصیلی ذکر کتب تاریخ اور کتب کلام میں آج بھی موجود ہے۔

لیکن جس شخص کو معمولی سے بھی اسلامی معلومات ہوں وہ سمجھ سکتا ہے کہ ان سوالات اور ان مباحث کا نیاز صاحب کے موجودہ "قضیئے" اور اُن کے اس "خالص کافرانہ عقیدہ" سے کوئی تعلق نہیں جس کا اظہار پوری بے باکی کے ساتھ انھوں نے جون کے "نگار" میں کیا تھا وہاں اُن کے صاف الفاظ یہ تھے:۔

"کلام مجید کو میں نہ کلام الٰہی سمجھتا ہوں نہ الہامِ ربّانی بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں"

اور ساتھ ہی اس کی ایک "جاہلانہ دلیل" بھی یہ لکھی تھی کہ

"کلام کا مفہوم اس وقت تک متعین نہیں ہوسکتا جب تک نطق اس سے متعلق نہ ہو اور نطق نام ہے مخصوص عضلات کی حرکت کا اسلیئے اگر ہم خدا سے کسی کلام کو منسوب کریں گے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے لیئے نطق بھی لازم ہوگا جس کا تعلق یکسر

مادیات سے ہے ۔[۵]"

اور اس سے بھی زیادہ جاہلانہ "دوسری دلیل" یہ لکھی تھی کہ

"صرف اہلِ عرب کی زبان میں اپنا کلام نازل کرنا اور تمام دنیا کے انسانوں کو مجبور کرنا کہ وہ اسے سمجھیں اور کلامِ ربانی قرار دیں کسی طرح قرینِ انصاف نہیں قرار دیا جاسکتا"

پھر اس ظالم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "قصص قرآن" کے متعلق (جن پر قرآن پاک کا اکثری حصہ مشتمل ہے) یہ بھی لکھ ڈالا کہ

"کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے کی وجہ سے صحیح کہا جاسکتا ہے عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت اور انجیل کے حوالہ سے لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کے لیے یہود و نصاری کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قایم تھا اس لیے رسول اللہ نے اُن کو اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط"

ان عبارات سے صاف ظاہر ہے کہ نیاز کے نزدیک

(۱) قرآن پاک کلام الٰہی اور الہامِ ربانی نہیں ہے بلکہ وہ ایک انسان کا کلام ہے۔

(۲) اسکو کلام الٰہی قرار دینا معاذ اللہ خدا کے لیے مادی عضلات ثابت کرنا ہے

(۳) نیز اسمیں اُن لوگوں کے ساتھ بے انصافی ہے جنکی زبان عربی نہیں ہے

(۴) قصص قرآن کی حیثیت تاریخی نہیں ہے اور نہ انکو صحیح ہی کہا جاسکتا ہے بلکہ عہد نبوی میں یہ قصے یہود و نصاریٰ عام طور سے بیان کرتے تھے انہی سے سُن سُنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح قرآن میں درج کر دیے اب خواہ غلط ہوں یا صحیح" یہ ہے نیاز کا اصلی جرم جسکی وجہ سے ہم اسکو مرتد یا منافق کہتے ہیں اب اس چیز سے کترا کر مسئلہ "خلق قرآن" یا صفت کلام کے قدم و حدوث کے کلامی مباحث میں بحث کو اُلجھانے کی کوشش کرنا انتہائی بزدلی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص صرف مرتد یا منافق ہی نہیں ہے بلکہ نہایت چھچھورا کم ہمت اور پست فطرت بھی ہے۔

غلط مبحث کرنیکے لیے نیاز نے "علماء کرام" سے جو دس سوال کیے ہیں ہمارے نزدیک اس بحث کی ذیل میں ان کا جواب دینا اس کی مُراد کو پورا کر دینا اور اُسے غلط مبحث کا موقع دیدینا ہے اس لیے اس وقت ہم نے اُنسے تعرض کرنا مناسب نہیں سمجھا، انشاء اللہ آئندہ کسی قریبی فرصت میں اُنکا جواب مستقلاً دیا جائے گا۔ واللہ الموفق و ھو المعین۔

---

[۵] یہ ہے جہالت اس مدعی علم کی کہ یہ خدا کی صفت کلام کیلیے عضلات اور انکی حرکات کو بھی ضروری سمجھتا ہے گویا اسکے نزدیک اگر خدا متکلم ہو سکتا ہے تو انہی آلات کے ذریعہ جن سے ہم کلام کرتے ہیں، ۔۔۔ اگر یہی قیاس ہے تو پھر خدا کی سمیع و بصیر و حی ہونے کا بھی انکار کرنا چاہیے کیا اسکی "حی" کو مستلزم حیات (جسکے لیے ضروری ہے کہ جسم ہو) نعوذ باللہ۔ مادۃ والنفس الخ

از

تازہ رشحات حضرت نکہت شاہجہانپوری انجمن اسلام بمبئی

(۱)

اے آنکہ باسلام بنازی بشنو! وز فکر و فسوں زمانہ سازی بشنو!
قرآں بزبان و در دلت گاؤ خر واللہ بریش خود بازی بشنو!

(۲)

از گفتن آب تشنہ کامی نہ رود بے سعی عمل ذوق غلامی نہ رود
مصحف خوانی و بے خبر از مغزش ایں راہ تو منزل و مقامی نہ رود

(۳)

قرآں کہ در بزم ظہور آمدہ است سرمایہ نور و صد سرور آمدہ است
بر چشمۂ آفتاب چشمت نہ رسد ایں دیدہ بینائی تو کور آمدہ است

(۴)

درخشاں آفتاب و ماہ تاب است بہار برق و باراں و سحاب است
زریں نقش و نگار باغِ فطرت ہزاراں جلوۂ ام الکتاب است

(۵)

فریاد ز نیرنگیٔ دنیائے دنی فریاد ز بدبختی قلاش و غنی
نے جسم براحت و نی جاں با سکوں قرآں بخدا نہ بود بگذاشتنی

(۶)

نکہت نہ حدیث بزم فانی گوید رمزے ز رموز زندگانی گوید
تا کے بہ طلسم رنگ و بوے نازی مصحف ز حیات جاودانی گوید

مَوعِظۃٌ وذِکریٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات

[اس سلسلہ میں رحم، عفو و درگزر، احسان، سخاوت اور فیاضی۔ رفق و لطف، حلم، فروتنی و خاکساری، عزتِ نفس اور خود داری، کے متعلق ہم آپ کی کچھ تعلیمات گزشتہ صحبت میں پیش کر چکے ہیں آج اس کا بقیہ ملاحظہ ہو]

استغناء و قناعت یعنی دل کی بے نیازی اور اپنے مقسوم پر قلبی اطمینان یہ دونوں بھی بڑی محمود خصلتیں ہیں جن کی وجہ سے انسان خود بھی راحت اور قلبی طمانیت کی نعمت سے ہمکنار رہتا ہے اور دوسروں کی تکلیف کا باعث بھی نہیں بنتا، نیز عزتِ نفس اور خودداری کا شریف جذبہ بھی ان خصلتوں ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ان پر بھی خاص زور دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:-

وَلَا تتمنو ما فضل اللہ بہ بعضکم علیٰ بعض ط (نساء)	اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہو اس کی ہوس مت کرو۔

ایک دوسری آیت میں ہے :-

ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم ( )	اور ہم نے جو سامان طرح طرح کے لوگوں کو دے رکھا ہے اس کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھو۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے استغناء کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔

ومن یستغن یغنہ اللہ (ک)	اور جو استغناء و بے نیازی چاہے گا خدا اُسے مستغنی اور بے نیاز کر دے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے فرمایا:۔

"خوشخبری ہو اُس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اُس کی روزی ضرورت کے مطابق ہو اور اللہ نے اس کو اس پر قانع بنا دیا ہے۔" (سیرت النبی جلد ششم ۳۷۹ بحوالہ زوائد صحیح ابن حبان)

اس کے برعکس حرص و ہوس اور طمع و طول امل کی اسلامی تعلیمات میں سخت مذمت کی گئی ہے اور ان بُری خصلتوں سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی گئی ہے، قرآن پاک ہی میں ارشاد ہے:۔

ومن یوق شحّ نفسہ فاولٰئک ہم المفلحون۔ (احزاب)	اور جو لوگ حرص نفس سے محفوظ رہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اتقوا الشحّ فان الشح اھلک من کان قبلکم حملھم علی ان سفکوا دماءھم واستحلّوا محارمھم الحدیث (مسلم)	خبردار حرص و ہوس سے بچے رہنا اُس نے تم سے پہلوں کو برباد کیا ہے اس نے اُن کو اس پر آمادہ کیا کہ انھوں نے آپس میں خونریزیاں کیں اور حرام باتوں کو حلال کر ڈالا۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے:۔

لا یجتمع الشح والایمان فی قلب عبدٍ ابداً (ادب المفرد)	حرص و ہوس اور ایمان کسی بندے کے دل میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

سچائی پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں جن خصائل کے اختیار کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، اُن میں سے ایک صدق کا التزام یعنی دوامًا سچ بولنا بھی ہے، قرآن پاک میں نہ صرف ہمیشہ سچ بولنے ہی کی تاکید کی گئی ہے بلکہ یہ بھی حکم ہے کہ تمہاری سوسائٹی بھی سچی ہو، تمہارے دوست احباب بھی سچے ہوں۔ ارشاد ہے:۔

یا ایہا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصٰدقین ط

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اور صرف سچّوں کے ساتھ رہو۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اپنے صحابہ سے فرمایا۔

من سرہ ان یحب اللہ ورسولہ او یحبہ اللہ ورسولہ فلیصدق حدیثہ اذا حدث (الحدیث)

جس کی خوشی یہ ہو کہ وہ اللہ اور رسول سے محبّت کرے یا خدا ورسول اس سے محبت کریں تو وہ جب بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے۔

ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

علیکم بالصدق فان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ (الحدیث)

سچائی کو لازم پکڑو کیونکہ سچ بولنا نیکی کی ہدایت کرتا ہے اور نیکی جنت میں پہونچا دیتی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے آپ نے فرمایا،۔

تحروا الصدق وان رأیتم فیہ الھلکۃ فان فیہ النجاۃ واجتنبوا الکذب وان رأیتم فیہ النجاۃ فان فیہ الھلکۃ (ک)

سچائی کو اختیار کرو اگرچہ تمہیں اس میں ہلاکت نظر آئے اس لئے کہ نجات سچائی ہی میں ہے اور جھوٹ سے پرہیز کرو اگرچہ بظاہر اُس میں نجات نظر آئے کیونکہ انجام کار اسمیں ہلاکت ہوتی ہے۔

محمدی تعلیم میں سچائی کی زبردست تاکیدوں کے ساتھ ساتھ جھوٹ سے پرہیز کرنے کی بھی سخت ہدایتیں فرمائی گئی ہیں. قرآن پاک میں ایک جگہ تو جھوٹ کو شرک جیسی عظیم ترین معصیت کے ساتھ ملادیا گیا ہے۔ فرمایا گیا:

فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور ط

بتوں کی ناپاکی سے الگ رہو اور دروغ گوئی سے کامل پرہیز کرو۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے منافق آدمی کی چند خاص علامتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک علامت اُن میں یہ بھی بتلائی کہ "اذا حدث کذب"، (جب بات کرے تو جھوٹ بولے)

ایک اور حدیث میں ہے آپ سے سوال کیا گیا کیا مومن بُزدل ہوسکتا ہے، فرمایا ہاں ہوسکتا ہے، پھر دریافت کیا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں ہوسکتا ہے۔ پھر پوچھا گیا "ایکون المومن کذابا؟ قال لا" (مشکوٰۃ) کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے فرمایا نہیں"

عہد کی پابندی یہ بھی سچائی ہی کا ایک شعبہ ہے کہ جو عہد کسی سے کیا جائے اسکو پورا کیا جائے، قرآن پاک نے اس کی تاکید اس بلیغ انداز میں کی ہے:۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل)	اور عہد کو پورا کرو، یقیناً (قیامت میں تم سے) عہد کے متعلق بازپرس ہوگی۔

ایک دوسری جگہ حقیقی نیکیوں اور نیکوں کے تذکرہ میں فرمایا گیا ہے:۔

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا (بقرہ)	اور وہ لوگ (بھی نیک ہیں) جو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں جب عہد کریں۔

حدیث میں ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

اضمنوا لی ستاً اضمن لکم الجنۃ اصدقوا اذا حدثتم واوفوا اذا وعدتم وادّوا اذا ائتمنتم واحفظوا فروجکم وغضوا ابصارکم وکفوا ایدیکم (مشکوٰۃ)	تم چھ باتوں کی ذمہ داری لے لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں، جب بات کرو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو اسے پورا کرو، جب کوئی امانت تمہاری سپرد کی جائے تو اس کو ادا کرو، اپنی شرمگاہوں کو بدکاری سے محفوظ رکھو، اپنی نگاہیں نیچی رکھو اور اپنے ہاتھ سے کسی کو آزار نہ پہونچاؤ،

ایک طرف تو عہد کی پابندی کیلئے یہ ترغیب و تاکید فرمائی گئی اور دوسری طرف بدعہدوں کے متعلق فرمایا گیا

لا دین لمن لا عہد لہ (جمع الفوائد)	جس میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

ایک اور حدیث میں منافق کی نشانیاں بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔ اذا عاھد غدر (وہ جب عہد کرتا ہے تو اس کو توڑتا ہی) اور ایک روایت میں ہے:۔ "اذا وعد اخلف" (جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے)

امانت داری اس کی بارہ میں قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا	اللہ تمکو حکم دیتا ہی کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دو۔

جو لوگ آخرت میں فلاح یاب ہوں گے اور خدا جن سے راضی ہو انکا ایک صفت قرآن پاک میں یہ بھی بتلایا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (مومنون ۱۶)	اور وہ جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا پاس رکھنے والے ہیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں اس اخلاقی وصف (امانت) کا کیا مقام ہے اور اس کو کیا اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ ذیل کی حدیث سے فرمائیے۔

لا تنظروا الیٰ صلوٰۃ احد و لا الیٰ صیامہ ولکن انظروا الیٰ من اذا حدث صدق و اذا اؤتمن ادّیٰ و اذا اشفیٰ ورع۔ (کنز العمال)

کسی کے زیادہ نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کی طرف نظر نکرو (یعنی انسان کی نیکوکاری اور مقبولیت کیلئے صرف یہی کافی نہیں ہی) بلکہ یہ دیکھو کہ جب بات کرتا ہی تو سچ بولتا ہی۔ اور جب تکلیف اور مشقت میں پڑتا ہی جب بھی پرہیزگاری پر قائم رہتا ہی۔

یہ تو تھی امانت کی تاکید اور اسکی اہمیت کا بیان، اب فرازبان رسالت سے اُن لوگوں کا حال بھی سنئے جو اس وصف امانت سے محروم ہیں ارشاد ہی:۔

لا ایمان لمن لا امانۃ لہ و لا دین لمن لا عہد لہ (جمع)

جس میں امانت نہیں اُس میں ایمان بھی نہیں اور جسکو عہد کا پاس نہیں اُس کا دین ہی نہیں۔

جس حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے منافق کی چند نشانیاں بیان فرمائی ہیں اُس میں ایک نشانی یہ بھی بتلائی ہے کہ "اذا اؤتمن خان" جب امانت اُس کے سپرد کی جائے تو وہ اسمیں خیانت کرتا ہی

یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی تعلیمات میں امانت کا مفہوم ودائع تک محدود نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ جس شخص سے متعلق جو کام کیا گیا ہو اس کی کما حقہ ادائگی کا نام اسلام میں امانت ہے اور اس میں کوتاہی، بددیانتی اور خیانت ہے اس طور پر فرائض الٰہیہ کی بجا آوری میں کوتاہی بھی خیانت ہی ـــــ معاملات میں دیانتداری اور راستبازی بھی امانت ہی کا ایک شعبہ ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی معاملہ میں تم پر اعتماد کر کے تم سے مشورہ لے تو اوسکی بات کو اپنے ہی تک رکھنا اور اپنی عقل وفہم کی حد تک اُس کو صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "المستشار موتمن" (یعنی جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے اور اسکو سمجھنا چاہیئے کہ اسکے سپرد ایک امانت کی گئی ہی)۔ ایسے ہی اگر کسی مجلس میں آپ شریک ہوں اور وہاں کوئی خاص بات آپکے سننے میں آئی تو اسکو اپنے ہی تک رکھنا اور باہر نہ پھیلانا بھی امانت ہی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "المجالس بالامانۃ"

علیٰ ہذا کسی کی کوئی راز کی بات آپ کو معلوم ہو تو وہ بھی آپکے پاس امانت ہی اور اس کا افشا خیانت اور معصیت ہی

حتیٰ کہ اگر اُس شخص نے زبانی طور پر اُس کے اخفار کی ہدایت بھی نہ کی ہو لیکن کسی طرح آپکو معلوم ہو جائے کہ اسکو پوشیدہ رکھنے میں اسکی مصلحت ہے اور وہ اس کا اخفا چاہتا ہو تب اُس کا پوشیدہ رکھنا آپ کا فرض ہو جاتا ہو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

اذا حدث رجلٌ رجلاً بحدیث ثم التفت فھو امانۃٌ (جمع الفوائد)	جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور احتیاطاً ادھر اُدھر دیکھتا جائے تو اس سُننے والے شخص کے پاس وہ بات اسکی امانت ہے

اسلام میں امانت کے مفہوم کی اس وسعت کو پیش نظر رکھیے اور پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پھر یاد کیجئے

الا لا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ	خبردار جس میں امانت نہیں اسکا ایمان بھی نہیں۔

نعوذ باللہ من الخیانۃ فانھا بئست البطانۃ

عدل و انصاف

اخلاقی تعلیمات میں عدل و انصاف کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو، اور یہ حقیقت ہو کہ نظم عالم کے بقا اور دنیا کے امن و امان کیلئے سب سے زیادہ ضرورت اسی وصف کی ہے۔۔ حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس پر کس قدر زور دیا گیا ہو اس کا اندازہ آپکی لائی ہوئی کتاب مقدس کی ان چند آیات سے کیجئے :-

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (الآیۃ) اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا، وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ، اِنَّ اللّٰہَ نِعِمَّا یَعِظُکُمْ بِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ہ (نساء)	اللہ تعالےٰ تم کو عدل و انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہو۔ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو انکی امانتیں ادا کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو، اللہ تمکو بہتر نصیحت کرتا ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ دیکھنے سُننے والا ہو۔

عدل و انصاف سے پھیر نیوالی ایک موثر چیز قرابت ہو سکتی ہے اور ہوتی ہو اسلئے قرآن نے صاف کہا ہو

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (انعام)	اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو اگرچہ ذریق مقدمہ تمہارا کوئی عزیز قریب ہی کیوں نہ ہو۔

عدل کی شاہراہ سے قدموں کو ڈگمگا دینے والی بڑی زبردست چیز کسی کی عداوت اور خاصکر قومی عداوت ہو سکتی ہو اور ہوتی ہو۔ غیر مہذبوں اور جاہلوں کا تو ذکر ہی کیا ہو آج بہت سے علم و تہذیب کے مدعی بھی قومی عناد و تعصب سے متاثر ہو کر غیر اقوام کے افراد کے مقابلہ میں اپنی قوم والوں کی بہرحال طرفداری کو بڑی نیکی سمجھتے ہیں،

اور جو ایسا نہیں کرتا اُس کو قومی حمیت سے عاری کہا جاتا ہی۔ افسوس! آج اپنی قوم والوں کی حمایت میں غیر قوم والوں کے خلاف عدالتوں میں جھوٹ بولنا جلسوں میں جھوٹ کہنا، اور اخباروں رسالوں میں جھوٹ لکھنا دوسروں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی رواج پاتا جارہا ہی، اور اسکی شناعت و قباحت انکے دلوں سے بھی نکلتی چلی جارہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو واقعہ کے خلاف نہ ہوگا کہ بہت سے مسلمان تو اس کو قومی خدمت اور اپنے مذہب کی حمایت سمجھکر کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ معصیت ہے، اور شدید ترین معصیت، گناہ ہی اور بڑا گناہ، اسلام کی خدمت و حمایت نہیں، بلکہ ظلم ہے اور بہت بڑا ظلم کیونکہ اُن کے اس طرز عمل سے اسلام کے امتیازی وصف اور اسکی معجزانہ تعلیم عدل پر پردہ پڑ رہا ہی۔ اسلامی تعلیم اور قرآنی حکم تو یہ ہی:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ
لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ
عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ط

(مائدہ)

مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ ہو رہو کسی قوم کی عداوت تم کو اس جرم کی ارتکاب پر آمادہ نہ کردے کہ تم اسکے ساتھ انصاف نہ کرو (نہیں ہر ایک کے ساتھ) انصاف کرو کہ شیوہ انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہی اور (اس معاملہ میں و نیز ہر معاملہ میں) اللہ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالی تمہارے سب اعمال و افعال سے باخبر ہی

عدل پر قایم رہنا اُس وقت سب سے زیادہ مشکل ہی جبکہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر پڑتی ہو، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم میں خاص اُس وقت کے لیئے بھی عدل کی زبردست تاکید کیگئی ہی ارشاد ہی:۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ
شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ
وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ
اَوْلٰى بِهِمَا، فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا، وَ
اِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ط (نساع ۲۰)

اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو جاؤ اللہ کیلیئے شاہد بنکر اگرچہ اس میں خود تم پر زد پڑے یا تمہارے ماں باپ یا دیگر قریبی رشتہ داروں کا اس سے نقصان ہوتا ہو، اگر وہ دولتمند یا محتاج ہی تو تم اسکی بھی پروا نہ کرو کیونکہ) اللہ سب سے زیادہ انکا خیر خواہ ہے تو تم انصاف کی راہ میں اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو اگر تم ایچ پیچ سے بات کروگے یا (حق بات کہنے سے) پہلو بچاؤگے تو یقین رکھو کہ اللہ تعالے تمہارے سب اعمال سے واقف ہے (لہذا وہ اس پر تم سے مواخذہ کریگا)

عدل وانصاف اور حق گوئی کی راہ میں اپنی ذات، اپنے ماں باپ اور اپنے اعزہ واقربا کے نقصان کے خیال سے بھی زیادہ خطرناک چیز جو حائل ہوسکتی ہے اور جو اچھے خاصے نیک نیتوں کے قدم بھی اس راہ سے پھسلا دیتی ہے وہ کمزور فریق کی حمایت اور اس کے ساتھ ہمدردی کا خیال ہوتا ہے، فرض کیجئے کہ ایک امیر کبیر اور دولتمند کسی مفلس اور محتاج کے خلاف دعویٰ کرتا ہے کہ جس ٹوٹے پھوٹے مکان یا جھونپڑے میں یہ رہائش رکھتا ہے وہ میری ملکیت ہے اور اس سے وہ خالی کرادیا جائے، محلہ کے لوگوں کو معلوم ہے کہ فی الحقیقت وہ اس رئیس ہی کی ملکیت ہے لیکن اس کے ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے پاس مکانوں بلکہ کوٹھیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور اس جھونپڑے کی اس کو کوئی ضرورت نہیں اور یہ غریب محتاج شخص اگر اس گھر سے بے دخل کردیا گیا تو اس کے پاس بارش اور دھوپ سے بچنے کیلئے بھی کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا اور اس کے بیوی بچے بے گھر ہوکر ٹھوکریں کھائیں گے اس لیئے صرف اس غریب اور کمزور شخص کی ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت وہ اس کے حق میں خلافِ واقعہ گواہی دینے کے لیئے تیار ہوجاتے ہیں، یا فرض کیجئے کہ خود حاکم عدالت کو یہ روداد اسی طرح معلوم ہے اور وہ اس غریب کی ہمدردی ہی کی وجہ سے فیصلہ اس کے حق میں کرتا ہے ——— تو اگرچہ ظاہر پرستوں کے نزدیک اس کا یہ فیصلہ قابلِ تحسین ہو لیکن فی الحقیقت اس حاکم یا اُن گواہوں کا یہ خلاف انصاف اقدام "مقدس فریب" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ——— قرآن پاک کی اس آیت میں کیسی عجیب انداز میں اس فریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے ارشاد ہے کہ

"صاحب معاملہ دولتمند ہو یا مفلس و محتاج، خدا سب سے زیادہ اس کا خیال کرنے والا ہے" لہذا تم کو اس کی امیری غریبی کے خیال سے بے انصافی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یعنی تم خدا سے زیادہ کسی کے خیرخواہ نہیں ہوسکتے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسی قسم کے کسی فریبِ نفس کے ماتحت بعض لوگ ایچ پیچ سے شہادت دیتے ہیں، (یا ہوشیاری کے ساتھ ادا، شہادت سے دامن بچا جاتے ہیں اور مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا (اگرچہ اُن کے اس رویہ سے نتیجہ وہی پیدا ہوتا ہے جو جھوٹی شہادت کا ہوتا) تو قرآن پاک کی اس آیت میں اس "حیلہ بازی" کا بھی قلع قمع کردیا گیا اور صاف فرما دیا گیا:-

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝"

عدل کے متعلق قرآن پاک کی اس بے لاگ تعلیم پر اگر کسی ظاہر بیں کو شبہ ہو کہ اس میں کمزوروں کی کمزوری کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو اُن کو چاہئیے کہ وہ رحم۔ احسان، انفاق اور امداد غرباء کے متعلق اسلام کی وہ تعلیمات پھر دیکھ لیں جو ہم پہلے نقل کر آئے ہیں، اُس سے معلوم ہو سکے گا کہ عادل کو بے لاگ رکھنے والے خدا نے کمزوروں اور غریبوں کی امداد و اعانت کے کتنے دروازے کھولے ہیں، بلکہ دولتمندوں اور بالادستوں کی املاک میں اُن کا کتنا حصہ لازمی مقرر کیا ہے، اور میرے نزدیک آیت مندرجہ بالا کے لفظ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا سے اُن احکام الٰہی کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے

اور فی الحقیقت اس مسئلہ کا صحیح اور حکیمانہ حل صرف یہی ہو بھی سکتا ہے کہ قانون عدل کو بالکل بے لاگ رکھا جائے اور کمزوروں ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے مستقل قوانین بنائے جائیں۔ اور مستقل ابواب مقرر کیے جائیں۔

یہاں تک تو ہوئے "عدل" کے متعلق اسلامی احکام اب عدل کرنیوالوں کا اجر ذیل کی حدیث سے معلوم کیجئے

"اِنَّ المقسطین عند اللّٰه علی منابر من نور..... الذین یعدلون فی حکمهم واهلیهم وما ولوا" (مشکوٰۃ)

انصاف کرنیوالے اللہ کے یہاں نور کے منبروں پر ہوں گے..... وہ لوگ جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے اہل وعیال اور اپنے محکوموں میں پورا عدل انصاف کرتے ہیں۔

عدل کے بارہ میں سب سے زیادہ ذمہ داری بادشاہ وقت پر عائد ہوتی ہے اس لیئے اگر وہ عدل پر مستقیم رہے تو اس کے لیئے اجر بھی غیر معمولی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عادل بادشاہ کے حق میں خوشخبری سُنائی ہے کہ قیامت کے دن جن سات قسم کے لوگوں کو عرش الٰہی کا سایہ نصیب ہوگا اُن میں ایک "سلطان عادل" بھی ہے۔

اور غیر عادل و بے انصاف بادشاہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

اشد الناس عذابًا امام جائر

ظلم و بے انصافی کرنیوالے بادشاہ کو سب لوگوں سے زیادہ عذاب ہوگا۔ (باقی)

عدل وانصاف اور حق گوئی کی راہ میں اپنی ذات، اپنے ماں باپ اور اپنے اعزہ واقربا کے نقصان کے خیال سے بھی زیادہ خطرناک چیز جو حائل ہوسکتی ہے اور جو اچھے خاصے نیک نیتوں کے قدم بھی اس راہ سے پھسلا دیتی ہے وہ کمزور فریق کی حمایت اور اس کے ساتھ ہمدردی کا خیال ہوتا ہے، فرض کیجئے کہ ایک امیر کبیر اور دولتمند کسی مفلس اور محتاج کے خلاف دعویٰ کرتا ہے کہ جس ٹوٹے پھوٹے مکان یا جھونپڑے میں یہ رہائش رکھتا ہے وہ میری ملکیت ہے اور اس سے وہ خالی کرادیا جائے، محلہ کے لوگوں کو معلوم ہے کہ فی الحقیقت وہ اس رئیس ہی کی ملکیت ہے لیکن اس کے ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے پاس مکانوں بلکہ کوٹھیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور اس جھونپڑے کی اس کو کوئی ضرورت نہیں اور یہ غریب محتاج شخص اگر اس گھر سے بے دخل کردیا گیا تو اس کے پاس بارش اور دھوپ سے بچنے کیلئے بھی کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا اور اس کے بیوی بچے بے گھر ہوکر ٹھوکریں کھائیں گے اس لیئے صرف اس غریب اور کمزور شخص کی ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت وہ اس کے حق میں خلافِ واقعہ گواہی دینے کے لیئے تیار ہوجاتے ہیں، یا فرض کیجئے کہ خود حاکم عدالت کو یہ روداد اسی طرح معلوم ہے اور وہ اس غریب کی ہمدردی ہی کی وجہ سے فیصلہ اس کے حق میں کرتا ہے —— تو اگرچہ ظاہر پرستوں کے نزدیک اس کا یہ فیصلہ قابل تحسین ہو لیکن فی الحقیقت اس حاکم یا ان گواہوں کا یہ خلاف انصاف اقدام "مقدس فریب" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا —— قرآن پاک کی اس آیت میں کیسے عجیب انداز میں اس فریب کا پردہ چاک کیا گیا ہے ارشاد ہے کہ

"صاحب معاملہ دولتمند ہو یا مفلس و محتاج، خدا سب سے زیادہ اس کا خیال کرنے والا ہے لہذا تم کو اس کی امیری غریبی کے خیال سے بے انصافی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یعنی تم خدا سے زیادہ کسی کے خیرخواہ نہیں ہوسکتے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسی قسم کے کسی فریبِ نفس کے ماتحت بعض لوگ ایچ پیچ —— شہادت دیتے ہیں، یا ہوشیاری کے ساتھ ادائے شہادت سے دامن بچا جاتے ہیں اور مطمئن ہوتے ہیں کہ ہم نے جھوٹ نہیں بولا (اگرچہ ان کے اس رویہ سے نتیجہ وہی پیدا ہوتا ہے جو جھوٹی شہادت کا ہوتا) تو قرآن پاک کی اس آیت میں اس "حیلہ بازی" کا بھی قلع قمع کردیا گیا اور صاف فرمادیا گیا:-

جنت و جہنم

(از حضرت مولٰنا سید مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی دکن)

پہلے بھی اور پچھلے دنوں میں بھی بعض خاص مغالطوں سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے عربی زبان کے جن الفاظ سے حق تعالےٰ نے جن معلومات کو ادا فرمانا چاہا تھا انھوں نے اُن الفاظ کو تو تسلیم کر لیا، لیکن جب معنی کے سمجھنے کا وقت آیا تو اُنھوں نے خدا کے معلومات کو خدا ہی کے سپرد کر کے خود اپنے یا اپنے جیسے انسانوں کے بافیدہ تخیلات پر اصرار کرنا ضروری خیال کیا۔ پرانے زمانہ میں اخوان الصفا کے مصنفین نے اور ہمارے ملک میں علی گڈھ کے سید صاحب نے اپنی تفسیر میں پادریوں کے اس چیپ فقرہ سے متاثر ہو کر کہ "قرآن کی جنت حیوانی جنت ہے" (خصوصاً اس فقرہ میں چستی اس لیئے اور زیادہ پیدا ہو گئی، کہ پادریوں کے دائرہ سے نکل کر علم و حکمت کے مدعیوں نے بھی ادعار بے تعصبی کے ساتھ اسی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا) تو محکومیت کے گھاؤ سے جن کے سینے مجروح تھے، پوادر سے گزر کر جب اُنھوں نے دیکھا کہ دکانتر کی زبانوں پر بھی یہی فقرہ جاری ہے، یہ بیچارے تلملا اُٹھے، گھبرا کر

مجھے تغیر بھی آتی ہی اپنا مدعا کہیئے!

مرعوبیت کے اختناقی دوروں میں اِن مبتلا ہونیوالوں کی زبان و قلم سے جس قسم کا اول قول نکلتا رہا اُسی کو اپنی کتابوں میں لکھتے چلے گئے۔ ان بندگانِ خدا نے ایک لمحہ کے لیئے اس کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر "غیب" جس کی "ذات" ہی کے متعلق "فلسفہ" شک میں مبتلا ہے اور سائینس جسے اپنے حدود بحث سے خارج سمجھتی ہے پھر اُس کے "صفات" کے متعلق ان علوم کی رہنمائی میں کیا بحث ہو سکتی ہے۔ لیکن صرف یہ اتفاق کہ جس ملک کے باشندوں نے قرآن کی جنت کے متعلق یہ فقرہ تصنیف کیا تھا، اُسی ملک کے ہاتھ میں آج کل "عقلی علوم" کا جھنڈا ہے۔ ان مسکینوں نے سمجھ لیا اور محض اسی اتفاقی واقعہ کی بنیاد پر سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو قرآن کی جنت پہ، نکا یہ اعتراض بھی سائنس ہی کا کوئی مسئلہ یا فلسفہ ہی کا کوئی نظریہ ہے۔

حالانکہ واقعہ کی کل نوعیت یہ تھی کہ صدوقی فرقہ (جس کے متعلق انجیل میں ہے کہ قیامت کے منکر تھے) اس فرقہ کے

ایک مسخرے یہودی نے حضرت مسیح علیہ السلام سے مشہور استہزائی سوال جنت کے متعلق کیا تھا۔ یعنی سات شوہروں سے یکے بعد دیگرے ان کے مرنے کے بعد شادی کرنے والی عورت

قیامت میں ان ساتوں میں سے کس کی بیوی ہوگی؟

کہا جاتا ہے کہ اسی سوال کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا

"قیامت میں شادی بیاہ نہ ہوگی بلکہ لوگ آسمان پر فرشتوں کے مانند ہوں گے"

متی باب ۲۲

لے دے کر انجیل کا یہی فقرہ ہے، جس کی بنا پر عیسائی سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسان انسان باقی نہیں رہتا، بلکہ جیسا کہ بعض مذاہب میں خیال ہے کہ آدمی مرنے کے بعد کبھی گھوڑا، اور کبھی چوہا وغیرہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے نزدیک مرنے کے بعد آدمی فرشتہ ہو جاتا ہے۔ گویا سارے مجاہدات اور ساری قربانیوں کا آدمی کو قدرت کی طرف سے یہ صلہ ملتا ہے کہ انسانیت اور اس کے سارے احساسات چھین لیئے جاتے ہیں۔ یہ سزا بصورت جزا ممکن ہے کہ عیسائیوں کی فطرت کے مطابق ہو، لیکن جو واقعی انسان ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عذاب کو آخر کس طرح برداشت کر سکتے ہیں۔ بالکلیہ سلب ہو جانا تو بڑی بات ہے، آج اگر کسی کے انسانی احساسات میں کسی قسم کی کمی واقع ہوتی ہے تو ڈاکٹروں حکیموں کے دروازوں کی وہ خاک اُڑا دیتا ہے، افریقہ سے بندر منگائے جاتے ہیں اور آدمی کے انسانی احساسات کو زندہ کرنے کے لیئے بندروں کے غدود سے کام لیا جاتا ہے، کروروں روپے کی دوائیں انسانی احساسات کی بیداری کے لیئے خرچ ہو رہی ہیں، جن کے برباد و ضائع کرنے کے لیئے عیسائی عمر بھر نیکیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس عیسائی یا سزائی جنت کا نام "روحانی جنت" رکھا گیا ہے اور ہمارے بدھو میاں" اس خالص عیسائی عقیدے کو سائنس کا کوئی اہم مسئلہ قرار دے کر قرآن کے الفاظ کو ان کے معانی سے اُدھیڑ اُدھیڑ کر دنیا کے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ ہم بھی آخرت کے متعلق ان ہی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ہمارے حکام کا ایمان ہے اور ان چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن سے ہمارے آقاؤں کو انکار رہا۔

علاوہ انجیل کے اس بیان کے چونکہ "عورت" ہی یہودی اور عیسائی مذاہب میں جنت سے نکلنے کی وجہ ہی اور دُنیا کی ساری مصیبتوں، گندگیوں، شرارتوں کا سرچشمہ ہے، اسی لیئے بڑے بڑے پوپوں نے اپنی ماؤں بہنوں کو مجسم شیطان صرف گناہ "مطلق نجاست اور گندگی" قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت جو قُربِ الٰہی کا مقام ہو اس کی

تقدیس کیلئے عورت کا وجود چونکہ ناپاک داغ تھا، اس لئے قرآنی جنت کا جو عنصر سب سے زیادہ عیسائیوں اور عیسائی مزاجوں پر گراں بلکہ انتہا قریب قریب انگارہ کی شکل اختیار کر چکا ہے وہ "حور عین" "ھم و ازواجھم" وغیرہ کے بیانات ہیں جس میں مردوں کے ساتھ جنت میں عورتوں کو بھی فی ظلل علی الارائک متکئون (چھاؤں میں چھپر کھٹوں پر تکیہ لگائے) کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، بلکہ مرد بیٹوں کی جنت کو اسلام میں عورت ماں کے قدموں کے نیچے ڈال دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مذہب اور مذہبی علم و عمل جو انسانیت کی ارتقار و تنزل سے بحث کرنیوالا نظام ہے جیسا کہ ہر علم کی ایک غایت اور غرض ہوتی ہے، اسی طرح اس کی غرض و غایت کو متعین کرتے ہوئے اسلام کہتا ہے کہ جو انسان ہے وہ مذہبی عقائد و اعمال کی راہ سے نہ خدا بنتا ہے، اور نہ گھوڑا، نہ ہاتھی، نہ فرشتہ، اور نہ شیطان، بلکہ انسان بہر حال انسان ہی باقی رہتا ہے، البتہ نامکمل انسان مکمل اور اس کی ناتشفی یافتہ فطرت تشفی کی انتہائی منزلوں تک ارتقار کرتی ہوئی چلی جاتی ہے، اسی لئے قرآن انسان سے انسانی احساسات کے چھن جانے کا نام جنت نہیں رکھتا، بلکہ وہ کہتا ہے کہ آدمی کی آنکھ جو کچھ دیکھنا چاہتی ہی، وہی دکھایا جائے گا، جو کان جو کچھ سننا چاہتے ہیں وہی سنایا جائے گا، زبان جو کچھ چاہتی ہے اس کی تکمیل کی جائے گی۔ الغرض انسان جو در اصل چند احساسات اور خواہشوں کا مجموعہ ہے اس کی تکمیل کی جائے گی اور اس حد تک کی جائے گی جس کی کوئی اجتماعی یا انفرادی نظیر دنیا کے موجودہ نظام میں پائی نہیں جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ ذات کی حد تک عالم آخرت کی دونوں ممالک (الجنۃ والنار) کے متعلق قرآن مجید نے تفصیل کے ساتھ ان کے موسم[۱]، آب و ہوا، دریا، پہاڑ، نباتات، حیوانات سب کا ذکر کیا ہے اور اس لیئے ہم ان ممالک میں بھی ان ساری چیزوں کو مانتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ اس دنیا میں ان چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ہاتھوں سے چھو رہے ہیں، ان مسکینوں کی عقل پر کیا آفت آئی ہے کہ جب دوسری دنیاؤں میں انہیں چیزوں کے ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو عیسائیت زدہ

۱۔ مثلاً لایرون فیہا شمسا ولا زمہریرا (جنت کا موسم)، وظل من یحموم (دھویں کی چھاؤں) جہنم کا موسم، فی سموم (لو)، جہنم کی ہوا وحمیم (آب گرم) گویا جہنم کی آب و ہوا کا یہ بیان ہوا۔ اسی طرح جنت کے عیون اور چشمے، انہار جہنم کے پہاڑ "صعودا" اسی طرح جنات تجری من تحتہا الانہار میں جنتی نباتات "ضریع" "غسلین" زقوم وغیرہ جہنمی نباتات، جہنم کے حشرات مثلاً سانپ بچھو وغیرہ کا ذکر حدیثوں میں ہے اور یحمم طیر میں جنت کی چڑیوں کی تفصیل مفقود نہیں ہے ورنہ قرآن و حدیث سے باضابطہ ان دونوں ممالک کے جمادات نباتات حیوانات آب و ہوا، دریا پہاڑ وغیرہ کی فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔

نظروں میں بلا وجہ انقباض پیدا ہوتا ہے۔ معلوم کا انکار کرتے ہیں اور مجہول پر ایمان لانا چاہتے ہیں، لیکن جب قرآن اس سے آگے بڑھکر ان ہی چیزوں کی صفات کی تفصیل شروع کرتا ہے۔ مثلاً جنت کی بوتلوں کی تیاری ایسے عنصر سے ہوگی جس کی تعبیر قرآن نے قواریر من فضۃ" (شیشے چاندی سے) سے کی ہے، یا وہاں کی نہروں کے پانی کو غیر آسن (نہ سڑنیوالا) قرار دیتا ہے. وہی دودھ جو یہاں تھنوں سے نکل نکلکر بہہ رہا ہے، نہروں میں بہے گا، یا وہی شکر جو یہاں پھولوں کے رس سے شہد کی صورت میں تیار ہوتی ہے، مکھی کے معدے میں نہیں، بلکہ جنت کی فضاؤں میں تیار ہوگی، یا وہاں کے میوہ دار درختوں کے پھل فصلوں اور موسموں کی قید سے آزاد ہوں گے وہ غیر ممنوع (نہ ختم ہونے والے ہوں گے) نہ گھٹنے والے ہوں گے۔

اسی طرح کھانے کے ساتھ قضاء حاجت، پینے کے ساتھ پیشاب کی ضرورت، یا پسینے کی کراہت، شباب کے ساتھ بوڑھاپا، صحت کے ساتھ مرض، زندگی کے ساتھ موت، الغرض دنیا کی ہر مسرت کے پھول کے ساتھ جو کلفت کا کانٹا چھپا ہوا ہے، جب کہا گیا کہ انسانی زندگی جنت میں برائی کے ان پہلوؤں سے پاک ہوگی۔ اسی طرح جہنم کی ناری فضا کو بجائے روشن ہونے کے دھوئیں کی چھاؤں جیسی سیاہ اس کی غذاؤں کو لا یسمن ولا یغنی من جوع (نہ فربہی پیدا ہو نہ بھوک کی تکلیف سے رہائی ہو) اس آگ میں بجائے کوئلہ اور راکھ ہونے کے احساسات کو تیز کرنے کے لیئے تروتازہ کھالیں آدمی میں پیدا ہونگی اور جہنمی نباتات میں اسی کی حرارت سے بالیدگی اور شادابی پیدا ہوگی وغیرہ وغیرہ تفصیلی امور تو یہی لوگ جو معلوم کو چھوڑ کر روحانی جنت" کے مجہول تخیل کی طرف بھاگ رہے تھے، یکایک پلٹ پڑتے ہیں، اور چونکہ اس دنیا میں کوئی چیز ان صفات کے ساتھ موصوف ہوکر ان کے یا ان کے تحقیقی اساتذہ کے علم میں نہیں آئی ہیں اس لیئے چیخ اٹھتے ہیں، ہم اسی پر ایمان لا سکتے ہیں یا لائیں گے جو ہمیں پہلے سے معلوم ہوں۔ ان ذہنی آوارہ گردیوں کا آخر کوئی علاج ہے۔ حالانکہ سیدھی بات یہ تھی کہ حق تعالےٰ نے عربی زبان کے جن الفاظ سے جو علم ہمیں عطا کرنا چاہا ہے ہم ان سے اپنے معلومات میں اضافہ بھی کرتے۔ یعنی جب ہم سے کہا گیا تھا کہ آخرت کے ممالک میں بھی نباتات وجمادات، دریا پہاڑ وغیرہ ہیں تو جو چیزیں ہم دیکھ رہے ہیں ان ہی چیزوں کے ماننے میں ہمیں آخر عذر کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ یہ خیال کہ یہاں تو یہ چیزیں ہوسکتی ہیں اور وہاں نہیں ہوسکتیں۔ یہ یہاں اور وہاں کا فرق کتنا عجیب ہے۔ ایک ایسا آدمی جو اس دنیا میں چند سال ہوئے آیا اور چند ہی سال بعد چلا جائے گا، وہ یہاں اور وہاں کی تقسیم آخر کس بنیاد پر کر رہا ہے۔ اور یہاں جو کچھ ہوسکتا ہے وہاں نہیں ہوسکتا۔ آخر اس قسم کی مضحک منطق

کی بنا کیا ہے۔ بہرحال جو کچھ دکھایا جارہا ہے جب وہی منوایا جاتا تھا تو ماننے کے لیے اس سے زیادہ آسان مطالبہ اور کیا ہوسکتا تھا لیکن چیزوں کی ذات وہی بیان کی گئی تھی جو یہاں ہے، پھر اسی کے صفات ایسے بیان کیئے جارہے ہیں جنھیں نہ کسی کی آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا، نہ کسی دل پہ اس کا خطرہ ہوا مثلاً ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہو، یا ایسا عنصر جس میں شیشہ کی شفافیت اور چاندی کی چمک تو ہو لیکن چاندی کی کثافت اور شیشہ کی بے لوثی کا عیب نہ ہو تو اپنے علم کے اضافہ سے محض اس بنیاد پہ انکار نہ کرنا چاہیئے کہ جو چیز آج نہیں معلوم ہوئی ہے وہ کبھی نہیں ہوسکتی۔ جو درخت یورپ میں بار آور نہیں ہوسکتا وہ ہندوستان میں بھی نہیں پھل سکتا، آخر یہ بھی کوئی منطق ہے۔ قرآن میں ان ہی صفاتی عجائبات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "لا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعين" (نہیں جانتا کوئی جو چھپائی گئی ہے اُس کی آنکھ کی ٹھنڈک) بلکہ میں تو خیال کرتا ہوں کہ جنت کے ہر لمحہ میں جن عجیب صفات کا ظہور ہوگا وہ اپنے پہلے لمحہ سے مختلف ہوگا آیت قرآنی کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا قالوا هذا الذی رزقنا من قبل" (جب دیئے جائیں گے پھل اُن جنتیوں کو تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہمیں پہلے دیا گیا تھا) یعنی ذات تو اُن پھلوں کی وہ ہی ہوگی جو اُنھیں دنیا میں یا جنت میں پہلے ملی تھی، مثلاً وہ آم ہی ہوگا یا سیب ہی ہوگا وغیرہ، لیکن صفاتی طور پر "اوتوا به متشابها" (دیئے جائینگے وہ ملتے جلتے) یعنی واقع میں یہ دوسرے پھل وہی نہیں ہونگے جو انھیں پہلے ملے ہوں گے، بلکہ صرف صورت میں مشابہت ہوگی اور صفاتاً مثلاً مزہ میں، بو میں اور دوسری کیفیتوں میں ایسا فرق ہوگا جسے نہ کسی نے دیکھا تھا نہ سُنا تھا، نہ سوچا تھا۔ اور یہ سلسلہ ہمارے تمام بیرونی واندرونی احساسات میں جاری رہے گا۔ میں ذاتی طور پر جسمانی اور روحانی دو قسموں کا قائل نہیں ہوں، بلکہ خالق کا وجود، مخلوق کا وجود، محض ان دو قسموں کا قائل ہوں۔ لیکن جو نہ روح کو جانتے ہیں اور نہ جسم کو سمجھ سکتے ہیں کہ واقع میں وہ کیا ہے، عرض ہے یا جوہر خارجی حقیقت ہے یا ذہنی احساس، ان بیچاروں کی رعایت سے کہدیتا ہوں کہ جسمانی اور روحانی ہر قسم کے انسانی مطالبات کی تکمیل اسی لامحدود طریقہ سے ہوگی۔ مرحوم شاعر اسلام رحمۃ اللہ نے

تپش ست زندگانی تپش ست جاودانی

میں اسی طرف اشارہ فرمایا، اور میں نے اپنے اُس خط میں جو یہ اشارہ کیا تھا کہ جنت سے تحویل کا کوئی خواہشمند نہ ہوگا، یہ دراصل سورہ کہف کی آخری آیتوں کا ماحصل ہے۔ جس میں اہل ایمان کیلئے فردوس کی مہمان نوازی

ذکر فرمانے کے بعد حق تعالیٰ فرمایا ہے لایبغون عنہا حولا (اہل فردوس اس فردوس سے باہر نکلنا نہ چاہیں گے) اس کے بعد قرآن کی مشہور آیت کلمات رب کے متعلق ہے:

قل لوکان البحر مدادًا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددًا۔ (کہف)

بول! کہ اگر سمندر بھی خدا کے کلمات کیلئے روشنائی بنجائے تو سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ خدا کے کلمات ختم ہوں اگرچہ ہم اسی سمندر جیسا کسی اور سمندر کا اضافہ کریں۔

مدت تک میری سمجھ میں "کلمات رب" کی اس لامحدودیت کا تعلق جنت سے نہ نکلنے کی خواہش کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن اچانک معلوم ہوا کہ پرانی چیزوں سے آدمی میں تھک جانے یا اکتا جانے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اسی کو پیش نظر رکھ کر بتایا گیا ہے کہ جنت میں جب صفاتی عجائبات کا ظہور "کلمات رب" کے ذریعہ سے ہر دن بلکہ ہر وقت بلکہ ہر لمحہ میں نو بہ نو تازہ بہ تازہ طریقہ سے ہوتا رہے گا، تو پھر جنت کی زندگی سے اکتا جانے کی آخر وجہ کیا ہو سکتی ہے، حدیثوں میں اسی اجمال کی تفصیل مختلف تعبیروں کے ذریعہ سے کی گئی ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ آدمی میں نئی نئی چیزوں کے دیکھنے کا جو بے پناہ جذبہ پایا جاتا ہے اور اس بنیاد پر کتنے ایسے ہیں جو اعزہ واقارب سب کو لات مار کر دنیا کی سیر کیلئے نکل پڑتے ہیں، لیکن چونکہ اپنے اس فطری جذبہ کا استعمال انھوں نے غلط طریقہ سے کیا اس لئے گھوم گھما کر جب گھر آتے ہیں اور لوگ پوچھتے ہیں کہ تم نے اپنی سیاحت کے دوران میں کن نئی چیزوں کو دیکھا تو میں نے دیکھا ہے کہ اکثر وہ گھبرا جاتے ہیں۔ آخر وہی دن وہی رات وہی ستارے وہی آفتاب وہی زمین وہی آسمان جہاں کہیں آدمی جائے ان کے سوا اور کیا دیکھے گا۔ دنیا میں چار آنکھوں والے آدمی یا تین ٹانگوں والی مرغیاں کہاں نظر آئینگی، مجبور ہو کر ان جہاں دیدوں کو عموماً دروغ بیانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ڈو ایک نئی چیز کے ذکر کے بعد ان کے سفرناموں کی اکثر چیز مکرر ہوتی ہے۔ حال میں ایک سیاح سے جو سائیکل پر ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہیں گیلانی میں ملاقات ہوئی، کلکتہ سے دلی تک ان کے معلومات میں صرف یہ اضافہ ہوا تھا کہ چلتے ہوئے انھوں نے دریائے سون کے شمالی پل کو ملور کے قریب کی محرابوں کو گنا تھا، اور واپسی میں ڈہری اون سون کے پل کے دروازوں کو شمار کر کے اپنے نوٹ بک میں درج کر کے اپنے سفر کی قیمت وصول کی تھی۔ اس کے سوا اس بیچارے کے پاس اور کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مئی اور جون کے اس مہینے میں سائیکل پر اس طرح ماری ماری پھرنا

صحیح جذبہ کے غلط استعمال کا کتنا اچھا خمیازہ ہے۔ حالانکہ

دلِ من مسافرِ من کہ خدا اش یار بادا (اقبال)

کتنے عجیب عوالم اور کتنے غریب ممالک کا سفر آدمی کے سامنے ہے، چاہے تو آرام و آسائش کے ساتھ اس سفر سے لذت اندوز ہوسکتا ہے اور چاہے تو اپنے اس سفر کو صرف دُکھ درد تکلیف مصیبت کی دوزخ بنا سکتا ہے۔ پورا پروگرام منزلوں کی تفصیل ہر موڑ پر تنبیہی کلمات لگا دیئے گئے ہیں، جس کا جی چاہے ان ہلاکت ناموں سے نفع اُٹھائے اور جس کا جی چاہے اس کو ٹھکرا کر قدرت اور قدرت کے قوانین کی ٹھوکر کھاتا پھرے، سفر سے گریز تو ممکن نہیں ہے، جس نے آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے مجھے اچانک قدرتی قوانین کے اس نظام میں لا کھڑا کیا ہے، وہی یوں ہی ایک نظام سے دوسرے نظام میں منتقل کرتا ہوا چلا جائے گا جس طرح اس دنیا میں آنے سے ہم اپنے آپ کو روک نہیں سکتے تھے آئندہ بھی ہم اپنے کو کہیں جانے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ الغرض وہ لوگ سخت گمراہ اور احمق ہیں)۔ جو یورپ کے سائنس نما عیاریت فروش مشاغبہ سے متاثر ہو کر مجاز و استعارہ کی چادر اُوڑھ کر "الجنۃ والنار" کے متعلق قرآنی الفاظ کی لفظی تصدیق کے ساتھ معانی کی تکذیب پر مصر ہیں۔ العیاذ" باللہ ان میں سے بعضوں کا اصرار تو اس حد تک بڑھ گیا کہ مداری نے تو قرآنی جنت پر صرف "حیوانی جنت" کا فقرہ چسپت کیا تھا، لیکن رقص کرنے والوں نے تو اس سے بھی آگے قدم بڑھایا اور خاک بدہنش رنڈیوں کے چکلے اور گھوسنوں کے لگھوہ سے بدتر ان کی نگاہوں میں وہی جنت نظر آئی جس کی دید کی تمنا میں تیرہ سو سال مسلمان ان کے اکابر و اصاغر اس دنیا سے سفر کر رہے ہیں بادشاہ دن کو اگر رات کہے تو ماہ و پروین کے دیکھنے کا بھی غلغلہ بلند کر دینا چاہیئے۔ محکومیت کے زمانہ کی ان پیداواروں میں اس کی کتنی اچھی مثال پائی جاتی ہے۔ مجاز و استعارہ کا لطیفہ بھی خوب تراشا گیا ہے، اس آڑ میں جس لفظ سے جب چاہیئے آپ اس کے وضعی معنی کو پوچھ کر جس مطلب کو چاہیئے گوند لگا کر چپکا دیجئے جوتہ کے معنے ٹوپی لے لیجیئے اور روٹی سے مراد اُگالدان۔ اُگالدان سے اونٹ مراد لے لیجیئے۔ رحم کرے اللہ حضرت امام غزالی پر، تہافہ میں سچ فرمایا ہے کہ مجاز و استعارہ کی اتنی بھر مار کہ مخاطب اس سے مغالطہ میں مبتلا ہو جائے۔ در اصل دروغ بیانی اور جھوٹ ہی کی ایک شکل ہے۔ تعالی اللہ عن ذلک علواً کبیراً

"صدق لکھنؤ"

افاداتِ طیّبہ

(از حضرت مولٰنا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند دامت فیوضہم)

[ہمارے محترم دوست جناب مرزا حکیم عبدالحمید بیگ صاحب بریلوی کو مولٰنا محمد طیب صاحب کے ساتھ خاص ذہنی تعلق ہے حکیم صاحب موصوف نے آیت کریمہ "لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا"، اور سورہ "والصّٰفّٰت" کی ابتدائی قسموں کے متعلق مولٰنا ممدوح سے کچھ سوالات کیئے تھے اُن کے جو جوابات مولٰنا (دام اللہ فیوضہم) نے تحریر فرمائے ہیں وہ ہم کو حکیم صاحب موصوف سے حاصل ہوئے ہیں ہم تعمیم فائدہ کیلئے اُن کو "الفرقان" میں شائع کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ قرآن پاک سے شغف رکھنے والے ہمارے ناظرین اُن کے مطالعہ سے محظوظ اور مستفید ہوں گے مضمون پر مرقومہ بالا عنوان ناچیز مدیر "الفرقان" نے قایم کیا ہے]

سوال (۱)

حکیم صاحب کے پہلے سوال کا حاصل یہ تھا کہ

وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا الآیہ نے اختلاف وتعارض کو کلام غیر اللہ کا خاصہ بتلا کر قرآن کو اختلاف سے مبرّا ثابت کیا اور اس عدمِ اختلاف کو اُس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل قرار دیا ہے لیکن اس میں خلجان یہ ہے کہ مطلقًا اختلافات سے تو ہم کلام الٰہی کو بھی خالی نہیں دیکھتے، علماءِ شریعت مفسرین اور

شراح حدیث کی صدہا مساعی آیتوں اور حدیثوں کے تعارض اٹھانے اور ان متعارض نصوص کو مختلف محامل پر حمل کرکے درمیانی تضاد فروکرنے میں مصروف رہتی آئی ہیں جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا پھر کیسے کہدیا جائے کہ تعارض و اختلاف کلام بشر ہی کا خاصہ ہے؟ اور کلامِ الٰہی میں بالکل نہیں ہے۔ رہا تاویلات و توجیہات کے ذریعہ نصوص سے رفع تعارض کی سعی اور اس سے اختلاف کی نفی تو یہ کلام بشر میں بھی ممکن ہے یہی تاویل و توجیہ بشر کے متضاد اقوال سے بھی تعارض اٹھا سکتی ہے بلکہ اٹھاتی رہتی ہے۔ وہاں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کلام بشر بھی اختلاف و تعارض سے مبرا ہے۔ چنانچہ تعزیرات ہند کی متعارض دفعات سے وکلاء اور قانون پیشہ اصحاب کتب فقہ سے اقوال مختلفہ سے فقہاء کتب طب سے متضاد مسائل سے اطباء وغیرہ تعارض کی گتھیوں کو تاویل و توجیہ ہی سے سلجھاتے رہتے ہیں اور متضاد اقوال کو مختلف محامل پر حمل کرکے اختلاف کو مرتفع دکھلا دیتے ہیں پس اگر تاویل و توجیح کی بنیاد پر اختلاف کی نفی ہوسکتی ہے تو کلام بشر سے بھی ہوسکتی ہے۔ بہرحال اس صورت سے بیش نظر اگر اختلاف و تعارض کا وقوع ہے تو کلام الٰہی اور کلام بشر دونوں میں ہے اور اگر تاویل و توجیح کے وسیلہ سے نہیں ہے تو دونوں میں نہیں ہے۔ یہ تخصیص کہ تعارض فقط کلام بشر ہی میں ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتی۔ اور جب یہ تخصیص مخدوش ہے جس پر قرآن کی منزل من اللہ ہونے کا استدلال مبنی تھا تو قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر یہ استدلال بھی تام نہیں ہوتا۔ لہٰذا اختلاف کلام بشر اور عدم اختلاف کلام الٰہی کی حقیقت پر کوئی ایسی روشنی ڈالی جائے جس سے آیت کے معنے مستقیم اور اس کا استدلال مستقیم ہوسکے؟

جواب

جواب کیلئے اولاً چند مقدمات سمجھ لیجئے جو قرآن کریم ہی سے ماخوذ اور مستنبط ہیں۔

(۱) اس سے آپ انکار نہ کریں گے کہ انسان کا علم خود اس کا اپنا اور خانہ زاد نہیں بلکہ عطاء غیر ہے یعنی اس میں جہل اصل ہے اور علم عارضی ہے۔ جہل اس کے اندر سے امنڈتا ہے اور علم باہر سے آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی علم کے سابق میں بھی جہل ہے اور لاحق میں بھی جہل ہے درمیان میں کچھ دھندلی سی روشنی علم کی نظر پڑتی ہے اور بس، ورنہ ظلمت جہل نے ہی علم کی دونوں جانبوں کا احاطہ کر رکھا ہے جہل سابق کی

بابت قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

والله اخرجکم من بطون امہاتکم لا تعلمون شیئاً وجعل لکم السمع والابصار والافئدة (نحل)

اور اللہ تعالےٰ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے، اور اس نے تم کو کان دیئے اور آنکھیں اور دل۔

اور جہل لاحق کی بابت ارشاد ربانی ہے۔

ومنکم من یرد الی ارذل العمر لکیلا یعلم بعد علم شیئاً (نحل)

اور بعضے تم میں سے وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں جسکا یہ اثر ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بیخبر ہو جاتا ہے

دونوں جگہ شیئاً کو نکرہ اور تحت النفی لایا گیا ہے جس سے حسب قواعد عربیہ عموم کا فائدہ مقصود ہے حاصل یہ ہے کہ پیدائش کے وقت بھی انسان کچھ نہیں جانتا تھا اور لاعلم محض تھا اور ارذل عمر میں ہو کر پھر ویسا ہی جاہل اور لاعلم محض ہو جاتا ہے کہ اسے کچھ بھی تمیز نہیں رہتی جو علم کی حقیقت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب علم انسانی عارضی بھی ہوا اور دو طرفہ جہل کے احاطہ میں گھرا ہوا بھی تو اس کے معنے بجز اس کے اور کیا ہو سکتے ہیں کہ انسان کا جہل اِس کے علم سے زیادہ ہے کیونکہ جہل محیط ہے اور علم محاط ہے اور حسّ و عقل شاہد ہے کہ محیط اپنے محاط کی نسبت بڑا بھی ہوتا ہے اور زیادہ بھی اور محاط ہر حیثیت سے اس سے چھوٹا اور قلیل ہوتا ہے اس لیئے انسانی علم لامحالہ اُس کے جہل کی نسبت صغیر بھی ہے اور قلیل بھی۔

اس قلت علم انسانی کی طرف قرآن کریم نے ذیل کی آیت میں اشارہ فرمایا ہے جبکہ یہود نے روح کے بارہ میں سوال کیا تھا۔

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (بنی اسرائیل)

آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

چنانچہ ہر دائرہ میں اس کا مشاہدہ کر لو کہ انسان کے مجہولات بہ نسبت معلومات کے زیادہ نکلتے ہیں۔ علم ایک حد تک چلتا ہے اور پھر تھک کر بیٹھ رہتا ہے۔ انجام کار پھر انسان کا اصلی رفیق جہل ہی آکر اس کا ساتھ دیتا ہے جس سے انسانی علم کا عارضی اور قلیل ہونا بداہتہً واضح ہے۔

اب اس پر غور کیجئے کہ یہ عارضی اور قلیل علم جو ایک محدود زمانہ تک انسان کے پاس رہتا ہے اس میں فقط قلت ہی کا روگ لگا ہوا نہیں، بلکہ قلتہ کے ساتھ علتہ بھی لگی ہوئی ہے جس نے اس قلیل علم کو کمزور اور غیر مستحکم بھی بنا دیا ہے یعنی بقاعدہ مشہور لکل شی آفتہ وللعلم آفات انسان کے اس قلیل علم پر کچھ ایسی آفات مسلط ہیں کہ وہ علی الاطلاق پایۂ اعتبار کو بھی نہیں پہونچ سکتا جب تک کہ مقررہ کسوٹیوں پر جانچا نہ جائے چنانچہ بہت سی نفسی اور آفاقی آفات کے مستمر ہجوم سے انسانی علم کی قطعیت ہمیشہ مجروح اور معرض زوال میں رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو بھول چوک اور سہو ونسیان سے مبرا نہیں ہو سکتا جس سے باد ماندہ علم ہی پورا باقی نہیں رہتا، اور رہ بھی جائے اور اتفاق سے سہو و نسیان کا شکار نہ ہو تو خطار فہم اور خطار فکر کی آفت اُس پر مسلط ہے جس سے یہ علم مشکوک اور مشتبہ بھی ہو جاتا ہے پس علم کی بقا بھی معرض زوال میں رہتی ہے اور بقا کے بعد اس کی صلیت بھی ہر وقت خطرہ میں پڑی رہتی ہے۔ پس ایک تو علم ہی اصلی نہ تھا اوپر سے خطا ونسیان کی آفات اسے عارضی بھی نہیں رہنے دیتیں نسیان کا تو یہ عالم ہے کہ خدا تک کو بھول جائے جو ہر وقت اس کے دل و دماغ اور تمام قویٰ پر غالب اور متسلط ہے اور خطار فہم وفکر کی یہ حالت ہے کہ اپنی پیدائش وخلقۃ تک کو صانع وخالق سے مستغنی سمجھ بیٹھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود اپنے کو بھول جائے اور اپنی کھلی حقیقت تک کے سمجھنے میں غلطی کر جائے۔ غرض نظریات ہی نہیں بدیہی امور میں بھی اُس کے علم کو یہ خطا ونسیان مشکوک اور مشتبہ کرتے رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسا مشکوک علم علی الاطلاق قابل پذیرائی کیسے ہو سکتا ہے؟

اس لئے قرآن کریم نے اس کے علم کو اُس وقت تک قابل تسلیم شمار نہیں کیا جب تک کہ وہ کسی عقلی یا نقلی حجۃ سے مستند نہ ہو اور اسی لئے قرآن نے ہر ایک انسانی دعوے پر مطالبۂ دلیل کا اصول قایم فرمایا تاکہ علم کا استناد صحیح ہو جائے۔ ورنہ عدم استناد اور عدم استدلال کی صورت میں اُسکے علم کو ظن وتخمین اور توہم کہکر رد فرما دیا ہے کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئا چنانچہ یہود نے جب لحم ابل کی حرمت کا دعوے کیا تو فرمایا گیا دلیل لاؤ۔

آپ ان سے کہیئے کہ تم لے آؤ توراۃ کو اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔	قل فأتوا بالتوریٰۃ فاتلوھا ان کنتم صٰدقین۔

کفار مکہ نے قرآن کو کلام بشر کہا تو فوراً دلیل علمی کا مطالبہ کیا گیا۔ اور فرمایا گیا۔

قل فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین (بقرہ)	آپ ان سے کہیئے کہ تم ایک ہی سورۃ اسکے مثل سے لے آؤ اور اللہ کے ماسوا اپنے سارے مددگاروں کو بلالو اگر تمھیں سچائی کا دعویٰ ہے۔

قرآن کو (معاذاللہ) نبی کا افترا کردہ کلام کہا تو فرمایا گیا کہ

قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم۔ (ہود)	آپ فرمایئے کہ تم دس ہی سورتیں اس جیسی "بنائی ہوئی" لے آؤ اور اس کام میں اپنی مددگاری کے لیئے جس کو بھی بلاسکتے ہو بلالو،

کفار مکہ نے جب دعویٰ کیا کہ اگر قیامت آئی تو ہم مسلمانوں سے بڑھکر اور برتر رہینگے تو قرآن نے فوراً ان کی تردید کرتے ہوئے اُن سے حجت مانگی اور فرمایا۔

ان للمتقین عند ربھم جنت النعیم افنجعل المسلمین کالمجرمین ؟ مالکم کیف تحکمون ام لکم کتاب فیہ تدرسون؟ ان لکم فیہ لما تخیرون ام لکم ایمان علینا بالغۃ الیٰ یوم القیمۃ ان لکم لما تحکمون؟ سلھم ایھم بذا لک زعیم ام لھم شرکاء فلیاتوا بشرکائھم ان کانوا صادقین۔ (قلم)	بیشک پرہیز گاروں کے لیئے ان کے رب کے پاس آسائش کے باغ ہیں، کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کی برابر کردیں گے، تم کو کیا ہوا تم کیسا (احمقانہ) فیصلہ کرتے ہو، کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں پڑھتے ہو کہ اس میں تمہارے لیئے وہ چیز ہے جس کو تم پسند کرتے ہو کیا ہماری ذمہ کچھ قسمیں چڑھی ہوئی ہیں جو تمہاری خاطر سے کھائی گئی ہوں اور وہ قسمیں قیامت تک باقی رہنے والی

ہوں کہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جو تم فیصلہ کر رہے ہو اُن سے پوچھیئے کہ اُن میں اس کا کون ذمہ دار ہے کیا اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریک ہیں سو ان کو چاہیئے کہ یہ اپنے ان شریکوں کو پیش کریں اگر یہ سچے ہیں۔

کفار مکہ نے جب کہا کہ ملئکہ حق تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں تو قرآن نے مختلف طرق سے اُنکی تجہیل کرتے ہوئے اس دعوے کی سند مانگی کہ آیا یہ تمہارا مشاہدہ ہے یا کسی معتبر کتاب میں تم نے دیکھا ہے یا یہ تمہارا کوئی وجدو الہام ہے۔ آخر یہ سب کچھ تم کہاں سے بک رہے ہو؟

فاستفتھم الربک البنات	آپ ان لوگوں سے پوچھیئے کہ کیا خدا کیلئے تو

ولھم البنون؟ ام خلقنا الملٰئکۃ اناثا وھم شاھدون (آگے فرمایا) مالکم کیف تحکمون؟ افلا تذکرون؟ ام لکم سلطان مبین۔ فاتوا بکتابکم ان کنتم صٰدقین (والصافات)

بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورت بنایا ہے اور وہ دیکھ رہے تھے (آگے فرمایا گیا) تم کو کیا ہو گیا تم کیسا حکم لگاتے ہو، پھر کیا تم سوچ سے بالکل کام نہیں لیتے ہو، ہاں! کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل موجود ہے؟ سو اگر تم سچے ہو تو اپنی وہ کتاب پیش کرو۔

دلائل کے ان تمام مطالبات کی بنیاد یہی ہے کہ انسان کے پاس علم ذاتی نہیں ہے عطاء غیر ہے تو خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا اور کیسے حاصل کیا؟ پس اُس وقت تک اُس کا علم قابل قبول نہیں ہوتا جب تک وہ اس منبع اور سرچشمہ کا پتہ نہ دے جہاں سے اس نے یہ علم حاصل کیا ہے جس سے واضح ہے کہ اس کا علم نہ بلا استثنا معتبر ہے اور نہ علی الاطلاق قابل قبول ہے جب تک وہ اس پر حجۃ نہ لائے اگر عقلی دعوےٰ ہے تو حجۃ معقول، اور نقلی ہی تو حجۃ منقول۔

غرض انسان کا علم قلیل ہی نہیں علیل بھی ہے اور یہی قلۃ وعلۃ اور اس کا قصور ادراک عموماً اسے مبتلائے مضار ومفاسد رکھتا ہے اور بہت کم اس کی نوبت آتی ہے کہ وہ کامیابی کا چہرہ دیکھے ورنہ اگر اُس کا علم محیط ہوتا تو اسے کبھی بھی ضرر نہ پہونچ سکتا اور وہ ہر خطرہ کی پیش بندی پہلے ہی اپنے علم کے زور سے کر لیا کرتا اور تو اور دنیا کے سب سے بڑے عالم اور اعلم الخلائق انسان کی زبان مبارک سے قرآن نے کہلایا ہے:۔

ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسّنی السوء (انعام)

اور اگر میں جانتا ہوتا غیب کو تو بہت زیادہ حاصل لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف۔

یعنی اگر انسان کا علم جامع ہر قلت وعلت سے پاک اور ہر نقص وکوتاہی سے بری ہوتا تو یقیناً اُسے وہ آفات نہ ستا سکتیں جو تدبیر کے سلسلہ میں قبل از وقت علم نہ ہونے سے اُس پر اچانک آپڑتی ہیں اور اُس کا سب بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتی ہیں۔ بہرحال آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کا علم ذاتی بھی نہیں اور محیط

بھی نہیں کامل بھی نہیں اور کثیر بھی نہیں پھر آفات خطا و نسیان کی وجہ سے صحیح بھی نہیں اور قطعی بھی نہیں
بلکہ قلیل بھی ہے اور علیل بھی ہے ناقص بھی ہے اور قاصر بھی ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اب اس پر غور کیجئے
کہ قصور علم اور نقص ادراک کی حقیقت کیا ہے اور اس قصور و فتور کے معنی کیا ہیں، سو غور کرنے سے
ذہن نارسا میں یہ آتا ہے کہ علم کے نقصان کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ جہل کی آمیزش ہو جائے
اور علم خالص نہ رہے خواہ یہ آمیزش جہل بایں معنی ہو کہ انسان کو ہر ہر چیز کا علم نہ ہو بلکہ کچھ اشیاء
معلوم ہوں اور کچھ مجہول ہوں اس صورت میں موجودات عالم کے مجموعہ کی نسبت انسان کا علم جہل
کے ساتھ مخلوط رہا گو علم اور جہل کے دائرے الگ الگ رہے۔ اور خواہ یہ آمیزش جہل بایں معنی ہو کہ
جتنا کچھ بھی اسے علم ہو خود اسی میں جہل کی آمیزش ہو یعنی ہر چیز کا علم ادھورا ہو خالص نہ ہو۔ پہلی صورت
کمی نقصان کی ہے کہ معلومات پوری نہیں ادھوری ہیں اور دوسری صورت کیفی نقصان کی ہے
کہ معلومات کا علم ادھورا ہے اور خود معلومات چھٹی ہیں جن کا علم خالص نہیں مگر بہرصورت نقصان
علم کے معنے یہی رہے کہ اس میں جہل کی آمیزش ہو اور علم و لاعلمی جمع ہو جائیں۔ چونکہ انسان میں نقصان
علم کے یہ دونوں معنی موجود ہیں اس کا علم قلیل بھی ہے کہ دونوں طرف سے اسے جہل نے گھیر رکھا ہے
اور ادھورا بھی ہے کہ بوجہ خطا و نسیان اور شک و شبہات کسی چیز کی پوری حقیقت کا اندازہ نہیں
اور جس قدر ہے وہ آفات علم کے سبب مشکوک ہے اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ کماً اور کیفاً ہر انسانی
علم کے ساتھ جہل کا اختلاط اور علم کے ساتھ لاعلمی کی آمیزش لازمی اور ایک ایسا امر طبعی ہے جو اس
سے کسی حال جدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ علم و لاعلمی کے اجتماع اور ادراک و عدم ادراک کے
جمع ہو جانے ہی کو تہافت، تفاوت، تخالف اور تعارض وغیرہ سے تعبیر کرتے ہیں جس کا جامع ترین
عنوان جس کے نیچے یہ سارے عنوانات مندرج ہو جاتے ہیں قرآن کریم کی اصطلاح میں اختلاف کثیر
ہے اس کے نیچے اجتماع ضدین اور اجتماع متناقضین۔ اجتماع متنافیین اجتماع متعارضین اجتماع
متخالفین وغیرہ سب آجاتے ہیں پس جبکہ نقصان علم کی حقیقت آمیزش علم و جہل نکلی جس کا نام اختلاف
کثیر ہے اور یہ نقصان علم انسان کی جبلت میں پڑا ہوا ہے تو بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف کثیر انسان
کے علم اور اس کے کلام کے ساتھ طبعاً لازم اور اس طرح وابستہ ہے جیسے آفتاب سے دھوپ اور دھوپ دار
اشیاء کیلئے سایہ نہیں بلکہ انسانی کلام کے لئے یہ اختلاف و تخالف اور تہافت و تفاوت ایک ایسی

امتیازی خصوصیت ہے کہ جہاں بھی یہ پائی جائے گی بے تکلف حکم لگا دیا جائے گا کہ یہ ضرور انسانی کلام ہے جس کا علم محیط نہیں بلکہ جہل آمیز ہے چنانچہ اسی لیئے صرف انسان ہی کو تردد بھی لاحق ہوتا ہے اور وہی اپنے بہت سے اعمال میں مذبذب اور متردد رہتا ہے کہ تنہا وہی علم و جہل کے درمیانی برزخ میں بھی ہے اگر اُس کا علم خالص اور کامل ہوتا تو اسے تردد کے بجائے یقین اور تذبذب یا شک کے بجائے طمانیت اور قناعت میسر آجاتی اور تردد نہ رہتا۔ اور اگر وہ جامد مطلق اور ناقابل علم یعنی جاہل محض ہوتا تب بھی اسے شک یا تردد لاحق نہ ہوتا کیونکہ اس حالت میں وہ کسی سوچ بچار کی راہ ہی نہ چل سکتا کہ شک کی نوبت آتی۔

پس تردد اور شک کی کیفیت ہی علم ولاعلمی کے اجتماع سے پیدا ہوتی ہے گویا اختلاف کثیر سے تردد پیدا ہوتا ہے ورنہ نہیں۔ اور اختلاف انسان کے سوا کہیں نہیں اس لیئے تردد بھی اور کہیں نہیں ہاں پھر اسی تردد اور تذبذب کا سب سے بڑا مظاہرہ کلام کا تعارض اور تہافت ہے کیونکہ متردد انسان شک کی حالت میں آج تو ایک پہلو کو راجح قرار دے کر اس کے مناسب رائے قایم کر لیتا ہے اور کل جبکہ دوسرا پہلو راجح ہو کر اول پہلو مرجوح ہو جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف رائے کا اظہار کرنے لگتا ہے چنانچہ انسانی قوانین و آئین اور اس کے قایم کردہ نظریوں کو ہم روز بدلتے ہوئے دیکھتے ہیں آج زمین گول ہے کل مسطح ہے آج زمین ساکن ہے کل متحرک ہے آج عالم قدیم ہے کل حادث ہے آج فلاں صنعت و ایجاد مفید ہے کل مضر ہے، آج فلاں قانون بہترین ہے کل بدترین ہے۔ آج فلاں طرز عمل قابل تحسین ہے کل قابل نفریں ہے۔ غرض علما، فلاسفہ۔ عقلاء شعراء ادبار وغیرہ کے بڑے بڑے نظریات کو ایک حالت پر قرار نہیں انسانوں کے صدہا مسائل کا تہافت اور اختلاف کثیر لاکھوں مسائل میں رجوع اور غلطی کا اقرار کوئی ایسی مخفی یا محض ماضی چیز نہیں جس کا سلسلہ کسی زمانہ میں بھی مختتم ہوا ہو کل تک بھی تھا اور آج بھی قایم ہے اور اس وقت تک برابر رہے گا جب تک کہ انسانی علم میں سے جہل کی آمیزش کلیۃً نہ نکل جائے مگر وہ "حتیٰ یلج الجمل فی سم الخیاط الآیۃ" پر معلق ہے، ورنہ خدا اور بندے کے علم میں کوئی فرق نہ رہے، اس سے واضح ہو گیا کہ تہافت اور اختلاف کثیر حقیقتاً کلام بشر ہی کا خاصہ ہے جو اس سے کسی حال منفک نہیں ہو سکتا، پھر یہ تخالف و اختلاف ایک اصل کلام ہی میں نہیں بلکہ بشری کلام کی عام کیفیات میں بھی رچا ہوا ملتا ہے خواہ وہ

فصاحت یا بلاغت یا اصناف کلام کی دوسری صنعتیں ہوں چنانچہ کسی بڑے سے بڑے فصیح و بلیغ کے کلام میں بھی اول سے آخر تک بلاغت بیانی کا یکساں زور قایم نہیں دیکھا گیا۔ اگر چند جملے بلیغ ہوتے ہیں تو وہ چند اُن سے گرے ہوئے بھی ہوتے ہیں کسی مصنف کی صرف بلیغ سطروں کا انتخاب چھوڑ کر جب اُس کا مجموعہ کلام سامنے آئے گا اگرچہ وہ کلام کی کسی ایک ہی صنعت اور ایک ہی مضمون سے متعلق ہو اُس میں بلاغت و سلاست بیان کا زور کبھی یکساں نہ ہوگا بلکہ تہافت کی کافی آمیزش ہوگی۔ پھر اگر ایک انسان کے مختلف موضوع کے مضامین سامنے لائے جائیں جیسے مرثیہ و تعزیت تبریک و تہنیت، ہجو و مذمت اور مدح و منقبت وغیرہ تو اُن میں یہ تفاوت اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں اس لیئے نظر آئے گا کہ عادۃً ہر ایک انسان کو ہر ایک مضمون سے کامل مناسبت نہیں ہوتی اگر کوئی تعزیۃ گوئی اور مرثیہ نویسی میں ید طولیٰ رکھتا ہے تو تبریک و تہنیت میں اکثر درماندہ ثابت ہوتا ہے جس کی طبیعت ہجوگوئی کی طرف زیادہ چلتی ہے وہ اکثر مدح سرائی میں پیچھے رہجاتا ہے جسے تغزل سے مناسبت ہے وہ قصیدہ خوانی میں اونچا نہیں پہونچتا اس لیئے اگر اس کے یہ مختلف الانواع کلام جمع کر لیئے جائیں تو ان میں زور بیان کا تفاوت و اختلاف کثیر اس درجہ نمایاں نظر آئے گا کہ ان سب کلاموں کو کسی ایک کا کلام سمجھنا ہی مشکل ہو جائے گا اسی پر افسانوں کے دوسرے مختلف فنون اور مضامین کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔

پھر اگر اتفاق سے کسی کو ہر مضمون اور ہر فن سے مناسبت بھی ہو تو بسا اوقات انسان کے طبعی تاثرات بھی کلام میں تفاوت پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی وقت مختلف حوادث کا شکار ہوتا رہتا ہے اُس میں متضاد کیفیات سرور و غم، انقباض و انبساط اور تشتّت و جمعیت وغیرہ ڈالتے رہتے ہیں جو اس کی کمزور طبیعت پر اثر انداز ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ جب اس متاثر طبیعت سے کوئی کلام نکلے گا تو اس میں بداہتہً اُن طبعی اثرات کی جھلک آجانی ضروری ہے جو کلام کے وقت اس پر چھائے ہوئے ہیں چنانچہ یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں کہ اگر کسی کیفیت کے غلبہ کے وقت اُس کے مقتضا کے مطابق کلام کیا جائے تو قدرتی طور پر وہ اُس کلام سے زیادہ زوردار ہوگا جو اُس کے مقتضا کے مطابق نہ ہو۔ یا اُس کے مطابق ہو مگر اُس کیفیت کے زوال کے بعد کیا جائے۔ مثلاً کسی صدمہ کی حالت میں قصیدۂ تہنیت اور کلامِ مسرۃ میں کوئی زور پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یا مثلاً

رکسی صدمہ کی کیفیت ختم ہو جانے پر مرثیہ و تعزیت گوئی میں کوئی جوش اور کشش پیدا نہیں کی جاسکتی اور کی جائیگی تو وہ تکلف ہوگا جس میں فطری تاثیر نہ ہوگی۔ پس اگر ایک انسان کے ایسے مختلف کلاموں کو جمع کرکے دیکھا جائے تو ایک کلام زوردار اور ایک پھس پھسا نظر آئے گا اور بلاغت بیانی میں کافی تفاوت و تہافت محسوس ہوگا۔ بہرحال انسان کا کوئی طبعزاد کلام اور اس کی کیفیات اختلاف و تہافت سے بری نہیں رہ سکتے۔ جو یقیناً اُس کی قلت علم اور ظرف علم کی طبعی کمزوریوں کا نتیجہ ہے جس کا حاصل وہی علم ولاعلمی اور زور و کمزوری یعنی اجتماع ضدین نکلتا ہے پھر اس تہافت و اختلاف کا اثر محض اُس کے طبعزاد کلام ہی میں نہیں بلکہ اُن مضامین و علوم میں بھی نمایاں ہوتا ہے جن میں وہ ناقل محض ہو اور قطعاً مدعی کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ بلکہ راوی کے درجہ میں ہو اور اپنی طرف سے نقل روایت میں امانت داری کا جذبہ بھی رکھتا ہو لیکن پھر بھی اسکی روایات میں تعارض اور تہافت کی کافی آمیزش ہو جاتی ہے کیونکہ اس علم کا تعلق اگر اُس کی فکر سے نہیں تو قوت حافظہ سے ہے اور حافظہ پر قوت فکریہ سے بھی زائد آفتیں مسلط ہیں، کہیں سوء حفظ ہے اور کہیں غلط فہمی کہیں دماغی امراض ہیں اور کہیں حوادث افکار جو حافظہ پر بھی اثر ڈالتے ہیں اور قلب کی یکسوئی پر بھی اور ظاہر ہے کہ جب دل و دماغ ٹھکانے نہ رہیں تو علمی محفوظات کہاں تک محفوظ رہ سکتی ہیں۔

اسی لیے روایت و نقل میں کوئی حکایت تو محکی عنہ کے مطابق نکلتی ہے اور کوئی نہیں نکلتی کہیں کلام کا لب و لہجہ بدل کر مضمون کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اور کہیں طرز ادا کے تفاوت سے افراد کلام کہیں سے کہیں جا پہونچتے ہیں چنانچہ معتبر سے معتبر مورخوں اور افسانہ نویسوں کی روایات کا تہافت و تخالف اور تضاد بیانی جمع کی جائے تو اختلاف کثیر کی کوئی حد نظر نہ آئے گی اگر بطور خرق عادت خدائی ذمہ داری کہیں مددگار نہ ہو تو حادثۂ انسانی نقل روایت سے واقعہ کی اصلی صورت سامنے آنی بہت ہی مشکل ہے۔

غرض علم عقلی ہو یا نقلی، ذوقی ہو یا وجدانی جہاں تک خود انسان کی جبلت اور کسب طاقت کا دخل ہے وہاں تک اختلاف و تفاوت کی کوئی کمی نہیں کہ اولاً تو اس کی جبلت میں علم ہی نہیں ہے اور باہر سے بھی آجاتا ہے تو اُسی جبلت میں اُس کے لیئے سیکڑوں آفات پوشیدہ ہیں

جو اس پر ضرب کاری لگاتی رہتی ہیں یعنی سہو، نسیان خطا، فکری غلط فہمی۔ سوء حافظہ۔ بیرونی عوارض اندرونی کیفیات اور قلبی و دماغی تاثرات وغیرہ جو سب کے سب جہالت ہی کے معین و مددگار ہیں۔ علم سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں اگر ہے تو اُس کے ازالہ سے ہے نہ کہ تحفظ سے۔ اس لیے انسانی کلام میں علم کے ساتھ لاعلمی اور جہالت کی آمیزش جسے تہافت اور اختلاف کہتے ہیں بہ نسبت خالص علم کی یکسانی کے اس درجہ غالب ہے کہ وہ انسانی علم اور بشری کلام کا تمیزی نشان قرار پاگئی ہے جس سے کلام بشر پہچانا جانے لگا۔

اب اس کے برعکس آپ علم الٰہی اور کلام خداوندی کو لیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ اُس کا علم خود اپنا اور خانہ زاد ہے عطا و غیر نہیں، ذاتی ہے عارضی نہیں، نہ جہل سابق پر وارد شدہ ہے اور نہ جہل لاحق سے شرمندہ۔ جہالت نہ اس کے اول میں ہے نہ آخر میں اس لیے نہ وہ قلیل ہے نہ وہ محدود۔ پھر جیسے نفس علم ہر آفت و نقص سے پاک ہے ایسے ہی اس کی ہر کیفیت عیب اور کوتاہی سے مبرا اور منزہ ہے نہ وہاں مناسبت و بے مناسبتی کا سوال ہے کہ کوئی مضمون اعلیٰ ہو اور کوئی ادنیٰ۔ نہ اس پر حوادث موثر ہیں کہ کیفیت کلام میں کوئی خفیف سا تغیر بھی پیدا کر سکیں نہ وہاں متضاد کیفیات اثر انداز ہو سکتی ہیں کہ کلام کے زور یا اُس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی ادنیٰ تفاوت و اختلاف پیدا کر سکیں۔ پھر ذاتی علم کے ہوتے ہوئے نہ اُس کے خلاف کوئی باطنی آفت ہے نہ ظاہری جو اُسے زائل کر سکے نہ وہاں غفلت ہے نہ نسیان نہ نوم ہے نہ سنہ نہ علم اکتسابی ہے کہ قوۃ حافظہ اور تفکر درکار ہو اور نہ علم تدریجی ہی ہے کہ ترتیب فکر و نظر کی حاجت پڑے۔ غرض جہل اور ضد علم کی کوئی آفت اُس کی علمی بارگاہ تک نہیں پہنچ سکتی اس لیے قرآن کریم نے جگہ جگہ دعوی کیا ہے کہ اس کا علم محیط اور لا محدود بھی ہے اور کامل تر اور خالص بھی یعنی وہاں علم بحت اور ادراک محض ہے جس میں جہل کے کسی ادنیٰ ذرہ کی آمیزش کی گنجائش نہیں ارشاد قرآنی ہے :۔

وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا	اللہ تعالےٰ نے اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط	اور اللہ ہی کے پاس ہیں خزانے تمام مخفی اشیاء کے ان کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے

من ورقۃ الا یعلمہا ولا حبۃ فی ظلمات الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین۔	اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے، اور کوئی دانہ زمین کی تاریک حصّوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز گرتی ہے مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں

کہیں اسی احاطہ علمی کو یوں فرمایا ہے کہ:۔

واللّٰہ بکل شیٔ محیط۔	اور اللہ تعالےٰ ہر چیز کو محیط ہے۔

غرض جب اس کا علم محیط اور لا محدود ہے تو اُس میں قلت و کثرت کا سوال ہی نہیں اُٹھتا کہ اس قلیل ہونے کا نام بھی آسکے اور جب خالص ہے تو اس میں جہل کی آمیزش کا تصوّر ہی نہیں آسکتا کہ اس پر علیل ہونے کا نام آسکے۔ اس لیئے علم خداوندی علم بشر کی مانند نہ قلیل ہے نہ علیل اور نہ ناقص ہے نہ قاصر کیونکہ اگر ذرا بھی قلیل ہو خواہ کماً یا کیفاً تو وہ لا محدود نہیں رہ سکتا حالانکہ جیسے اُس کی ذات لا محدود ہے ایسے ہی اس کی صفات کمال علم وغیرہ بھی لا محدود ہیں۔ اسلیئے اس کے علم کے ساتھ جہل کی آمیزش کسی نہج سے بھی ممکن نہیں اور ظاہر ہے کہ علم کے ساتھ آمیزش جہل ہی کا لقب تہافت اور اختلاف کثیر تھا اس لیئے یہ نتیجہ واضح ہے کہ کلام الٰہی میں تہافت و اختلاف بھی عقلاً محال اور ناممکن ہے۔

پس اب ہم خلاصہ مضمون کے طور پر اس نتیجہ تک پہونچ گئے کہ کلام بشر سے اختلاف کثیر اُٹھ جانا محال ہے کہ اس کا علم محدود اور قلیل ہے یعنی جہل کے ساتھ مخلوط ہے اور کلام خداوندی میں اختلاف کثیر کا پایا جانا محال ہے کہ اُس کا علم لا محدود اور جہل کی آمیزش سے منزہ ہے چنانچہ کلام حق اور کلام غیر حق کی باہمی تمیز عرفاً بھی اسی اصول پر کی جاتی ہے کہ ملزم کے دعوے کو پرکھنے یا ساقط الاعتبار بنانے کے لیئے وکلاء جرح وقدح کرتے ہیں اور آخر میں اُس کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہی بتلاتے ہیں کہ اس شخص کے کلام میں چونکہ تضاد بیانی ہے اس لیئے یہ کلام صادق اور حق نہیں ہے جسے باور کیا جائے گویا کلام حق ہونے کے معنے عرفِ عام میں بھی یہی ہیں کہ اسے جس طرح بھی اُلٹو پلٹو لیکن اس کا کوئی ایک جملہ دوسرے جملہ کا مکذب ثابت نہ ہو یعنی اختلاف وتہافت سے بری رہے۔

اس اصول کے مطابق اگر قرآن کریم کلام الٰہی ہے اور بلا شبہ ہے تو اُس میں تہافت و اختلاف نہ اصل کلام میں پایا جاسکتا ہے نہ کیفیات وصفات کلام میں۔ چنانچہ اصل کلام کے متعلق تو حضرت خاتم الانبیار صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا دعویٰ ہے کہ یصدق بعضہ بعضاً کہ قرآن کا بعض اُسکے بعض کیلئے مصدق ہے یہ اُسی اختلاف کثیر کی نفی ہے جس کے تحت میں کلام کا ایک جزء دوسرے جزء کے لیئے مکذب ہوجاتا ہے۔ اور کیفیات کلام کا یہ حال ہے کہ قرآنی نظم ہر ہر نوع کے مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ کہیں اُس کا زور گھٹا ہے نہ فصاحت و بلاغت حد اعجاز سے گری ہے نہ جامعیت کلام میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ متضاد کیفیات کی یکجائی کے باوجود کلام میں کوئی ایک کیفیت اپنی ضد سے متاثر ہوئی ہے۔ عین رحمۃ ورافتہ کی آیتوں کے ساتھ قہر وغضب کی آیتوں کا زور ذرہ برابر کم نہیں ہوتا۔ رہبت کی آیتوں میں جو جلال وجبروت نظر آتا ہے اُسی آن وہی ہیبت وجلال رغبت کی آیتوں میں بھی قایم ہے۔ غرض عدم تہافت اور عدم اختلاف معانی ہی میں نہیں الفاظ اور نظم کلام کے بھی ایک ایک نقطہ سے واضح ہے جو لوگ مشاہدہ کیفیات کا حاسّہ رکھتے ہیں وہ مشاہدہ سے جو عملی ذوق رکھتے ہیں وہ علم عربیۃ سے اور جو عقل سلیم سے بہرہ ور ہیں وہ عقلی دلائل سے باور کرسکتے ہیں کہ کلام الٰہی جبکہ علم خالص ہو جس میں جہل کی آمیزش ناممکن ہے تو وہ اختلاف کثیر سے بھی ہر پہنچ بری وبالا ہی رہے گا۔

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا

بہرحال جب عقل ونقل بلکہ حس ومشاہدہ کی روشنی میں یہ واضح ہوگیا کہ کلام الٰہی میں اختلاف و تفاوت اور تضاد بیانی نہیں ہوسکتی تو اب آپ خود سمجھ لیں کہ اگر پھر بھی اس مقدس کلام میں کسی کو تضاد بیانی متخیل ہو تو وہ علم الٰہی کا نقص نہیں بلکہ علم بشر کا نقص ہوگا کہ بشر ہی کے علم میں جہل کی آمیزش ہوتی ہے جس سے وہ بعض اوقات یا نصوص کے تمام محملوں کو سمجھے ہوئے نہیں ہوتا یا ایک محمل کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو نظر انداز کر دیتا ہے جس سے نصوص میں تعارض یا نص واحد میں گنجلک محسوس ہونے لگتی ہے مگر جب اس کا جہل مرتفع اور فہم سیدھا کر دیا جاتا ہے تو ہر نص اپنے اپنے موقعہ پر چسپاں نظر آنے لگتی ہے اور وہ اختلاف ہباءً منثوراً ہو جاتا ہے۔

یہاں سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ بشری کلام میں جبکہ حقیقتاً آمیزش جہل ہونے کے سبب تعارض کا

امکان ہی نہیں بلکہ وقوع ہوتا ہے اس لیئے اگر اُس کے کلام سے تعارض رفع کرنے کی سعی کی جائے تو اُس کا نام بلاشبہ توجیح وتاویل ہوگا کیونکہ تاویل ظاہر سے پھیر دینے یا خلاف ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بشری کلام میں ثابت شدہ چیز تعارض ہی ہے عدم تعارض نہیں اس لیئے تعارض کو اُٹھانا گویا خلاف ظاہر کرنا ہے جو تاویل کی حقیقت ہے اور جو کلام بشر میں محض حسن ظن کی بنا پر کی جاتی ہے ورنہ اگر کلام بشر متعارض ہی چھوڑ دیا جایا کرتا تب بھی بعید نہ تھا کہ اُس کے کلام کی اصلی شان ہی تعارض ہے پس توفیق وتطبیق کی سعی اگر کی جاسکتی ہے تو وہ صرف کلام بشر ہی میں ہوسکتی ہے کہ وہی متعارض بھی ہوتا ہے اور اسی کا نام تاویل وتوجیح بھی ہوگا کہ یہ سعی فی الحقیقت خلاف ظاہر ہے لیکن کلام خداوندی آمیزش جہل سے پاک ہونے کی وجہ سے تعارض کا امکان ہی نہیں رکھتا اس لیئے اُس کے کلام سے نہ تعارض اُٹھانے کی حاجت ہے نہ توفیق وتطبیق کی۔ اگر تعارض کسی کو متخیل ہوتا ہے تو فی الحقیقت وہ خیالی تعارض ہے اس لیئے یہاں توفیق وتطبیق یا رفع تعارض کی جد وجہد اس کے خیال کے لیئے ہے نہ کہ کلام الٰہی کے لیئے پس کلام الٰہی کے لحاظ سے اس سعی کا نام توجیح وتاویل بھی نہیں ہوسکتا بلکہ بیان مجمل یا بیان مراد یا بیان حقیقت ہوگا جو معترض پر مخفی ہوگئی تھی۔ گویا دوسرے لفظوں میں اس سعی کا نام طالب کے علم کی تصحیح ہوگا نہ کہ اللہ کے علم کی تصحیح کہ وہ تو پہلے ہی سے بذاتہ صحیح اور خالص تھا غرض یہاں تعارض رفع کرنے کی سعی چونکہ کوئی خلاف ظاہر سعی نہیں کہ اسے تاویل کہا جائے بلکہ عین ظاہر اور مطابق واقعہ یہی ہے کہ کلام الٰہی بلا تعارض دکھایا جائے کہ وہ فی نفسہ ہے بھی غیر متعارض اس لیئے یہاں توجیہ وتاویل کا کوئی اطلاق ہی درست نہ ہوگا بلکہ اس مطابقِ ظاہر سعی کا نام تفسیر ہوگا۔

اس لیئے اب یہ خوب واضح ہوگیا کہ اختلاف وتعارض میں کلام بشر اور کلام الٰہی ہرگز یکساں نہیں ایک حقیقتاً محل تعارض ہے ایک حقیقتاً بالکل نہیں اس لیئے ایک جگہ کا تعارض حقیقی ہے اور ایک جگہ کا سطحی اور خیالی جو حقیقتاً کلام الٰہی میں نہیں بلکہ بشری دماغ کا ہے پس کلام الٰہی کو غیر متعارض دکھلانے کی سعی کے یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ نصوص سے تعارض اُٹھایا جارہا ہے بلکہ یہ ہونگے کہ معترض کے دماغ سے تعارض ہٹایا جارہا ہے اور اس کے باطن سے علم وجہل کی آمیزش ہٹا کر علم کو خالص اور اسکی بصیرت کو جو اپنی جبلۃ سے دھندلی اور ظلماتی تھی روشن کیا جارہا ہے تاکہ کلام الٰہی کی

اصلی حقیقت سامنے آجائے۔ چنانچہ جبتک بصیرت صاف نہ ہو اور اسمیں بے بصیرتی کی ظلمت شامل رہے کبھی بھی نصوص اپنی اپنی جگہ چسپاں دکھائی نہیں دے سکتے انمیں تعارض ہی نظر آتا رہے گا مگر وہ نہانی دماغ کا اسی طرح تضاد ہوگا جس طرح کہ شفاف آئینہ میں کوئی سوداویت زدہ اپنی سیاہ شکل دیکھکر آئینہ پر سیاہی کی تہمت دھرنے لگے حالانکہ یہ سیاہی خود اسی کی اندرونی تیرگی کی ہے جس کا علاج یہ نہیں ہوسکتا کہ آئینہ کو دھونے بیٹھ جائے کہ وہ تو پہلے ہی سے صاف ہے بلکہ یہ ہے کہ مصفیات کے ذریعہ اپنی سوداویت کو زائل کرے بس بے بصیرہ افراد کو اگر قرآن میں تعارض محسوس ہو تو وہ فی الحقیقت انہی کی لاعلمیوں کی اندرونی ظلمت ہے جو قرآن کی شفاف الواح میں انھیں محسوس ہوتی ہے نہ کہ قرآن کی۔ اسلئے اسکا علاج یہ نہیں ہے کہ تاویلات سے قرآن کا علاج شروع کردیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اُن ظلماتی نفس کا جو اپنی جبلت ہی سے ظلمت جہل رکھتا ہے جیسا کہ اوپر ثابت کیا جاچکا) علاج مصفیات روحانی سے کیا جائے جسے تزکیہ کہتے ہیں اور وہ مصفیات مجاہدہ و ریاضت ہے۔ کیونکہ جب مجاہدات و ریاضات و تزکیہ نفس سے یہ دھندلاہٹ جاتی رہتی ہے اور خدا کی علم سے بندہ کے علم کا کنکشن درست ہوجاتا ہے اور خدا کی طرف سے اُس کے علم و فہم کی حفاظت ہونے لگتی ہے تو اس قسم کی خیالی گتھیاں خود ہی ہباءً منثورا ہوجاتی ہیں۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو انکے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہ نے مکہ معظمہ سے تحریر فرمایا کہ سب متوسلین اپنے اپنے احوال لکھکر بھیجتے ہیں مگر آپنے اپنا کوئی باطنی حال نہیں لکھا حضرت نے جوابی عریضہ میں ابتداءً بطور تواضع حالات باطنی سے اپنی محرومی و محرومی القسمتی کے کلمات تحریر فرماکر اخیر میں لکھا کہ حضرت کی جوتیوں کی برکت سے تین باتیں اپنے اندر پاتا ہوں اُمور شرعیہ امور طبعیہ بنگئے ہیں (گویا نفس امتثال احکام شرعیہ پر طبعاً اسی طرح مجبور ہوچکا ہے جیسے کھانے پینے اور سونے جاگنے پر طبعاً مجبول و مجبور ہے) مادح و ذام یکساں نظر آتے ہیں (گویا اخلاق النفس میں اس درجہ سکون و طمانیت پیدا ہوگئی ہے کہ کوئی ہزار مدح کرے نفس منبسط نہیں ہوتا اور کوئی ہزار مذمت کرے نفس منقبض نہیں ہوتا یعنی حقیقی عبدیت پیدا ہوگئی ہے) نصوص شرعیہ میں کہیں تعارض محسوس نہیں ہوتا۔ ہر نص اپنے اپنے محل و مجمل پر چسپاں نظر آتی ہے۔ اللھم ارنا الاشیاء کما ھی۔

پس اہل حقیقت کے دماغ سے چونکہ علوم معاملہ میں علم و جہل کی آمیزش زائل و قلب سے زیغ نکل جاتا ہے اسلئے اللہ تعالےٰ کے کلام کو یکساں اور غیر مذبذب علم کو وہ ٹھیک اسکی اصلی حالت یکسانی پر دیکھنے لگتے ہیں اور اختلاف کثیر یا تعارض کے تخیل سے بالاتر ہوجاتے ہیں۔ اس کیفیت کے پیدا ہونے سے پیشتر یا تقلید محض کا درجہ ہے کہ آدمی کسی مبصر کے کہنے سے یہ مانے کہ کلام الٰہی اختلاف سے پاک ہے یا تحقیق و استدلال کا درجہ ہے کہ دلائل سے قلب کو مطمئن کرے یا استدلال سے سمجھے میں نے استدلال بھی عرض کردیا ہے جو عقل و نقل دونوں پر مشتمل ہے اور ایک مبصر اعظم کا قول بلکہ حال بھی پیش کردیا ہے جس میں

انشاء اللہ مقلد کیلئے بھی قناعت ہوا محقق کے لیے بھی طمانیت ہو۔ اس کے آگے دعا کا درجہ ہو کہ اللہ تعالےٰ مشاہدۂ کیفیات کے مرتبۂ علیا تک بھی پہونچا دے اور بے بصیرتی کو مغلوب اور زائل فرما دے۔

ورنہ بے بصیرتی کے ہوتے ہوئے جبکہ تقلید یا استدلال کے بغیر محض اپنے غیر مزکّی ذوق سے آدمی قرآنی حقائق کو دیکھنے لگے تو اس اٹکل سے دیکھنے کا نتیجہ بھی تہافت و اختلاف کا تخیل ہوا اور ایسے شخص کے جہل آمیز علم کی مثال ایسی ہوگی جیسا کہ چند آدمی ایک دور کھڑے ہوئے ہاتھی کو چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے دیکھ کر جمع ہوئے ایک کی نگاہ صرف اس کی ٹانگوں پر پڑی سر و پشت اس کی نگاہ سے اوجھل رہے تو اس نے کہا ہاتھی چار ستونوں کی مانند ہوتا ہے۔ دوسرے نے صرف اس کی چوڑی پشت کو دیکھا پاؤں اور سر نہ دیکھ سکا تو اس نے پہلے کی تغلیط کرتے ہوئے کہا، کہ ہاتھی ستونوں کی طرح نہیں بلکہ ایک مسطح تخت اور ہموار چبوترہ کے مانند ہوتا ہے تیسری کو صرف اس کی دُم نظر پڑی اور پشت و پا غائب رہے تو اس نے ان دونوں کی تکذیب کرتے ہوئے کہا۔ کہ ہاتھی تو مثل ایک موٹے رسے کے ہوتا ہے جس میں صُوف کے گچھے لٹکتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہو کہ ہاتھی کے بارہ میں ان تینوں نے جس باہمی تردید و تکذیب اور کلاموں کے تہافت و تفاوت کا مظاہرہ کیا وہ انہی کے دماغوں کی تنگی اور تنگ نظری کا ثمرہ تھا۔ ہاتھی کی حقیقی حالت ان ترددات سے قطعاً مبرا تھی یعنی جو نقصِ حال اُنھوں نے ہاتھی کی نسبت ظاہر کیا وہ خود ان ہی کے علم کا نقص تھا نہ کہ ہاتھی کی صفت کا۔ اگر یہ تنگ سوراخوں کے بجائے کھلے میدان میں آکر ہاتھی کو دیکھ لیتے تو یہ تضاد بیانی جو خود انہی کی قلۃ وعلۃ سے پیدا ہوئی تھی رفع ہو جاتی اور وہ اپنے سارے کلاموں میں تطبیق و توفیق دے لیتے۔ کیونکہ ہر ایک نے ایک ایک پہلو دیکھا تھا سب پہلوؤں پر سبکی نظر نہ تھی جب سب پر سارے پہلو منکشف ہو جاتے تو ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا اور اختلاف و تہافتِ کلام رفع ہو جاتا بس یہ رفع اختلاف جو میدان میں آکر دیکھ لینے سے ہوتا ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کسی توجیہ و تاویل سے رفع ہوا بلکہ معائنہ حقیقت سے مرتفع ہوا بس یہی صورت قرآن و حدیث کے سطحی اور ظاہری تعارض کی بھی ہو کہ وہ فی الحقیقت قرآن و حدیث میں نہیں ہوتا بلکہ خود انسانوں میں اُنکی قلت معرفۃ کے سبب ہوتا ہو جو انسانی جبلۃ میں پڑی ہوئی ہو اس کے ارتفاع کی صورت توجیہ و تاویل نہیں بلکہ اس غیر عارف نفس کا تزکیہ ہو کہ قرآن بوجہ کلام خداوندی ہونیکے ہر تعارض و اختلاف سے خود ہی بری ہو۔

ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً الآیہ (باقی)

دُنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا

غزوۂ بدر اور اس کا شاخسانہ

(از حضرت مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی شیخ الادب والفقہ دار العلوم دیوبند)

ہمتم بدرقۂ راہ کن ای طائر قدس
که دراز است رہ مقصد و من نو سفرم (حافظ)

میں نے اس اُمید پر کہ افضل الرسل (صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ) کے مبارک ذکر کو اپنی تضییع عمر کا کفارہ بناؤں، عنوان بالا کے سلسلہ میں عرصہ تک ناظرین "الفرقان" کی سمع خراشی کی تھی، مگر متشتت او کثیر اعذار کے ساتھ تساہل نے دوسرے اعمال صالحہ کی طرح اس حسنہ سے بھی محروم رکھا —— آج اسی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی کڑی کو دوبارہ جوڑنے کے ارادہ سے قلم اُٹھا رہا ہوں، اور اس زمانہ کے سکوت کو کہ اسلام اور اہل اسلام کو سرور کائنات (علیہ افضل الصلوٰۃ والتحیات) کے حالات معلوم کرنے کی بہت زیادہ احتیاج ہے مجرمانہ سکوت خیال کر کے موفق حقیقی سے توفیق اتمام کا طالب ہوں اور حافظ شیرازی کے اس شعر پر اپنی معذرتانہ گزارش ختم کرتا ہوں ؎

حافظ ایں حال عجب با کہ تواں گفت کہ ما
بلبلانیم کہ در موسم گل خاموشیم

بدر کی مشہور جنگ ہو چکی، مسلمانوں کو دنیا کی بھی دولت ملی اور آخرت کی بھی، حوصلے بڑھے اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ مسلمان خداوندی احکام کے مقابلہ میں نہ قوت و شوکت سے ڈرتا ہے۔ نہ جاہ و حشم سے، نہ قرابت کی پرواہ کرتا ہے نہ دوستانہ اور محبت کی۔ اپنی اس چند روزہ زندگی میں وہ اگر ڈرتا ہے تو خدا اور صرف خدا سے۔ اسکی تلوار نیام

سے باہر صرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ احکام خداوندی کی تعمیل کرے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دے اُسکی تلوار نیام میں صرف اس لیے جاتی ہے کہ اسکو اسکے مالک حقیقی کا امر مجبور کرتا ہے۔ اسکو نہ کسی سے ذاتی بغض ہے نہ طبعی عداوت، خدا کا دُشمن ان کا دُشمن اور خدا کا دوست ان کا دوست ہوتا ہے۔

جنگ بدر کے بعد سے گھر گھر کہرام مچا۔ مگر بقیۃ السیف باشندگان مکہ کی کمیٹی نے یہ طے کیا کہ چونکہ مسلمانوں نے ہمارے ہاتھوں سے ایذاؤں پر ایذائیں برداشت کی ہیں اس لیے اسوقت اگر مکہ سے گریہ و زاری کی آواز بلند ہوئی تو ان کی خوشی میں اضافہ ہوگا۔ اس لیے کوئی شخص بھی اپنے کسی مقتول پر گریہ و بکا نہ کرے۔ جب تک کہ ہم لوگ ازسرنو مجتمع ہو کر مسلمانوں سے اپنا بدلہ نہ لے لیں۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ اور اگرچہ وہ چہل پہل تو نہ ہوسکی جو جنگ بدر سے پہلے تھی مگر یہ ضرور ہوا کہ مکہ میں ایسا سکون ہوگیا گویا کہ کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ اسود بن زمعہ کے تین بیٹے زمعہ، عقیل، حارث اس جنگ میں مارے گئے تھے اسکو اپنے ان تینوں بیٹوں سے بہت زیادہ محبت تھی کہ مکہ میں ضرب المثل تھی مگر ان میں سب سے زیادہ محبت زمعہ سے تھی اس شدید محبت کی حالت میں نہ صبر ہی کرسکتا تھا۔ نہ پنچایت کے فیصلہ کے خلاف کرنا چاہتا تھا ہاں کبھی گھر کے کسی کونے میں چھپکر خوب روتا کہ کوئی دیکھنے نہ پائے۔ کبھی مکہ سے باہر میدان میں جاکر پھوٹ پھوٹ کر رولیتا مگر دُنیا جانتی ہے کہ پیاسے کی پیاس کو شبنم سے بجھانا دُشوار ہے اس لیے اس چھپ چھپ کر رونے سے نہ اس کی تسلّی ہی ہوتی تھی، نہ دل ہی بھرتا تھا انھیں دنوں میں ایک مرتبہ کسی رونے والی عورت کی آواز سُنی کہ بہت بلند آواز کے ساتھ رو رہی ہے، چونکہ خود نابینا تھا کسی غلام کے سہارے سے مکہ کی گلیوں میں پھر رہا تھا تو اس نے غلام سے کہا کہ میں تو یہیں بیٹھا جاتا ہوں تو یہ معلوم کرکہ یہ عورت کیوں رو رہی ہے میرے خیال میں تو غالبًا نہ رونے کے متعلق جو فیصلہ پنچایت نے کیا تھا وہ منسوخ کردیا گیا۔ اگر یہ بات ہے تو میں بھی زمعہ کے مزار پر رو رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لوں ہاتھ پکڑ کر لے چلنے والا غلام اسود بن زمعہ کو وہیں بٹھا کر گیا، اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر کہا کہ فیصلہ تو ابتک باقی ہے۔ کسی نے بھی اس کی خلاف ورزی کی ہمّت نہیں کی ہے۔ مگر اس عورت کے رونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس ایک ہی اونٹ تھا جس سے اس کی بسر اوقات تھی وہ کھو گیا ہے اس کی وجہ سے وہ چیخ چیخ کر رہی ہے۔ اسود نے یہ سُنکر ایک آہ سرد بھری اور یہ شعر پڑھے۔

اتبکی ان یضل لہا بعیر ویمنعہا من النوم السہود
فلا تبکی علی بکر و لکن علی بدر تقاصرت الجدود

ان اشعار کا خلاصہ یہ تھا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک عورت کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اونٹ کے کھوئے جانے پر گریہ و بکا میں مصروف رہے۔ اور رات کو جاگنے کی حالت میں بسر کرے مگر اپنے جگر گوشوں پر رو کر آنسو بہانا بھی جرم قرار دیا جاتا ہے (اے عورت) تو اپنے اونٹ پر گریہ و بکا نہ کر، اس پر گریہ کر کہ جنگ بدر میں ہم سب کی قسمت پھوٹ گئی۔ مختصر یہ کہ جنگ بدر کے کافر مقتولین تو موت کی وجہ سے دنیا کی مصیبتوں سے فارغ ہو گئے تھے۔ مگر ان کے پسماندوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ لوگ اس دیوانہ کی طرح مشتعل تھے جو کسی کسی کی جان لینے کے لیئے مضطرب ہو۔ عمیر بن وہب بحالت کفران بدمعاشوں میں سے ایک تھے جن سے قریش کے بڑے بڑے بدمعاش بھی پناہ مانگتے تھے۔ ان کی حالت یہ تھی کہ جس کو تیز نظر سے دیکھ لیتے تھے وہ یقین کر لیتا تھا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان کے ہاتھوں سے نہیں بچا سکتی پھر اس کو نہ راتوں کو نیند آتی تھی نہ دن کو چین نصیب ہوتا تھا، غرض مکہ میں انکی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور فی الحقیقت یہ نہایت ہی خطرناک آدمی تھا۔ جماعتوں کی جماعتوں کو ایک معمولی ارادے کے بعد تباہ و برباد کر کے کالعدم کر دینا اس کا معمولی کام تھا۔ جنگ بدر کے قریب ہی زمانہ میں عمیر بن وہب کی ملاقات، صفوان بن امیہ سے کسی تنہائی کے مقام پر ہوئی۔ اور دونوں نے آہستہ آہستہ مقتولین بدر پر اظہار غم شروع کیا۔ صفوان کا باپ بدر میں کُتّے کی موت مارا گیا اس لیئے وہ بہت زیادہ مشتعل تھا۔ ادھر عمیر کا لخت جگر وہب نامی اسی جنگ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو گیا تھا اور فدیہ کی بہت بڑی رقم کا مطالبہ تھا۔ صفوان نے ایک ٹھنڈا سا سانس لیکر کہا کہ عمیر رؤساء مکہ اور خصوصاً ابا جان کے مرنے کے بعد زندگی کا لطف ہی نہ رہا۔ ہم لوگ لڑائیوں میں مارے ہی جایا کرتے تھے کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر اوّل تو بڑے بڑوں کے مرنے پر "عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" جی بھر کے ماتم کر لیا کرتے تھے گریہ و بکا کی بڑی بڑی مجلسیں ہوا کرتی تھیں مگر یہاں اس کی بھی ممانعت ہے، دوسرے ہم میں سے اگر ایک مرتا تھا تو ہم تیاریاں کر کے ایک کے بجائے دس دس کو قتل کرتے تھے مگر ان ملیچھ مسلمانوں کی قوت اسقدر بڑھ گئی ہے کہ اس کی بھی توقع نہیں ہے کہ ہم کسی سے اپنا انتقام لے سکیں گے عمیر نے کہا کہ صفوان تم نے تو بالکل میرے دل کی سی بات کہدی۔ تم غور تو کرو آج یہ نوبت ہے کہ عمیر کا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہے۔ اور عمیر چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کوئی اس کی امداد کرے، اکل تک تو کسی کو اتنی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ عمیر کی اس بکری کا دودھ بلا اجازت تھن سے نکال لے جو چرنے کے لیئے جنگل میں اری ماری پھرتی تھی۔ اب زمانہ کا یہ انقلاب ہے کہ عمیر کا بیٹا گرفتار ہے اور عمیر کچھ نہیں کر سکتا۔ صفوان نے عمیر کی اس تقریر سے معلوم کر لیا کہ عمیر

جیسا بد معاش بہت زیادہ غضبناک ہو رہا ہے۔ اس کو صرف یہی خیال نہیں ہے کہ میرا بیٹا گرفتار ہے اور میرے پاس فدیہ کیلئے مال نہیں ہے بلکہ اسکو اپنی اس دھاک کے مٹ جانیکا بھی خیال ہے جو سارے عرب پر تھی اسلئے اس سے کام نکالنا آسان ہے، یہ سوچکر اس نے عمیر سے کہا کہ عمیر! تم کو معلوم ہے کہ میرا باپ مکہ کا رئیس تھا۔ مکہ کے سیکڑوں قضیئے اس کے متعلق تھے پھر ہمارا خاندان بھی بڑا خاندان ہے، اس کے جھگڑے بھی اس کے ذمہ تھے۔ اسکی مرنیکے بعد یہ تمام پریشانیاں میرے ذمہ ہوگئیں۔ میں نوجوان ہوں، کبھی ان جھگڑوں میں گرفتار نہ ہوا تھا۔ میری لیئے تو ایک ایک جھگڑا ایسا ہو رہا ہے کہ ساری عمر ختم ہو جاوے مگر جھگڑا طے نہ ہو پاوے مگر تم تو کہو کہ تمہاری ساری عزت خاک میں مل گئی کہ تمہارا جگر گوشہ قید میں ہے، اور تمہارے ادنےٰ سے اشارے میں مسلمانوں سے اسکا انتقام لیا جاسکتا ہے، اور تم اس انتقام کے لینے میں دوسروں کے محتاج بھی نہیں ہو۔ خود بڑے سے بڑا انتقام لیسکتے ہو۔ نہ صرف اس لیئے کہ تمہاری تلوار بے پناہ ہے، بلکہ اس لیئے کہ تمہارے متعلق کوئی جھگڑا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے مرنیکے بعد پڑا رہ جاوے۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارا اس طرح پریشان ہونا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اُن سب لوگوں کیلئے قابل تعجب ہے جو تم کو تمہاری صولت کو جانتے ہیں۔ میرے نزدیک تو مسلمانوں کا اقبال ہی کہ تم جیسے لوگ بھی عورتوں کی طرح چوڑیاں ہی پہنکر بیٹھنے کا ارادہ کر رہے ہو۔

عمیر کی آنکھوں سے غصہ کی وجہ سے شرارے نکلنے لگے اُس نے کہا صفوان تم کو میری اندرونی حالت کا علم نہیں ہے میں بہت سے لوگوں کا مقروض ہوں اور قرض بھی دو چار روپیہ کا نہیں سیکڑوں روپیہ کا ہے اگر میں اس وقت اپنے انتقام کیلئے کوئی حرکت کروں اور اس میں مارا جاؤں تو میرے مرنے کے بعد میرے تمام قرضخواہ ہم کو نام لے لیکر گالیاں دیا کریں گے اور کہیں گے کہ ہمارا قرض مار لیا۔ اور یہ ذلت ہم پر نسلاً بعد نسلٍ باقی رہے گی۔ پھر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں عیالدار ہوں اور تنہا میرے ذریعہ سے تمام خاندان کی پرورش ہوتی ہے۔ اگر میں مار اگیا تو سارے خاندان کے بچے بھیک مانگتے پھریں گے، اگر یہ اندرونی مصیبتیں مجھ پر نہ ہوتیں تو میں خدا کی قسم ان مسلمانوں کے سب سے بڑے شخص (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) کی جان کھلے بندوں لیتا پھر میں چاہے مارا جاتا یا بچ جاتا۔ خدا کی شان ہے کہ عمیر کا بیٹا اور ان فاقہ مستوں کے ہاتھ قید ہو۔ جن کی کل تک کوئی وقعت میرے نزدیک نہ تھی۔ صفوان نے کہا کہ عمیر جوش کی بات نہ کرو ہوش کی بات کرو۔ اگر فی الواقع تم کو اس ذلت کا کوئی احساس ہے اور قرض اور عیال کی فکریں تم کو عزت کی حفاظت سے روکتی ہیں تو میں تمہارا معاون ہوں۔ میں تو اپنا انتقام پھر کسی وقت لیکر ہونگا۔ مگر تم اپنی اس ذلت کو ابھی دور کر لو تمہارا سارا دَین اسی وقت سے میرے

ذمہ ہے۔ اور اسی طرح تم زندہ رہو یا مارے جاؤ تمہارے سارے خاندان کی پرورش بھی میرے ذمہ ہے جاؤ تم اپنا بدلہ اُن سے لو، اپنی عزت میں بٹہ نہ لگنے دو۔ عمیر یہ سُنکر پھولے نہ سمایا۔ اسکو تو شرارت کا موقع ملنا ضروری تھا۔ اب تو اس کے ساتھ مالی نفع بھی ہو گیا فوراً اُٹھا اور کہا صفوان اس قدر وعدہ اور کرلو کہ جب تک میری سعی کا نتیجہ ظاہر نہ ہو اُس وقت تک یہ راز کسی کو معلوم نہ ہو۔ صفوان نے کہا کہ تم اس سے بالکل اطمینان رکھو۔

عمیر اُٹھا اور گھر آکر تلوار پر دھار رکھی۔ اس پر صیقل کی۔ اس کو زہر میں بجھایا اور مختصر سا سامان سفر ساتھ لیکر مدینہ کو چلدیا اور بہت جلد مدینہ جا پہونچا۔ عمیر ایسے وقت مدینہ جا پہونچا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور چند اصحاب جنگ بدر ہی کا ذکر کر رہے تھے، اور قدرت خداوندی پر تعجب کر رہے تھے کہ کس طرح اس چھوٹی سی بے سروسامان جماعت کو ایسی پرشکوہ جماعت پر فتح عطا فرمائی۔

عمیر تلوار کا پرتلہ گلے میں ڈالے ہوئے مسجد نبوی کے دروازہ پر پہونچا۔ اُترنے کیلئے اونٹنی کو بٹھلایا ہی تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر عمیر پر پڑی اور انکی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ "خدا کا دشمن عمیر آگیا، یہ کُتا یہاں کیسے پہونچا۔ یقیناً یہ کسی بڑے فساد کے ارادہ سے یہاں پہونچا ہے۔ اس خبیث نے جنگ بدر میں بہت بڑا فتنہ قائم کر دیا تھا"۔ یہ فرماتے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کی کہ یارسول اللہ عمیر بن وہب اس شان سے آیا ہے کہ تلوار کا پرتلہ اسکے گلے میں ہے اگر وہ اپنے بیٹے کو فدیہ دے کر چھڑانے کے ارادہ سے آتا تو اس شان سے ہرگز نہ آتا مجھ کو تو یقین ہے کہ یہ خبیث کسی فساد کی غرض سے یہاں آیا ہے۔

حضور نے فرمایا کہ اس کو یہاں لاؤ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ اس کے پاس پہونچے اور اس کی تلوار کے پرتلے کو اس کی گردن میں اس طرح ڈالا جس طرح کہ قیدی کا گلا تسمے سے باندھتے ہیں اور اس شان سے لیکر اسکو خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر اسی پر بس نہ کی۔ بلکہ جس قدر انصار حضرت فاروق اعظم کے ساتھ بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ان سے کہا کہ اس خبیث کے پہونچنے سے پہلے تم لوگ حضور کی خدمت میں پہونچ جاؤ میں اس کو پکڑے ہوئے ہوں۔ تم اس کے ہاتھ پیر اور تلوار کی حرکت کی طرف پورا دھیان رکھنا۔ اور کسی چیز کی طرف خیال بھی نہ کرنا۔ مبادا یہ خبیث کسی قسم کی حرکت کرے۔ مجھ کو تو اس سے بہت ہی زیادہ کھٹکا ہے۔ یہ حضرات پہلے حضور کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ اسکے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ عمیر کو اس حالت سے گرفتار کئے ہوئے لائے۔

آپ نے حضرت عمرؓ اور عمیر کو ایسی حالت میں دیکھ کر فرمایا کہ عمرؓ! عمیر کو چھوڑ دو۔ عمیر قریب آؤ! اور قریب آؤ!

عمیر آپکے آواز کو سن کر قریب جا بیٹھا اور کہا کہ انعمو صباحاً[۵] (صبح خوشی سے گزرے) آپ نے فرمایا کہ تمہارے اس

سلام سے بہت اچھے سلام کا طریقہ خداوند عالم نے ہم کو عطا فرمایا ہے۔ ہم کو دنیا میں اس طریقہ پر سلام کرنے کو

فرمایا ہے جس طریقہ پہ دار آخرت میں اہل جنت سلام کیا کریں گے۔ اچھا عمیر! یہ تو بتاؤ کہ اس وقت تم کس ارادہ

سے آئے ہو؟ عمیر نے کہا کہ میرا لخت جگر آپکے رفقا کے ہاتھوں میں قید ہے۔ میں اس قیدی کے لیئے حاضر ہوا تھا

یہ لوگ تو بہت زیادہ فدیہ مانگتے ہیں اس قدر فدیہ ہمارا سارا خاندان مل کر بھی ادا نہیں کر سکتا چہ جائے کہ

میں اکیلا اسلیئے میں خود حاضر خدمت ہوا کہ میں کیسا ہی سہی لیکن آپ کی سہولت اخلاق آپ کو مجبور کرے گی

کہ آپ میرے اور بچے کے حال پر رحم فرماویں۔ آپنے فرمایا کہ اگر یہی بات ہے تو عمیر! تمہارے پاس یہ تلوار اس

طرح کیوں ہے، گویا کہ کوئی سپاہی میدان جنگ میں حملہ کی تیاری کر کے جا رہا ہے اور دشمن پر حملے کے وقت

کا منتظر ہے۔ عمیر نے ندامت آمیز طریقہ پر سر جھکایا اور چاہتا تھا کہ کوئی جواب دے کہ آپنے جواب کا انتظار

کیئے بغیر فرمایا کہ عمیر! خداوند عالم تمہاری ان تلواروں کو روسیاہ کرے تم نے یہ بھی دیکھا کہ تمہاری یہ تلواریں

ہمارے مقابلہ میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکیں۔ اب تم سچ سچ بتادو کہ تم اس ہیئت سے یہاں کیوں آئے ہو؟

عمیر نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ پھر کہا کہ میں تو اسی لیئے حاضر ہوا تھا کہ اپنے قیدی بیٹے کے متعلق آپسے گفتگو کروں۔ آپنے

فرمایا کہ زور سے کہہ دینے سے واقعہ نہیں بدل سکتا ہے۔ سنو! تم اور صفوان بن امیہ مکہ میں فلاں جگہ بیٹھے

اور تم نے اپنے مقتول روسائے مکہ کا ذکر کیا، اور یہ بھی ذکر کیا کہ ان کی موت کتے کی موت ہوئی کہ وہ ایک

گڑھے میں یکے بعد دیگرے ڈال دیئے گئے۔ اور تم نے کہا کہ اگر میرے اوپر بہت سا قرض نہ ہوتا، بال بچوں

کا خرچ میرے ذمہ نہ ہوتا تو میں خود جاکر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرتا اور یاد رکھو کہ قادر مطلق تمہارے اس

ارادہ کو ہرگز ہرگز پورا نہ ہونے دے گا۔

عمیر نے یہ تمام تفصیل سنی تو اس کا چہرہ فق ہو گیا اور بے اختیاری طریقہ پر اس کی زبان سے نکل گیا

کہ بے شک آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، ہم نے اس وقت تک تو آپ کی تکذیب کی جب تک کہ آپنے

اور ساری خبریں ہمارے سامنے بیان کیں۔ لیکن یہ بات تو ایسی ہے کہ صفوان اور عمیر کے سوا تیسرے شخص کو اسکی

خبر ہی نہیں ہے۔ خدا کی قسم مجھکو اس کا یقین ہے کہ اس خبر کو آپ تک پہونچا دینے والا بجز خدا کے کوئی دوسرا

---

[۵] یہ جاہلیت کے زمانہ کے الفاظ تھے جو بطور سلام کے استعمال کیئے جاتے تھے۔ شائد اس کا صحیح ترجمہ گڈ مارننگ ہو۔

نہیں ہو سکتا۔ اور میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اپنا لآباؤ کے لیئے دوزخ میں جانے کو حاضر ہوا تھا۔ مگر خدا نے مجھ کو اسلام عطا فرما کر جنت کا مستحق بنا دیا اور اس کے بعد پھر بآواز بلند توحید و رسالت کی شہادت دی۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ان کو ضروریات دین کی تعلیم دو اور قرآن پڑھایا کرو اور ان کے بیٹے کو بھی چھوڑ دو چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

عمیرؓ کو ابھی دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اپنی ساری جوانی اسمیں صرف کی کہ خدا کے نور کو بجھا دوں اور جو لوگ مسلمان ہوتے تھے۔ ان کو نا قابل برداشت تکلیفیں دیا کرتا تھا۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ آپ مجھے مکہ جانیکی اجازت دیدیں تاکہ میں اہل مکہ کو اسلام کی دعوت دوں۔ اگر مسلمان ہو جاویں فبہا ورنہ جس طرح میں مسلمانوں کے درپئے آزار رہا کرتا تھا۔ اسی طرح ان کفار کے بھی درپئے آزار رہوں۔ آپ نے تبلیغ اسلام کیلیئے اجازت دی۔ عمیرؓ مکہ پہونچے۔ صفوان کو یقین تھا کہ عمیر کا وار خالی نہ جاوے گا۔ اس لیئے مکہ سے عمیر کی روانگی کے بعد ہی اس نے خاص خاص موقعوں پر کہنا شروع کر دیا تھا کہ عجب نہیں کہ اس رنج کے زمانہ میں کسی دل خوش کن واقعہ کی خبر ہم سب سُن لیں جس کی وجہ سے جنگ بدر کا رنج و غم دلوں سے جاتا رہے۔ اور اس خبر کے سُننے کے شوق میں بستر پر راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں مکہ کے آئندہ بڑے بڑے مجامع میں یہ کہہ سکوں گا کہ تم سب کی شوکت اور ساز و سامان نے وہ نہ کیا جو میری اس تدبیر نے کرلیا۔ جو کہ میں نے مکہ میں بیٹھے بیٹھے کرلی۔ اور اس بنا پر اہل مکہ کو میری عقلمندی کا اندازہ ہو گا۔ اور پھر مکہ کی سیادت میرے ہی لیئے ہو گی، عمیرؓ کے جانے کے بعد ہی سے آنے جانے والوں سے عمیر کا حال دریافت کرتا رہتا تھا اور اس جستجو میں اسکو تقریباً عمیرؓ کی ہر حرکت و سکون کا علم ہو جاتا تھا۔ بالآخر اسکو معلوم ہوا کہ عمیرؓ مسلمان ہو گئے۔ یہ سُنکر اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دل کو سمجھا لیا کہ یہ بھی اس کی مکاری ہو گی کہ اس حیلے سے محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر قابو پالے مگر جب یہ سُنا کہ عمیرؓ واپس آرہے ہیں۔ تو صفوان کو یقین ہو گیا اور قسم کھائی کہ نہ میں عمیر کی صورت دیکھوں نہ دکھاؤں نہ اس سے کبھی بات کروں۔

عمیر اگر اپنی تدبیر میں کامیاب ہو جاتے تو صرف یہ ہی نہ ہوتا کہ قرض کے بار گراں سے نجات ہو جاتی، بلکہ روسائے مکہ بھی بہت زیادہ ممنون ہوتے کیونکہ جس کام کو وہ سب مل کر نہ کر سکے تھے ان اکیلے نے اس کو انجام دے لیا، مگر سچ یہ ہے کہ رسول کی غلامی کا شرف دنیاوی ہزار شرافتوں پر غالب تھا۔

(باقی)

”ضمیمۂ دفع بعض الشبہات“

(از حضرت حکیم الامت دامت فیوضہم و برکاتہم)

[حضرت والا کی ایک تحریر ”دفع بعض الشبہات“ کے عنوان سے ربیع الثانی کے ”الفرقان“ میں شایع ہوئی تھی ــــ اور ایک پیدا ہونیوالی غلط فہمی کے دور کرنے کیلئے اس کے ساتھ بطور تذئیل چند سطریں ناچیز مدیر الفرقان نے بھی لکھی تھیں اس کے ملاحظہ کے بعد حضرت نے اپنے اصل مضمون میں بھی اسی مقصد کیلئے ذیل کا اضافہ فرمایا ہے ــــ اس اضافہ کی نقل کے ساتھ حقیر سراپا تقصیر کے نام جو سترفنامہ رقام فرمایا گیا ہے اس میں ارشاد ہے۔

”...... اپنی تحریر کے بعض مقامات کی شرح ”الفرقان“ میں پڑھ کر مسرور ہوا اور اس سے موافقت کر کے اصل عبارت میں بھی اضافہ کر دیا۔ اور حسب معمول ترجیح الراجح میں بھی درج کرا دیا اس کا مسودہ ...... مرسل ہے“

اضافہ کے متعلق حضرت کی وہ تحریر گرامی یہ ہے]

میرا رسالہ (دفع بعض الشبہات) الفرقان بریلی بابت ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ میں مع شرح بعض مقامات کے شایع ہوا ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ میرے رسالہ میں ایک احتمال کا حکم صراحۃً ذکر کرنے سے رہ گیا ہے۔ چونکہ وہ شرح میرے اعتقاد کے موافق ہے اسلیئے میں اسکو ملخصاً رسالہ میں اب بڑھائے دیتا ہوں اور اسکے ساتھ بعض حاشی نظائر بھی لکھے دیتا ہوں۔ اور شائقین بسط الفرقان میں ملاحظہ فرمادیں اور اس اضافہ کا موقع رسالہ کی اس عبارت کے بعد ہے ” یہ معنی ہیں دونو جماعتوں سے کام لینے کی اور دونوں جماعتوں کے بالاتفاق کام کرنیکے“ ــــ وہ اضافہ یہ ہے ”البتہ اگر کسی وقت کوئی جماعت اہل سیاست کی ایسی نہو کہ علماء سے احکام پوچھ کر عمل کیا کرے جیسا اس وقت غالب ہے تو اس وقت علما ایسی جماعت کے پیدا ہونیکے منتظر نہ رہیں ورنہ محبان دُنیا دینی مقاصد کو تباہ کر دینگے بلکہ وہ خود اپنے میں سے ایسی جماعت بنادیں جو علماً و عملاً سیاست اور شریعت کے جامع ہوں مگر یہ حکم کچھ سیاست مُدنیہ کیساتھ خاص نہیں بلکہ سیاست بدنیہ یعنی طب بلکہ اسباب معاش بھی جن سے جتنے فرض کفایہ ہیں مثل تجارت و زراعت سب کا یہی حکم ہوگا البتہ جس چیز کا ضرر دین میں قریب ہو اسمیں دخل اصلاحی کا وجوب ایسی چیز میں دخل اصلاحی کی وجوب سے اقوی و اوکد ہوگا جس کا ضرر دین میں قریب نہ ہو۔ اور ان سب مقاصد کی اصلاح کیلئے خصوص حفاظت دین کیلیئے جماعت کا انتظام کرنا ہر حال میں مشروط ہوگا استطاعت کیساتھ ــــ یہ تو ایک تحقیق کلی ہے اس سے آگے کچھ جزئیات ہیں جنمیں کلام کچھ متفق علیہ اور کچھ مختلف فیہ اپنے محل میں مبسوط و منضبط ہے۔ نہیں ایک مسئلہ استطاعت کا بھی ہے“ یہ اضافہ ختم ہوا آگے عبارت سابقہ بعینہا باقی ہے اور یہ سلسلہ الی آخر الرسالہ“

[اب سے کچھ دنوں پہلے ہانسوٹ ضلع بھڑوچ (گجرات) سے ۲ دو سوال بغرض استفتا آئے تھے ان کا جو جواب لکھا گیا تھا بغرض تعمیم فائدہ اس کو "الفرقان" میں شائع کیا جاتا ہے، "مدیر"]

سوال اوّل

ہمارے یہاں حیلہ میّت نکالا جاتا ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ میت کا جنازہ مکان کے باہر رکھ کر ایک من بارہ سیر گیہوں اور ایک قرآن شریف مکان سے لایا جاتا ہے بعد میں گاؤں کے مُلاجی صاحب گاؤں کے فقیر کو بلا کر اس کو اس طرح کہتے ہیں کہ "اس میت نے بلوغت کے بعد جتنے گناہ کیے ہوں تو خدا کے واسطے اپنے ذمہ لیتا ہے؟ ——— تو وہ فقیر ان گناہوں کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ بعد میں وہ گیہوں اور قرآن شریف کا ہدیہ سوا روپیہ فقیر اور ملّاجی آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کا حیلہ کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور اس کا کرنے والا کیسا ہے؟

جواب

لا الٰہ الا اللہ، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا تھا:۔

بدء الاسلام غریبًا وسیعود غریبًا یعنی اسلام اپنے دور آغاز میں بھی دنیا کے لئے اجنبی غیر معروف اور نامانوس تھا، اور بعد میں بھی وہ ایسا ہی اوپرا اور نامعروف ہوکر رہ جائے گا ———

اسلام کی غربت و نامعروفی اور اس کی اجنبیت و ناموسی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ خود اسی کے نام لیوا اسی کے نام پر۔ اور اسی کا کام سمجھ کر ایسی ایسی خرافات کرتے ہیں جس سے کفر و کافری بھی شرمائے۔

قرآن شریف نے اگلی اُمتوں کے گمراہوں کے متعلق فرمایا ہے اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا، اور اِتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَهْوًا، (یعنی انھوں نے اپنے دین کو کھیل کھلونا بنا رکھا ہے) دین خدا کے ساتھ اس سے بڑھکر اور کیا کھیل بازی اور گستاخی ہوسکتی ہے کہ اس کے "قانون جزا و سزا" کے ساتھ یہ تلعب اور یہ مسخرہ پن کیا جائے۔

اگر شرعی اوامر و نواہی، خدائی مطالبات اور الٰہی فرائض کی بس اتنی ہی حقیقت ہے کہ مردہ پیچھے سوا روپیہ کے حساب سے بدکردہ ایک نسخہ قرآن، اور ایک من بارہ سیر گیہوں کی ادائیگی ان سے فارغ الذمہ کر دیتی ہے تو سارا دین بلکہ وحی و پیغمبری کا سارا سلسلہ معاذ اللہ ایک کھیل تماشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا قرآن پاک تو جابجا صاف کہتا ہے:۔

لا تجزی نفس عن نفسٍ شیئًا ولا یوخذ منها عدل (اور ایک جگہ ہی) "لا یقبل منها عدلٌ"،	کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے بدلہ نہیں سکتا اور نہ کسی نفس کی طرف سے معاوضہ لیا جائے گا

نیز وہ پوری وضاحت اور صراحت کے ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہے:۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (نجم)	کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر نہیں لے سکتا۔

پس جو لوگ گناہوں کی خرید و فروخت کا یہ کاروبار کرتے ہیں اور اس عقیدہ کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس طرح مرنے والے کے گناہ اس ملّا یا فقیر پر لد جاتے ہیں اور مرنے والا بے گناہ ہوجاتا ہے وہ نہ صرف عاصی اور گنہگار ہی ہیں بلکہ قرآن پاک کی ان واضح دفعات کے منکر بھی ہیں۔ معاذ اللہ۔

درحقیقت یہ نظریہ کہ (کوئی کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور کسی معاملہ یا معاہدہ کی بنا پر ایک کے گناہ دوسرا اپنے ذمہ لے سکتا ہے) بعض کافروں کا تھا جس کی قرآن پاک نے نہایت صراحت اور پورے زور کے ساتھ تردید اور تکذیب کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس طرح جو لوگ دوسروں کے گناہ

اپنے ذمہ لیتے ہیں وہ دوسروں کا بوجھ تو کچھ بھی ہلکا نہیں کرتے البتہ اپنی اس حرکت اور اس جرأت بیجا کی وجہ سے اپنے گناہوں میں ضرور اضافہ کر لیتے ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ہے :-

وقال الذین کفروا للذین اٰمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم وما ہم بحاملین من خطایاھم من شیء انھم لکٰذبون ۝ ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم ولیسئلن یوم القیٰمۃ عما کانوا یفترون ۝

اور کافروں نے مسلمانوں سے کہا تم ہمارا کہنا مانو اور ہماری راہ چلو تمہارے سارے گناہ ہم اپنے سر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اُن کے گناہوں میں سے ذرا بھی نہیں لے سکتے وہ بالکل جھوٹ بکتے ہیں۔ ہاں! ان پر اپنے گناہوں کے ساتھ اور گناہوں کا بوجھ بھی لدھے گا اور قیامت کے دن ان سے اس افترا پردازی کی ضرور بازپرس ہوگی۔

افسوس یہ شدید اور کافرانہ گمراہی "امت مسلمہ" میں بھی راہ پاگئی یہاں تک کہ ایک مسلمان کو اس بارے میں یہ استفتا کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہے کہ "یہ حیلہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ —— اور اس کا کرنے والا کیسا ہے؟ حالانکہ ایک مسلمان کو اگر ضرورت ہوسکتی تھی تو یہ پوچھنے کی ہوسکتی تھی کہ اس فعل اور اس کے فاعلوں پر خدا کی کتنی لعنت ہوتی ہے؟

سوال دوم

"عبدالنبی" اور "عبدالرسول" نام رکھنا کیسا ہے؟ بعض لوگ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَائِکُمْ.. میں "مِنْ عِبَادِکُمْ" کے لفظ سے ان ناموں کے جواز کیلئے استدلال کرتے ہیں، اس مسئلہ پر ذرا مفصل روشنی ڈالی جائے؟

جواب

اسلام "دین التوحید" ہے اور اس کے اُن خصائص میں سے جن کی وجہ سے اس کو دوسرے ادیان پر تکمیلی فوقیت حاصل ہے ایک اہم ترین خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے توحید کے استحکام کے لئے صرف شرک اور موجبات شرک ہی کے استیصال پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جو چیز اور جو کام کسی طرح بھی شرک کا سبب بن سکتے تھے یا جن امور میں شرک کا کوئی شائبہ اور واہمہ بھی ہوسکتا تھا اس نے اُن پر بھی

کڑی بندش عائد کردی ہے، جس شخص نے قرآن و حدیث کا بصیرت کے ساتھ مطالعہ کیا ہوگا اُس کے علم میں اسلام کی وہ تمام بندشیں تفصیل کے ساتھ ہونگی جو ایسی چیزوں پر عائد کی گئی ہیں جن کے کسی طرح منجرالی الشرک ہونے کا خیال ہو سکتا تھا مثلاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے "ما شاء اللہ و شاء محمد" کہنے سے بھی صحابہ کو منع فرمادیا، اور حیات مبارکہ میں اپنی ذات مقدسہ کو اور بعد وفات اپنی قبر منور کے لیئے تعظیماً سجدہ کرنا بھی حرام قرار دیا، بلکہ اپنے لیئے قیام تعظیمی سے بھی صحابہ کو منع فرما یا۔

علی ہذا دفع امراض کیلئے کانسی پیتل کے کڑے پہننے، گلے میں الٹے فلیتے ڈالنے، منکا لٹکانے اور تانت باندھنے کا مشرکین میں جو رواج تھا، اُمت کو شائبہ شرک سے بچانے کیلئے ان چیزوں سے بھی آپ نے ممانعت فرمادی۔

اسی طرح آفتاب پرستوں کی ظاہری اور صوری مشابہت نیز آفتاب پرستی کے شبہ اور شائبہ سے بھی اپنی اُمت کو بچانے کے لیئے طلوع، غروب اور زوال کے وقت نماز ادا کرنے اور خدا کے لیئے سجدہ کرنے کو بھی منع فرمادیا۔ قبروں کو پختہ بنانے ان پر عمارتیں بنوانے، اور ان پر چراغاں کرنے سے یکسر امت کو روکدیا، اور اس بارہ میں نہایت سخت احکام نافذ کیئے، یہ سب اس لیئے کہ انہی راہوں سے اُمت میں شرک گھس سکتا تھا یا کم ازکم شرک کا شائبہ آسکتا تھا۔

جس شخص نے اسلام کے مزاج کو کچھ بھی سمجھا ہے اور ان احکام کی روح اور لم پر کچھ بھی غور کیا ہے وہ ایک لمحہ کے لیئے بھی اس میں شک نہیں کرسکتا کہ "عبدالنبی" "عبدالرسول" "عبد المصطفےٰ" جیسے نام رکھنا اسلام کی روح کے خلاف جنگ اور "اسلامی توحید" کے مقتضا کے قطعاً منافی ہے۔ اور کسی "مولوی" "ملا" کا "دلیلوں" اور "تاویلوں" سے اُس کا جواز یا استحسان نکالنا افسوسناک بے راہ روی اور اُن گمراہیوں میں سے ایک گمراہی ہے جنکے "امت مسلمہ" میں پھیلنے کی پیشین گوئی خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی تھی۔

لتتبعنّ سنن من کان قبلکم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع (بخاری)	تم ضرور بالضرور اگلے گمراہوں کے طور طریقوں کی قدم بقدم پیروی کروگے۔

کون نہیں جانتا کہ مشرکین عرب عبد وُد، عبد العزیٰ، اور عبد شمس قسم کے نام رکھتے تھے مشرکین ہند بھی اپنے بچوں کے نام گنگا داس، جمنا داس، اور لچھمن داس وغیرہ رکھتے ہیں (داس کے معنی

قریب قریب وہی ہیں جو عبدؔ کے ہیں) عیسائیوں میں عبدالمسیح بہت رواج یافتہ اور مقبول نام ہے، بس جو لوگ عبدالنبی، اور عبدالرسول جیسے نام رکھتے ہیں وہ عملاً ان حاملانِ شرک ہی کی پیروی کرتے ہیں — یہ مانا کہ عبدؔ کے معنی مملوک غلام کے بھی ہیں اور کبھی اُس سے محض خادم بھی مراد ہوتا ہے، اور اسی لیے مجرد اس قسم کے نام رکھنے سے ہم کسی کو "مشرک" (بالمعنی المصطلح) اور خارج از اسلام نہیں کہتے اور نہیں کہہ سکتے لیکن ایہام معنیٔ شرک و شائبہ شرک اور تتبع طریقِ مشرکین سے اس کو خالی بھی نہیں کہا جا سکتا اور اس لیے اس کے عدم جواز میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا — جو دین "ماشاء اللہ وشئت" اور "ماشاء اللہ وشاء محمد" جیسی تعبیرات کو برداشت نہیں کرسکتا وہ "عبدالنبی" "عبدالرسول" اور "عبدالمصطفےٰ" جیسے ناموں کو کیونکر برداشت کرسکتا ہے۔ اور جس پیغمبر نے غلاموں اور باندیوں کے لیے بھی عَبدِی اور اَمَتِی کے لفظ سے خطاب کرنے سے لوگوں کو منع فرمایا[ؔ] ہو (حالانکہ اُس میں مشکل ہی سے کسی کو معنی شرک کا وہم ہوسکتا ہے) اُس پیغمبر کی لائی ہوئی شریعت میں اس قسم کے نام رکھنے کی کس طرح گنجائش ہوسکتی ہے جنہیں امکانِ وہم شرک سے گزر کر "ایہام شرک" اور پھر ایک "رسم کافری" کا اتباع بھی ہو؛

ہاں تو جس شخص نے مغز شریعت کو کچھ بھی پہچانا ہے اُس کو اس میں شبہ نہیں ہوسکتا کہ اگر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی شخص ایسا نام رکھتا تو آپ ضرور اس کو منع فرماتے جس طرح کہ "ماشاء اللہ وشئت" اور "ماشاء اللہ وشاء محمد" سے منع فرمایا بلکہ اس کے بارہ میں آپ کی نہی اشد ہوتی کیونکہ بنسبت اس کلمہ کے شرکیہ معنی کا ایہام ان ناموں میں بدرجہا زیادہ ہے کیونکہ ناموں میں عبدیت کی نسبت اپنے "معبود" ہی کی طرف تمام ملتوں کے عرف میں شائع ذائع ہے اور عبد بمعنی مملوک یا بمعنی خادم کے استعمال کا رواج کسی قوم اور کسی ملت کے ناموں میں معلوم نہیں،

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ ناموں سے جواز کے لیے آیت کریمہ "وانکحوا الایامی منکم

[ؔ] ایک بار کسی صحابی کی زبان سے سلسلہ کلام میں نکل گیا "ماشاء اللہ وشئت" (جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) تو آپ کو سخت غصہ آیا، اور فرمایا "اجعلتنی للہ ندًا بل ماشاء اللہ وحدہ" (تم نے مجھے خدا کے ہمسر بنا دیا، بلکہ یوں کہو کہ جو تنہا خدا چاہے) ایک دوسری حدیث میں ہے آپ نے فرمایا "میں تم سے یہ کلمہ ("ماشاء اللہ وشاء محمد") سنتا ہوں تو مجھے اس سے تکلیف ہوتی ہے لہذا تم یہ مت کہا کرو۔ کنز العمال ج ۱۳ ص ۲۶

[ؔ] صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے لوگوں کو اس سے منع فرمایا کہ اپنے غلاموں باندیوں کو "عبدی" "امتی" سے خطاب کریں ۱۲

والصالحین من عبادکم" سے سند پکڑنا کیسی شدید جہالت ہے عام محاورات اور تعبیرات میں زبان عرب کے اندر غلاموں کے لئے "عبد" کا استعمال شائع ذائع ہے اور اس لئے ایسے مواقع میں معنی شرکیہ کا وہم بھی کسی کو نہیں ہوسکتا بخلاف "عبد النبی" اور "عبد الرسول" جیسے ناموں کے، کیونکہ ناموں میں عبد بمعنی غلام یا بمعنی خادم کا استعمال متعارف نہیں ہے اس لئے وہاں شرک کا ایہام ضرور ہے اور اس فرق سے انکار کوئی جاہل معاند ہی کرسکتا ہے۔

خیر یہ تو اصولی بحث تھی اور ایسے مسائل میں غور و بحث کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے، لیکن چونکہ اس قسم کے شرکیہ نام رکھنے کی بدعت اب سے بہت پہلے مسلمانوں میں آچکی تھی اس لئے اُن علماء کرام کی تصنیفوں اور فتووں میں بھی ان ناموں کے حرام و ناجائز ہونے کی تصریح حسن اتفاق سے موجود ہے جن کو یہ گمراہ اور "شرک نواز" مدعیان اسلام بھی معتبر اور مستند مانتے ہیں۔ چند تصریحات ملاحظہ ہوں:-

شیخ علی قاری حنفی "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" میں زیر حدیث احب اسمائکم عند اللہ عبد اللہ وعبد الرحمٰن" ارقام فرماتے ہیں:-

ولا یجوز نحو عبد الحارث ولا عبد النبی ولا عبرۃ بما شاع بین الناس

عبد الحارث اور ایسے ہی عبد النبی جیسے نام رکھنا جائز نہیں ہے اور لوگوں میں جو وبا پھیل گئی ہے اُس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اور یہی علی قاری "شرح فقہ اکبر" میں فرماتے ہیں:-

واما ما اشتہر من التسمیۃ بعبد النبی فظاہرہ کفر الا ان ارادبالعبد المملوک"

اور یہ جو عبد النبی نام رکھنا شایع ہوگیا ہے تو اس کا ظاہر تو کفر ہے مگر یہ کہ "عبد" سے مملوک مراد ہو۔

واضح رہے کہ یہ اشتنا حکم کفر سے ہے ورنہ عدم جواز بہر صورت ہے، جیسا کہ پہلی عبارت سے ظاہر ہے۔

اور ابن حجر مکی شافعی منہاج کی شرح میں فرماتے ہیں:-

وبحرام ملک الملوک لان ذالک لیس لغیر اللہ وکذا عبد النبی وعبد الکعبۃ والدار وعلی والحسن لایھام التشریک	(اور "ملک الملوک" (لقب یا نام اختیار کرنا) حرام ہے کیونکہ یہ شان خدا کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ اور ایسے ہی عبد النبی وعبد الکعبہ اور عبد الدار اور عبد علی، اور عبد الحسن (یہ سب نام رکھنے بھی حرام ہیں) ایہام شرک کی وجہ سے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ "حجۃ اللہ البالغہ" میں بعض خاص قسم کے مشرکین کی یہ عادت وحالت بیان کرنے کے بعد کہ وہ عبد المسیح اور عبد العزیٰ جیسے نام رکھتے ہیں فرماتے ہیں:۔

وھذا مرض جمھور الیھود والنصاریٰ والمشرکین وبعض الغلاۃ من منافقی دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی یومنا ھذا۔	اور یہ عام یہود ونصاریٰ، اور تمام مشرکوں کی بیماری ہے، اور ہمارے زمانہ کے بعض غالی لوگ (جن کو دین محمدی کا منافق کہنا چاہیئے وہ بھی) اس میں گرفتار ہیں۔

اور یہی شاہ صاحب قدس سرہ اپنے ترجمہ قرآن (فتح الرحمٰن) میں آیت "فلما آتٰھما صالحا جعلا لہ شرکاء" پر فائدہ لکھتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:۔

"وازیں جا دانستہ شد کہ شرک در تسمیہ نوعے است از شرک چنانچہ اہل زمان ما غلام فلاں وعبد فلاں نام نہند۔ واللہ اعلم"۔	اور یہاں ہی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ناموں میں شرک بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے جیسا کہ ہمارے زمانہ کے لوگ غلام فلاں اور عبد فلاں نام رکھتے ہیں۔

اور حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر فتح العزیز میں زیر آیت "لاتجعلوا للہ اندادا" وجوہ شرک بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ازانجملہ اند کسانیکہ در نام نہادن خود را بندۂ فلاں وعبد فلاں میگویند وایں شرک در تسمیہ است۔	اور انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے نام رکھنے میں بندۂ فلاں اور عبد فلاں کہتے ہیں اور "یہ شرک فی التسمیہ" ہے

اور اصل یہ ہے کہ جس کے دل میں اسلام کی توحید رچ چکی ہو اور اصل توحید کا رنگ جس پر چڑھ چکا ہو وہ کسی حال میں اللہ کے سوا کسی اور کی "عبدیت" پر برائے نام بھی راضی نہیں ہو سکتا صبغۃ اللّٰہ ومن احسن من اللّٰہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون"

جو لوگ ان امراض میں عملاً گرفتار ہیں اور جو "علم فروش" اپنی "منطقی" تاویلوں یا تشقیقوں سے ایسی گمراہیوں کے جواز کے لیے راہیں نکال کر لوگوں کی گمراہی میں اپنے بدترازجہل علم سے مدد کرتے رہتے ہیں درحقیقت وہ ظالم اس "امانت الٰہیہ" کے اصل ذوق ہی سے محروم ہیں جس کا نام "توحید" ہے۔

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا۔

وثبتنا اللہ علی الصراط المستقیم

اہل بدعت کے رد میں اکابر علمائے اہلسنت کی قابل دید کتابیں

براہین قاطعہ میلاد، عرس، فاتحہ، مروجہ تیجہ، دسواں وغیرہ بدعات مروجہ کی تحقیق میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور و مبسوط کتاب ہے قیمت عہ رعایتی ۸ؔ

طریقۂ مولد میلاد کا صحیح اور جائز طریقہ اس میں بتلایا گیا ہے۔

فتاویٰ میلاد شریف اس میں مروجہ میلاد کے متعلق اکابر علمائے ہند کے مدلل اور مستند فتاوے درج ہیں قیمت ۲ ر رعایتی ۱۰ ر

تنشیط الاذان اذان خطبہ کے اندرون مسجد مشروع ہونے کے ثبوت میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا لاجواب رسالہ بہت کم یاب ہے قیمت رعایتی ۱۰ ر

النفائس المرغوبہ دعاء ثانیہ کے بدعت و منکر ہونے کا ثبوت از حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قیمت صرف ۸ ر رعایتی ۷ ر

دلیل الخیرات تجہیز و تکفین و ایصال ثواب کی مروجہ بدعات کارد قیمت ۱۰ ر

تحریری مناظرہ شرک و بدعت کے رد میں مختصر اور بہت مفید رسالہ قیمت ۱۰ ر

الشہاب الثاقب خان صاحب بریلوی کے رد میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث کا بہترین اور لاجواب رسالہ ہے قیمت ۸ ر رعایتی ۶ ر

التصدیقات بریلوی خرافات کے رد میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا قابل دید رسالہ ہے علمائے دیوبند کے عقائد حقہ کا مدلل بیان اور علمائے حرمین شریفین و علمائے مصر و شام کی تائیدات قیمت ۶ ر رعایتی ۵

تزکیۃ الخواطر اس نے خان صاحب بریلوی کے جعلی فتوے "حسام الحرمین" اور ان کی مایۂ ناز کتاب "تمہید ایمان" کی دھجیاں اُڑا کر ان ابلہ فریبیوں کا پردہ چاک کر دیا ہے از حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب قیمت ۴ ر رعایتی ۳ ر

اسکات المعتدی ابن شیر خدا کی مناظرانہ قابلیت کا شاہکار جس نے خانصاحب بریلوی کے چھکے چھڑا دیئے اس میں خانصاحب اور ان کے حواریوں سے قریباً ڈیڑھ سو ۱۵۰ مناظرانہ سوالات کیے گئے ہیں جن کی لاجوابی کا داغ خانصاحب اپنے ساتھ قبر میں لے گئے ضرور ملاحظہ فرمائیے قیمت ۴ ر ۳ر

اہلہد عش سے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کے قابل دید مناظرے کم تعداد میں باقی ہیں

نصرت آسمانی بر فرقۂ رضاخانی قیمت ۵ ر نشر الملہاد قیمت ۔

ہر قسم کی کتابوں پر صرف آخر رمضان تک خاص الخاص رعایت ہوگی

بالخصوص مکتبۂ الفرقان کی مطبوعات کا مکمل سٹ صرف نصف قیمت میں حاصل کیجئے

جو حضرات پورا سٹ (یعنی ہماری تمام مطبوعات) لینا نہ چاہیں بلکہ ان میں سے صرف دو چار دس پانچ کتابیں ان کو درکار ہوں تو بوقت ذیل کی انتہائی رعایتی قیمتوں پر یہ کتابیں دی جائیں گی

آپ ملاحظہ فرمائیں بعض کی قیمتوں میں ہم نے نصف کی تخفیف کردی ہے اکثر میں تہائی کی اور جنمیں کسی وجہ سے گنجائش ہی نہ تھی ان میں بھی چوتھائی کی

ہر قسم کی دوسری کتابیں بھی اس وقت خاص الخاص رعایت پر دی جائیں گی

مکمل رعایتی فہرست الگ بشکل اشتہار شایع کی جارہی ہے

اس زریں موقع سے خود فائدہ اٹھائیے اور الفرقان کی مالی مشکلات میں مدد فرمائیے

ہماری مطبوعات کے محض نام اور قیمتیں یہاں دیکھئے اور تعارف ٹائٹل کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیے

ہماری مطبوعہ سینتالیس کتابیں

نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی	نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی	نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی
النبی الخاتم مجلد سنہری	عہ	۱۲ر	توحید و شرک	۱۰ر	۱ر	مناظرہ بریلی (فتح بریلی)	۸ر	۵ر
مجدد الف ثانی نمبر قسم اول	عہ	۱۲ر	اسلامی توحید } اول	۲ر	۱ر	مناظرہ گیا (ہدایت ربانی)	۸ر	۵ر
مجدد الف ثانی نمبر قسم دوم	عہ	۱۲ر	اسلامی توحید } دوم	۲ر	۱۰ر	مقامع الحدید	۶ر	۴ر
تذکار شہید یعنی شہید نمبر	۸ر	۶ر	ہماری گیارھویں } اول	۲ر	۱۰ر	تحریری مناظرہ	۱۰ر	؎
فتنہ رفض و تفضیلیت کے خلاف مجدد الف ثانی کا جہاد	۳ر	۲ر	ہماری گیارھویں } دوم	۱۰ر	۱ر	کوائف بمبئی	۲ر	۱ر
اسلام کا نظریہ سیاسی	۲ر	۱۰ر	حضرت مجدد الف ثانی اور اہل بدعت	۳ر	۲ر	جہنم کی بشارت	۳ر	۲ر
اسلام میں قربانی	۱ر	۰ر	مشائخ چشتیہ اور سماع مزامیر	۱ر	۰ر	الکوکب الیمانی	۲ر	۱ر
تمدن اسلام کا پیام	۱۰ر	۱ر	حاضر ناظر	۱ر	۰ر	نئے مجدد کا نیا ایمان	۱۰ر	؎
[illegible] اور علماء کا جرم عظیم	۳ر	۲ر	مسئلہ حیات النبی کی حقیقت	۱ر	۰ر	بریلوی کا نادان دوست	۰ر	ــ
اشتراکیت اور مذہب و اخلاق	۱ر	؎	شارع حقیقی } اول / دوم	۴ر / ۳ر	۲ر / ۲ر	مباحثہ آریہ سماج بریلی	۳ر	۲ر
خاکسار تحریک مذہب سیاست کی روشنی میں	۱۰ر	۷ر	بوارق الغیب } اول / دوم	عہ / عہ	۱۲ر / ۱۱ر	حدوث روح و مادہ	۱۰ر	؎
خاکسار تحریک کیوں قابل قبول نہیں	۱ر	؎	مروجہ محافل میلاد پر تبصرہ	۱۰ر	؎	عدم الخبیل	۳ر	۲ر
[illegible] کا مفہوم جو علامہ مشرقی نے سمجھا اور سمجھایا	۱ر	۰ر	معان النظر فی اذان القبر	۳ر	۲ر	گفتگوئے مذہبی	۳ر	۱۰ر
نماز اور خطبہ کی زبان	۲ر	۱ر	تاریخ میلاد	۱۰ر	۷ر	ناظم مکتبۂ "الفرقان" بریلی یوپی		
داڑھی اور فطرت	۳ر	۱۰ر	تیجہ	۱۰ر	۱ر	سے طلب فرمائیے۔		
			احکام النذر الاولیاء اللہ	۲ر	۱ر			
			مناظرہ علم غیب } اول / دوم	۶ر / ۶ر	۴ر / ۴ر			

کتابوں کا آرڈر دیتے وقت قواعد مکتبہ کا ضرور لحاظ رکھا جائے اور اپنا نام و مکمل پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے۔ اگر زیادہ کتابیں منگوانی ہوں تو اسٹیشن کا نام بھی ضرور لکھئے

حضرات اکابر علماء دیوبند کی تصنیفات

اس وقت خاص الخاص رعایت سے فائدہ اُٹھائیے

ان کتابوں کا مفصل تعارف ناظرین کرام سے بارہا کرایا جاچکا ہے

نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی
تصانیف حضرت مولانا محمد قاسم بانی دار العلوم دیوبند رح		
تقریر دلپذیر طبع جدید	عہ	عہ
حجۃ الاسلام	۸/	۶/
انتصار الاسلام	۴/	.۴
آب حیات	ع/	[illegible]
قبلہ نما	۸/	۶/
مباحثہ شاہجہانپور	۷/	.۵
گفتگوئے مذہبی	۳/	۲/
الدلیل المحکم	۲/	.۱
توثیق الکلام	.۱	۱/
الحق الصریح	۱/	ث
تحذیر الناس	۳/	۲/
تحفہ لحمیہ	۱/	ث
تصفیۃ العقائد	۳/	۲/
جمال قاسمی	۱/	ث
فیوض قاسمی	.۴	۳
لطائف قاسمی	۲/	۱/
قصائد قاسمی	۳/	۲/
سوانح قاسمی	۳/	۱/
اسرار الطہارۃ	۳/	.۱
تصانیف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح		
فتاوی رشیدیہ کامل	۶ ع	۶ ع
کیا ہندوستان دار الحرب ہے؟	۳/	۲/
سبیل الرشاد	۳/	۲/
رد الطغیان فی اوقات القرآن	۱/	.
اوثق العری	.۱	۱/
قطوف دانیہ	.۱	۱/
فتوی احتیاط الظہر	.	.
الرای النجیح فی رکعات التراویح	۱/	ث

نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی
تصانیف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ		
ضیاء القلوب (فارسی)	۵	۴/
ضیاء القلوب ترجمہ اردو	۶/	۵/
غذائے روح	۵/	۴/
مثنوی تحفۃ العشاق	۲/	.۱
جہاد اکبر	.۱	۱/
گلزار معرفت	۲/	.۱
ارشاد مرشد مع فیصلہ ہفت مسئلہ	۲/	.۱
کلیات امدادیہ	۱۲/	۱۰/
تصانیف حکیم الامۃ حضرت تھانوی مدظلہ		
تفسیر بیان القرآن مکمل جدید	عہ	[illegible]
مسائل السلوک کامل	۴/	۶ ع ۸
حیات المسلمین مکمل مدلل	۱۲/	۹/
التکسیر فی اثبات التقدیر	۱۲/	۹/
تکمیل تعلیم الدین	۸/	۶/
شوق وطن	۴/	۳/
آداب معاشرت	۲/	۲/
صفائی معاملات	.۲/	۲/
حق السماع	.۲/	.۱
جزاء الاعمال	.۲/	۲/
زاد السعید	.۲/	۱/
الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد	۴/	۳/
القول البدیع	.۲/	۱/
القول الصواب	۲/	.۱

نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی
تصانیف حضرت مولانا میاں اصغر حسین صاحب مدظلہ		
نور المسلمین ۳/ رحمۃ علم الاولین	.۱	۱/
دست غیب ۲/ سہام بجواب شیرین	۲/	.۱
چہل حدیث ۳/ ۲/ رحمۃ رضوان	۱/	۱/
الجواب المتین باحادیث سید المرسلین	۵/	۴/
حیات خضر ۵/ ۳/ مولوی معنوی	۵/	۴/
الصالحات (نیک بیبیاں)	۵/	۴/
میراث المسلمین	۳/	۲/
مفید الوارثین	عہ	۱۵
بین الغایات	.۹	۷/
خطبات الاحکام	عہ	۱۲
انکام التجلی	۳/	۲/
اصلاح الرسوم	۶/	۵
قصد السبیل	۲/	.۱
فروغ الایمان	۴/	۳/
حقوق الاسلام	۱/	ث
حقوق العلم	۵/	۴/
آئینہ تربیت	۶/	۵/
جمال القرآن محشی	۳/	۲/
آداب التبلیغ	.۳	.۲
اشرف الجواب	عہ	عہ
تبلیغ دین طبع جدید عمدہ	۱۴/	۱/
الانتباہات المفیدہ	۹/	۶

اشرف السوانح ہر سہ جلد کامل

یعنی حضرت حکیم الامت دامت برکاتہم کی سوانح عمری، حضرت کی ولادت باسعادت ۱۲۸۰ھ سے ۱۳۵۰ھ تک کامل ۷۰ سال کے حالات اور فیوض و برکات و تکمیل و ارشاد کا مرقع جس کا مطالعہ ہی ایک مرشد کامل کا کام دینے والا ہے ہر سچے مسلمان کیلئے قابل دید ہے۔ قیمت جلد اول ع رعایتی عہ جلد دوم عہ رعایتی ع جلد سوم عہ رعایتی ع تینوں جلدوں کی رعایتی قیمت صرف سوا پانچ روپیہ (عہ)

نام کتاب	قیمت اصلی	قیمت رعایتی
تصانیف شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ		
حکایات صحابہ	۱۲	۹/
رسالہ تبلیغ	.۲	۲/
چہل حدیث در فضائل قرآن	۵/	۴/
فضائل نماز	۶/	۴/
فضائل رمضان	۵/	۴/
تصانیف مولانا محمد شفیع صاحب		
سیرت خاتم الانبیاء	۱۰/	.۷
آداب المساجد	۳/	۲/
آداب النبی	۴/	۳/
آداب الاخبار	۱/	ث
آداب السفر	.۱	۱/
آداب الشیخ والمرید	۲/	۱/
مساوات اسلامی کی حقیقت	۴/	۳/
بعض التفصیل لمسئلۃ التفضیل	۳/	۲/
التصویر لاحکام التصویر	۱۲/	۹/
ثمرات الاوراق ہر چہار حصہ	عہ	۱۲/
فی حصہ	۴/	۳/
مختلف بزرگوں کی متفرق تصانیف		
اشاعت اسلام قسم اعلیٰ	ہے	۶ ع ۴
ایضاح الادلہ کامل	۶ ع	عہ
اسیر مالٹا	۱۰/	۸/
براہین قاطعہ	عہ	عہ
افادات حسینیہ	۳/	۲/
سلاسل طیبہ	۳/	۲/
التشرف فی الاسلام حصہ دوم	۱۲/	۹/
علم الکلام نمبر ۱	۲/	.۱
علم الکلام نمبر ۲	۴/	۳/
علم الکلام نمبر ۳	۴/	۳/
اعجاز القرآن	۴/	۳/

حضرت تھانوی مدظلہ کے مواعظ اور دیگر حضرات اکابر کی بھی وہ کتابیں جو عدم گنجائش کی وجہ سے یہاں درج نہیں کی گئیں طلب فرما سکتے ہیں اس وقت کم از کم ۴/ فی روپیہ رعایت کی جائیگی

المعلن ناظم مکتبۃ الفرقان بریلی

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ الفرقان بریلی

چندہ سالانہ — قسم اول تین روپے، دوم ...

ممالک غیر سے — قسم اول سات شلنگ پیشگی

نمبر ۱	بابت ماہ رجب المرجب ۱۳۵۹ھ	جلد ۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نگاہِ اوّلیں

الفرقان کے گزشتہ پرچہ میں تاخیرِ اشاعت کی معذرت کے طور پر اپنی علالت کا جو ذکر کر دینا پڑا تھا اُس کو دیکھ کر بہت سے مخلص احبابِ کرم فرماؤں نے "بیمار پرسی" اور "اظہار ہمدردی" کے طور پر خطوط لکھے ہیں جنمیں بڑی محبت اور بڑی اخلاص کا اظہار کیا گیا ہے ـــــ ادھر میری مجبوریوں کا یہ عالم ہے کہ اُن حضرات کو اب بھی نہ دیسکا ـــــ بس حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری للّٰہی محبتوں کو قایم رکھے اور بڑھائے۔ اور دنیا و آخرت میں انکی برکتوں سے متمتع فرمائے ـــــ میرا حال یہ ہے کہ بفضلہ تعالیٰ پاؤں کا زخم اب بالکل اچھا ہو چکا ہے لیکن ابھی پوری طرح چل پھر نہیں سکتا ہوں اُمید ہے انشاء اللہ ہفتہ عشرہ میں یہ کمی بھی پوری ہو جائیگی۔

مولوی محمد عطاء اللہ صاحب ابتک کہ شعبان کا آخری عشرہ ہے واپس نہیں ہو سکے ہیں اور اب تو اُنسے مایوسی بھی ہو چکی ہے تاہم دُعا ہے کہ حق تعالیٰ اُنکے حالات کو اس قابل کر دے کہ وہ جلد آسکیں۔

اس اشاعت میں "فتنۂ نگار" کے متعلق دو مضمونوں نے زیادہ جگہ لے لی اس وجہ سے "بارق" اور "دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا" کی قسطیں تیار ہونیکے بعد روک لینی پڑیں۔

اب شعبان کا آخری عشرہ ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ یہ رسالہ کسی طرح شعبان ہی میں شایع ہو جائے ـــــ اس کے بعد اب انشاء اللہ "ولی اللہ نمبر" ہی شایع ہوگا ـــــ گزشتہ پرچہ میں آخر رمضان تک نمبر کی اشاعت کی اُمید ظاہر کی گئی تھی لیکن کام کی کثرت اور میری تنہائی کی وجہ سے اس امید کے پورا ہونیکی توقع بھی ٹوٹتی جا رہی ہے بلکہ ٹوٹ چکی ہے اور اب اندازہ یہ ہے کہ غالباً وسط شوال سے پہلے وہ شایع نہ ہو سکیگا یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے زیادہ دیر لگ جائے لہٰذا ناظرین کرام آخر شوال تک اس کا تقاضا نہ فرمائیں ـــــ نمبر کا اجمالی حال اُس فہرست سے معلوم ہوگا جو ضمیمہ کے طور پر اس رسالہ کے ساتھ آپکی خدمت میں پہنچیگی۔

نمبر کی تیاری میں جو مالی مشکلات یا مجبوریاں درپیش ہیں اُن پر قابو پانیکے لیئے خریداروں کی فراہمی کے ذریعہ دوستوں سے جو مدد طلب کیگئی تھی افسوس ہے اسکی طرف احباب نے بالکل ہی توجہ نہیں فرمائی حالانکہ کم از کم ایک دو خریدار پیدا کر دینا تو شاید ہی کسی کیلیئے مشکل ہو۔ اگر رسالہ کی انتہائی مالی کمزوری مجبور نہ کر دیتی تو بحالات موجودہ میں اتنا بھی عرض کرنے کیلیئے تیار نہ تھا کیا احباب کرام اب توجہ فرمائینگے؟

موعظة وذکری

رحمت ومغفرت کا ایک مہینہ!

[یہ رسالہ ناظرین کی خدمت میں انشاء اللہ ایسے وقت پہنچیگا کہ اللہ کی رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ (رمضان المبارک) شروع ہونے والا ہوگا، یا شروع ہو چکا ہوگا، اسلئے جی چاہا کہ اس مرتبہ "موعظة وذکری" کے ذیل میں اس "موسم رحمت" ہی کے متعلق کچھ عرض کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنّت کو ادا کیا جائے کہ جب یہ "ماہ مبارک" آتا تھا تو آپ اس کی برکات کی طرف لوگوں کو توجہ دلاتے تھے۔]

روزہ اور اس کا مقصد:-

یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ۞

(ترجمہ) اے ایمان والو! تم پر (رمضان کے) روزے فرض کیئے گئے، جیسا کہ تم سے پہلی امتوں پر فرض کیئے گئے تھے اس اُمید پر کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

قرآن پاک کی اس آیت میں روزہ کی فرضیت کا حکم سُنایا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کا مقصد یہ تبلایا گیا ہے کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔ — روزہ سے کس طرح تقویٰ پیدا ہو سکتا ہے؟ — اس کے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ کو تقویٰ کی صحیح حقیقت معلوم ہو، فی الحقیقت تقویٰ نام ہے انسان کے اس احساس اور اسکے مطابق عمل کرنے کا کہ میں خدا کا بندہ اور اس کا محکوم ہوں، اپنی زندگی کے اعمال اور اس کا رُخ متعین کرنے میں، میں آزاد و خود مختار نہیں ہوں بلکہ قانون الٰہی کا پابند ہوں اگر اس کے مطابق چلونگا تو خیر ہے ورنہ ہلاکت اور ابدی خسران ہے، بس اس تصوّر سے دل میں جو ایک خاص خوف و حذر کی کیفیت اور قانونی پابندی کا عملی اہتمام پیدا ہوتا ہے دراصل اسی کا نام "تقویٰ" ہے اور اسی پر انسان کی صلاح و فلاح کا مدار ہے — اور بیشک روزہ کو اس کیف وحال کے نشو ونما اور اس کی ترقی و بالیدگی میں بڑا دخل ہے۔

ذرا غور فرمائیے! کھانا پینا اور اپنے جوڑے سے لطف اندوزی یہی انسان کی وہ دو حیوانی خواہشیں ہیں جنکی

من مانی تکمیل کیلئے وہ بے قیدی اور مطلق العنانی کی زندگی چاہتا ہے۔ اکثر عملی گمراہیوں اور بدکاریوں کا تعلق انہی دونوں بہیمانہ خواہشوں سے ہے، وہ پیٹ کی خاطر چوری کرتا ہے، ڈاکہ ڈالتا ہے، لوگوں کے ساتھ دھوکہ فریب کرتا ہے، کمزوروں کا مال غصب کرتا اور امانتوں میں خیانت کرتا ہے ـــــ علی ہذا اپنی دوسری نفسانی خواہش پوری کرنے کیلئے وہ فواحش کا مرتکب ہوتا ہے اور ناجائز طریقوں سے آزاد شہوت رانی کرنا چاہتا ہے۔

اب رمضان کے روزوں کے ذریعہ گویا انسان کو سال کے پورے ایک مہینہ مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ چاہت اور قدرت کے باوجود اپنی بہیمی قوتوں کے ان تقاضوں کو پورا نہ کرے اور اپنی ان خواہشوں کو قابو میں رکھے بالفاظ دیگر ان روزوں کے ذریعہ انسان کو عادی بنایا جاتا ہے کہ وہ ان خواہشوں سے مغلوب نہ ہو جائے بلکہ خود ان پر سوار اور قابو یافتہ رہے ـــــ اس طرح زندگی کو پرہیزگارانہ بنانے اور متقیانہ سیرت پیدا کرنے میں روزہ اعلیٰ درجہ کی مدد دیسکتا ہے۔

پھر جب ہم روزہ کی اس پوری حقیقت کو ملحوظ رکھیں جو فرضیت صوم کا پیغام پہونچانے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو بتلائی ہے اور اس باب کے وہ تمام احکام ہمارے پیش نظر ہوں جو زبان نبوت سے ہم تک پہنچے ہیں تو تقویٰ کی پیداوار میں روزہ کی یہ تاثیر اور زیادہ واضح اور سہل الادراک ہو جاتی ہے ـــــ عام طور پر روزہ کی حقیقت صرف یہی سمجھی جاتی ہے کہ قبل صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور مباشرت سے اجتناب کیا جائے لیکن احادیث نبوی میں تفصیل سے بتلایا گیا ہے کہ روزہ دار کو نفس کے دوسرے غلط تقاضوں اور بیہودہ باتوں سے بھی کلیۃً پرہیز کرنا چاہیئے مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب فان سابّہ احدٌ او قاتلہ فلیقل انی امرءٌ صائم (بخاری)

جب تم میں کسی کے روزہ کا دن ہو تو وہ بری باتیں نہ کرے، حتی کہ شور و غل میں بھی حصہ نہ لے اور اگر کوئی اس کو برا کہے یا اس سے آمادہ جنگ ہو تو کہدے کہ "میں روزے سے ہوں"۔

ایک اور حدیث میں فرمایا

لیس الصیام من الاکل والشرب انما الصیام من اللغو والرفث (حاکم، بیہقی)

روزہ صرف کھانے پینے سے باز رہنے ہی کا نام نہیں ہے بلکہ تمام بیہودہ اعمال اور بری باتوں سے بچنا روزہ ہے۔

ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا۔

من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه (بخاری)

جو شخص روزہ میں جھوٹ بولے اور غلط کام کرنے سے کلی پرہیز نہ کرے تو اللہ کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ بیکار بھوکا پیاسا رہے۔

ان تمام ہدایات کو سامنے رکھنے کے بعد روزہ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے اور ہر صاحب فکر سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کا روزہ آدمی کی روحانیت پر کیا اثر ڈال سکتا ہے اور ایک مہینہ کی اس تمرین سے "حسن سیرت" اور "تقوے" کے کیسے جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اگر آپ دیکھتے ہیں کہ روزہ کے باوجود بہت سوں میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "بہ تعمیل امر خداوندی کے ماتحت یہ مقاصد حاصل کرنے کے لیئے روزے ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ محض ماحول کے غیر محسوس دباؤ اور عام فضا کے اثر سے صرف رسمی روزے رکھتے ہیں بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں "صبح سے شام تک صرف وہ اپنا منہ بند کر لیتے ہیں" ـــــ اور ایسوں ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے

رب صائم لیس له من صیامه الا الجوع (وفی روایة الا الظماء)

بہت سے روزہ دار ہیں جن کے روزوں کا حاصل اور نتیجہ سوائے بھوک یا پیاس کے کچھ بھی نہیں۔

درحقیقت محررہ بالا نتائج تو روزوں سے جب ہی پیدا ہو سکتے ہیں کہ روزہ دار اس احساس کے ساتھ روزہ رکھے کہ محض امر خداوندی کے ماتحت مجھے نفس کے مطالبات اور بری عادات کے خلاف جنگ کرنی ہے اور اس طرح تقوی کی صفت اپنے اندر پیدا کر کے مجھے خدا کو راضی کرنا ہے ـــــ اگر روزہ اس طرح اور اس نیت سے رکھا جائے (اور وہی حقیقی روزہ ہے) تو انشاء اللہ یہ سب نتائج اُس سے پیدا ہوں گے اور ہوتے ہیں! اور پھر یہی وہ روزہ ہے جس کے متعلق حدیث قدسی میں ارشاد خداوندی ہے۔

الصوم لی وانا اجزی به

روزہ دار کا روزہ بس میرے لیئے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دونگا۔

اور ایسے ہی روزہ داروں کیلئے لسان نبوت سے یہ خوشخبری سنائی گئی ہے کہ

من صام رمضان ایماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه (بخاری)

جو شخص ایمان کے تقاضے کے ماتحت اور خدا کو راضی کرنیکے لیئے (رمضان کے) روزے رکھ کر اپنی نفسانی خواہشوں کو پامال کریگا اسکے سب پہلے گناہ معاف کر دیئے جائینگے

ماہ رمضان میں دن کے فرض روزوں کے علاوہ دوسری شبینہ عبادت "قیام لیل" (گویا تراویح) کا حکم دیا گیا ہے یہ حکم اگرچہ فرض کے درجہ میں نہیں ہو مگر ایک اعلیٰ درجہ کی اور بڑی برکت والی عبادت ہو، جن دلوں کو اللہ تعالےٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ تعلق عبدیت کا کچھ حصہ ملا ہو وہی اس لذت اور سرمستی و محویت کو جانتے ہیں جو دن بھر بھوک پیاس میں کاٹنے کے بعد دربار خداوندی کی اس حضوری میں اُن کو حاصل ہوتی ہو گویا دن کے اس مجاہدہ کا یہ نقد انعام ہو جو ان "مستانوں" کو دیا جاتا ہو۔ ؎ خوشا وقتے و خرم روزگارے — کہ یارے برخورد از وصل یارے

غرض یہ مبارک مہینہ عالم روحانیت کا "موسم بہار" ہے اسمیں رحمت الہٰی کا سمندر جوش پر ہوتا ہو متلاشیان خیر و صلاح اور طالبان فوز و فلاح کیلئے راستہ آسان کر دیا جاتا ہو یہاں تک کہ ان دنوں میں نیکیوں کا اجر و ثواب بدرجہا بڑھا دیا جاتا ہو اور اس طرح گویا جنت کے دروازے کھولدیئے جاتے ہیں —— اسکے برعکس شیطانی جذبات اور نفسانی خواہشات پر اس مہینے میں پیہم ضربیں لگائی جاتی ہیں ان کو پامال کر دیا جاتا ہو، تائبوں کی توبہ قبول کی جاتی ہو، روزہ، تراویح اور دوسری حسنات کے صلہ میں پچھلے ہزاروں گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، اور اس طرح گویا اس مہینہ "دوزخ کا بازار" مندا ہو جاتا ہو۔ اور اللہ کا منادی اعلان کرتا ہو۔

یا باغی الخیر اقبل ویا باغی الشر اقصر — اے نیکی کے طالب آگے بڑھ اور اے شر پسند ٹھیر جا!

خوش نصیب ہیں وہ جو رحمت و مغفرت کے اس مہینے میں خدا کی رحمت و مغفرت میں حصہ لیں اور اپنی نجات و فلاح کا سامان کرلیں —— اور بدنصیب ہیں وہ محروم القسمت جو اس موسم رحمت کی برکتوں سے بھی محروم رہیں،

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخسرین۔ ربنا اغفرلنا وارحمنا وانت خیر الرحمین۔

"قرآن" کس معنی کر "کلام خدا" ہے

"نیاز" کے مغالطوں کا جواب

[نیاز صاحب اگر بلا کسی ترمیم اور قطع برید کے اس جواب کو "نگار" میں شایع کر سکتے ہوں جیسا کہ انھوں نے اگست کے نگار میں اعلان کیا ہے تو ضرور شایع کریں۔ مدیر]

قرآن پاک کے "کلام الٰہی" اور "الہام ربّانی" ہونے سے "بیباکانہ" انکار کرنے والے نیاز فتح پوری نے اگست کے "نگار" میں خلط مبحث کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈالنے یا مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی جو پُر فریب کوشش کی ہے اس کا ذکر "الفرقان" کی اس سے پہلی اشاعت میں کیا جا چکا ہے، اس سلسلہ میں جو دَس سوالات یا "شبہات" انھوں نے پیش کیے ہیں آج کی صحبت میں حسب وعدہ انکا جواب ہمیں عرض کرنا ہے،

عرض جواب سے پہلے ہم یہ پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ نیاز صاحب پر ملت کی طرف سے جو جرم قائم ہے وہ یہ ہے کہ

(الف) وہ ادعاء اسلام کے باوجود قرآن پاک کے "کلام الٰہی" اور "الہام ربّانی" ہونے کے منکر ہیں؛

(ب) قرآن پاک کو وہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا تالیف کردہ کلام اور آپ کی فہم و فراست کا نتیجہ کہتے ہیں۔

(ج) قرآن پاک میں امم ماضیہ کے جو واقعات اور قصص مذکور ہیں وہ ان کی حتمی صحت کے قائل نہیں، بلکہ اُن کا خیال ہے کہ اُس زمانہ کے یہود و نصاریٰ یہ قصّے تورات و انجیل سے بیان کیا کرتے تھے (معاذ اللہ) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اُنہی سے سُن سُنا کر بلا تحقیق و تنقیح ان کو قرآن میں درج کر دیا ہے اب قرآن میں اُن کا درج ہونا ان کی صحت و واقعیت کا ضامن نہیں۔

یہ ہیں نیاز صاحب کے وہ "کافرانہ ہفوات" جو اُنھوں نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ "جون" کے "نگار" میں درج کیے اور انھیں کی بنا پر ہم نے اُن کو "مرتد" یا "منافق" لکھا، اور اُن کی یہی خرافات ہیں ملت کی نزدیک اُن کا اصل جرم!

اس کے بعد انھوں نے اگست کے نگار میں جس نئے انداز سے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے اور "قرآن" کی قدم و حدوث کی بحث کے

دامن میں پناہ لینے کی جو کوشش کی ہے اور اپنے "شبہات" پیش کر کے مسلمانوں کو اپنی "معذوری" اور "معصومیت" کا جو یقین دلانا چاہا ہے ہمارے نزدیک وہ صرف ان کی ایک بزدلانہ چال ہے جس کا تجربہ اپنے متعلق ہم کو وہ پہلے بھی کرا چکے ہیں اس لیے ہمیں یہ توقع تو نہیں کہ ہماری یہ خامہ فرسائی ان کے دلی روگ کو دور کر سکے گی ہاں یہ امید ضرور ہے کہ اُن کے ان شبہات اور مغالطات نے جن اور بہت سے مذہب سے ناواقف سادہ لوحوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے ہوں گے انشاء اللہ وہ ہمارے اس جواب سے اطمینان حاصل کر سکیں گے اور درحقیقت وہی طبقہ اس وقت ہمارا مخاطب ہے وَاللّٰهُ يَدْعُوا إِلَىٰ دَارِ السَّلَامِ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝

نیاز صاحب کے پیش کردہ "شبہات" یا مغالطات کا جواب شروع کرنے سے پہلے حق تعالےٰ کی "صفت کلام" اور "قرآن پاک" کے متعلق بطور تمہید چند اصولی باتیں عرض کر دینا ضروری ہیں جن کے بعد اس بحث کو سمجھنا ہر ایک کے لیے انشاء اللہ تعالےٰ آسان ہو جائے گا اس تمہیدی گزارش کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمایا جائے۔

تمہید:-

یہ تو ظاہر ہے کہ صفت کلام کے لحاظ سے خود انسان میں تین حیثیتیں نمایاں ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ اُس میں "قوتِ ناطقہ" یعنی گویائی کی صلاحیت اور قابلیت ہے، اور اسی حیثیت سے اس کو "حیوان ناطق" کہا جاتا ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ جب وہ کچھ کہنا چاہتا ہے تو تکلم اور تلفظ سے پہلے اس کے ذہن میں ایک مطلب اور مضمون ہوتا ہے جس کو وہ بعد میں الفاظ سے ادا کرتا ہے۔

(۳) تیسری حیثیت یہ ہے کہ وہ نطق اور تلفظ کے ذریعہ اپنے اُس مافی الضمیر کو ادا کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں حیثیتیں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ بلاتشبیہ اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ حق تعالےٰ کی "صفت کلام" میں بھی تین حیثیتیں اور تین درجے ہیں۔

پہلے درجہ کو بمنزلہ[۱] "قوت تکلم" کے سمجھنا چاہیئے (اور علمی اصطلاح میں اس کو "مبدأ تکلم" اور "منشا و مصدر کلام" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح کہ علم کو مبدءِ انکشاف کہا جاتا ہے)

تو حق تعالےٰ کی "صفت کلام" کا یہ پہلا درجہ علم اور قدرت وغیرہ کی طرح قدیم اور ازلی ہے اور اسکی

[۱] بمنزلہ کا لفظ اسلیے لکھا گیا ہے کہ فی الحقیقت اس درجہ کو "قوت تکلم" سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے اسکی صحیح تعبیر "مبدء تکلم" اور "منشاء و مصدر کلام" ہی سے ہو سکتی ہے ۱۲

صفات حقیقیہ میں سے ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قایم ہیں اور اس کا مشہور اصطلاحی نام "کلام نفسی" ہو۔
دوسرا درجہ وہ مفصل مطالب اور مضامین ہیں جن کو الفاظ و حروف سے ادا کیا جاتا ہے اور جو کلام لفظی کا مدلول ہوتے ہیں تو حق تعالےٰ میں بھی اس کی شان رفیع کے مطابق یہ درجہ موجود ہے اور اس کو بھی کلام نفسی کہا جاتا ہے اور یہ بھی قدیم ہے۔
تیسرا درجہ ان مرتب الفاظ و عبارات اور حروف و کلمات کا ہے جن سے مضمون و مقصود ادا کیا جاتا ہے اور اس درجہ کا اصطلاحی نام "کلام لفظی" ہے اور اس حیثیت سے جب کسی کلام کو "کلام الٰہی" کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ حق تعالےٰ نے اپنی مرضی و منشا اور اپنے احکام بندوں کے علم میں لانے کیلئے خود اس کلام کی تالیف و تنزیل فرمائی ہے لیکن اس کلام کے ظہور کا محل عموماً کوئی شئ مخلوق ہی ہوتی ہے مثلاً حق تعالےٰ اپنے اس کلام لفظی کو اپنی قدرت کے ذریعہ حامل وحی فرشتہ کی زبان پر جاری فرما دیتا ہے یا اس پر دلالت کرنے والے نقوش لوح محفوظ میں منتقش فرما دیتا ہے یا رسول کے قلب میں اپنے اس مولف کلام کا القا فرما دیتا ہے اور پھر وہ رسول انہی الہام شدہ الفاظ و عبارات میں اس کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے اور لوگوں کو سناتا ہے ——— یہ تیسرا درجہ جس کا اصطلاحی نام "کلام لفظی" ہے اپنے وجود خارجی کے لحاظ سے حادث و مخلوق ہے (خواہ وہ وجود خارجی لوح محفوظ میں نقوش کی شکل میں ہو یا رسول یا فرشتہ کی زبان پر الفاظ و حروف کی صورت میں ہو) پھر یہ "کلام لفظی" "کلام نفسی" درجہ اوّل کے آثار میں سے ہوتا ہے اور درجہ دوم اس کا مدلول اور معبر عنہ ہوتا ہے۔ اگر یہ تینوں درجے اور ان کا باہمی فرق آپ کے ذہن نشین ہو چکے ہیں تو اسی جگہ اہل سنت اور معتزلہ کے اختلاف کی حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کیونکہ اس بارہ میں عام طور پر لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔
پس معلوم ہونا چاہیئے کہ معتزلہ کا خلاف دراصل صرف یہ ہے کہ وہ حق تعالےٰ کی "صفت کلام" کے پہلے درجہ کے منکر ہیں یعنی ان کو اس سے انکار ہے کہ علم و قدرت وغیرہ کی طرح حق تعالےٰ کی کوئی مستقل ازلی صفت "کلام" یا "تکلم" ہو ——— دوسرے درجہ کو وہ صرف "ضمن علم" تسلیم کرتے ہیں، غرض وہ "کلام نفسی" کے وجود ہی سے انکاری ہیں ——— البتہ "کلام لفظی" کے وہ قائل ہیں اور اسی کے لحاظ سے حق تعالےٰ کو متکلم اور قرآن پاک کو "کلام الٰہی" کہتے ہیں۔ پس "کلام لفظی" تو ہر دو فریق کے نزدیک مسلّم ہے اور "کلام نفسی" جو اہل سنت کے نزدیک قدیم اور ازلی صفت ہے اس سے معتزلہ کو انکار ہے۔ پس معتزلہ جو کلام الٰہی کو مخلوق کہتے ہیں تو اس کا منشا یہ ہے کہ ان کے نزدیک

"کلام الٰہی" صرف "کلام لفظی" میں منحصر ہے اور وہ مخلوق ہے، اور اہل سنت کے نزدیک "کلام الٰہی" کا اوّلی مصداق چونکہ "کلام نفسی" ہے اور وہ قدیم ہے۔ اس لیئے وہ کلام الٰہی کو قدیم کہتے ہیں، تو اصل اختلاف "کلام نفسی" کی نفی و اثبات کا ہے اور وہی حقیقی محل نزاع ہے ورنہ "کلام لفظی" جو اصوات وحروف سے مرکب ہوتا ہے اس کا حادث ہونا خود اہلِ سُنّت کو بھی مسلم ہے۔

اور یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہمارا اپنا خیال نہیں ہے بلکہ کتب کلام میں پوری تشریح اور توضیح کے ساتھ مذکور ہے چند عبارتیں ملاحظہ ہوں،

علم کلام کی مشہور کتاب "مواقف" میں بیان اختلاف کے بعد فرمایا

اذا عرفت هذا فاعلم ان ما يقوله المعتزلة وهو خلق الاصوات والحروف وكونها حادثة قائمة فنحن نقول به ولا نزاع بيننا وبينهم فى ذالك وما نقوله من كلام النفس فهم ينكرون ثبوته ولو سلموه لم ينفوا قدامه فصار محل النزاع نفى المعنى واثباته"

اور محقق دوانی شرح عقائد جلالی میں فرماتے ہیں۔

"لا نزاع بين الشيخ (الاشعرى) والمعتزلة فى حدوث الكلام اللفظى انما نزاعهم فى اثبات الكلام النفسى وعدمه"

اور شیخ شہاب خفاجی حاشیہ بیضاوی میں فرماتے ہیں:

والاشاعرة قالوا كلامه قديم نفسى قائم بذاته لا باصوات وحروف ولا نزاع بينهم وبين المعتزلة فى حدوث كلامه اللفظى انما النزاع فى اثبات النفسى"

ان تمام عبارات کا حاصل یہی ہے کہ اہل سنت اور معتزلہ میں اصل اختلاف "کلام نفسی" کی نفی و اثبات کا ہے ورنہ کلام لفظی کا حادث ومخلوق ہونا متفق علیہ مسئلہ ہے۔

اس تمہیدی گزارش کے بعد نیاز صاحب کے شبہات یا مغالطات کا نمبروار جواب ملاحظہ ہو!

پہلے ہم "نگار" کا شبہ خود اسی کے الفاظ میں نقل کریں گے، اس کے بعد اپنا جواب عرض کریں گے واللہ الموفق۔

نگار "(۱) قرآن مجید کو خدا نے پیدا کیا ہے یا خدا کے ساتھ از خود وہ بھی وجود میں آیا ہے، دوسری صورت فرض کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس طرح قرآن کو بھی خدا کی طرح قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم صرف ذات خدا

کی ہے اور اگر اول صورت مانی جائے تو قرآن کو "شئ مخلوق" ماننا پڑے گا لیکن "شئ" کے متعلق یہ ارشاد ہے کہ "کل شئ ھالک الا وجہہ" اس لیئے نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن فنا ہو جانیوالی چیز ہے اس لیئے وہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا۔

"الفرقان" جواب عرض کرنے سے پہلے یہ تنقیح ضروری ہے کہ نیاز صاحب کی مراد قرآن مجید سے کیا ہے؟ اگر وہ "کلام لفظی" مراد ہے جو الفاظ واصوات یا نقوش سے وابستہ ہے اور جس کا قیام محال مخلوقہ ہی کیساتھ ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ خدا کا مخلوق ہے اور دوسری "اشیاء مخلوقہ" کی طرح بیشک اس کے لیئے بھی "بقاء دائم" نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ "خدا کا کلام" ہے بایں معنی کہ اس کی تالیف اسی کی طرف سے ہے اور "لوح محفوظ" یا "لسان ملک" پر اس کا خلق وایجاد، یا قلب رسول میں اس کا القاء بلا توسط کسی کے براہ راست اسی کی جانب سے ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کو کلام خدا کہا جاتا ہے اور ہم جو مختلف اوقات میں اپنے قصد وارادہ سے اس کی تلاوت کرتے ہیں یا کاغذ پر اس کو لکھتے ہیں تو یہ اسی کی حکایت ہوتی ہے، جس طرح کہ ہم جب غالب کا کوئی شعر اپنی زبان سے پڑھتے یا اپنے قلم سے لکھتے ہیں تو وہ شعر ہمارا نہیں ہو جاتا بلکہ غالب ہی کا کہلاتا ہے کیونکہ اس کو ہمارا پڑھنا یا لکھنا اسی کی نقل وحکایت ہوتی ہے ——— بہر حال اگر سوال میں قرآن مجید سے مراد مذکورہ بالا "کلام لفظی" ہے تو وہ بیشک خدا کے خلق وایجاد ہی کا نتیجہ ہے، اور ہم عرض کر چکے کہ دوسری تمام "اشیاء مخلوقہ" کی طرح اس کے لیئے بھی "بقاء دائم" نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے اسکی "کلام خدا" (بالمعنی المذکور) ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا، نہ نیاز صاحب نے اس کی کوئی دلیل پیش کی ہے اور نہ وہ کرسکتے ہیں۔

اور اگر قرآن مجید سے ان کی مراد اس کے مطالب ومضامین ہیں یعنی "کلام نفسی" اور یہ اگرچہ عرف عام کے خلاف ہے لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ ان کی مراد یہی ہوگا کیونکہ وہ "مطالب قرآن" کے بھی منجانب اللہ ہونے کے منکر ہیں، اور اس کے مضامین کو بھی معاذ اللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی "فہم وفراست" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر اسکے قصص کو غلط اور غیر تاریخی بتلاتے ہیں ——— اور ان کا یہ مدعا جب ہی ثابت ہوسکتا ہے کہ مضامین قرآن کے بھی وہ من اللہ ہونے کی نفی کریں اس لیئے قرین قیاس یہی ہے کہ اس سوال میں قرآن مجید سے انکی مراد "کلام نفسی" ہوگا ——— تو اس صورت میں ہمارا جواب یہ ہے کہ وہ حادث ومخلوق نہیں ہے بلکہ قدیم ہے ——— رہا اس پر نیاز صاحب کا یہ شبہ کہ قدیم صرف ذات خدا ہے تو یہ محض مغالطہ ہے، اسکی ذات مقد

کی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں، یعنی جس طرح حق تعالےٰ ہمیشہ سے ہے اسی طرح اس کا علم اور اس کی قدرت وغیرہ صفات بھی ہمیشہ سے ہیں اور "کلام نفسی" بھی اس کی صفت ہی جو قدیم ہے۔[ف]

چونکہ ہمارے اس جواب کی بنیاد "کلام نفسی" کے قدیم اور "کلام لفظی" کے حادث و مخلوق ہونے پر ہے اور آئندہ نمبروں میں بھی ہم کو اس اصول سے کام لینا ہے اس لیئے ہم یہ بھی واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ نظریہ ہمارا اپنا اختراع نہیں ہے بلکہ اہل سنت کے مشہور مسلمات میں سے ہے کتب کلام کی صدہا تصریحات میں سے چند ملاحظہ ہوں:۔

شرح "عقائد نسفی" میں ہے:۔

"التحقیق ان کلام اللہ تعالیٰ اسم مشترک بین الکلام النفسی القدیم ومعنی الاضافۃ کونہ صفۃ لہ تعالیٰ وبین اللفظی الحادث المؤلف من السور والآیات ومعنی الاضافۃ انہ مخلوق اللہ تعالیٰ"

اور "مسامرہ" "شرح مسایرہ" میں اسی مسئلہ "کلام" کے بارہ میں اہل سنت کے مخالف فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"ومنھم المعتزلہ قالوا کلامہ تعالیٰ اصوات وحروف یخلقھا فی غیرہ کاللوح المحفوظ وجبرئیل والرسول وھو حادث عندھم...... وھذا الذی قالتہ المعتزلۃ لا ننکرہ نحن بل نقول بہ ونسمیہ کلاماً لفظیاً ولکنا نثبت امراً وراء ذالک وھو المعنی القائم بالنفس"

اور عارف جامی نے "کلام نفسی" کی قدامت اور "کلام لفظی" کے حدوث کے اس مسئلہ کو لباس اور صاحب لباس کی تمثیل سے حل کیا ہی — مثنوی "سلسلۃ الذہب" میں اسی مسئلہ کلام باری کے متعلق مسلک اہل سنت کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

مکن از حق گراں چوں معتزلی — لایزالش دان ولم یزلی
حرف وصوتے کہ نو بنو حادث — میشود نیست چوں دوال لابث
باشد آں پیش عقل خورده شناس — مر کلام قدیم را چو لباس
دم بدم چوں شود لباس بدل — شخص صاحب لباس را چہ خلل

اور حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ اپنے مکتوبات میں ایک جگہ یہی لباس کی مثال دے کر

[ف] ناظرین کرام کو بیان ماسبق کا نمبر شبہ پڑھنے سے معلوم ہو گا کہ "صفات باری" کی قدامت انکو بھی مسلم ہی لیکن یہاں انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ صرف "ذات خداوندی" کو قدیم کہا ہی سچ ہے "دروغ گو را حافظہ نباشد"

مسئلہ کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

"قرآن کلام خداست جل سلطانہ کہ بہ لباس حرف وصوت درآوردہ بر پیغمبر ما علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ است وعباد را باں امر ونہی فرمودہ چنانچہ ما کلام نفسی خود را بتوسط کام وزبان در لباس حرف و صوت درآوردہ ظاہر مے سازیم ومقاصد خفیہ خود را در عرصہ ظہور مے آریم ہمچنیں حضرت حق سبحانہ کلام نفسی خود را بے توسط کام وزبان بقدرت کاملہ خود لباس حرف وصوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و اوامر ونواہی خفیہ خود را در ضمن حرف وصوت آوردہ بر منصہ جلوہ دادہ است"

دوسری جگہ ایک اور مکتوب میں "کلام نفسی" کی قدامت اور "کلام لفظی" کے حدوث کے اسی مسئلہ کو اس طرح صاف فرماتے ہیں:۔

والحال کہ تبلا حق افکار منقح شدہ است گوئیم کہ محل نزاع اگر حروف وکلمات اند کہ دوال اند بر کلام نفسی شک نیست کہ حادث اند ومخلوق واگر مدلولات مراد باشند قدیم وغیر مخلوق است"

ایک اور مکتوب میں اس سے زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ فرماتے ہیں:۔

حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کہ از شجرہ مبارکہ کلام حق شنید جل سلطانہ نسبت آں کلام بحق جل سلطانہ ہمچو نسبت مخلوق بود بہ خالق وہمچو نسبت کلام بہ متکلم وہمچنیں کلامیکہ از حضرت جبریل علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام شنید نسبت آں کلام بحضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ہمچو نسبت مخلوق بود بخالق غایت ما فی الباب آں کلام نیز کلام حق است جل سلطانہ ومنکر آں کافر وزندیق گویا کلام حق مشترک است درمیان کلام نفسی وکلام لفظی کہ بے توسط امرے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ ایجاد آں فرماید وایں کلام لفظی نیز بحقیقت کلام حق باشد جل وعلا پس ناچار منکر آں کافر بود۔

ان عبارات سے مندرجہ ذیل امور بصراحت ثابت ہوئے:۔

(۱) "کلام الٰہی" کا اطلاق "کلام نفسی" پر بھی ہوتا ہے اور "کلام لفظی" پر بھی

(۲) "کلام نفسی" قدیم اور ذات حق کے ساتھ قایم ہے اور "کلام لفظی" حادث ومخلوق ہے

(۳) "کلام لفظی" حادث ومخلوق ہونے کے باوجود اس معنی کر "کلام الٰہی" ہے کہ حق تعالیٰ ہی بلا واسطہ اُس کا موجد ہے اور اس کی تالیف وتنزیل اسی کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی "کلام لفظی" کے بایں معنی کلام الٰہی ہونیکا

انکار کرے وہ کافر و زندیق ہے۔

بلکہ عرف عام اور علیٰ ہذا عام دینی محاورات میں "قرآن" اور "کلام الٰہی" سے عموماً یہی کلام لفظی مراد ہوتا ہے کیونکہ "احکام تکلیفیہ" کا تعلق اسی سے ہے اور اسی کا "کلام الٰہی" ہونا اُمت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اور اس کے "کلام الٰہی" ہونے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ وہ حق تعالےٰ کا مخلوق ہے یا اُس کی مرضی ومنشا اور اوامر ونواہی پر اس کی دلالت ہے بلکہ اس کو "کلام الٰہی" اس خصوصیت کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ اس کی نظم وعبارت کی تالیف وایجاد بھی بلا واسطہ حق تعالےٰ ہی کی طرف سے ہے اور اسی واسطے قرآن پاک کے تراجم کو "کلام اللہ" نہیں کہہ سکتے۔

علامہ قوشنجی شرح تجرید میں فرماتے ہیں:۔

لانزاع فی اطلاق اسم القرآن وکلام اللہ تعالےٰ بطریق الاشتراک علیٰ ھذا المولف الحادث وھو المتعارف عند العامہ والقراء والاصولیین والفقھاء...... واطلاق ھذین اللفظین علیہ لیس بمجرد انہ دال علیٰ کلامہ القدیم حتیٰ لوکان مخترع ھذہ الالفاظ غیر اللہ تعالےٰ لکان ھذا الاطلاق بحالہ بل لانّ لہ اختصاصاً اخربہ تعالےٰ وھو انہ اخترعہ،،

پھر یہی علامہ قوشنجی یہ بھی تصریح فرماتے ہیں کہ جو شخص اس قرآن پاک کے جو مخصوص الفاظ وعبارات ہیں مصاحف میں لکھا جاتا ہے "کلام الٰہی" ہونے سے انکار کرے اور اس کو کسی انسان کی تالیف قرار دے وہ مسلم طور پر کافر اور خارج از اسلام ہے ـــ فرماتے ہیں:۔

ومن انکر کلامیۃ ما بین دفتی المصحف انما یکفر لواعتقد انہ لیس کلام اللہ تعالیٰ بمعنی انہ من مخترعات البشر،،

بہر حال نیاز صاحب کے اس مغالطہ کے جواب میں ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ متکلمین کی تصریحات اور اہل سنت کے مسلمات ہی کی بنا پر کہا ہے اور کتب کلام کی جو عبارات ہم نے یہاں نقل کی ہیں وہ صرف یہی ظاہر کرنیکے لیئے پیش کی ہیں ورنہ ہم جانتے ہیں کہ ان عبارات سے جناب نیاز پر حجت نہیں قایم کیجا سکتی جب کہ وہ سرے سے قرآن ہی کو "اساطیر الاولین" ہونے سکتے تو اقوال سلف کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے۔

نگار:۔ (۲) اگر قرآن شریف نام ہے اُن الفاظ یا حروف کا جو کاغذ پر منقوش ہوتے ہیں جو پریس کے ذریعے سے چھاپے جاتے ہیں اور جو انسان کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو کلام مجید کا ہر نسخہ کلام خداوندی

اور جو نسخہ اُن میں سے ضایع ہو جائے اسکے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا کلام ضایع ہو گیا"

"الفرقان"۔ اوپر کے جواب میں بتلایا جا چکا ہے کہ جو قرآن شریف کاغذ پر لکھا جاتا یا پریس میں چھاپا جاتا ہے اور جو تلاوت کے وقت ہماری زبانوں سے ادا ہوتا ہے وہ درحقیقت نقل و حکایت ہے اُس "کلام الٰہی لفظی" کی جس کی حقیقت اوپر وضح کی جا چکی ہے اور قرآن پاک کے ان مکتوبہ یا مطبوعہ نسخوں کو اور علیٰ ہذا ہماری تلاوت کو جو قرآن مجید کہا جاتا ہے تو وہ اسی حیثیت سے، اور یہ بلاتشبیہ ایسا ہی ہے جس طرح کہ ہم دیوان غالب کے ہر نسخے کو خواہ وہ کسی شخص کے قلم کا لکھا ہوا یا کسی پریس کا چھپا ہوا ہو "دیوان غالب" ہی کہتے ہیں — اب اگر "دیوان غالب" کا کوئی نسخہ ضایع ہو جاتا ہے تو اُس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غالب کا کلام ہی ضایع ہو گیا، اسی طرح قرآن پاک کے نسخہ کے تلف ہو جانے سے کلام الٰہی کے ضایع ہو جانے کا نتیجہ نکالنا نیاز ہی جیسے "ارباب علم و دانش" کا کام ہو سکتا ہے۔

"نگار" (۳) اگر قرآن پاک خدا کا کلام ہے تو اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، یا تو اس کو خدا کی عین ذات تصور کیا جائے یا صفات خداوندی میں شامل کیا جائے۔ قرآن کو خدا کی عین ذات نہیں کہہ سکتے یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن خدا ہے اور خدا قرآن، ہی اسلیئے لامحالہ اسے "صفت ربانی" ماننا پڑے گا لیکن چونکہ خدا کی ہر صفت اُس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیئے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ الفاظ یعنی عربی زبان بھی خدا کی طرح قدیم ہے"

"الفرقان" نیاز صاحب کے آخری خط کشیدہ فقرہ سے ظاہر ہے کہ یہاں "قرآن پاک" سے انکی مراد "کلام لفظی" ہی ہے جو عربی زبان میں دوسرے درجہ کے "کلام نفسی" کی تعبیر ہے اور عرف عام میں ہی کو قرآن پاک کہا بھی جاتا ہے — اور ہم بتلا چکے ہیں کہ وہ حادث و مخلوق ہے اور کلام نفسی جو قدیم اور قایم بذاتہ تعالےٰ ہے وہ از قبیلہ الفاظ ہی نہیں چہ جائیکہ اس کو عربی یا عجمی کہا جا سکے لہذا عربی زبان کا قدیم ہونا کسی طرح بھی لازم نہیں آسکتا۔

عقائد کی مشہور کتاب مسامرہ شرح مسائرہ میں صراحۃً مرقوم ہے:۔

"ان کلامہ النفسی ..... لا یوصف بانہ عبری ولا سودی ولا عربی انما العبری و السودی والعربی ھو اللفظ الدال علیہ[۱]"

"نگار" (۴) اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن کا ہر ہر لفظ "نطق خداوندی" ہے جو جبریل کے ذریعہ

[۱] اس عبارت کا حاصل یہ ہو کہ عربیت یا عجمیت "کلام نفسی" کی صفت نہیں بلکہ یہ اُس "کلام لفظی" کے اوصاف ہیں جو اُس پر دلالت کرتا ہو ۱۲

سے آنحضرت تک پہونچایا گیا تھا تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ رسول اللہ نے بھی اس کو اسی طرح نطق کیا تھا جس طرح خدا نے کیا تھا بلکہ ہم لوگ سب اسی طرح اس کو ادا کرتے ہیں جس طرح خدا نے ادا کیا تھا اور اس طرح گویا رسول اللہ اور ہم سب اس صفت میں خدا کے مماثل قرار پائیں گے جو بالکل محال ہے"

الفرقان .. جی ! کس نے آپ سے یہ تسلیم کرنے کو کہا کہ "قرآن کا ہر ہر لفظ نطق خداوندی ہے"! ہم بھی بتلا چکے ہیں کہ الفاظ قرآن یا بالفاظ دگر "کلام لفظی" کو کلام الٰہی" اس حیثیت سے کہا جاتا ہے کہ ان کی تالیف و تنزیل بلا واسطہ حق تعالےٰ کی طرف سے ہے اور وہی بلا توسط کسی شیٔ آخر کے اُن کا خالق و موجد ہے اور حق تعالےٰ کے لیئے جو "صفت کلام" ثابت کی جاتی ہے اور اُس کو جو "متکلم" مانا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب تو کسی کے نزدیک بھی نہیں ہے کہ وہ ہماری طرح کام و دہن سے بولتا ہے اور آلات نطق سے تلفظ کرتا ہے بلکہ جس طرح اس کی دوسری صفات مثلاً علم اور سمع و بصر وغیرہ کا حال ہے کہ وہ بلا کانوں کے سُنتا اور بلا آنکھوں کے دیکھتا اور بلا دل و دماغ کے علم محیط رکھتا ہے اسی طرح اس کی "صفت کلام" بھی کام و دہن سے بے نیاز ہے۔

سیدنا حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ "فقہ اکبر" میں ارقام فرماتے ہیں:-

وصفاته كلها بخلاف صفات المخلوقين يعلم لا كعلمنا ويقدر لا كقدرتنا ويرى لا كرؤيتنا ويتكلم لا ككلامنا ويسمع لا كسمعنا نحن نتكلم بالآلات والحروف والله سبحانه يتكلم بلا آلة وحروف۔

یعنی حق تعالیٰ کی تمام صفات حقیقت کے لحاظ سے ہماری صفات سے بالکل مختلف ہیں اس کا علم اس کی قدرت اس کا دیکھنا اور سننا ہمارے علم، ہماری طاقت اور ہمارے دیکھنے سننے سے بالکل مختلف الحقیقت ہے گویا کہ اشتراک اسمی کے سوا دونوں میں کوئی مشابہت اور مماثلت نہیں اور یہی حال "صفت کلام" کا ہے کہ ہم آلات اور حروف کے ساتھ تکلم کرتے ہیں اور خدا کا "تکلم" بلا آلات اور بغیر حروف کے ہے"

بہر حال قرآن پاک کو "کلام خدا" ماننے کی وجہ سے جیسا کہ اسلامی عقیدہ ہے کسی طرح بھی خدا اور بندوں میں مماثلت و مشابہت لازم نہیں آتی۔

"نگار" (۵) قرآن شریف جس سلسلہ سے نازل ہوا تھا وہ موجودہ ترتیب سے بالکل مختلف ہے اسلیئے

وہ قرآن جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے، اس قرآن سے بہ لحاظ ترتیب مختلف ہے
جو لوح محفوظ میں پایا جاتا تھا اس کے معنے یہ ہوئے کہ اصل قرآن میں تغیر پیدا ہوا اور ہر تغیر پذیر
چیز حادث ہے حالانکہ خدا کی طرح اس کے کلام کو بھی غیر فانی ہونا چاہیئے۔

الفرقان "ہم بتلا چکے ہیں کہ "قرآن شریف جو مخصوص عربی عبارت میں ہمارے سامنے موجود ہے وہ حادث ہی ہے، اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس حادث ہونے کے باوجود وہ "کلام خدا" ہے — اس لئے نیاز صاحب کے اس استدلال یا مغالطہ کی ساری عمارت ہی غلط ہے۔ لیکن جس عجیب و غریب منطق کے ذریعہ انھوں نے "قرآن شریف" کا حدوث یہاں ثابت کیا ہے اس سے اُن کے علم و فہم اور اسلامی معلومات کی وسعت کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے، اگرچہ جواب طویل ہوتا جا رہا ہے تاہم ایک ہلکی سی نظر اس پر بھی ڈال لیجئے!

نیاز صاحب نے اس نمبر میں قرآن کو حادث ثابت کرنے کیلئے جن مقدمات سے کام لیا ہے اُن میں ایک مقدمہ یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی جو ترتیب ہے وہی لوح محفوظ کی ترتیب ہے اور اس کو انھوں نے بطور ایک مسلّمہ امر کے پیش کیا ہے حالانکہ نہ یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے اور نہ اس پر نیاز صاحب کوئی دلیل ہی پیش کر سکتے ہیں، جمہور اہل اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ آیات قرآنیہ کی موجودہ ترتیب لوح محفوظ کے مطابق ہے اور یہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

نیاز صاحب نے بالکل غلط طور پر یہ فرض کرنے کے بعد کہ موجودہ قرآن کی ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب سے مختلف ہے غالباً اپنی "منطق دانی" اور "معقولیت" کا ثبوت دینے کے لئے اس مشہور منطقی قضیہ کلیہ سے بھی کام لیا ہے کہ "ہر تغیر پذیر چیز حادث ہے"، اور اسی سے پھر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "قرآن پاک"، حادث ہے — حالانکہ یہاں یہ "کلیہ" چسپاں ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ جو کلام "لوح محفوظ" میں مندرج ہے خود اس میں تو اس تقدیر پر بھی کوئی تغیر نہیں ہوا۔

بہر حال اگرچہ یہ صحیح ہے کہ موجودہ قرآن جو زبان عربی ہے وہ حادث ہے لیکن اس حدوث کے اثبات کیلئے جو دلیل نیاز صاحب نے پیش کی ہے وہ اُن کی علمی حیثیت کا اندازہ کرنے کیلئے اچھی چیز ہے — علیٰ ہذا اس حدوث کی بنیاد پر انھوں نے "قرآن پاک"، کے کلام خدا ہونے سے جو انکار کیا ہے وہ بھی محض ذہول ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ مسلمان اس "قرآن عربی مبین" کو کس معنی کر "کلام خدا" مانتے ہیں، یا وہ اپنے جرم کو ہلکا ثابت کرنے کیلئے جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں۔

"نگار" (۶) کہا جاتا ہے کہ قرآن شریف نجماً نجماً نازل ہوا ہے یعنی اسکی ہر آیت خاص وقت اور خاص حالات میں جناب رسالت مآب پر نازل ہوئی ہے جسکو اصطلاح میں "شان نزول" کہتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک وہ خاص وقت نہ آیا تھا وہ آیت بھی موجود نہ تھی اسلیے یہ کہنا کہ پورا قرآن لوح محفوظ میں ازل سے درج تھا بے معنی ہو جاتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ خدا کو معلوم تھا کہ فلاں وقت فلاں واقعہ پیش آئیگا اور اسی علم کی بنا پر پہلے ہی سے تمام آیات لوح محفوظ میں لکھ لی گئی تھیں، تو پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائیگا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔"

"الفرقان" جی ہاں! قرآن پاک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر مختلف اوقات میں نجماً نجماً ہی نازل ہوا ہے لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آگیا کہ اس نزول سے پہلے وہ "لوح محفوظ" میں بھی موجود نہ تھا، کیا ان دونوں باتوں میں کوئی عقلی لزوم ہے یا اس طرح بے دلیل باتیں کرنا بھی آج کل کی "عقلیت" کا کوئی شعبہ ہے؟

رہا آپ کا یہ سوال کہ "پھر ان واقعات و حالات کے متعلق کیا کہا جائیگا جو کلام مجید میں اس انداز سے بیان کیئے گئے ہیں گویا وہ قرآن کے وجود میں آنے سے پہلے ہو چکے ہیں"۔۔۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ "اُس" دانائے کل کا کلام ہے جس کیلئے ماضی، حال اور مستقبل بالکل یکساں ہیں، تو اگرچہ "اُن واقعات" کے وجود خارجی سے بہت پہلے لوح محفوظ میں یہ کلام پاک ثبت ہو چکا تھا مگر اُس وقت بھی اس کا تعلق عہد نبوی ہی سے تھا گویا "لوح محفوظ" میں جو مرقوم تھا وہ ایک پیشینی نقل تھی اُس قرآن مجید کی جو چھٹی صدی مسیحی میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر نجماً نجماً نازل ہو کر ایک مرتب مجموعہ بننے والا تھا۔۔۔ اب جو شخص حق تعالےٰ کے علم اور اس کی قدرت کو اپنے علم و قدرت کے برابر یا الگ بھگ سمجھے تو اس کو تو اس میں استبعاد ہو سکتا ہے لیکن جنکے دل کی آنکھیں اندھی نہیں ہوئی ہیں اور جو خدا کے علم و قدرت کی بے پایاں وسعت کا یقین رکھتے ہیں انکے لیئے اُسکے سمجھنے اور اُس پر ایمان لانے میں کوئی بھی اشکال و استبعاد نہیں ہو سکتا وَاللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ہ

"نگار" (۷) اگر قرآن مجید پہلے سے لوح محفوظ میں موجود تھا تو پھر اُن آیات کے متعلق کیا کہا جائیگا جو لفظ قل سے شروع ہوتی ہیں یعنی جن میں رسول اللہ سے خطاب کر کے کہا جاتا ہے کہ "ایسا کہو" ورنہ کیا اس وقت رسول اللہ کی ذات دُنیا میں موجود نہ تھی اسی طرح اُن دعاؤں کی کیا تاویل کی جائیگی جنکی تعلیم رسول اللہ کو دی گئی ہے کیا رسول اللہ کی پیدائش سے قبل یہ تمام دعائیں مرتب کر لی گئی تھیں

اور اس کی کیا ضرورت تھی"۔

"الفرقان" اس کا جواب وہی ہے جو اوپر عرض کیا جا چکا اعادہ کی حاجت نہیں۔

نگار (۸) اگر کلام مجید خدا کا کلام ہے تو پھر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے یہ معنے ہوں گے کہ وہ خود اپنے نام سے قرآن مجید کو شروع کرتا ہے اور خود اپنی ہی ذات سے خطاب کرتا ہے[1] (؟) جو بالکل بے معنی سی بات ہے،

سورۂ فاتحہ میں الحمد للہ سے لیکر مالک یوم الدین تک دعا کا انداز ایسا ہی گویا مخاطب سامنے نہیں ہے اور پھر دفعۃً "ایاک نعبد" سے انداز تخاطب بدل جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو حاضر مان کر خطاب کیا جا رہا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دونوں ٹکڑے علٰحدہ علٰحدہ دو مختلف موقعوں پر رسول اللہ کی زبان سے نکلے تھے۔ اگر سورہ فاتحہ پہلے سے "لوح محفوظ" میں منقوش ہوتی تو اس کا انداز تخاطب یہ نہ ہوتا۔

"الفرقان"، نیاز صاحب نے اس نمبر میں "قرآن مجید" کے کلام خدا نہ ہونے پر جو "دو دلیلیں" پیش کی ہیں اگر وہ اپنی معصومیت، اور بھولا پن ثابت کرنے کیلئے "تجاہل عارفانہ" نہیں ہے تو یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ "اسلامیات" پر انھوں نے جو بھی صحیح یا غلط علمی قسم کے مضمون کبھی لکھے ہیں وہ سب کہیں سے مسروقہ ہیں اور خود اُن کو اسلامی علوم سے مس بھی نہیں ہے —— ورنہ یہ دونوں مغالطے ایسے ہیں کہ ان کا جواب قرآن پاک سے متعلق عام اور معمولی کتابوں بلکہ قرآن کے مختصر مختصر حاشیوں تک میں مذکور ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے متعلق تو اتنا سمجھنا کافی ہے کہ حق تعالیٰ نے خود اس کے ساتھ تلفظ نہیں فرمایا ہے بلکہ ہماری "تلاوت" کیلئے اس کی تالیف و تنزیل فرمائی ہے اور ہم کو حکم دیا ہے کہ ان بابرکت کلمات سے ہم قرآن پاک اور اپنے دوسرے اچھے کام شروع کیا کریں، اور یہ اُس کا ہم پر انتہائی رحم ہے کہ اُس نے ہماری عقلوں کے تصور کا لحاظ رکھتے ہوئے ہماری یہ رہنمائی فرمائی ورنہ ایسا جامع اور پُر معنی اور پھر اتنا مختصر اور سباب جملہ تلاش کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی —— اس متبرک جملہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی معجزانہ جامعیت اور معنوی وسعت معلوم کرنے کیلئے نیاز صاحب متداول تفاسیر میں صرف "تفسیر کبیر" ہی ملاحظہ فرمالیں ——

اور یہی حیثیت الحمد شریف کی ہے اُس میں بھی حق تعالیٰ نے ہم کو اپنی حمد و ثنا اور اُس بہترین طریقۂ دعا کی تلقین کی ہے جس کا ہم خود ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ اللھم لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک

[1] نگار کا یہ خط کشیدہ فقرہ نیاز صاحب کی علمی حالت کا اندازہ کرنے کیلئے کافی ہے ۱۲

نیاز صاحب نے سورہٗ فاتحہ میں طریقہ خطاب کی تبدیلی سے "قرآن پاک" کے کلام الہیٰ ہونے پر جو استدلال کیا ہے وہ تو اس قدر جاہلانہ اور بوگس ہی کہ کسی نیاز جیسے شخص سے اس کی توقع اُن لوگوں کو بھی نہ ہوسکتی تھی جو اُکی "علمی حیثیت" کے بھی قائل نہیں ہیں ۔ آخر وہ ایک اچھے ادیب تو ہیں ہی، پھر "التفات" جیسی عام "صنعت" سے اُن کی ناواقفی و بے بہرگی کیا معنی ؟

"صفت التفات" (یعنی کسی خاص مقصد اور جذبہ کے ماتحت کلام میں غیبت سے مثلاً خطاب کی طرف یا خطاب سے غیبت کی طرف متکلّم کا انتقال) عربی کے علاوہ اُردو اور فارسی ادب میں بھی پاجاتا ہے۔ اور خاصکر عربی میں تو بکثرت مستعمل ہے چند نظیریں ملاحظہ ہوں۔

زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر "مسافع بن حذیفہ" بنی عمرو کے مرثیہ میں کہتا ہے :۔

ابعد بنی عمرو اسرّ بمقبل من العیش او آسی علی اثر مدبر

(ترجمہ) کیا بنو عمرو کے اس دُنیا سے جانے کے بعد عیش و راحت کی آنیوالی گھڑیوں کی کوئی مسرت یا گزر جانے والے لمحات پر کوئی رنج مجھے ہوسکتا ہے ، یعنی اب نہ مجھے عیش و راحت ملنے کی کوئی خوشی ہوگی اور نہ اُس کے جانے کا غم

دیکھیے اس پہلے شعر میں بنی عمرو کا ذکر شاعر نے غائبانہ کیا ہی ، اسکے بعد وہ بنی عمرو کو مخاطب کر کے کہتا ہی

سلام بنی عمرو ! وعلے حیث هامکم | جمال الندی والقنا والسنور

(ترجمہ) ای بنی عمرو ! (جن سے مجلس کی زینت تھی اور نیزے اور ہتھیار جن پر سجتے تھے) تم پر اور اوس سرزمین پر جہاں تمہارے سر دفن ہیں میرا سلام ہو؛

سخن شناس سمجھ سکتے ہیں کہ دوسرے شعر میں طریقہ خطاب کی اس تبدیلی نے کس قدر جان ڈالدی ہی

عرب کا ایک اور مشہور شاعر ابن الطثریہ کہتا ہے

عقیلیۃ اما ملاث ازارها | فدعص و اما خصرها فبتیل

یعنی میری محبوبہ قبیلہ بنی عقیل میں سے ہے ، اُس کی سُرینیں بڑی پُر گوشت ہیں اور کمر ایسی پتلی ہی کہ گویا ٹوٹی ہوئی ہی

دیکھیے اس شعر میں شاعر نے اپنی محبوبہ عقیلیہ کا ذکر غائبانہ طور پر کیا ہی لیکن اسکے بعد وہ "التفات" کر کے کہتا ہی اور کیا خوب کہتا ہی

الیس قلیلاً نظرۃ ان نظرتها | الیک و کلاً لیس منک قلیل

یعنی تیرا وہ تھوڑا سا دیدار جو مجھے نصیب ہوتا ہے کیا تھوڑا نہیں ہی ؟ (پھر خود ہی اس خیال سے توبہ کرتے ہوئے

کہتا ہو کہ) نہیں ہرگز نہیں تیری طرف سے جو بھی ہے وہ تھوڑا نہیں ہی۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں ورنہ عربی لٹریچر سے اس قسم کی صدہا بلکہ ہزارہا نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اور عربی ادب سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہو کہ "صنعت التفات" اگر برمحل ہو تو وہ کلام کے اعلیٰ محاسن اور لطائف میں سے ہی۔ اور سورۂ فاتحہ میں جس طرح اس کا استعمال ہوا ہو فی الحقیقت ایک صاحب ذوق سلیم کیلئے اس میں نہ صرف اعلیٰ درجہ کا حسن و لطف ہی ہو بلکہ وجد و سرمستی کا بھی پورا سامان ہی۔ لیکن ع "دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے"۔

ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور۔

اگر جناب نیاز یا اور کوئی صاحب اس "التفات" کے لطائف و محاسن معلوم کرنا چاہیں تو تفسیر کبیر، یا تفسیر فتح العزیز ہی ملاحظہ فرمالیں۔ موخر الذکر کا تو اردو ترجمہ بھی عام طور سے ملتا ہے۔

"نگار" (۹) قرآن شریف میں بکثرت ایسے واقعات اور ایسی شخصیتوں کا ذکر پایا جاتا ہی جنکا تعلق بالکل عہد نبوی سے ہی۔ مثلاً ابولہب یا کفار مکہ اور انکے اصنام وغیرہ۔ پھر اگر قرآن مجید ازل سے یا خلق عالم کے وقت لوح محفوظ میں منقوش تھا (جیساکہ عام عقیدہ ہی) تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ یہ سب کچھ بصورت مقدرات طے ہوچکا تھا اور قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسی تاریخی کتاب کی ہوجاتی ہی جسمیں واقعات کے ظہور سے پہلے صرف انکے وقوع کی پیشین گوئی کی گئی ہو درانحالیکہ کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہے"

"الفرقان" اسکا جواب بھی وہی ہی جو ہم نمبر ۵ کے ضمن میں عرض کرچکے ہیں جسکا حاصل یہ ہی کہ "نزول قرآن" سے پہلے "لوح محفوظ" میں جو یہی قرآن درج تھا تو اسکا بھی خلق و انشا بعد میں آنیوالی اُسوقت اور اُس ماحول کو ہی لحاظ سے ہوا تھا جس وقت اور جس ماحول میں وہ بعد میں نازل ہوا اور جیساکہ ہم نے عرض کیا وہ بس ایک پیشبینی نقل تھی اُس قرآن پاک کی جو چھٹی صدی مسیحی میں حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو جسکو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم محیط اور اپنی قدرت کاملہ سے وقت نزول سے ہزارہا برس پہلے "لوح محفوظ" میں ثبت فرمادیا تھا۔ ہماری عرض کی ہوئی اس حیثیت اور "پیشین گوئیوں والی تاریخی کتاب" کی حیثیت میں جو فرق ہی امید ہی کہ جناب نیاز اور انکے معاونین اگر غور کرینگے تو انکی سمجھ سے محروم نہ ہوگی۔

"نگار" (۱۰) خدا کو سمیع و بصیر بھی کہتے ہیں لیکن اسکی سماعت و بصارت کان اور آنکھ کی محتاج نہیں، پھر کیا وجہ ہی کہ جب اسکی صفت "نطق" کا ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ "نطق" ہو جو الفاظ کا محتاج ہی جس طرح اسکو سننے اور دیکھنے کیلئے کان اور آنکھ کی ضرورت نہیں اسی طرح کلام کیلئے زبان یا الفاظ سے اُسے بے نیاز ہونا چاہیئے اور اس صورت میں الفاظ قرآنی کو خدا کا کلام کہنا گویا یہ کہنا ہی کہ وہ زبان و الفاظ کا محتاج ہی۔"

"الفرقان"۔ نیاز صاحب نے اس نمبر میں نہ صرف یہ کہ خود ہی فرض کرلیا ہی بلکہ اپنے ناظرین کو بھی یہ باور کرانیکی کوشش کی ہی

کہ مسلمان جو قرآن پاک کو "خدا کا کلام" کہتے ہیں تو وہ اس عقیدہ کی بنا پر ہے کہ جس طرح ہم الفاظ قرآن کو اپنے کام و دہن سے ادا کرتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کے نزدیک معاذ اللہ خدا نے بھی اپنی "زبان" اپنے "تالو" اپنے "حلق" اور اپنے ہونٹوں سے اس قرآن کو ادا فرمایا ہے حالانکہ جو غیر مسلم بھی مسلمانوں کے عقائد سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں وہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ یہ نیاز صاحب کا محض افترا ہے جس کو کسی طرح انکی ناواقفی یا سادہ لوحی پر محمول نہیں کیا جا سکتا ــ ہم بتلا چکے ہیں کہ اس قرآن "عربی مبین" کو مسلمان بس اس حیثیت سے "کلام الحق" مانتے ہیں کہ اسکی تالیف و تنزیل در محال معلومہ میں اسکی ایجاد و تخلیق بلا واسطہ کسی شی آخر کی حق تعالےٰ کی طرف سے ہوئی ہے فرمایئے کہ اسکے لیے کام و دہان اور حلق و زبان کی کیا ضرورت ہے؟

دراصل جو حضرات نیاز صاحب اور انکی گمراہیوں سے واقفیت رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ نیاز خود بھی اتنے جاہل اور مسلمانوں کے ایسے مشہور عام عقیدے سے ناواقف نہیں ہیں بلکہ وہ صرف اپنے جرم کو ہلکا کرنے کیلئے اس "تجاہل" کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور لوگوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ قرآن پاک کے کلام خدا ہونے سے انکا انکار تنزیہ خداوندی کے نیک جذبہ کے ماتحت ہے، حالانکہ انکو خدا کے ساتھ جتنی "ہمدردی" ہوسکتی ہے وہ معلوم ہے۔

علاوہ ازیں اگر واقعی انکے انکار کی بنیاد اسی تنزیہ پر ہوتی تو وہ صرف خدا کے تکلم بمعنی "تلفظ و نطق" کا انکار کرتے حالانکہ انھوں نے نہایت صفائی اور ڈھٹائی کے ساتھ قرآن پاک کے منجانب اللہ ہونے سے بھی انکار کیا اور اسکو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہم و فراست کا نتیجہ قرار دیا، پھر اس سے بڑھکر یہ کہ انھوں نے اسکو بیان کردہ قصص و واقعات کو غیر تاریخی غیر محقق اور یہود و نصاریٰ کے بیانات سے ماخوذ بتلایا اور اسی بنا پر ہم نے ان کو "مرتد" یا "منافق" لکھا ہے:۔

"تبیع المشرق" کی مدعی نیاز صاحب کی ایک حمایتی نے شکوہ کیا ہے کہ جب نیاز صاحب رسول اللہ کی صداقت اور بلند اخلاقی کو تسلیم کرتے ہیں اور جون ہی کے پرچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ

"میں رسول اللہ کو بڑی بلند اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے"،

تو ان کو "مرتد" "منافق" اور "خارج از اسلام" کیوں کہا جاتا ہے؟

ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ "صداقت" اور "بلند اخلاقی" کا ایسا اقرار "ابوجہل" بھی کرتا تھا حدیث کی مشہور اور مستند کتاب "جامع ترمذی" میں ہے کہ اس نے ایک دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا

یا محمد انا لا نکذبک و انما نکذب ما جئت بہ	اے محمد ہم تم کو جھوٹا نہیں سمجھتے ہاں جس قرآن کو آپ لائے ہیں ہم اسکی تکذیب کرتے ہیں

تو قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:۔

انھم لا یکذبونک ولکن الظٰلمین بایات اللہ یجحدون	بیشک یہ لوگ آپکی تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم "آیات الہیہ" کا انکار کرتے ہیں

پس نیاز صاحب کا جرم اس اقرار صداقت کے باوجود وہی ہے جو "ابوجہل" کا تھا اور اسلیے ہمارے نزدیک انکا حکم اور انکا مذہب بھی وہی ہے جو اس قدیم دشمن ایمان کا تھا۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام کے قلعے

(از جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی استاذ تفسیر ندوۃ العلماء لکھنؤ)

(۳)

مقصد کی تعیین اور نصب العین کی بلندی

ذہنی تشکیل اور سیرت کی تعمیر کے سلسلہ میں ایک نہایت اہم اور موثر چیز مقصد کی تعیین و وضاحت اور نصب العین کی بلندی ہی متعین اور واضح مقصد اور بلند نصب العین ہی وہ چیز ہے جو چستی اور نشاط اور زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔ قرآن حکیم نے غالباً اسی لیے جا بجا مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کے ظہور کے بلند ترین مقاصد اور اعلیٰ نصب العین کو بار بار یاد دلایا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (الآیہ)، وکذلک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس" اور اسی لیے ان کے درخشاں مستقبل اور ان کی آئندہ کامرانیوں کا ذکر کیا ہے تاکہ افسردگی مُردہ دلی اور ناامیدی دور ہو کہ یہ جماعت کی زندگی کیلئے سم قاتل ہے ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم (الآیہ) سورہ یوسف، سورہ قصص سورہ روم اور سورہ فتح کو غور سے پڑھنے اور جن یاس انگیز اور بظاہر تاریک حالات میں یہ سورتیں نازل ہوئیں ان کو پیش نظر رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں میں بھی مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارات ہیں تفصیل و تشریح کا یہ موقع نہیں۔

علامہ اقبال مرحوم نے "اسرار خودی" میں مقصد کی تابندگی اور بلندی اور اسکے نفسیاتی اور اجتماعی اثرات کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ قوموں کی زندگی کے عمیق مطالعہ پر مبنی ہے

عربی مدارس کے طلبہ کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں غیر معمولی افسردگی اور زندگی کی ایک خاص بے کیفی نظر آتی ہے اس کا جواب مختلف طریقوں پر دیا جاتا ہے کسی خاص ماحول، طریق ماندو بود نصاب اور طرز تعلیم کی خشکی کا عذر کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ بعض معترضین اس جواب سے مطمئن ہو جاتے ہوں اور ممکن ہے کہ اس افسردگی میں ان چیزوں کو بھی دخل ہو لیکن ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے ان طلباء کے سامنے کوئی متعین اور واضح

پروگرام کوئی صاف اور روشن راستہ اور کوئی حوصلہ افزا مستقبل اور کوئی بلند نصب العین نہیں، وہ نظر اُٹھاتے ہیں تو انکو سامنے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے نصب العین میں سخت ابہام اور شک، ارادوں میں شدید تذبذب اور ذہن میں سخت الجھاؤ ہوتا ہے یہ بھی اُن چند حساس اور ذکی طلبہ کا ذکر ہے جو اپنے مستقبل پر غور کرتے ہیں ورنہ طلبا کی کثریت کو اس مسئلہ پر غور کرنیکا موقع ہی نہیں ملتا، آپ جب چاہیں اس کا امتحان کر سکتے ہیں، معاشی حیثیت سے انکی آئندہ زندگی انکی نظر کے سامنے ہوتی ہے اور اس کی ناکامی کا خیال رہ رہ کران کے دل میں چٹکیاں لیتا رہتا ہے، پھر اپنی حقارت پستی اور پسماندگی کا احساس ان کو اور زیادہ افسردہ اور پژمردہ کرتا رہتا ہے،

اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ ان کو ان کی قیمت بتائی جائے ان کو بتایا جائے کہ وہ کس اہم اور مقدس کام کے لیئے تیار ہو رہے ہیں، ان کی زندگی کا نصب العین کس قدر بلند اور ان کا مطمح نظر کتنا اعلیٰ ہے دُنیا کی تاریخ میں (صحابہ کرام اور مصلحین امت کے علاوہ) کسی جماعت کا جو بلند سے بلند نصب العین رہا ہے ان کا نصب العین اس سے کہیں بلند ہے اور آج بھی دُنیا کی مختلف ممالک میں جتنی جماعتیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا اصلاحی و معاشرتی کام کر رہی ہوں، اور بلند مقاصد رکھتی ہوں، ان کے مقاصد بھی ان کے مقاصد کے مقابلہ میں کہیں فروتر اور پست ہیں.

کیا بندوں کے نام خدا کا پیغام پہونچانا، پیغمبر خاتم کے احکام کی تبلیغ، کیا تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفوس کی خدمت ان بے شمار انجمنوں کے مقاصد سے فروتر ہے جو حشرات الارض کی طرح زمین کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور جن کے کارکنوں میں زیادہ جوش اور زندگی ہے ——— کیا اخلاق و اجتماع و سیاست کے آسمانی نظام کے قیام و تاسیس کا پیغمبرانہ فریضہ اور انسانی زندگی کی وحیٔ الٰہی کے مطابق تشکیل، کسی اشتراکی یا قومی و سیاسی تحریک سے کم درجہ کا کام ہے اور کیا احیا، اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی عظیم الشان اور مجددانہ تحریک کسی تحریک "اصلاح مذہب اور رفارم" سے پست تر ہے، پس اگر درحقیقت طلبہ کے یہی مقاصد ہیں (اور حقیقتاً انکے یہی مقاصد ہونے چاہئیں) اور اگر واقعتہً وہ اسی کام کیلئے تیار ہو رہے ہیں تو ان کو اپنی قسمت پر ناز ہونا چاہیئے ان کا سر اونچا، ان کا دل ولولوں سے، ان کا سینہ حوصلوں سے معمور، انکو جوش سے مخمور اور افسردگی اور مردہ دلی کو ان سے کوسوں دور ہونا چاہیئے، ان کو ان علوم کی شرافت اور ان معارف وحقائق کی عظمت پر غور کرنا چاہیئے جن سے اللہ تعالیٰ نے انکو مالامال کیا ہے وہ اگرچہ بے مایہ اور دُنیا کی دولت سے تہی دامن ہیں لیکن وہ تہی سینہ نہیں ہیں۔

برخود نظر کشا زتہی دامنی مرنج　　　در سینۂ تو ماہ تمامے نہادہ اند

اور انکے یہ مقاصد اور انکے سامنے کام کا یہ نقشہ اور زندگی کا نصب العین نہیں ہو تو ہم کو ایکے حال پر رحم آتا ہے اور ان کی زندگی کی بربادی اور ناکامی پر تعزیت کا موقع ہے کہ انسے بڑھکر خسر الدنیا والآخرۃ ذلک ھو الخسران المبین کا مصداق کوئی نہیں، وہ اپنی تعلیم کے جس مرحلہ پر بھی ہیں ان کو اپنی سمت صحیح کر لینی چاہیئے، عربی مدارس کے بجائے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رُخ کرنا چاہیئے کہ ان کے لیئے عربی مدارس میں خسران دنیا کامی، حسرت و یاس اور نوحہ و ماتم کے سوا کچھ نہیں، ہم صفائی کے ساتھ کہدینا چاہتے ہیں کہ عربی مدارس کا ہرگز یہ کام نہیں، کہ وہ کسی خاص زبان یا علوم کی تعلیم دیں یا زمانہ کی چلتی ہوئی مشنری میں فٹ ہونے کیلئے پُرزے ڈھالیں، یہ کام جن فیکٹریوں میں ہوتا ہو ان کو ان کا رُخ کرنا چاہیئے۔ ہمارے طلبہ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کے سامنے بہت بڑا کام ہے دین اس وقت سخت کس مپرسی اور غربت کی حالت میں ہے ——— اور دین کی حفاظت و ترقی کی آس صرف انسے ہو ملک کی تمام غیر مذہبی تربیت یافتہ جماعتوں نے مذہب کی تحریف و تخریب پر کمر باندھ لی ہو علماء اور ان جماعتوں کے خلاف جو مذہب کے اصلی نظام کی محافظ ہیں، ہر جگہ بغض و عداوت کی آگ روشن ہو اور اس بارہ میں عوام اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں میں عجیب و غریب قسم کا نادر الوقوع اتحاد ہو گیا ہو قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر ان کو ایسے ناموافق حالات میں کام کرنا ہے، اور لوگوں کی مرضی کے خلاف زندہ رہنے کی اور اسلامی شریعت کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنا ہو۔

انسانوں کی خواہشات اور زمانہ کے رجحانات کے برخلاف اور خود اہل مذہب کی سرد مہری بلکہ مخالفت کے باوجود کسی "خشک" اخلاقی و روحانی اور تعمیری نظام کو قایم کرنا، یا اس کی حفاظت کرنا آسان کام نہیں۔ اس میں فسردگی اور پژمردگی کا کیا گزر اسکے لیئے فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیئے۔

لیکن ان ہمت شکن حالات سے ان کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے ظہور اسلام کی محیّر العقول تاریخ کے علاوہ جس کا انھوں نے مطالعہ کیا ہے بیسویں صدی کی اس پہلی تہائی کی تاریخ ان کی ہمت افزائی کیلئے کافی ہو۔ اس عرصہ میں دنیا میں متعدد غیر معقول اور بظاہر ناممکن العمل تحریکیں شروع ہوئیں، لیکن اپنے کارکنوں کی مسلسل کوششوں اور قربانیوں سے وہ حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب ہوئیں انھوں نے بڑے بڑے وسیع نظام اور بڑی بڑی سلطنتیں قایم کیں کیا اسلام کی تحریک کسی ایسی وطنی و سیاسی و اقتصادی تحریک سے زیادہ ناممکن العمل ہے؟ ہم اس کو تسلیم کرنیکے لیئے تیار نہیں!

(باقی)

اسلام کے دوست نما دشمن

(از حضرت مولٰنا اعزاز علی صاحب شیخ الادب و الفقہ دار العلوم دیوبند)

وصف رخسارۂ خورشید ز خفاش مپرس — کہ دریں آئنہ صاحب نظراں حیرانند

ایک صاحب سالہا سال تک الحاد، دہریت اور مغرب زدگی کے امراض متعدیہ میں مبتلا رہ کر، اہل یورپ کے توہمات اور وساوس کی رَو میں بہتے رہے، اور اس طرح کہ یورپ کے کسی معروف، غیر معروف ماہرِ فن کا قول تو بلا دلیل اور بلا تاویل مان سکتے تھے، مگر اسلام کے اصول اور فروع میں سے ہر ایک اُن کیلئے محل نظر اور قابل غور تھا، انگریزی میں ایم اے اور ہندوستان کے ایسے ضلع کے باشندے تھے کہ وہاں کی فصاحت، طلاقتِ لسانی بچوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہوتی ہی، اس لیئے تحریر، تقریر، تصنیف، تالیف کے ذریعہ سے اپنے خیالات سے اپنی جنس کے بہت سے لوگوں کو متاثر کر چکے تھے، اور یہ کوششیں اب بھی ختم نہ ہوئی تھیں بلکہ زندقہ اور الحاد کے اس جال میں انسان نما جانداروں کے پھنستے رہنے کا سلسلہ جاری تھا، اور اگر یہ سمند اسی طرح طغیانی پر رہتا تو یقیناً ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک اچھی جماعت اس میں ڈوب کر حیات ابدیہ کو کھو دیتی اور دردمندان اسلام حسرت کے ساتھ کہتے ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار — کہ پیدا نشد تختہ بر کنار

لیکن ارحم الراحمین کی اُس ذات ستودہ صفات نے (جس کی رحمت کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، کسی ذی کے کرم کو خرید نہیں لیا، کوئی اُسکی عطاؤں اور بخششوں کا ٹھیکہ دار نہیں) اُس وقت اُن کی دستگیری کی جبکہ وہ دوزخ کے کنارے پہونچ چکے تھے، قبر کا اژدہا ان کیلئے مُنہ کھولے ہوئے تھا اور جہنم کا تنور تیز تیز نظروں سے اُن کا منتظر تھا۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بسا اوقات ایک شخص عرصۂ دراز تک کافروں کے سے اعمال کرتا رہتا ہے، اُسکے اعمال پر نظر رکھنے والوں کو یقین ہوتا ہی کہ یہ شخص دوزخی ہے لیکن آخر وقت میں ماں باپ سے زیادہ مہربان خدا کی رحمت اُس کی دستگیری کرتی ہی، اور وہ اپنے سابقہ اعمال سے توبہ کر کے اعمال صالحہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہی، اور اسی لیئے

اُن کے سئیات معاف کردیئے جاتے ہیں اور وہ حسب وعدہ خداوندی دار خلد کا مستحق ہو جاتا ہی، اسی طرح بعض لوگ ایسے بھی بدنصیب ہوتے ہیں کہ اپنی عمر کے اکثر حصے میں اُن سے فرائض اور واجبات تو کیا ترک ہوتے مستحب اور اولی کا ترک بھی حتی المقدور نہیں کرتے ہیں، اور اُن کے انہیں افعال حسنہ کو دیکھ کر یہ خیال قائم ہو جاتا ہی کہ یہ لوگ اون خوش قسمتوں میں سے ہیں جو بہشت بریں میں سب سے پہلے داخل ہونگے لیکن اُن کے ان افعال پر انکی ازلی شقاوت غالب آجاتی ہی، اور وہ موت کے قریب پہونچکر کبائر کا ارتکاب کرتے اور بجائے ناجی ہونے کے ناری ہو جاتے ہیں اللھم احفظنا من سوء الخاتمۃ

"اس ناری" کی نجات بھی رسالت مآب صلے اللہ وسلم کے فرمان کی ایک مثال ہی اور اس وقت تک یہ عبد آبی اپنے گزشتہ سیئات کے رد عمل مصروف ہی، صبح کا گم شدہ اگر شام کو واپس آجائے تو اُس کی گمشدگی پر افسوس نہیں کیا جاتا ہی۔

موصوف کے بعض بے تکلف دوستوں نے دریافت کیا کہ آپ یکایک مذہب کے اُس کنارے سے اس کنارے پر کس طرح آگئے، کہ ضال و مضل تھے، یا اب ہادی و مہدی ہو گئے؟

فرمایا کہ یہ داستان طویل ہی، (ع) "کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہی داستاں میری"، مگر اس انقلاب تام اور مکمل کا یابٹ کے قوی محرکات میں سے دو چیزیں ضرور قابل ذکر ہیں،

(اول) یہ کہ میں فلاں عجائب خانہ میں قدیم اشیاء کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ یہ میوزیم (عجائب خانہ) عجائبات زمانہ کا مخزن تھا، اس کی ایک ایک چیز گزشتہ زمانہ کے حالات کیلئے بولتی ہوئی تصویر تھی میں ہر چیز کو غور سے دیکھتا بھالتا ایک مجسمہ کے قریب پہونچا جس پر مختصر عبارت میں یہ کندہ تھا کہ "یہ مجسمہ مسلمانوں کے آخری نبی کا ہے، اور اس تصویر کو روما کے عجائب خانہ سے حاصل کیا گیا ہی"

ظاہر ہی کہ اول تو میوزیم میں کہ جس کی تعمیر پر کروروں روپیہ بیدریغ صرف کیا جاتا ہی، اور لاکھوں روپیہ اُسکے عملہ کی تنخواہوں اور دیگر مصارف میں صرف ہوتا رہتا ہی۔ کوئی چیز غیر ثابت رکھی ہی نہیں جاتی ہی، کسی میوزیم میں کسی چیز کا موجود ہونا ہی اُس کی صحت اور صلیت کا صحیح ضامن ہی، خصوصاً ایسا میوزیم جس کا تعلق یا انتساب یورپ کی کسی وسیع جاہ سے ہو، یہ دیکھ لینے کے بعد کہ اس میوزیم پر تقریباً اسّی نوّے ہزار روپیہ ماہانہ خرچ ہوتا ہی کوئی خارج از عقل ہی ہوگا جو اسکی زبان حال کی روایات میں شک کر سکتا ہو، اگر بالفرض کسی کو شبہ ہوتا بھی تو اس تحریر نے کہ یہ تصویر روما سے لائی گئی ہی شک کی گنجائش ہی نہیں رکھی اب تو "سند متصل" ہو گئی، روما کے عجائب خانہ میں کوئی ایسی چیز رکھی جا سکتی ہی نہیں جس کا انتساب

صحیح نہ ہو، اقطار ارض کو گھیر لینے والے آسمان میں شک ہو سکتا ہی، اس کو سطح نظر قرار دے کر اس کے وجود کا انکار کیا جا سکتا ہی، اور اگر قرآن کی آیتوں سے اس کا ثبوت ہوتا ہو تو (نعوذ باللہ) قرآن کی آیات کو مسخ کیا جا سکتا ہی انہیں اگر لفظی تحریف ممکن نہیں تو معنوی تحریف کی جا سکتی ہی لیکن وہاں کے عجائب خانہ سے حاصل شدہ چیز میں خطا کا احتمال یا کسی غلطی کا شبہ کیا معنی؟ "الحدیث بالحدیث یذکر" کے طور پر ایک واقعہ درمیان میں اور سن لیجئے اسکو بعد ہم ان ایم اے صاحب کا بقیہ بیان نقل کریں گے۔

ایک صاحب جو میری دوست بھی تھے اور ان سے خاندانی قرابت بھی تھی، دیوبند تشریف لائے، میں نے چاہا کہ وہ دار العلوم کا معائنہ اس طرح کریں کہ ان کو رائے قائم کرنے کیلئے عمدہ موقع مل جائے، کیونکہ دار العلوم دیوبند کے متعلق ابتدا ہی سے پروپیگنڈے کو اسکی اشاعت کا ذریعہ نہیں بنایا گیا ہی۔

جب خلافت کمیٹی سرگرمی کے ساتھ کام کر رہی تھی، تو حضرت مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی مرحوم دار العلوم دیوبند بھی اس غرض سے تشریف لائے تھے کہ علمائے دیوبند کو بھی شرکت کی دعوت دیں، اکابر دار العلوم کا اجتماع ہوا، میں اُس میں شریک نہ ہو سکا، تشریف آوری کے دن ہی ظہر کی نماز کے بعد دار العلوم کی مسجد میں بسلسلہ تقریر فرمایا کہ دار العلوم کے طلبہ کی خواہش بلکہ اصرار ہی کہ میں انکے سامنے موجودہ سیاست پر تقریر کروں، نیز ظاہر کروں کہ دار العلوم کو دیکھنے کے بعد میں نے اُسکے متعلق کیا خیال قائم کیا ہی، مجھ کو نہ تو تقریر کی عادت ہی، نہ میرے پاس اس قدر کافی وقت ہے کہ تقریر کروں کیونکہ میں ابھی واپس جا رہا ہوں سیاست حاضرہ کے متعلق مجھ کو جو کچھ کہنا تھا میں فرمہ داران دار العلوم سے کہہ چکا ہوں اُسکے اعادہ کی حاجت نہیں، لیکن دار العلوم دیوبند کے متعلق میں یہ ضرور کہونگا کہ دنیا کا ہر ادارہ، ہر کمیٹی، اپنی زندگی کا ذریعہ پروپیگنڈے کو سمجھے ہوئے ہی، لیکن حالات مشتہرہ کے بعد جب کبھی جانچ کیجاتی ہے تو اصل حقیقت بہت کم ثابت ہوتی ہی، لیکن دار العلوم دیوبند کی خدمات جس قدر ہیں یقیناً اپنی شہرت سے بدرجہا زائد ہیں دار العلوم آج بھی وہی دار العلوم ہی، علمی، عملی فیوض میں نہ اُس نے کبھی کوتاہی کی نہ آج کر رہا ہی، اُس کا نظریہ ہی کہ مسلمانوں کو ان کے خدا اور خدا کے رسول کے فرمان سمجھا دیئے جائیں، احکام بتلا دیئے جائیں، وہ اب بھی اُسی نقش قدم پر گامزن ہی اُس کے مخالفین اُس وقت بھی تھے جبکہ اُس کی صدارت تدریس کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس اللہ سرہٗ یا حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ سے زینت حاصل تھی اور اب بھی ہیں کہ دار العلوم دیوبند کے صدر المدرسین استاذ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی مدظلہ ہیں، مگر فرق اس قدر ہی کہ زمانہ سابقہ کے مخالفین تعداد میں کم تھے اور اب زیادہ ہیں پہلوں کی عداوت میں متانت، تہذیب غالب تھی اور چھچھوراپن مغلوب تھا اور اب مخالفین میں چھچھوراپن غالب ہے اور تہذیب ومتانت کی ناگوار کمی ہی،

یہ صحیح ہو کہ بعض ارباب اغراض دار العلوم دیوبند سے صرف اسلیے ناراض ہیں کہ اُس کی خدمات کو انجام دینے والی ہستیوں میں سے بعض ہستیاں اُنکی ناجائز خواہشوں کو پورا نہیں ہونے دیتی ہیں، اسی لیے یہ جماعت ساعی ہو کہ یا تو یہ جماعت دار العلوم سے نکل جائے، اور یا دار العلوم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔

یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ" کی مصداق یہ جماعت زہریلے جراثیم کی طرح خفیہ ریشہ دوانیوں پر فخر کرتی ہو لیکن شاید اس سے ناواقف ہو کہ ایک دن وہ بھی ہو جس میں کوئی چیز بھی مخفی اور پوشیدہ نہ رہیگی۔

قریب ہی یار روز محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر ۔ جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اگر وقت آگیا ہو کہ علوم اسلامیہ کے خزانے ہیں پر نہ رہیں، دُنیا سے ناپید ہو جائیں تو کوئی بھی تدبیر اس وقت کو آنے سے روک نہیں سکتی ہے، یہ وقت آئیگا اور ضرور آئیگا، اور اس صورت میں نہ صرف دار العلوم دیوبند تباہ ہو کر رہیگا بلکہ تمام دینی، مذہبی، علمی ادارے تباہ ہونگے، اور زمین و آسمان کی کوئی طاقت اُن کو اس سے بچا نہیں سکیگی لیکن اگر یہ وقت ابھی تک نہیں آیا ہے (اور خدا کرے نہ آئے اور اُسکے فیوض، اسکے اعداء و حسّاد کے علی الرغم دیر تک باقی رہیں) تو بجز اسکے کہ دار العلوم کی تباہی میں سعی کرنیوالوں کی دناءت، افترا پردازی، کذب کا اظہار ہو ذرہ برابر نقصان نہ دار العلوم کو پہونچا ہو اور نہ انشاء اللہ پہونچیگا۔ —— خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا کہ تعلیم دین کے ایک مرکز اور اسکے خدام کی حمایت میں قلم سے نکل گیا ورنہ میں اپنے ایک دوست کا واقعہ نقل کر رہا تھا کہ میں نے جب ان کو دار العلوم کی مکمل سیر کرائی، تو بہت خوش ہوئے، بہت زیادہ مسرّت کا اظہار کیا، سب سے آخر میں میں اُن کو دار العلوم کی خوشنما اور پتھر کی بنی بلکہ گویا ڈھلی ہوئی مسجد میں لایا، جس میں پانچ چھ سو طلبہ پنجوقتہ نماز پڑھا کرتے ہیں، مسجد کی تعمیر پسند فرمائی، اس مسجد میں ایک طویل و عریض حوض صحن مسجد کے وسط میں ہی مسجد کے قریب ہی ایک عالی شان پختہ کنواں، ہی جسمیں غسل خانہ اور حوض میں پانی پہونچانیکے لیئے ایک برقی موٹر لگا ہوا ہی جسکے ذریعہ سے یہ حوض پانچ چھ گھنٹے میں بھر دیا جاتا ہی اور اسی لیئے اس حوض کا پانی جلد جلد تبدیل کیا جاتا رہتا ہی، اور اسواسطے اس حوض کا پانی دوسرے عام حوضوں کی نسبت بہت زیادہ صاف رہتا ہی، مگر خدا جانے کیوں؟ اُس روز اس حوض کا پانی نسبتًہ کچھ زیادہ متغیر بھی تھا، حوض پر چند طلبہ وضو کر رہے تھے، اس حوض کو دیکھ کر میرے اُن دوست نے فرمایا کہ ایسا مکدّر پانی صحت کیلئے بھی مضر ہی، اور اس کو دیکھتے ہی کراہت ہوتی ہی، غیر مسلم لوگ یہاں بطور سیر کے آتے ہوں گے تو اس متغیر اور مکدّر پانی کو دیکھ کر وہ اسلام کی نسبت اچھا خیال لیکر واپس نہ ہوتے ہونگے، میں نے عرض کیا کہ پانی کی مقدار کے بارہ میں شرعی مسئلہ اس طرح ہی، ائمہ مجتہدین یہ فرماتے ہیں، نصوص شرعیہ سے یہ معلوم ہوتا ہی، غرض یہ کہ مختلف سی چیزیں اُن کے سامنے پیش کیں، اور جو دلیل زیادہ سے زیادہ

تو ہی سمجھتا تھا اُن کے سامنے پیش کی مگر اُن کی رائے میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہ ہونا تھا نہ ہوا،

بالآخر میں نے عرض کیا کہ امریکہ کے ایک ڈاکٹر کا ایک لیکچر شایع ہوا ہے جس میں اُس نے ثابت کیا ہے کہ دھوپ میں رہنے والے پانی صحت کے لئے بہت زیادہ مفید ہوتے ہیں، کیونکہ آفتاب کی تیز شعاعیں زہریلے جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہیں، اسکو غور سے سنکر فرمایا کہ سبحان اللہ! مسائل شرعیہ میں بھی خداوند عالم نے کیا کیا حکمتیں رکھی ہیں، بے شک اسلام دین برحق ہے، جب اُس کے چھوٹے چھوٹے احکام میں بے شمار مصلحتیں ہیں تو بڑے بڑے احکام میں خدا ہی جانے کہ کیا کیا منافع ہوں گے،

یہ بزرگ جب امریکن ڈاکٹر کے اس قول کو سن لینے کے بعد اسلام اور مسائل اسلامیہ کے متعلق قصیدہ خوانی سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کیا کہ اس پانی کے متعلق میں نے سچے شرعی دلائل آپکی خدمت میں پیش کیئے تھے کلام الٰہی کی کچھ آیتیں بھی تلاوت کیں، فخر عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی سنائے، مگر آپ کے خیال کو بدلنے کیلئے کوئی ایک بھی موثر ثابت نہ ہوا، لیکن اسی جگہ جب میں نے ایک امریکن ڈاکٹر کا ذکر کیا، تو آپ نے اس کو سنتے ہی سر تسلیم خم کر دیا۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ میں انگریزی سے قطعی نابلد ہوں اس صورت میں تو آپ کو یہ فرمانا ضروری تھا کہ تم انگریزی سے ناواقف ہو، تم کو امریکن ڈاکٹر کا لکچر کہاں سے مل گیا، یقیناً کسی نے ترجمہ کرکے سنایا ہوگا، وہ سنانے والا کون تھا، ایسا شخص تھا کہ اُسکا انگریزی ترجمہ معتبر ہو یا انگریزی سے ناواقف تھا کہ اُس کا ترجمہ غیر معتبر ہو، یہ بھی دریافت فرمانا تھا کہ یہ لیکچر کس اخبار میں درج تھا، اس کا اڈیٹر اس درجہ کا دیانت دار ہے کہ اُسکی اس روایت کو قابل اعتبار قرار دیا جاوے یا نہیں؟ اس طرف بھی توجہ نہ فرائی کہ وہ امریکن ڈاکٹر کون تھا، فی الواقع ڈاکٹر تھا، یا جس طرح مراد آباد میں مردہ زندہ کرنیوالے ڈاکٹر ہیں یہ بھی ویسا ہی تھا، پھر یہ کوئی اشتہاری ڈاکٹر تھا یا فی الحقیقت کوئی ماہر فن تھا، گویا آپکے نزدیک امریکن ڈاکٹر کا ذکر کچھ ایسا زبردست ذکر ہے کہ اُسکے ہوتے ہوئے نہ کسی دلیل کی حاجت نہ کسی تفتیش و تحقیق کی ضرورت لیکن مسائل شرعیہ جو صرف ظنی نہیں بلکہ اُن میں سے بعض ایسے قطعی بھی ہیں کہ خدا سے جبریل اور جبریل کی وساطت سے فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچے، قلبی اطمینان کے لیے کافی نہیں، امریکن ڈاکٹر کے قصہ میں تو بہت سے احتمالات تھے، وہ ڈاکٹر ہی نہو بلکہ ایک ایسا چوہا ہو کہ جسکے ہاتھ میں ایک ہلدی کی گرہ آگئی اور وہ کہنے لگا ہو کہ میں پنساری ہوں، یا ڈاکٹر تو ہو مگر اسکی تحقیقات کامل نہ ہو، اور یوں ہی تسویل نفس کی وجہ سے اپنے تخیلات اور توہمات کو تحقیقات سے تعبیر کر دیا ہو، یا تحقیق تو کی مگر تحقیق ہی غلط ہو، یا اخبار نے لکچر کی خبر ہی غلط دی ہو، یا میں نے ہی غلط کہا ہو، یا میں نے تو غلط نہیں کہا مگر جس نے مجھ کو یہ لیکچر سنایا اُس نے غلط ترجمہ سنا یا ہو، مگر ارشادات الٰہیہ میں تو مرسل (مالک الملک) اور مُرسَل الیہ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم) اور ما بہ الارسال (جبریل) ان میں سے کسی جگہ بھی غلطی کا احتمال نہیں، ان کے فرمائے ہوئے احکام کے بعد سر نہ جھکنے کا سبب ضعف ایمان کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہی نہیں ہے ـــــ خیر یہ تو بات میں بات" کے طور پر ذکر آگیا تھا ورنہ میں ایک ایم۔ اے صاحب کی داستان سنا رہا تھا جو پہلے ملحد بلکہ ملحد گر تھے اور اب بفضلہ تعالیٰ راسخ مومن بلکہ مومن گر ہیں۔

ہاں تو اُس وقت اُنکے نزدیک روما کے عجائب خانہ کا نام لے دینا نقل کی صحت کا ایسا کفیل تھا کہ غلطی کا احتمال ہی نہ ہو سکتا تھا، اور ادھر ذہن ہی نہ جا سکتا تھا کہ عہد نبوی صلے اللہ علی صاحبہ وسلم میں ایسی تصویر کشی کا رواج صفر کے درجہ میں تھا، نہ یہ خیال میں آسکتا تھا کہ اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہے کہ آپ کی خدمتیں کوئی مصوّر، بارادۂ صورت گری آیا ہو اور نہ ادھر ذہن جا سکتا تھا کہ آپ کی ہر حرکت وسکون کا ذکر کتب احادیث و تواریخ میں ہے مگر کسی جگہ بھی نہیں ہے کہ آپنے کبھی تصویر کھنچوائی ہو بلکہ ارشادات نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے تو بصراحت جاندار کی تصویر کشی حرام بھی معلوم ہوتی ہے، یہ سب ایسی وجوہ تھیں کہ جنکی بنا پر حضور کی تصویر کا بہم پہنچا یقیناً غلط ثابت ہوتا ہے لیکن روما کے "معتبر راوی" کی خبر کو غلط کس طرح کہا جا سکتا تھا۔

ہاں تو وہ تصویر میں نے دیکھی، اُس تصویر کے خط وخال، نقش ونگار سے ایک قیافہ شناس کے نزدیک نہ صرف اُن تمام اخلاق حسنہ اور جمال کامل کا بطلان ہوجاتا ہے جو احادیث یا تواریخ کی کتابوں میں نبی آخر الزماں کے متعلق بیان کئے جاتے ہیں، بلکہ اس صورت کو دیکھ کر ایک معمولی عقل والا انسان بھی اس نتیجہ کے اخذ کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کی تصویر ہے جو قسوت قلب بلکہ راہزنی اور سفاکی جیسے اخلاق شنیعہ کا جامع ہے۔

میں نے اس تصویر کو بغور دیکھا، اور ہادی حقیقی نے مجھکو سمجھا دیا کہ اسلام اور ہادیِ اسلام کے خلاف شاطرانہ چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ بہت سے ضعیف الایمان قلوب سے اس ہوشیاری کے ساتھ ایمان نکال لیا جاوے کہ خبر بھی نہ ہو کہ یہ شخص کہاں تھا اور کہاں پہونچ گیا۔

دوسرا محرک میرے لیئے یہ ہوا کہ میں ایک کتاب دیکھ رہا تھا جس کا تعلق بظاہر کسی مذہب سے کچھ نہ تھا، یہ کتاب ایک ماہر فن عیسائی ڈاکٹر کی تھی جس میں اُس نے نہایت عمدہ اور سلیس پیرایہ میں امراض بدنیہ کی تشریح کی تھی، اور ڈاکٹروں کے طریقہ پر اُسکے علاج بتائے تھے۔

امراض کے بیان کے سلسلہ میں جب صرع کی تحقیق کی، اُس کے انواع کو بیان کیا تو نہایت "معصومانہ" انداز میں یہ بھی کہا کہ ایک قسم صرع کی نہایت شدید ہے اُسمیں مریض کے سامنے متخیلہ صورتیں بھی آجاتی ہیں وہ اُن سے اپنے زعم میں کلام کرتا اور

جواب حاصل کرتا ہے، اور اُس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ہو بہو وقوع میں آیا ہی، اس کے دورے مریض پر وقتاً فوقتاً پڑتے ہیں، مگر اُس کو اور اس کی پاس اُٹھنے بیٹھنے والوں کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ کوئی مرض ہے، غرض نہایت ہی شاطرانہ انداز میں وہ تمام علامات بیان کردیں جو نزول وحی کے وقت علیٰ فرق مراتب انبیار میں پیدا ہو جاتی ہیں، اور یہ لکھ کر کہا کہ یہ مرض ہے اور یقیناً موجود ہی، اور دماغی اعضا اور عروق کی فلاں فلاں خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہو سکتا ہی، مگر ہم نے اب تک کسی ایسے مریض کو نہ دیکھا نہ ہمارے زیر علاج رہا، جہاں تک حالات کے معلوم ہونے کا تعلق ہے اُس سے ظاہر ہی کہ اب سے چند صدی قبل اس مرض کا ایک مریض دُنیا میں تھا جو اس مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود بڑے بڑے دماغی کام بھی انجام دیتا تھا اور ملکی انتظام میں بھی مصروف رہتا تھا، اکا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا، اسی کو مسلمان اپنا نبی سمجھتے ہیں۔

طب کی کتاب کوئی مذہبی کتاب نہیں ہے، اس فن کی کتاب جب ایک طالب علم کے سامنے لائی جاتی ہی اور وہ بھی اس طرح کہ ادھر تو نہ طالب علم مذہب سے واقف نہ اُس کو مذہب سے کوئی اُنس، اودھر کتاب کے مصنف کی نسبت اُس کا عقیدہ ہی کہ یہ اپنے فن کا ماہر اور حق گو ہے، اور کبھی نہیں سُنا گیا کہ اس کتاب کے مصنف نے اسلام کے مقابلہ میں عَلم مخالفت بلند کیا ہو، تو اس کتاب کو ان خیالات کے ساتھ مطالعہ کرنے والا جو کچھ نتیجہ نکالیگا وہ زیادہ غور کا محتاج نہیں ہی اسی قسم کے واقعات کی بنا پر یہ کہنا بیجا نہیں ہی کہ عیسائی کا ہر قدم خواہ ہمدردی کی صورت میں ہو یا مذہبی گفتگو کے سلسلہ میں، علاج کے طرز پر ہو، یا صدقہ وخیرات کی ہیأت میں تبلیغی ہی ہوتا ہی، اُس کا ہر گرم وسرد سانس اپنے مذہب کی تبلیغ کرتا ہے؛

جرجی زیدان ایک عیسائی ہی جو عربی تاریخی ناول نویسی میں مشہور ہی، اور خود فخر کرتا ہی کہ میں نے ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کے گھر گھر میں اپنے ناول پہونچا دیے، احقر مضمون نگار نے بھی اُس کے وہ ناول دیکھے ہیں یہ شخص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا بلکہ امت اسلامیہ کے دیگر ابرار واخیار کا بھی ذکر بالکل اس طرح کرتا ہی جس طرح ایک راسخ العقیدہ صاحب ایمان کامل ذکر کرتا ہے، اسکے حالات سے ناواقف لوگ اسکو مسلمان ہی سمجھتے ہوں گے، مگر احقر اُسکے اُن تمام ناولوں کو دیکھ کر جو دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں موجود ہیں اس نتیجہ پر پہونچا ہی کہ کسی ناول کی تصنیف سے پہلے وہ اسلام کی کوئی مشہور روایت، یا مسلمانوں کا کوئی صحیح اور ضروری عقیدہ یا کوئی شرعی مہتم بالشان مسئلہ اپنے ذہن میں رکھ لیتا ہی اور ناول کو شروع کرتا ہی اس ارادہ سے ہی کہ اُس کو اُس کا ابطال کرنا ہی اور اپنے مورخانہ طرز میں اس طرح چلتا ہی گو یا کہ ایک محقق شخص اپنی تحقیق کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے میں نے

اس تلبیس کو دیکھ کر دل میں کہا کہ خدا جانے اس ملمع سازی سے کس قدر مسلمان بدعقیدہ ہو چکے ہوں گے؛

جرجی زیدان نے تو اپنی عیسویت کا فریضہ نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا مگر بہت زیادہ قابل تاسف یہ امر ہی کہ ہندوستان میں بڑے طمطراق کے ساتھ ان ناولوں کے تراجم شایع ہوئے یعنی ایک طرف تو عربی دانوں کی ایک بڑی جماعت احادیث اور اسلامی تاریخوں کو اغلاط کا مجموعہ سمجھنے لگی ہوگی اودھر ہندوستان کے اُردو داں "محقق" جنکا مبلغ علم ہی اُردو لکھنا پڑھنا ہے کس درجہ میں پہونچ چکے ہوں گے۔

غرض ان دونوں واقعات نے اس مغرب زدہ سعید ہستی پر اثر کیا، اور جس طرح کہ حکیم لقمان نے اپنی اخلاقی تعلیم کو تمیز ون کی طرف منسوب کردیا تھا کہ میں نے اُن کی ہر بات کو میزانِ عقل میں وزن کر کے اُن کے افعال کو ناقابل عمل سمجھا، اسی طرح یہ سعید روح ان کفریہ محرکات کو دیکھنے کے بعد بجائے اس کے کہ کچھ آگے اور بڑھ جاتی اور پیچھے ہٹ گئی۔

غرض روزمرہ کے تجربات، آئے دن پیش آتے رہنے والے واقعات نے ہم کو یقین دلا دیا ہی کہ اسلام کے اُن مخالفین نے جنکے قلوب میں اسلام سے نفرت ہی نفرت بھری ہی، اسلامی شعائر کو غور سے دیکھا اور معلوم کیا کہ ان شعائر اسلامی کی حامی کون کونسی قوتیں ہیں، تو اُن کو معلوم ہو گیا کہ اسلام میں ما بہ الامتیاز یہ چیزیں بھی ہیں۔

(۱) علم (۲) نبوت (۳) خدا اور خدا کے رسول کے کلام کو واجب الاطاعت ماننا (۴) تقوی و دیانت (۵) خواتین اسلام کی عصمت شعاری اور پاکبازی (۶) زعمائے قوم کو گالیاں نہ دینا (۷) موت سے نہ ڈرنا (۸) اتحاد باہمی۔

اسلامی قوتوں کے اس تجزیہ کے بعد اس مخالف جماعت کیلئے تقسیم عمل سہل ہو گئی، اور اس نے خفاً و ثقالاً انہیں سے ہر ایک کے پرخچے اُڑانے شروع کر دیئے، اور سعی کی کہ اسلام کے ساتھ دُنیا کے محاسن میں سے کوئی بھی باقی نہ سمجھا جاوے

(۱) علم کی جوگت اس زمانہ میں بنی ہی شاید اس سے پہلے کبھی نہ بنی ہو، قومی مدارس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے وہ طلبہ کو علوم اسلامیہ کی طرف راغب کر سکیں صرف خدا کی قدرت ہی ہی کہ کچھ نہ کچھ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو اسکولوں، کالجوں کی چمک بھڑک، اُس کی اسناد کی عظمت اور شاندار نتایج کو دیکھتے ہیں مگر کسی جانب نظر نہیں اُٹھاتے ہیں اور دیوانہ وار

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و جمال ماہے　　　چہ کنم کہ چشم خوش بیں نکند بکس نگاہے

کی رٹ لگاتے ہوئے ہزاروں قسم کی دُنیوی ذلتوں کو برداشت کرتے ہوئے چلے آتے ہیں، یہاں اگر اُن کو بجز اس کے کہ خدا اور خدا کے رسول برحق کی اطاعت کے طریقوں سے واقف ہوں اور کیا ملتا ہی اسکولوں اور کالجوں میں ہمارے بچے داخل ہو کر بفرض محال "لاٹ صاحب" ہی کیوں نہ ہو جاویں مگر "مسلمان صاحب" تو ہوتے نہیں

اس جدید تعلیم کے جو نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں آج کون ہے جو ان کو دیکھنے کے بعد اکبر مرحوم کے اس شعر کی تکذیب کرسکے۔

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے ۔ تو پھر اس کی کیا خوشی ہو کوئی جنٹ کوئی جج ہے

(۲) مسلمان کا پہلا اور اہم فریضہ تھا کہ قرآن پاک کو کلام الٰہی مانے اور کلام الٰہی اور ارشادات نبویہ کو اپنے اپنے درجہ میں واجب الاطاعت جانے لیکن قربان جائیے اس وسعت نظر یا روشن خیالی کے کہ ایک شخص ضروریات اسلام کا انکار کرے قرآن شریف کی تحریف معنوی کرے، شعائر اسلامی کے ساتھ استہزا کرے، اور نوبت باینجا رسید کہ قرآن شریف کی نسبت یہ کہدے کہ میرے نزدیک یقیناً وہ کلام خداوندی نہیں ہے بلکہ خود رسول کا کلام ہے، اور اس کے باوجود بھی کہے کہ میں مسلمان ہوں، کل تک یہ نادان علما کا منہ چڑاتا تھا، نماز روزے کا مذاق اڑاتا تھا، کچھ دنوں کیلئے کسی ناقابل بیان مصلحت کی بنا پر زبان بند بھی کرلی تھی کہ سنہری روپہلی مصلحتوں پر پانی پھرتا ہوا دیکھ کر نہ رہا گیا، اور اس مرتبہ قرآن پاک ہی پر ہاتھ صاف کیا، اگرچہ مذہبی اداروں، اسلامی انجمنوں نے اس شخص کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، اور اس کی اس بے راہ روی پر رنج وغصہ کا اظہار کیا مگر میرے نزدیک یہ کافی نہیں ہے،

نیاز فتحپوری مدت سے اسی روش پر ہے، آخرت سے بے نیاز اور مالک حقیقی کی نعمت اور نقمت، دونوں سے بے پروا اور بے خوف ہو کر اس کا قلم سرپٹ چلتا اور ادعاء اسلام کے باوجود اسلام کے خلاف سب کچھ لکھتا ہے اور حد یہ ہے کہ اب وہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ خداوندی کلام کو انسانی کلام کہکر بھی کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔

کیا مسلمان اس بارہ میں صرف اسی پر اکتفا کریں گے کہ مخالفانہ تجویزیں پاس کر کے اپنے غم والم کا اظہار کردیں، اگر ایسا ہی (اور خدا کرے کہ ایسا نہ ہو) تو یقیناً انھوں نے اپنے دین کی حمایت میں کچھ نہیں کیا، یہ سچ ہے کہ غیر مسلم حکومت ہے، اگر آئینی سعی کی جائے تو اس میں ہزاروں روپیہ کا خرچ ہے اور افلاس کی وجہ سے مسلمان ان مصارف کو برداشت نہیں کرسکتا ہے، تاہم اگر حکومت ہند ان دل آزاریوں کو جائز سمجھتی ہے تو سمجھے ہماری لئے ضروری ہے کہ حسب استطاعت ان دریدہ دہنیوں کو روکیں، اور اگر دلوں میں اسلام کی محبت ہے، خدا اور خدا کے رسول، یا اس کے احکام کا استہزا ہمارے لیئے تکلیف دہ ہے تو کم از کم اتنی سعی تو کریں کہ مسلمان "نگار" کا پورا پورا مقاطعہ کردیں؛

یہ حریص اور طامع طبقہ اپنے چند پیسوں کے نقصان کو برداشت نہیں کرسکتا ہے تحصیل زر کی آز ہیجا ہی ایسے لوگوں کو اس قسم کی حرکتوں پر آمادہ کرتی ہے، جب ان کو اس طرح نقصان اٹھانا پڑیگا تو یقیناً وہ مسلمانوں کی دل آزاری سے

اجتناب کرینگے۔۔۔ ان آوارہ گرد دُنیا پرستوں کا خدا، اور ان کا ایمان یہی وقت کے چلتے ہوئے سکّے ہیں، ان کے چلے ہوئے دماغوں کا علاج صرف اسی طرح ہوسکتا ہے کہ انکی اس رگ کو دبا دیا جائے۔

میں اُن سچّے جاں نثار مسلمانوں کی اولاد سے مالک حقیقی کے نام پر اپیل کرتا ہوں جنکے آباؤ اجداد اسلام کے ایک اشارے پر اپنی جان، اپنا مال، اپنی اولاد سب کچھ فدا کر دیتے تھے، کہ خدا کے واسطے اس درد و تکلیف کو محسوس کرو اور دین الٰہی کی حمایت میں صرف ذرا سی یہ کوشش قلم یا زبان کے ذریعہ سے کرو کہ کوئی مسلمان رسالہ نگار کا خریدار باقی نہ رہے پھر دیکھ لینا کہ میاں نیاز کا دماغ کتنی جلدی درست ہوتا ہے۔

اس فتنہ نگار "نیاز فتحپوری" نے اب سے دس سال قبل بھی مسلمانوں کی دل آزاری، اور اس اسلام پر ستہبرا کو ذریعۂ رزق بنایا تھا جسکو مسلمان جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اس وقت اسلامی پریس نے اس پر شدید احتجاج کیا اور بہار، نپور میں تو غیور مسلمانوں نے عدالت فوجداری میں دعوے دائر کرنیکی تیاری بھی کر لی تھی کہ اس فتنہ نگار نے ۱۹۳۱ء میں بعبارت ذیل توبہ نامہ شایع کیا۔

"اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میرے یہ خیالات احترام اسلام و شریعت کے خلاف تھے جن پر میں منفعل ہوں اسلیئے میں اعلان کرتا ہوں کہ اب میں ان امور سے باز آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ میری طرف سے ایسے مقالات کبھی شایع نہونگے جنسے مذہبی شکایت کا سبب پیدا ہو مجھے افسوس و ندامت ہے کہ ان مضامین سے مسلمانوں کو صدمہ پہنچا، اور یہ یقین دلانے کیلئے میں ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں اپنے معاصی سے جناب باری میں اظہار برأت و استغفار کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّی كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ اعلان معذرت بغیر کسی تمہید یا نوٹ کے نگار کے آئندہ تین پرچوں میں برابر اسطرح شایع ہوگا کہ کسی نہج سے کسی پرچہ سے علٰحدہ نہو سکے، اور ساتھ ہی اتنا نمایاں ہو کہ ہر پڑھنے والا اسے بآسانی پڑھ لے"

"اس اعلان معذرت کو مسلمانان لکھنؤ یا دوسرے مسلمان جس طریقہ پر مناسب سمجھیں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے علم میں لانے کیلئے مشتہر کریں"

نگار میں آئندہ سے کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کرونگا۔ واللہ علیٰ مانقول شہید "نیاز فتحپوری" (از صدق)

اس توبہ نامہ کے الفاظ پر غور کرو کہ بندگان حرص و ہوا جب اپنی کساد بازاری کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہماری حرکات سے مسلمانوں کے قلوب زخم رسیدہ ہو چکے ہیں اور اب اسکا اثر ہماری دوکانداری پر پڑنے والا ہے تو وہ کتنی جلدی سیدھے ہو جاتے یا سیدھے بنجاتے ہیں اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی غفلت اور انکے دینی جوش کی برودت دیکھ کر یا کسی دشمن اسلام طاقت کی پیش کش پر مفتوں ہو کر پھر وہی اگلنا شروع کر دیتے ہیں جو انکے ناپاک ظرف میں ہوتا ہے۔۔۔ چنانچہ اس توبہ سے دس سال بعد اس فتنہ نگار نے بھی پھر وہی حرکت شروع کی ہے۔

چنانچہ "نگار" بابت جون ۱۹۴۰ء کی باب الاستفسار میں "آتش نمرود" کے تحت عنوان لکھتا ہے (۱) کلام مجید کو میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں نہ الہام ربّانی (۲) بلکہ ایک انسان کا کلام سمجھتا ہوں (۳) کلام مجید کو بھی جی کہتے ہیں، اسلئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسکو بھی سول کی فہم و فراست سے تعبیر نہ کیا جائے۔ (۴) قرآن کی کسی حکایت کو محض اس بنا پر کہ اُسے الہام خداوندی سمجھا جاتا ہے صحیح باور نہیں کر سکتا (۵) کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونیکی وجہ سے صحیح کہا جا سکتا ہے، عہد نبوی میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالہ لوگوں کو سمجھانے اور ڈرانے کیلئے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قایم تھا، اسلئے رسول اللہ نے بھی انکو محض اعتبار و بصیرت کیلئے بیان[عہ] کر دیا اور اس سے کوئی بحث نہیں کی کہ وہ صحیح ہیں یا غلط، (۶) چونکہ میں رسول اللہ کو بڑے بلند[عہ] اخلاق کا انسان سمجھتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے تھے اسلئے قرآن میں واقعہ براہیم کا پایا جانا اس امر کی دلیل تو ضرور ہے کہ رسول اللہ نے اُسے جھوٹ بیان نہیں کیا یعنی اپنی طرف سے گڑھ کے بیان نہیں کیا، لیکن اس سے نفس واقعہ کی صحت یا عدم صحت پر بالکل نہیں پڑتا۔

یہ صحیح ہے کہ بھوک اگر اضطرار کی حد تک پہنچ جاوے تو شرعی طور پر بھی اُن ماکولات میں توسع کر دیا جاتا ہے جو غیر مضطر کیلئے قابل استعمال نہیں، اسی طرح اگر انسان افلاس یا کاروبار کی کساد بازاری کی وجہ سے اپنے حد سے بڑھے ہوئے مصارف کی ہاتھوں مضطر ہو گیا ہو یا باوجود علم و فضل سے قطعاً عاری ہونیکے زمرۂ علما اور طبقۂ محققین میں شمار کئے جانیکی ہوس خام ہرزہ کردنی کو کردنی قرار دے رہی ہو تاہم تجوع الحرة[عہ] ولا تاکل بثدیہا کے موافق ایک باشعور انسان کو اپنے اعمال اپنے اقوال کا خود ہی محاسبہ ضروری ہے، اور مقتضائے عقل ہے کہ قبل اسکے کہ انسان اپنے سخیف اقوال اور ناشائستہ اعمال کی وجہ سے ہدف ملامت ہو خود ہی غور کرے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اسمیں کوئی ضعیف سے ضعیف جہت بھی استحسان کی نکلتی ہے یا نہیں؟

منقولہ بالا عبارتوں میں کس جسارت، ڈھٹائی، بیباکی کے ساتھ نیاز نے (اُسی نیاز نے جس نے پوری ندامت کا اظہار کر کے "نگار" میں آئندہ

سے کسی قسم کے مذہبی مضامین درج نہ کرونگا" کا وعدہ[عہ] کیا تھا) کہا ہے کہ قرآن کلام الٰہی نہیں ہے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام ہے اور اُسمیں بھی وہ زبانزد افواہیں ہیں جو کہ اسرائیلیات کی ذریعہ سے نئے بانوں پر جاری ہو گئی تھیں، ورنہ صداقت اُنکی لئے کوئی لازمی چیز نہیں؛

اب اگر مان بھی لیا جائے کہ اشاعرہ و ماتریدیہ اور معتزلہ میں ذات باری عز اسمہ کے خود موصوف بالتکلم ہونے یا خلق کلام میں اختلاف بھی ہے جسکو یہ نام نہاد مسلمان آڑ بنا رہا ہے تب بھی کیا خط کشیدہ عبارت اسکو اجازت دیتی ہے کہ جس میدان کا یہ شخص اہل نہیں اس میدان میں دخل کرے

عہ کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع کے موافق یہ بیان کرنا بھی کذب ہوا، اس طور پر اس شخص نے صادق و مصدوق صلے اللہ علیہ وسلم کو بصراحت (نعوذ باللہ) جھوٹا بھی کہا ۱۲ منہ

عہ کیا اس فتنہ نگار کے نزدیک ہر ایک بات خواہ غلط ہو یا صحیح بیان کر دینا بھی "خلق عظیم" کا کوئی شعبہ ہے ۱۲ منہ

عہ شریف عورت بھوک کی حالت میں مرجانے کو پسند کرتی ہے لیکن بدکاری پر راضی نہیں ہوتی ہے ۱۲

عہ تیرے وعدے کو اے بیوفا! نہ قرار ہے نہ قیام ہے کبھی شام ہے کبھی صبح ہے۔ کبھی صبح ہے کبھی شام ہے۔

ہل من مبارز کہے :-

محررہ بالا عبارتوں میں یہی نہیں کہ اس فتنہ نگار نے قرآن پاک کی کھلم کھلا تکذیب کی کیونکہ اگر قرآن پاک کی تلاوت کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اسمیں بکثرت ایسی آیتیں موجود ہیں جنکا مطلب اسکے سوا کچھ نہیں ہوسکتا ہے کہ قرآن شریف احکم الحاکمین کا کلام ہے جو شائبہ کذب سے بالکل ہی معرا اور مبرّی ہے، مثلاً

الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا — یعنی ہر تعریف اللہ کو زیبا ہے جسنے اتاری اپنے بندے (محمد) پر کتاب اور نہ رکھی اس میں کجی

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا — بڑا بابرکت ہے جسنے نازل فرمایا قرآن اپنے بندے پر تاکہ ہو تمام جہان کیلئے ڈرانیوالا

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا — کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے ؟ اور اگر یہ ہوتا اللہ کے سوا کسی دوسرے کی جانب سے تو بے شک اسمیں پاتے بہت اختلاف

المص کتاب انزل الیک فلا یکن فی صدرک حرج منہ — (اے محمد) یہ کتاب تجھ پر اتری ہے تو اس سے تیرا دل تنگ نہ ہو

تنزیل من رب العالمین — اُتارا ہوا ہے رب العالمین کی طرف سے

تنزیلا ممن خلق الارض والسموات العلی — اُس کا اُتارا ہوا ہے جس نے پیدا کیا زمین اور اونچے آسمانوں کو

وکذلک اوحینا الیک قرآنا عربیا — اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجدیا تیری طرف قرآن بہ زبان عربی

قل انزلہ الذی یعلم السر فی السموات والارض — کہدے کہ یہ اس نے اُتارا ہے جو جانتا ہے چھپے بھید آسمانوں اور زمین میں

واذا تتلی علیہم آیاتنا بینات قال الذین لا یرجون لقاءنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی — اور جب پڑھی جاتی ہیں اُن پر ہماری آیتیں صاف صاف تو کہتے ہیں وہ لوگ جنکو ہم سے ملاقات کی اُمید نہیں کہ لے آؤ کوئی اور قرآن اسکے سوا یا اسی کو بدل ڈالو کہدے کہ میرا کام نہیں کہ میں اسکو بدل ڈالوں اپنی طرف سے۔

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی — اور نہ بات کرتا ہے اپنی خواہش نفس سے یہ قرآن تو وحی ہے جو اسکو بھیجی جاتی ہے

بلکہ جس رسول کو صرف اسلیئے کہ عام مسلمانوں کو دھوکا دیسکے یہ "بڑی بلند اخلاق کا انسان" کہتا ہے اسکی بھی تکذیب کی، کیونکہ تواتر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جان نثاروں سے برابر یہی فرماتے رہے کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے، جو جبرئیل کے ذریعہ سے مجھ پر نازل کیا جاتا ہے۔

پھر جس قرآن کے ابتداہی میں یہ ہے کہ "ذلک الکتاب لاریب فیہ" یعنی اُسکے بیان کیئے ہوئے مضامین میں شک کی گنجائش ھی نہیں اُسکی نسبت یہ کہنا دیدہ دہنی نہیں تو اور کیا ہے کہ "ہم کہتا ہے کہ اسمیں واقعات و حالات بالکل ہی بے بنیاد ہوں" فالی اللہ المشتکی!

قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونیکا یہ منکر، اوسکے مضامین کا صادق ہونا اسکے نزدیک ضروری نہیں صادق و مصدوق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کا یہ کذب گم ہے کا اسلام اس درجہ کا مضبوط ہے کہ ان چیزوں میں سے کسی ایک نے بھی اسکے اسلام کو جنبش نہ دی گو یا نیاز کا اسلام انکی کسی ہم مشرب بی بی تمیزہ کے وضوء سے بھی زیادہ مضبوط اور پختہ ہے جو کسی بڑے سے بڑے ناقضِ وضو سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا اعاذنا اللہ من ھمزات الشیاطین، ـــــ آہ!

وہ باغ جو رسول خدا خود لگا گئے ۔۔۔ اور وہ چمن کہ جس کو محمد جما گئے
ہاتھوں سے اپنے سینچ کے کلیاں کھلا گئے ۔۔۔ عالم کو ایک عالمِ حیرت بنا گئے

افسوس اس صدی میں وہ ایسا تباہ ہو
باقی نہ جس میں نام کو بھی جز گیاہ ہو

زمانہ کے انقلابات لیل و نہار کے تلونات نے ہم کو وہ دن بھی دکھا دیا جس میں ایک شخص اسلام کے تمام اصول اور ضروریات قطعیہ کے انکار کے باوجود اپنے لیئے دعوی اسلام کر سکتا ہے یا للعجب

حافظ اسرار الٰہی کس نمیداند خموش ۔۔۔ از کہ می پرسی کہ دور روزگاراں را چہ شد

حالانکہ ایسے بدبخت مجرم کے لیئے جو ادعار اسلام کے ساتھ قرآن پاک کے کلام الٰہی ہونے سے انکار کرے اور اسکو خود رسول کا بنایا ہوا کلام بتلائے اگر اسلامی حکومت قایم ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کے ناپاک وجود سے خدا کی زمین پاک کر دی جائے۔

قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ جو علم و افتا، اور زہد و تقوی کے درخشندہ ستارے ہیں اور جنکے اقوال دنیائے اسلام میں مسلم ہیں کتاب الشفا جلد اول باب اول قسم رابع میں فرماتے ہیں۔

وقال ابن القاسم فی المسلم اذا قال ان محمدا لیس بنبی او لم یرسل الیہ او لم ینزل علیہ قراٰن وانما ھو شئ تقولہ یقتل

امام ابن قاسم عبدالرحمن مصری نے (جو کہ امام مالک رحمۃ اللہ کے مشاہیر اصحاب میں سے ہیں) اُس مسلمان کے بارے میں فرمایا ہے جو کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی نہیں ہیں یا رسول نہیں ہیں یا اُن پر قرآن (خدا کی طرف سے) نازل نہیں ہوا بلکہ اُنھوں نے خود ہی اسکو کہہ لیا ہے (یعنی وہ آپ ہی کا کلام ہے) تو ایسا شخص واجب القتل ہے

غور فرمایئے کہ امام ابن قاسم نے یہ حکم اُس مسلمان کے بارے میں دیا ہے جو محررہ بالا ہفوات کا ارتکاب کرے، اس صورت میں اسکے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انکے نزدیک اس شخص میں اسلام کا شمہ بھی باقی نہیں ہے وہ جسد اسلامی کے اُس عضو فاسد کیطرح ہو گیا ہے جسکو کاٹکر پھینک دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے، اسکے بعد شفا کے جلیل القدر شارح مسلم الثبوت عالم ملا علی قاری رحمہ اللہ کی اس صریح اضافہ پر بھی نظر ڈالیئے۔ وھذا مجمع علیہ جلد ثانی صفحہ ۴۳ یعنی اسکو واجب القتل ہونے پر تمام ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے۔

ان تصریحات کو ملاحظہ فرمانے کے بعد اس دیدہ ہن بیباک کی ان جرأت پر غور کیجیے کہ مسائل دینیہ میں بند رکھنے کی حتمی اور صریح وعدے کے خلاف اسلام کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے کی سعی کر رہا ہے اور پھر اس تحسین کو بھی نظر انداز نہ فرمایئے جو ایک کثیر الاشاعت ہندو اخبار میں اس فتنہ نگار کے متعلق کی جایا کرتی ہے کہ فتنہ نگار (نیاز فتحپوری) تمام مذاہب پر آزادانہ خصوصاً اسلام پر بیباک تنقید کرتے ہیں ؎ دہ تنگ نائی جبر ہم از نخوت رقیب ۔۔۔ یارب مباد آں کہ گدا معتبر شود

افاداتِ طیّبہ

(از جناب مولٰنا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند)

(گزشتہ سے پیوستہ)

حکیم مرزا عبد الحمید بیگ صاحب کے دوسرے سوال کا حاصل یہ تھا:۔

قرآن کریم میں جہاں کسی چیز کی قسم کھائی گئی ہے وہاں عموماً اس مقسم بہ کو (جسکی قسم کھائی گئی ہے) جواب قسم کیلئے بمنزلہ شاہد و گواہ کے پیش کیا گیا ہے جیسا کہ والعصر اور والقلم اور والتین وغیرہ قسموں سے واضح ہے اس قاعدہ کے مطابق سورۂ صافات کی شروع ہی میں جو ملائکہ کی صف بندی اور تلاوت وغیرہ کی قسم کھا کر توحید الٰہی کا دعویٰ کیا گیا ہے یہاں بھی یہ تینوں مقسم بہ یعنی صف بندی زجر و توبیخ اور تلاوت ذکر توحید پر شاہد اور اسکی دلیل ہونی چاہئیں حالانکہ ملائکہ کی صف بندی اور زجر و توبیخ کا توحید سے کوئی رابطہ بظاہر مفہوم نہیں ہوتا اسلیے اسکی کوئی واضح تقریر فرمائی جائے کہ قسم اور جواب قسم میں ارتباط محسوس ہونے لگے اور قرآن کی صحتِ استدلال منکشف ہو جائے۔

جواب

قرآن کریم میں مقسم بہ (جسکی قسم کھائی جائے) بلاشبہ بمنزلہ شاہد اور دلیل کے لایا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ شاہد ہمیشہ مقسم بہ کی ذات ہی ہو بلکہ کبھی عین "مقسم بہ" بذاتہ شاہد ہوتا ہے جیسے واللہ یا تاللہ کے لفظ سے قسم کھائی جائے کبھی اس کا کوئی وصف شاہد ہوتا ہے اور ذات محض بیان وصف کیلیے لائی جاتی ہے۔ اور کبھی اوصاف کے ضمن میں محض اُسکے متعلقات اور منتسبات شاہد ہوتے ہیں اور اس صورت میں خود اوصاف بھی محض بیان منتسبات کے لیے ذکر کر دیئے جاتے ہیں اور قسم بہ نظر حقیقت ان اوصاف یا ان منسوبات ہی کی کھائی مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً والعصر میں زمانہ کو خسران انسان پر شاہد بنایا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ خود زمانہ اور بذاتہ لیل و نہار کا یہ چکر اس دعوے پر شاہد نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقۃً زمانہ کے وہ حوادث و واقعات شاہد ہیں جو ان زمانوں میں واقع ہوئے ورنہ بلا حدوث وقائع، کورا زمانہ اسکی شہادت کیسے دے سکتا ہے کہ اکثر انسان حرمان و خسران میں رہے اور بعض اُس سے بچ گئے کیونکہ بہ حقیقت تو واقعات ہی ظاہر کریں گے، نہ کہ دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی پس یہاں حلف بظاہر تو زمانہ کا کیا گیا ہے لیکن بہ نظر حقیقت ان زمانیات کا ہوا ہے جو ان زمانوں میں واقع ہوئیں مگر بواسطہ زمانہ۔ گویا قسم کے سلسلہ میں ظرف بولا گیا اور مظروف کا ارادہ کیا گیا یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ آج کل زمانہ بہت خراب آگیا ہے زمانہ بہت نازک ہے، فلاں شخص کے بُرے دن آگئے۔ ظاہر ہے کہ دن بُرے اور زمانہ خراب کبھی بھی نہیں ہوتا بلکہ خود

انسان اور اُن کے افعال بُرے اور بھلے ہوتے رہتے ہیں اور زمانہ کے بُری ہونے سے ان افعال وحرکات ہی کی بُرائی کی طرف اشارہ ہوتا ہے محض اسی تعلق سے کہ یہ افعال اُس زمانہ میں واقع ہوئے، عرب کی مشہور شاعرہ خنساء کا شعر ہے

ان الجدیدین فی طول اختلافہما
لا یفسدان ولکن یفسد الناس

ترجمہ:۔ بلاشبہ یہ جدیدین (رات اور دن) اپنے روزانہ کے لمبے لمبے دوروں میں خود فاسد نہیں ہوتے البتہ لوگ اور اُن کے افعال وحرکات فاسد ہوجاتے ہیں۔

یہی صورت یہاں بھی ہے کہ زمانہ کو شہادت میں پیش کرکے حقیقتاً زمانہ کے واقعات کو شاہد بنانا ہے اس لئے یہاں قسم کے سلسلہ میں مقسم بہ کی ذات مراد نہیں بلکہ اس کے متعلقات مراد ہیں۔

اسی طرح مثلاً "والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین" میں ایک درخت ایک پہاڑ اور ایک شہر کی قسم کھاکر فرمایا گیا کہ انسان کو ہم نے احسن تقویم (بہترین اندازہ) میں پیدا کیا ہے ظاہر ہے کہ نوع انسان کی خوبی وکمال کیلئے دلیل اور گواہ خود پہاڑ یا درخت اور شہر بذاتہ نہیں ہوسکتے بلکہ انسانی خوبیوں کی شہادت میں تو کوئی انسانی نمونہ ہی پیش کیا جاسکتا ہے کہ انسان ایسے ہوتے ہیں نہ کہ پہاڑ یا درخت کی لمبائی چوڑائی پیش کرکے کہا جائے کہ انسان ایسے ہوتے ہیں پس یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ان تینوں مقسم بہ اشیا سے خود ان کی ذوات مُراد نہیں اور ان ذوات کو شہادت میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ذکر سے بعض وہ انسانی ذوات مُراد لی گئی ہیں جن کو ان اشیاء سے خاص نسبت حاصل ہے اور اس نسبت خاص کی بنا پر درحقیقت احسن تقویم پر اُن انسانوں ہی کو شاہد بنایا گیا ہے چنانچہ تین وزیتون طور سینا اور مکہ معظمہ کو تین مقدس انسانوں سے ایسی خصوصی نسبت حاصل ہے کہ جب ان تین چیزوں کا ذکر آتا ہے تو ان ذوات کی طرف ذہن خود جا پہونچتا ہے بیت المقدس کے تین وزیتون کے جھرمٹ میں چونکہ عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں اسلیئے ایک عارف کا دھیان ان مخصوص درختوں کے ذکر سے ان کی ذاتِ اقدس کی طرف بآسانی جا پہونچتا ہے۔ طور سینا کا نام لیتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور مکہ کرمہ کا مبارک نام آتے ہی ذات بابرکات محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ذہن منتقل ہوجاتا ہے۔ اس لیئے مکانِ تین وزیتون مکانِ طور سینا اور مکانِ بلد امین بول کر اُن کے ان مخصوص مکینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنھیں ان مواضع سے خاص نسبت حاصل ہے گویا مکان کے پردہ میں ان تینوں مکینوں کی قسم کھاکر دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے شاہد اور دلیل درکار ہو تو ان تینوں مقدس پاک صورت اور نیک سیرت ہستیوں کو دیکھ لو پس یہاں بھی مقسم بہ کی ذوات مراد

نہ ہوئیں بلکہ ان کے منسوبات اور متعلقات مُراد ہوئے۔

اسی طرح قلم کی قسم کھا کر ذات برکات نبوی سے نفی جنون فرمائی گئی ہے ظاہر ہے کہ قلم کی چوب خشک کو بذاتہٖ نفیِ جنون یا اثبات عقل سے کوئی رابطہ و تعلق نہیں۔ ہاں قلم چونکہ اظہار علوم و معارف کا ذریعہ ہے اور علوم و معارف دلیل عقل و کمال ہوتے ہیں نہ کہ دلیل جنون اس لیے یہاں حضور کی نفی جنون پر آپ کے بے انتہا علوم و کمالات کو شاہد بنانا مقصود ہے مگر علوم کی پائداری چونکہ زبان کی بہ نسبت قلم سے زیادہ ہوتی ہے اس لیے قلم کی قسم اور بحقیقت قلم کے پردہ میں علم و عقل محمدی کی قسم کھا کر کہا گیا ہے کہ آپ مجنون نہ تھے شاہد کی ضرورت ہو تو ان کے علوم و کمالات کو سامنے رکھ لو جو عقل کامل کی دلیل ہیں نہ کہ جنون کی۔ پس یہاں مقسم بہٖ کی ذات مُراد نہ ہوئی بلکہ اُس کے آثار اور متعلقات۔ ٹھیک اسی طرح سورۂ صٰفّٰت میں بھی ملائکہ کی قسم کھائی گئی ہے لیکن ذات کی نہیں ورنہ فرمایا جاتا والملائکۃ بلکہ ان کے چند اوصاف کی جو عنوان میں ذکر کیے گئے یعنی والصّٰفّٰتِ۔ والزّٰجرٰت والتالیات۔ جس سے واضح ہے کہ ذوات ملائکہ کی نہیں بلکہ ان کے وصف عنوانی کی قسم کھائی جا رہی ہے کہ یہ مقدس فرشتے عبادت کے لیے صف بندی کرتے ہیں، ترک عبادت سے بندوں کو ڈراتے ہیں، اور تلاوتِ ذکر یعنی قرآن لا کر بندوں پر پیش کرتے ہیں پہلی صفت (صف بندی عبادۃ) تو ان کی ذاتی صفت ہے اور بعد کی دو صفتیں اضافی ہیں کہ وہ بندوں کو ترک عبادت سے ڈرا کر آمادۂ عبادت کرتے ہیں اور عبادت کے لیے انھیں علم لا کر دیتے ہیں تا کہ ان کا عمل بلا علم رہ کر نامقبول نہ ہو جائے۔

بہرحال فرشتوں کا خود عبادت کرنا دوسروں کو عبادت کی تعلیم دینا اور پھر عبادت پر انھیں تربیت دینا تین اوصاف عنوانی ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے جن کا حاصل ملائکہ کا جذبۂ عبادت پیش کرنا ہے۔ اس لیے اگر غور سے کام لیا جائے تو ان تین اوصاف کے پردہ میں درحقیقت عبادت ملائکہ کی قسم کھائی گئی ہے کہ تینوں اوصاف کا محور عبادت ہی نکلتا ہے اور ظاہر ہے کہ عبادت کی روح توحید ہے کیونکہ شرک کے ساتھ کتنی ہی مشقت کی عبادت و ریاضت ہو وہ عبادت ہی نہیں اور اسی لیے مردود ہے جس سے ملائکہ علیہم السلام بری ہیں۔ بلکہ عبادت کرائی ہی جاتی ہے اس لیے کہ قلوب میں توحید پیوست ہو جائے اور اسی لیے ہر مذہب کسی نہ کسی انداز سے توحید کو بیان کرنے اور اسے عقیدۃ العقائد ماننے پر مجبور ہوا ہے۔ اس لیے ان صفات ثلٰثہ کے ضمن میں ملائکہ علیہم السلام کی سب سے بڑی اور محبوب صفت جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قسم کھائی یہ نکلی کہ وہ اللہ کی توحید بالعبادۃ کرتے ہیں اور اُسے واحد بالالوہیت مانتے ہیں توحید ہی پر خود بھی عامل ہیں

انسان اور اُن کے افعال بُرے اور بھلے ہوتے رہتے ہیں اور زمانہ کے بُرے ہونے سے ان افعال وحرکات ہی کی بُرائی کی طرف اشارہ ہوتا ہے محض اسی تعلق سے کہ یہ افعال اُس زمانہ میں واقع ہوئے، عرب کی مشہور شاعرہ خنساء کا شعر ہے

ان الجدیدین فی طول اختلافہما
لا یفسدان ولکن یفسد الناس

ترجمہ:۔ بلاشبہ یہ جدیدین (رات اور دن) اپنے روزانہ کے لمبے لمبے دوروں میں خود فاسد نہیں ہوتے البتہ لوگ اور اُن کے افعال وحرکات فاسد ہو جاتے ہیں۔

یہی صورت یہاں بھی ہے کہ زمانہ کو شہادت میں پیش کر کے حقیقتاً زمانہ کے واقعات کو شاہد بنانا ہے اس لئے یہاں قسم کے سلسلہ میں مقسم بہ کی ذات مراد نہیں بلکہ اس کے متعلقات مراد ہیں۔

اسی طرح مثلاً "والتین والزیتون وطور سینین وھذا البلد الامین" میں ایک درخت ایک پہاڑ اور ایک شہر کی قسم کھا کر فرمایا گیا کہ انسان کو ہم نے احسن تقویم (بہترین اندازہ) میں پیدا کیا ہے ظاہر ہے کہ نوع انسان کی خوبی وکمال کیلئے دلیل اور گواہ خود پہاڑ یا درخت اور شہر بذاتہ نہیں ہوسکتے بلکہ انسانی خوبیوں کی شہادت میں تو کوئی انسانی نمونہ ہی پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسان ایسے ہوتے ہیں نہ کہ پہاڑ یا درخت کی لمبائی چوڑائی پیش کر کے کہا جائے کہ انسان ایسے ہوتے ہیں پس یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ان تینوں مقسم بہ اشیاء سے خود ان کی ذوات مُراد نہیں اور ان ذوات کو شہادت میں پیش نہیں کیا گیا بلکہ ان کے ذکر سے بعض وہ انسانی ذوات مُراد لی گئی ہیں جن کو ان اشیاء سے خاص نسبت حاصل ہے اور اس نسبت خاص کی بنا پر درحقیقت احسن تقویم پر اُن انسانوں ہی کو شاہد بنایا گیا ہے چنانچہ تین وزیتون طور سینا اور مکہ معظمہ کو تین مقدس انسانوں سے ایسی خصوصی نسبت حاصل ہے کہ جب ان تین چیزوں کا ذکر آتا ہے تو ان ذوات کی طرف ذہن خود جا پہونچتا ہے بیت المقدس کے تین وزیتون کے جھرمٹ میں چونکہ عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے اسلیئے ایک عارف کا دھیان ان مخصوص درختوں کے ذکر سے ان کی ذات اقدس کی طرف بآسانی جا پہونچتا ہے۔ طور سینا کا نام لیتے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور مکہ کرمہ کا مبارک نام آتے ہی ذات بابرکات محمدی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ اس لیئے مکان تین وزیتون مکان طور سینا اور مکان بلد امین بول کر اُن کے ان مخصوص مکینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جنھیں ان مواضع سے خاص نسبت حاصل ہے گویا مکان کے پردہ میں ان تینوں مکینوں کی قسم کھا کر دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے شاہد اور دلیل درکار ہو تو ان تینوں مقدس پاک صورت اور نیک سیرت ہستیوں کو دیکھ لو پس یہاں بھی مقسم بہ کی ذوات مراد

نہ ہوئیں بلکہ ان کے منسوبات اور متعلقات مُراد ہوئے۔

اسی طرح قلم کی قسم کھا کر ذات برکات نبوی سے نفی جنون فرمائی گئی ہے ظاہر اکہ قلم کی چوب خشک کو بذاتہ نفیِ جنون یا اثبات عقل سے کوئی رابطہ و تعلق نہیں۔ ہاں قلم چونکہ اظہار علوم و معارف کا ذریعہ ہے اور علوم و معارف دلیل عقل و کمال ہوتے ہیں نہ کہ دلیل جنون اس لیئے یہاں حضور کی نفی جنون پر آپ کے بے انتہا علوم و کمالات کو شاہد بنانا مقصود ہے مگر علوم کی پائداری چونکہ زبان کی بہ نسبت قلم سے زیادہ ہوتی ہے اس لیئے قلم کی قسم اور بحقیقت قلم کے پردہ میں علم و عقل محمدی کی قسم کھا کر کہا گیا ہو کہ آپ مجنون نہ تھے شاہد کی ضرورت ہو تو ان کے علوم و کمالات کو سامنے رکھ لو جو عقل کامل کی دلیل ہیں نہ کہ جنون کی۔ پس یہاں مقسم بہ کی ذات مُراد نہ ہوئی بلکہ اُس کے آثار اور متعلقات۔ ٹھیک اسی طرح سورۂ صٰفّٰت میں بھی ملائکہ کی قسم کھائی گئی ہے لیکن ذات کی نہیں ورنہ فرمایا جاتا والملائکہ بلکہ ان کے چند اوصاف کی جو عنوان میں ذکر کیئے گئے یعنی والصّٰفّٰتِ۔ والزاجرات والتالیات۔ جس سے واضح ہے کہ ذوات ملائکہ کی نہیں بلکہ ان کے وصف عنوانی کی قسم کھائی جارہی ہے کہ یہ مقدس فرشتے عبادت کے لیئے صف بندی کرتے ہیں، ترک عبادت سے بندوں کو ڈراتے ہیں، اور تلاوتِ ذکر یعنی قرآن لاکر بندوں پر پیش کرتے ہیں پہلی صفت (صف بندی عبادۃ) تو ان کی ذاتی صفت ہے اور بعد کی دو صفتیں اضافی ہیں کہ وہ بندوں کو ترک عبادت سے ڈرا کر آمادۂ عبادت کرتے ہیں اور عبادت کے لیئے انھیں علم لاکر دیتے ہیں تا کہ ان کا عمل بلا علم رہ کر نامقبول نہ ہو جائے۔

بہر حال فرشتوں کا خود عبادت کرنا۔ دوسروں کو عبادت کی تعلیم دینا اور پھر عبادت پر انھیں تربیت دینا تین اوصاف عنوانی ہیں جن کی قسم کھائی گئی ہے جن کا حاصل ملائکہ کا جذبۂ عبادت پیش کرنا ہے۔ اس لیئے اگر غور سے کام لیا جائے تو ان تین اوصاف کے پردہ میں درحقیقت عبادت ملائکہ کی قسم کھائی گئی ہے کہ تینوں اوصاف کا محور عبادت ہی نکلتا ہے اور ظاہر ہے کہ عبادت کی روح توحید ہے کیونکہ شرک کے ساتھ کتنی ہی مشقت کی عبادت و ریاضت ہو وہ عبادت ہی نہیں اور اسی لیئے مردود ہے جس سے ملائکہ علیہ السلام بری ہیں۔ بلکہ عبادت کرائی ہی جاتی ہے اس لیئے کہ قلوب میں توحید پیوست ہو جائے اور اسی لیئے ہر مذہب کسی نہ کسی انداز سے توحید کو بیان کرنے اور اسے عقیدۃ العقائد ماننے پر مجبور ہوا ہے۔ اس لیئے ان صفات ثلثہ کے ضمن میں ملائکہ علیہم السلام کی سب سے بڑی اور محبوب صفت جس کے لیئے اللہ تعالےٰ نے یہ قسم کھائی یہ نکلی کہ وہ اللہ کی توحید بالعبادۃ کرتے ہیں اور اُسے واحد بالالوہیت مانتے ہیں توحید ہی پر خود بھی عامل ہیں

اور توحید ہی کی تعلیم و تربیت دوسروں کو دیتے ہیں گویا اُن کا ہر وقت کا مشغلہ توحید ہی کے ساتھ اشتغال ہے اور خلاصہ یہ کہ اُن کی عابدانہ صف آرائی، اُن کی تعلیم قرآن، اور اُن کی تربیت اخلاق سب کچھ اسی ایک مقصد کے لیئے ہے کہ

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ

پس اب قسم کی صورت یہ ہوگئی کہ ملائکہ کے اوصاف ثلثہ کے ضمن میں تو گویا اُن کی عبادت کی قسم کھائی گئی اور معنی عبادت کے ضمن میں اُس کی روح (توحید ملائکہ) کی قسم کھا کر کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے شاہد عدل کار ہو تو ملائکہ کے یہ موحدانہ اعمال دیکھ لو جو لازمی بھی ہیں اور متعدی بھی، گو یا جب ملائکہ جیسی مقدس اور معصوم مخلوق مشاہدہ جلال و جمال کے بعد صرف توحید ہی پر آکر رکی اور تمہارے لیئے معلم توحید ہی تو تمہارے لیئے اثبات توحید کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوگی کہ تمہارے پاک معلم جن کی عظمت و بزرگی کے تم بلاریب قائل ہو علماً و عملاً توحید ہی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور اسے کسی پہلو سست نہیں پڑنے دیتے، ان کا ذاتی عمل تو تب بھی توحید کا شاہد عدل ہے اور متعدی عمل (تعلیم و تربیت) تو تب بھی توحید ہی پر گواہ ہے اور تمہارے حق میں خصوصیت سے یوں حجۃ ہے کہ وہ تمہارے معلم اور تمہارے قلوب میں تعلیمی الہام کنندہ ہیں اس لیئے تمہیں تو کسی طرح بھی توحید کو ماننے اور قبول کرنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیئے۔

بہر حال جیسے پہلی عرض کردہ نظیروں میں مقسم بہ کی ذات نہیں بلکہ ذات کے ضمن میں اوصاف اور متعلقات مراد تھے ایسے ہی یہاں بھی مقسم بہ فی الحقیقت ذات و صفات ملائکہ نہیں بلکہ ان اوصاف کے پردہ میں اُن کی اصلی روح اور منتہائے مقصود توحید ملائکہ مراد ہے اور معنًی اسی کی قسم کھا کر اُسے توحید الٰہ پر بطور شاہد کے پیش کیا گیا ہے کہ فی الحقیقت توحید پر اس سے زیادہ زبردست اور کوئی شاہد استدلال نہیں ہو سکتا کہ ہر وقت کا مشاہدہ رکھنے والی مخلوق توحید خالص کی گرویدہ اور عاشق ہو واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم و علمہ اتم و احکم

خاکسار لیڈروں کا دماغی جائزہ

(از جناب مولوی عبدالمجید صاحب قرشی بانی تحریک سیرت و اڈیٹر اخبار "ایمان" پٹی۔ لاہور)

[اب سے قریباً ایک سال پہلے رجب و شعبان ۱۳۵۸ھ کے "الفرقان" میں خاکسار تحریک پر جو مفصل و مبسوط تبصرہ ہم نے قریباً سوا سو صفحے میں کیا تھا اور جو بعد میں بنام "خاکسار تحریک مذہب و سیاست کی روشنی میں" کتابی شکل میں بھی شایع ہو چکا ہے، اس میں ہم نے خاکسار تحریک کے بانی و قائد اور خاکساروں کے "امیر مطلق" "علامہ مشرقی" کے متعلق ان کی اعتقادی گمراہیوں کے علاوہ یہ چار دعوے کیے تھے۔

(۱) ایک یہ کہ وہ نہایت غیر مدبر اور پراگندہ دماغ شخص ہیں جو دماغی توازن کی نعمت سے یکسر محروم ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ بولنے میں نہایت بیباک اور بدسلیقہ بھی واقع ہوئے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی کوئی ساکھ کسی با اصول طاقت کے نزدیک نہیں ہو سکتی جو کسی قوم کی لیڈر کیلئے نہایت ضروری ہے۔

(۳) تیسری یہ کہ وہ "احساس ذمہ داری" سے قطعاً عاری "اور لاف زنی" و لغو گوئی کے مجسم پیکر ہیں اور بس بے حقیقت ڈینگیں مارنا انکی "لیڈری" کا حاصل ہے اور اپنی اس "صفت" کو وہ اتنے شرمناک تجربے دُنیا کو کرا چکے ہیں جن کے بعد ایک سوچ سمجھ والا انسان انکی کسی بات کا اعتبار نہیں کر سکتا اور انکی بڑی سے بڑے دعوی کو کوئی وزن نہیں دیسکتا۔

(۴) چوتھی یہ کہ وہ نہایت تیز زبان بلکہ بدگفتار واقع ہوئے ہیں جس کی وجہ سے کسی ہمہ گیر تحریک کو وہ کامیابی کیساتھ نہیں چلا سکتے کیونکہ انکی بدگفتاری ہی، روز بروز انکے مخالفین کی تعداد کو بڑھاتی جائیگی، اور ایک وقت آئیگا کہ جو اُن سے وابستہ ہیں وہ بھی انکی بدکلامی سے بدل ہو کر اُن سے کٹ جائینگے جیسا کہ قرآن حکیم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے " ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک " (اور اگر تم تیز زبان اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ جو تمہارے گرد جمع ہو گئے ہیں سب تتر بتر ہو جاتے۔)

غرض ہم نے علامہ مشرقی کے متعلق یہ چار دعوے کیے تھے اور خاکساری لٹریچر اور معلوم و مسلم واقعات سے ان سب کا ثبوت پیش کیا تھا اور پھر بتلایا تھا کہ جس تحریک کا "لاشریک قائد" اور "امیر مطلق" ان اوصاف کا حامل ہو اس سے کسی قومی فلاح اور مفید انقلاب کی توقعات وابستہ کرنا صرف اُن احمقوں کا کام ہے جو عقل و بصیرت کی نعمت سے محروم اور قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ سے قطعاً ناواقف ہیں ـــــ اپنے اُس مقالہ میں ہم نے علامہ صاحب کے ان اوصاف کے ثبوت میں جو واقعات پیش کیے تھے وہ سب ۱۹۳۹ء ہی تک کے تھے اس کے بعد حکومت پنجاب سے اُن کا جو تصادم ہوا اسمیں انکی و نیز انکے حواریوں اور جانشینوں (گویا ڈپٹی ہیروں) کی طرف سے جن حماقتوں، لاف زنیوں اور نہایت بھونڈی اور مضحکہ خیز دروغ بیانیوں اور بدتمیزیوں کا ظہور ہوا فی الحقیقت اُس نے پہلا سارا ریکارڈ مات کر دیا اور اب اگر کوئی شخص خاکسار تحریک کے خط و خال اُس کے لیڈروں کی دماغی بے مائگی اور اسکی انجام کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کرنا چاہے تو ہمارے نزدیک تنہا یہی کافی ہے کہ واقعات لاہور پر وہ سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ غور کرے ان شاء اللہ ان تمام واقعات کو ہم مفصل و مرتب طور پر صرف علامہ صاحب اور دیگر خاکسار لیڈروں کے بیانات اور مسلم واقعات کے مطابق آئندہ کسی صحبت میں پیش کرینگے اُس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ علامہ کی تربیت اور انکی فیض صحبت نے خاکسار تحریک کے تمام ہی

لیڈروں میں یہ "کمالات" پیدا کر دیئے ہیں یا یہ کہ اُنھوں نے اپنے "وزیر" بھی اپنے ہی جیسے مقرر کیئے ہیں — سچ ہے "جیسی روح ویسے فرشتے" — اس وقت تو ہم مولوی عبدالمجید صاحب قرشی ایڈیٹر "ایمان" کا ایک مختصر مضمون کو اخبار "ایمان" ہی سے نقل کرتے ہیں اس سے بھی قارئین کرام کو خاکسار لیڈروں کی "بے دماغی" کا اندازہ ہو سکتا ہے] مدیر

خدا تعالیٰ ہمارے بعض بھائیوں کے حال زار پر رحم فرمائے وہ مرتے بھی ہیں تو ٹانگیں اوپر اور سر نیچے کر کے مرتے ہیں تاکہ مرتے بھی دنیا میں اپنی حماقت اور بے توقیری کے نشانات ثبت کر جائیں ۔ میں نے یہ دردناک الفاظ بامر مجبوری لکھے ہیں اور بعض خاکسار لیڈروں کی طرزِ عمل کو دیکھ کر لکھے ہیں ۔ خدا تعالیٰ مجھے معاف کرے ۔

آٹھ قابلِ افسوس غلطیاں

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے سترہ کے قریب نیم فوجی جماعتوں پر پابندیاں لگائی تھیں کہ وہ ہتھیاروں کے ساتھ منظر عام میں فوجی ڈرل نہ کریں عقلمند ہندوؤں اور سکھوں نے سوچ لیا کہ اب سول نافرمانی کا وقت نہیں ہے وہ طاقت کی باوجود خاموش ہو گئے اور ہم کمزوری کے باوجود اُچھل پڑے اور سول نافرمانی کا اعلان کر دیا ۔ یہ ہمارے خاکسار رہنماؤں کی پہلی غلطی تھی ، خدا تعالیٰ انھیں معاف فرمائے ۔

۲۔ پھر ہم نے سول نافرمانی کیلیئے وہ وقت منتخب کیا جبکہ لاہور میں مسلم لیگ کا جلسہ منعقد ہو رہا تھا ، یہ وقت قومی شوکت و اتحاد کے مظاہرے کا تھا مگر ہم نے ہر طرف مصیبت پھیلا کر رنگ میں بھنگ ڈال دی ، لیگ کا اجلاس بے رونق ہو گیا ، جلوس ملتوی ہو گیا اجلاس کے اندر مخالفانہ مظاہرے ہوئے اور سر سکندر پر آوازے کسے گئے ۔ غیر موزوں وقت کا انتخاب ہمارے خاکسار لیڈروں کی دوسری غلطی تھی خدا تعالیٰ انھیں معاف فرمائے ۔

۳۔ جب سول نافرمانی کا وقت آیا تو سول نافرمانی کرنیوالی فوج کے سردار نے "بزن" (مارو) کا حکم دیدیا اور خونریزی تک نوبت پہونچی جسمیں اگر حکومت کا ایک آدمی مارا گیا تو اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دس نوجوان "شہید" ہوئے ، اس تشدد کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی پوزیشن مضبوط ہو گئی اور کوئی بھی شخص خاکساروں کے حق میں ہمدردی کا اعلان کرنے کے قابل بھی نہیں رہا ، شدید اور دردناک نقصان جان کے باوجود ہر طرف سے یہ آواز اُٹھی کہ "تشدد" کرنے والے قابل ملامت ہیں ۔ افسوس کہ مسلمان مارے گئے اور پھر جھوٹے مسلمان ہی سمجھے گئے ۔ یہ ہمارے خاکسار رہنماؤں کی تیسری غلطی تھی ۔

۴۔ حکومت نے ہماری اس "عقلمندی" سے فائدہ اُٹھایا ، پہلے تو صرف ڈرل ممنوع تھی اب اس نے خاکسار جماعت ہی کو خلاف قانون جماعت قرار دیدیا اُن کا اخبار بند ہو گیا ، اچھرہ کے مرکز پر قبضہ کر لیا گیا ، خاکسار بیت المال کا قریباً دو لاکھ روپیہ ضبط کر لیا گیا یہ بھی ہماری خاکسار لیڈروں کے طرزِ عمل کا نتیجہ تھا ، اُنھوں نے خود حکومت کو موقع دیدیا ۔

۵۔ پھر اس حال میں بھی مسلم لیگ والوں نے سمجھایا کہ اگر اس وقت بھی کوئی صحیح راہِ عمل اختیار کی جائے اور تشدد و سول نافرمانی

روک دی جائے تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ (۱) حکومت شہداء کا معاوضہ دے (۲) گولی چلانیوالوں کو سزا دی جائے (۳) قیدی رہا کیے جائیں (۴) خاکساروں کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کا حکم واپس لے لیا جائے، مگر افسوس کہ خاکسار لیڈروں نے کسی بھی معزز مسلمان کی بات کو نہیں سنا، انھوں نے نہ سول نافرمانی روکی نہ ترک تشدد کا اعلان کیا، اور وہ نہایت سادہ لوحی سے حکومت برطانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے ارادے پر برابر تلے رہے۔ اس سے سب لوگوں پر ظاہر ہو گیا کہ خاکسار رہنماؤں میں کس قدر معاملہ فہمی اور دور اندیشی ہے۔

۶۔ سول نافرمانی کیلئے جب باہر کے آدمی بہم نہ پہنچے تو مسجدوں کو مرکز بنایا گیا جب پولیس پس چلی جاتی خاکسار سپاہی بازاروں میں پریڈ کرنے لگتے جب سپاہی سامنے آجاتے تو خاکسار سپاہی بھاگ کر مسجدوں میں داخل ہو جاتے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسجدوں پر پہرے بیٹھے، نمازی تنگ ہوئے، مسجدوں کے دروازوں پر نمازیوں کی تلاشیاں لی جانے لگیں، یہاں تک کہ لاہور کے معزز مسلمان اس دینی رسوائی کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے ایک وفد میں سرسکندر کو مجبور کیا کہ آپ خدا کیلئے مسجدوں اور نمازیوں کی اس قدر بے عزتی نہ ہونے دیں۔ اس پر سرسکندر نے اسی وقت مسجدوں پر سے پہرے اٹھا دیئے۔ اس کے چند روز بعد انہی معززین نے خاکساروں کو سمجھایا کہ آپ بھی خدا کیلئے مسجدوں کو خالی کر دیں تاکہ خدا کے گھروں کی مزید بے عزتی نہ ہو۔ مگر خاکسار رہنماؤں نے اس مخلصانہ مشورہ کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا اور وہ اسی خیال پر جمے رہے کہ ہم مسجدوں کے اندر بیٹھ کر حکومت برطانیہ کو "تباہ" کرینگے۔ یہ خاکسار رہنماؤں کی چھٹی "معاملہ فہمی" تھی۔ خدا تعالے مسلمانوں پر رحم کرے جن کے لیڈر اس قدر معاملہ فہم ہیں۔

۷۔ اب لاہور میں بڑا جوش وخروش پیدا ہوا۔ طلباء نے خاکساروں کے حق میں مظاہرے کیئے، اسکول وکالج بند ہوگئے ہڑتالیں کی گئیں، بے شمار مسلمانوں نے خاکساروں کی حمایت کا اعلان کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ (۱) مشرقی صاحب کو رہا کر دیا جائے (۲) شہداء کے خون کی تلافی کی جائے (۳) پابندیاں واپس لی جائیں۔ یہ تھا حکومت پنجاب کے ساتھ مصالحت کرنیکا وقت اگر اس جوش وخروش کے زمانہ میں مسٹر جناح کی بات سنی جاتی، یا معززین کے مشورہ پر سول نافرمانی کو وقتی طور پر ہی موقوف کر دیا جاتا تو مسلمانوں کے ہاتھ بات رہ جاتی بلکہ فتح ہو جاتی اور تمام دنیا "خاکسار زندہ باد" کے نعرے بلند کر دیتی۔ لیکن افسوس کہ خاکسار لیڈروں نے اس زندہ جوش وخروش سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ ہماری خاکسار رہنماؤں کی آخری اور مہلک ترین غلطی تھی۔

(۸) اب حکومت نے خاکساروں کے حامیوں کو پکڑنا شروع کیا، انجمن حمایت الاسلام لاہور سے جواب طلبی کی گئی کہ اسلامیہ کالج کی امداد کیوں نہ بند کر دی جائے؟ لاہور پر تعزیری پولیس قایم کر دی گئی اور اس کا خرچ کئی لاکھ روپیہ خاکساروں کے حامیوں پر ڈال دیا گیا پولیس نے مسجدوں پر چھاپے مارے اور چند ہی دنوں میں لاہور بلکہ پنجاب کی ایک ایک مسجد کو خاکساروں کے وجود سے خالی کرا لیا۔ مسلمانان لاہور نے بھی رنگ بدلا۔ صرف چند ہی منٹ میں ان کی ہمدردیاں کافور ہو گئیں، انھوں نے خاکساروں کو اجتماع جمعہ کیلئے

دہماں دینے سے انکار کر دیا، خیمے دینے سے انکار کر دیا، بلکہ بے شمار لوگوں نے سنہری مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنا بھی چھوڑ دی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ جب خاکسار لوگ لاہور کی کسی مسجد میں مورچہ لگاتے تو محلہ کے مسلمان خود پولیس کو بلا کر انھیں گرفتار کرا دیتے مختصر یہ کہ سب قصہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اطلاعات آنے لگیں کہ خاکسار کارکن مسلمان "پراحسان" کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ حکومت پنجاب کو معاف کر دیا جائے۔

اب "مصالحت" کا ورد

جب سول نافرمانی کو پوری طرح شکست ہو چکی تو خاکسار رہنماؤں نے حاتم کی قبر پر لات ماری اور مسٹر جناح کو اختیار دیا کہ آپ حکومت پنجاب سے ہماری مصالحت کرا دیں۔ اب تمام دنیا نے اس "مصالحت" کا مضحکہ اڑایا۔

پہلے ۱۰ جولائی تک سول نافرمانی بند کی گئی، پھر ۱۰ اگست تک میعاد بڑھائی گئی تاکہ مسٹر جناح "مصالحت" کرا دیں لیکن مسٹر جناح رسوا کن شکست کے بعد اب کیا "مصالحت" کرا سکتے تھے؟ اسی اثنا میں اعلان ہوا کہ ۱۱ اگست کو دوبارہ سول نافرمانی شروع ہو گی پھر ابر کو اعلان ہوا کہ ۲۰ اگست تک سول نافرمانی ملتوی کی جاتی ہے اب ۲۰ اگست بھی گزر گئی تو ۲۲ اگست کو میاں احمد شاہ نے یہ اعلان کیا۔

۱۔ خاکسار حکومت ہند کے اعلان کی خلاف ورزی نہیں کرینگے۔

۲۔ خاکسار خدمت خلق تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھیں گے۔

۳۔ خاکسار بیلچے لیکر پریڈ نہیں کریں گے۔

۴۔ خاکساروں کی وردی کو فوجی وردی سے الگ کر دیا جائیگا

میاں احمد شاہ صاحب کے بیان کا ایک فقرہ یہ ہے: "امید ہے کہ خاکساروں اور حکومت پنجاب کے درمیان مصالحت ہو جائے گی"

میاں احمد شاہ صاحب اگر کوئی نو عمر نوجوان ہیں تو ہم انھیں کہنا چاہتے ہیں میاں صاحبزادے! جب آپ نے گھٹنے ہی ٹیک دیئے تو مصالحت کا کیا ذکر؟ جب تشدد نہیں، سول نافرمانی نہیں، پریڈ نہیں، وردی نہیں تو اب "مصالحت" میں کیا کسر باقی ہے؟ آپ یہ سب کچھ چھوڑ دیجئے کچھ دنوں کے بعد حکومت خود بخود آپکو معاف کر دے گی اور آپکے قیدی وغیرہ چھوڑ دے گی۔

اب یکم ستمبر کو مشرقی صاحب نے ایک آخری بیان شایع کیا ہے کہ میں حکومت کو اب پھر ۵ ہزار جوانوں کی پیش کش کرتا ہوں ہم پر نازی ہونے کا الزام غلط ہے، سانحہ لاہور میں خاکسار میری ہدایت سے جمع نہیں ہوئے تھے، اب خاکسار تحریک صرف خدمت خلق کے اصول پر عمل کریگی ہم ۲۸ فروری والے حکم پر بھی کوئی اعتراض نہ کرینگے۔ مجھے وزیر اعظم پنجاب کی مذکورہ بالا سب شرطیں منظور ہیں اور میری وزیر اعظم سے درخواست ہے کہ وہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں، دہ پابندی ہٹالیں، قیدی رہا کر دیں اور میری ذاتی منقولہ وغیر منقولہ جائداد اور ۲ لاکھ روپیہ واپس کر دیں ــــ یہ ہے خاکسار لیڈروں کی "غلبہ اسلام" کا انجام۔ حکومت نے انکی توبہ قبول کر لی ہے ہماری دعا ہے کہ اب خدا بھی انھیں معاف کر دے۔ "ایمان"

مجلسِ علمی کا ایک شاندار کارنامہ

"تخریج زیلعی"

از حضرت مولانا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمن صاحب اعظمی دامت فیوضہم

فقہ حنفی کی بے شمار کتابوں میں، جو مقبولیت ہدایہ کو نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو، اس کے جہاں اور اسباب ہیں، ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں احناف کے مسلک کے ساتھ ساتھ دوسرے ائمہ کے اختلافات اور ہر ایک کے نقلی و عقلی دلائل و شواہد بھی پیش کیے گئے ہیں، لیکن دلائل نقلیہ کے سلسلہ میں جو حدیثیں ذکر کی گئی ہیں ان کی سندیں یا ان کے حوالے مذکور نہیں ہیں، نہ ان کے ضعف و قوت کا بیان ہے، نہ ان کے رواۃ پر جرح و تعدیل کی گئی ہے، جو حدیثوں کے لیے نہایت ضروری چیز ہے، لیکن ہدایہ کے موضوع سے یہ مباحث خارج تھے، اس لیے صاحب ہدایہ کو یہ مباحث نظر انداز کرنے پڑے، جن خوش نصیبوں کو روایات پر کامل عبور اور فن روایت میں مہارت حاصل تھی، ان کیلئے تو کوئی زحمت و دشواری نہ تھی لیکن جو اس کمال سے عاری تھے، ان کو احادیث کے بے پایاں دفتر میں ان احادیث کی تلاش اور ان کے ضعف و قوت کی تحقیق میں بڑی دشواری پیش آتی تھی،

حق تعالیٰ جزائے خیر دے، امام جمال الدین زیلعی کو جنھوں نے ان دشواریوں کا احساس فرمایا اور نصب الرایہ لتخریج احادیث الہدایہ کے نام سے ایک نہایت بیش قیمت کتاب تصنیف فرما کر طالبان تحقیق کو بہت سی صعوبتوں سے نجات دلا دی۔

مصنف کے حالات مصنف کتاب جمال الدین زیلعی آٹھویں صدی ہجری کے ایک بلند پایہ حافظ حدیث فن روایت اور حدیث و فقہ کے یکتائے روزگار امام تھے، فقہ اور فنون حدیث میں جن اجلہ ائمہ سے ان کو تلمذ کی نسبت تھی، سب اپنے اپنے فن میں یکتا ماہر و امام تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں،

(۱) حافظ ابو الحجاج مزی جن کے باب میں ذہبی کا قول ہے "واما معرفۃ الرجال فھو حامل لوائھا والقائم باعبائھا لم ترالعیون مثلہ" یعنی معرفت رجال کے علم بردار ہیں، ان کی نظیر آنکھوں نے نہیں دیکھی، ذہبی ہی کا یہ قول بھی ہے "اوضح منشکلات ومعضلات ماسبق الیھا فی علم الحدیث ورجالہ" علم حدیث ورجال کے بہت سے ایسے عقدے انھوں نے حل کیئے ہیں جن میں ان کو اولیت وتقدم کا شرف حاصل ہے۔

(۲) حافظ شمس الدین ذہبی جن کی نسبت سبکی نے فرمایا "خاتم الحفاظ امام العصر حفظا واتقانا"۔

(۳) علاء الدین ماردینی جن کی وسعتِ نظر اور اتقان ومہارت کا زندہ شاہکار ان کی تصنیف الجوہر النقی ہے حافظ ابو الفضل عراقی (حافظ ابن حجر کے استاد) نے ان کو "الامام العلامۃ الحافظ قاضی القضاۃ" کے القاب سے یاد کیا ہے (لحظ الالحاظ ص۱۲۶) حافظ ابو الفضل کو فن حدیث میں جو کمال حاصل ہوا وہ علاء الدین ہی کا فیض تھا، ابن فہد نے تصریح کی "بہ تخرج وانتفع" (لحظ الالحاظ ص۲۲۳) سیوطی نے ان کے حق میں فرمایا ہی "کان امامافی الفقہ والاصول والحدیث" فقہ، اصول اور حدیث میں ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا،

(۴) فخر الدین زیلعی جن کی بے مثل فقاہت اور علمی جلالت کا بین ثبوت کنز کی شرح تبیین الحقائق ہی، امام جمال الدین زیلعی کو ان اجلۂ فقہاء ومحدثین کے فیضِ صحبت سے حدیث اور فقہ میں جو پایۂ عالی نصیب ہوا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ کل اصحاب تراجم وطبقات نے امام زیلعی کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے (دیکھو ذیول تذکرۃ الحفاظ) سیوطی ان کو "الامام الفاضل المحدث" کے اوصاف سے موصوف اور ابن فہد "الفقیہ الامام الحافظ" کے القاب سے ملقب کرتے ہیں (ذیول ص۱۲۸ وص۳۶۲) خاتمۃ الحفاظ علامہ ابن حجر عسقلانی فقہی مسلک میں اختلاف کے باوجود ان کو "امام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں[۱] اور اس کا بھی پوری صفائی اور کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ "میں نے تلخیص حبیر کی تصنیف میں امام زیلعی کی تخریج سے استفادہ کیا ہے"[۲] یہ بھی لکھتے ہیں "کہ تخریج کے علاوہ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور بھی بہت سے متفرق علمی فوائد سے مستفید ہوا ہوں"[۳] حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر حافظ حدیث کا یہ لکھنا انکی جلالت قدر کی کافی شہادت ہے؛

---

[۱] تلخیص ص۲ ودرایہ ص۲ [۲] تلخیص ص۲ [۳] مقدمہ نصب الرایۃ بحوالہ طبقات تمیمی

تنہا حافظ ابن حجر ہی پر موقوف نہیں، دوسرے اکابر علمائے شافعیہ نے بھی زیلعی کی تخریج سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر کی تصریح کے موافق علامہ بدرالدین زرکشی کی تخریج احادیث رافعی، بڑی حد تک تخریج زیلعی کی رہین منت ہے (مقدمہ نصب الرایہ بحوالہ تمیمی)

اور حق تو یہ ہے کہ زیلعی کی جلالت شان علو مرتبت اور امامت فن کے ثبوت کے لیئے کسی بیرونی شہادت کی مطلق ضرورت نہیں ہے، اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ معتبر شہادت خود ان کی کتاب تخریج ہدایہ ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی انصاف پسند ان کے وسعت معلومات اور دقت نظر کا معتقد و معترف نہ ہو جائے۔

تخریج زیلعی کی اہمیت یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ زیلعی نے ہدایہ کی تخریج لکھ کر مذہب احناف کی بڑی خدمت انجام دی، اور علمائے احناف پر بہت بڑا احسان کیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تنہا احناف ہی ان کے زیر بار احسان نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ ابھی اوپر گزرا زرکشی اور ابن حجر جیسے علمائے شافعیہ بھی ان کے رہین منت ہیں۔

تخریج زیلعی کی مزیت وضرورت یوں تو تخریج ہدایہ کے سلسلہ میں کئی کتابوں کے نام لیئے جاتے ہیں لیکن زیلعی کی تخریج ان سب میں اعلےٰ و ارفع ہے، اور اس باب میں اس کو تقدم و اولیت کا شرف بھی حاصل ہی، امام علاءالدین ابن الترکمانی کی تصنیفات میں تخریج ہدایہ کا نام لینا کسی مصنف کا وہم نہ ہو تو یہ تخریج بیشک زیلعی کی تخریج سے مقدم ہے، لیکن میرے خیال میں واقعہ یوں نہیں ہے، امام علاءالدین نے ہدایہ کی مستقل تخریج نہیں لکھی ہے، بلکہ ہدایہ کی شرح لکھی ہے، اور شرح کے ضمن میں احادیث کا پتہ بھی یقیناً دیا ہوگا حافظ عبدالقادر قرشی ان کے خاص تلامذہ اور حاضر باش شاگردوں میں سے ہیں۔ وہ جواہر مضیہ میں بسط کے ساتھ ان کے اختصار ہدایہ اور شرح ہدایہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن تخریج کا نام نہیں لیتے، حالانکہ اسی مقام پر اپنی تخریج ہدایہ کی تصنیف اور اس کو استاذ کی خدمت میں پیش کرنے کا تذکرہ کرتے ہیں، اگر امام علاءالدین کی کوئی مستقل تخریج ہوتی تو حافظ عبدالقادر کو تخریج لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔

اس مقام پر بعض حضرات سے ایک اور وہم بھی سرزد ہوا ہے، وہ یہ کہ انھوں نے امام علاءالدین کی تخریج ہدایہ کا ذکر کر کے یہ بھی لکھ دیا کہ اس کا نام کفایہ ہے، حالانکہ الکفایہ ہدایہ کے اس مختصر کا نام ہے جو امام علاءالدین کی تصنیف ہے قرشی لکھتے ہیں واختصر کتاب الهدایہ بکتاب سماہ الکفایہ فی

مختصر الهدایہ، آگے خود امام علاء الدین کا یہ قول نقل کیا ہے فانی سمیت مختصری للهدایة بالکفایة (ص ۳۶۷)

بہر حال امام علاء الدین کی طرف کسی تخریج ہدایہ کی تصنیف کی نسبت میرے نزدیک بالکل غیر محقق ہے، ہاں ان کے شاگرد خاص حافظ عبد القادر قرشی نے بیشک ہدایہ کی تخریج لکھی ہے، اور لکھ کر استاد کی خدمت میں پیش کی ہے، یہ واقعہ تو خود قرشی نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی تخریج کا نام کفایہ رکھا تھا، جب استاذ کی خدمت میں اس کتاب کو پیش کیا تو انھوں نے از راہ ظرافت فرمایا کہ تم نے یہ نام مجھسے "چرالیا ہے"، اس لئے کہ میں نے اپنی مختصر ہدایہ کا نام یہی رکھا ہے، لہذا یہ نام بدل دو، انھوں نے عرض کی کہ پھر آپ ہی دوسرا نام رکھدیں، چنانچہ انھوں نے ان کی تخریج کا نام العنایہ فی معرفۃ تخریج الهدایہ تجویز فرمایا (جواہر مضیئہ ص ۳۶۷)

حافظ عبد القادر بھی آٹھویں ہی صدی کے عالم ہیں، مگر ان کا طبقہ زیلعی سے متاخر ہے، اسلئے گمان ہوتا ہے کہ ان کی تخریج بھی زیلعی کی تخریج سے متاخر ہوگی۔

تخریج قرشی کا پتہ | علامہ قرشی کی تخریج کے کسی مکمل نسخہ کا پتہ ہم کو نہیں چل سکا، کتب خانہ خدیویہ (مصر) کی فہرست میں بے نام کی ایک تخریج ہدایہ کا ذکر موجود ہے، مرتب فہرست نے اس کے مصنف کا نام محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابی الوفا لکھا ہے اور اس کا سن وفات ۷۷۵ھ بتایا ہے، میرا خیال ہے یہ کتاب العنایہ فی معرفۃ احادیث الهدایہ ہے اور مرتب فہرست نے مصنف کے نام و نسب میں غلطی کی ہے صحیح نام و نسب یوں ہے ابو محمد عبد القادر بن محمد بن محمد بن نصر اللہ بن ابی الوفا یہ وہی علامہ عبد القادر قرشی صاحب جواہر مضیئہ ہیں، فہرست خدیویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا صرف پہلا حصہ جو کتاب النکاح پر ختم ہوتا ہے، کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے، اوراق کی تعداد ۲۱۸ ہے۔

بہر حال آٹھویں صدی کے نصف اول میں زیلعی کی تخریج کے ماسوا ان ہی دونوں تخریجوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن میں سے پہلی کا سرے سے تصنیف ہی ہونا غیر محقق ہے، اور دوسری تصنیف ضرور ہوئی مگر متداول نہیں ہے، بلکہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا کوئی مکمل نسخہ کہیں موجود بھی ہے یا نہیں اسلئے طالبان تحقیق کی پیاس بجھانے کے لئے تنہا زیلعی کی تخریج رہ گئی، اس سے اس تخریج کی ضرورت کا صحیح

اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

باقی رہی حافظ ابن حجر کی درایہ تو اہل علم کو معلوم ہے کہ وہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ اسی تخریج زیلعی کا ملخص و مختصر ہے، پھر بہ تلخیص و اختصار بھی توقع کے خلاف ایسا ہے کہ طالب تحقیق کی اس سے مطلق تشفی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ ان قیمتی معلومات و نادر فوائد سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو تخریج زیلعی میں جا بجا منتشر اور اس کتاب کا طغرائے امتیاز ہیں۔

تخریج زیلعی کی خصوصیات امام زیلعی کی تخریج کی بہت سی خصوصیتیں ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:-

(۱) امام زیلعی التزام کے ساتھ ہر حدیث کی نسبت پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اس حدیث کو فلاں محدث نے اپنی فلاں کتاب میں روایت کیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب سے پوری سند کے ساتھ پورا متن لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں، اور حافظ ابن حجر سند بالکل حذف کر دیتے ہیں، صرف روایت کرنیوالے صحابی کا نام بتا دیتے ہیں، اسی طرح عموماً متن بھی پورا ذکر نہیں کرتے، بلکہ صرف اتنا ہی ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے مدعا کا تعلق ہوتا ہے۔

(۲) امام زیلعی سند و متن نقل کرنے کے بعد عموماً یہ کرتے ہیں کہ اگر کسی محدث نے اس حدیث کی سند یا متن پر کوئی کلام کیا ہے، تو اس کو بتمامہ نقل کرتے ہیں، پھر اگر کسی دوسرے محدث نے اس کا جواب دیا ہی تو اس کو بھی ذکر کرتے ہیں، حافظ ابن حجر عموماً ان باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً ابن حجر نے کتاب الحج میں قارن کیلئے دو طوافوں کی ایک حدیث بروایت حضرت عمران نقل کی اور صرف اتنا لکھ دیا کہ دار قطنی نے اس کی علت بیان کی ہے، حالانکہ زیلعی نے پوری تفصیل کے ساتھ دار قطنی کے حوالہ سے اس علت کو لکھا ہے۔

(دیکھو زیلعی ص ۱۱۱ جلد ۳)

(۳) اگر کوئی سند ضعیف یا متکلم فیہ ہوتی ہے، تو امام زیلعی تصریح کے ساتھ پہلے یہ بتاتے ہیں، کہ اس سند میں فلاں مجروح یا متکلم فیہ راوی ہے، پھر اس راوی کی نسبت ائمہ نقد کے اقوال نقل کرتے ہیں اور حافظ ابن حجر عموماً یہ کہکر گزر جاتے ہیں کہ یہ سند کمزور ہے، یعنی نہ ضعیف راوی کا نام بتاتے ہیں، نہ اس کے بارہ میں اقوالِ جرح و تعدیل نقل کرتے، مثلاً "عدم جواز نکاح بلا ولی" کے باب میں ابن حجر نے حضرت جابر، حضرت ابن عمر، حضرت عمران، حضرت علی، حضرت انس اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہم

کی حدیثوں کا حوالہ دے کر صرف اس قدر بتادیا کہ ان کی سندیں بہت کمزور ہیں، حدیث کے الفاظ تک نہیں بتاتے، اور امام زیلعی نے حدیث کے الفاظ نقل کیے، سند ذکر کی، پھر مجروح راوی کی تعیین کی اور سب سے آخر میں محدثین کے اقوال بھی اس کے باب میں نقل کیے، (دیکھو زیلعی صفحہ ۱۸۹ ج ۱)

(۴) امام زیلعی اصول حدیث کے بعض بعض مسائل کے متعلق بڑی نادر تحقیقات ذکر کر جاتے ہیں حافظ ابن حجر کو بالکل چھوڑ جاتے ہیں،

(۵) امام زیلعی کا ایک التزام یہ بھی ہے کہ جس حدیث کی تخریج کرتے ہیں اگر اس کے ہم معنی دوسری حدیثیں ہوتی ہیں تو ان سب کو سند و متن کے ساتھ بالتفصیل ذکر کرتے ہیں، لیکن حافظ ابن حجر بہتیرے مقامات میں صرف اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس باب میں فلاں صحابی کی بھی ایک حدیث ہے جس کو فلاں محدث نے فلاں کتاب میں بیان کیا ہے، مثلاً حدیث التراب طہور المسلم کی تخریج کے بعد لکھتے ہیں، کہ اس باب میں ابو ہریرہ کی ایک روایت بھی ہے جو معجم اوسط طبرانی و مسند بزار میں مذکور ہے لیکن امام زیلعی پہلے بزار کا حوالہ دے کر ان کی پوری سند اور لفظ بلفظ پورا متن بلکہ اس کے بعد بزار نے حدیث کی غرابت کا جو بیان اور اپنے شیخ کی جو توثیق کی ہے، اس کو بھی نقل کرتے ہیں، پھر اسی بسط و تفصیل کے ساتھ طبرانی کی سند اور انکے الفاظ میں حدیث کا پورا متن نقل کرتے ہیں، (دیکھو زیلعی صفحہ ۱۳۹ ج ۱)

یہاں تخریج زیلعی کی خصوصیات کا استقصا مدنظر نہیں ہے، یہ چند باتیں بطور نمونہ اس لیئے ذکر کردی ہیں، کہ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مدد مل سکے،

اگر میری معروضات آپ نے غور سے پڑھے ہیں تو آپ کو اقرار کرنا پڑے گا کہ تخریج زیلعی شائقین حدیث کیلیئے ایسی ضروری چیز ہے کہ کوئی طالب حدیث اس سے کسی طرح مستغنی نہیں ہو سکتا،

زیلعی کا پہلا اڈیشن اس زمانہ میں جب تک کوئی کتاب چھپ نہ جائے، اس وقت تک تعمیم نفع ناممکن اور اس کا بسہولت حاصل ہونا سخت دشوار ہے، اس لیئے ضرورت تھی کہ کوئی صاحب توفیق اس کو چھپوانے کی ہمت کرکے اس گوہر نایاب کو وقف عام کرتا۔

چنانچہ سب سے پہلے مولوی خادم حسین عظیم آبادی کو یہ توفیق نصیب ہوئی اور انھوں نے سنہ ۱۳۰۳ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں اس کو چھپوانا شروع کیا، لیکن بڑی تمناؤں کے بعد جب کتاب چھپکر پریس سے نکلی تو ہائیں حال زبوں کہ کاغذ نہایت میلا اور کمزور، خط بیحد خراب، اور بھونڈا، اور طباعت نہایت ناصاف، پھر

غضب بالائے غضب یہ کہ ظاہری حسن وجمال سے محرومی کے ساتھ معنوی محاسن سے بھی وہ قطعاً عاری تھی، معلوم نہیں چھپوانے کے وقت کوئی صحیح نسخہ پیش نظر تھا یا نہیں یا تصحیح کا انتظام نہیں کیا گیا، یا کوئی دوسرا سبب تھا کہ چھپنے کے بعد کتاب اتنی مسخ اور اس طرح اغلاط سے پُر تھی کہ ہر شخص کا اس سے کما حقہ نفع اُٹھانا ناممکن تھا، تاہم مولوی خادم حسین مرحوم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ ان کی کوشش وہمت سے یہ کتاب عام تو ہو گئی اور ہر کس وناکس کو اس سے کامل طور پر نہ سہی تو فی الجملہ انتفاع واستفادہ کا موقع تو مل گیا، چنانچہ جب تک یہ اڈیشن ملتا رہا تمام اہل ذوق اس سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے۔

بیس برس سے یہ اڈیشن بھی نایاب ہو چکا تھا، اور نہایت شدت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پہلے اڈیشن کی خرابیوں کو دور کر کے صحت وصفائی و پاکیزگی کے اہتمام کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن نکلتا، کئی جگہوں سے یہ خبر سننے میں آئی کہ تخریج زیلعی کے دوبارہ طبع ہونے کا انتظام ہو رہا ہے

مجلس علمی ڈابھیل کی مساعی جمیلہ کا اعتراف

لیکن کارکنانِ قضاوقدر نے یہ سعادت مجلس علمی (ڈابھیل) کے لئے مقدر کر رکھی تھی، دوسرے کے حصہ میں کیسے آتی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کارکنانِ مجلس تمام احناف ہی کے نہیں، بلکہ حدیث کا ذوق رکھنے والے طبقہ کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے وقت کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا اور فن کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دی۔

اگر ارکان مجلس اور کچھ نہ کرتے، صرف پہلے اڈیشن کی نقل ہی چھپوا دیتے تب بھی وہ ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق تھے، لیکن آپ کو یہ سن کر بے پایاں مسرت ہو گی اور آپ ان کے شکریہ پر مجبور ہوں گے کہ انھوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ پہلے ہزاروں روپئے صرف کر کے جید و مستند عالموں سے پوری کتاب کی تصحیح اور اس کا تحشیہ کرایا، اصل کتاب میں متداول کتابوں کی جو حدیثیں ہیں ان کو ان کتابوں میں تلاش کرا کے حاشیہ میں جلد اور صفحات کے حوالے درج کرائے، پھر دو جواں ہمت، جواں عمر عالموں کو اہتمام و نگرانی کے ساتھ اس کتاب کو طبع کرانے کے لئے مصر بھیجا وہاں ان کو خوش قسمتی سے تخریج زیلعی کا وہ نسخہ ہاتھ آگیا جو حافظ ابن حجر کے مطالعہ میں رہ چکا تھا اور جا بجا ان کے قلم سے اس میں تصحیحات بھی موجود تھیں، ان حضرات نے اپنے نسخہ کا اس سے مقابلہ کیا، اس کے بعد انھوں نے راحت طلبی کا شیوہ اختیار نہیں کیا،

بلکہ تصحیح کتاب کے بلیغ اہتمام کے پیش نظر اور مزید اطمینان کی خاطر مصر کے عہد حاضر کے سب سے بڑے وسیع النظر عالم اور فن حدیث و رجال کے ماہر علامہ زاہد کوثری کی نظر سے جدید اڈیشن کے مطبوعہ فرمے گذرائے۔ اور جو اغلاط رہ گئے تھے، ان کا استدراک لکھوا کر بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کیا، یہی اہتمام کاغذ کی عمدگی اور طباعت کی خوبی کا ہے کہ کتاب کی ظاہری صورت ہی دیکھ کر دل خوش ہوجاتا ہے اس اہم علمی خدمت پر کارکنان مجلس ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، اور ہم ان کی خدمت میں بصمیم قلب پرخلوص ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں، اور دُعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے، ان کی علمی خدمتوں کا بہترین صلہ ان کو دے اور علم دین کے لیے اس طرح کے مساعی جمیلہ کی مزید توفیق ان کو عنایت فرمائے۔

مجلس علمی ڈابھیل کی جلیل القدر مطبوعات

(یہاں اصلی قیمتیں درج کی جاتی ہیں ان پر صرف ایک آنہ فی روپیہ اس وقت رعایت کی جائے گی)

تخریج زیلعی اس عظیم القدر کتاب کے تعارف میں یہاں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ مصر و شام اور حرمین شریفین کے علماء و فضلاء نے مجلس علمی کی اس شاندار علمی خدمت پر بیحد تحسین کی ہے اور حکومت حجازنے بلا کسی خاص سعی و کوشش کے اس کے تین سو نسخے خریدے ہیں کاغذ اور طباعت وغیرہ نہایت اعلیٰ ہے قیمت ہر چہار جلد کامل صرف چودہ روپیہ للعہ/

خیر کثیر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ جلیل القدر عدیم النظیر کتاب قطعاً نایاب تھی "مجلس علمی" نے اس کو نہایت اعلیٰ صورت میں شایع کرکے فی الحقیقت بڑا احسان کیا ہے قیمت ایک روپیہ عہ/

البدور البازغہ یہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی تصنیف ہے اور خیر کثیر کی طرح یہ بھی کبھی طبع نہ ہوئی تھی اسمیں حضرت مصنفؒ نے اہم مباحث الہیہ و مسائل کلامیہ پر اپنے مخصوص حکیمانہ اور مجددانہ انداز میں بحث کی ہے قیمت پونے دو روپیہ ۱۲/ عہ

تفہیمات الٰہیہ کامل حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی ایک نایاب اور نادرۂ روزگار کتاب ہے جس کے قلمی نسخے بھی ہندوستان بھر میں دو چار سے زیادہ نہ تھے مجلس علمی نے بڑی شان کے ساتھ دو جلدوں میں شایع کیا ہے قیمت ہر دو جلد ساڑھے تین روپے (للعہ)

زاد الفقیر امام ابن ہمام کی یہ کتاب جو فقہ میں ہے قطعاً نایاب تھی اب تک غیر مطبوع تھی مجلس نے اسکو بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے قیمت ۱۲/

معارف لدنیہ حقائق و معارف پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قابل دید رسالہ قیمت ۶/

فیض الباری فی شرح البخاری یہ شیخ الاسلام خاتم المحدثین حضرت مولٰنا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ کی اُن تقاریر کا مجموعہ ہے جو حضرت ممدوح درس بخاری میں فرماتے تھے۔ بڑی محنت اور قابلیت سے انکو عربی میں مرتب کیا گیا ہے اور "مجلس علمی" نے بڑے اہتمام سے اس کو بھی مصر میں چھپوایا ہے فی الحقیقت صحیح بخاری کی نہایت بلند پایہ شرح اور علوم دینیہ بالخصوص فن حدیث کی بہترین دائرۃ المعارف ہے اسکے بھی تین سو نسخے حکومت حجاز نے خریدے ہیں کل چار جلدیں ہیں لیکن ہندوستان میں ابھی صرف پہلی دو جلدیں آئی ہیں فی جلد قیمت چھ روپیہ

مشکلات القرآن قرآن پاک کی جن آیات میں علمی اشکالات ہیں انکی تفسیر اور اشکالات کا حل حضرت مولٰنا انور شاہ کا خاص فن تھا یہ کتاب حضرت ممدوحؒ کی انہی تحقیقات کا مجموعہ ہے قیمت

خزائن الاسرار اسمیں حضرت قدس سرہ نے وہ مجرب اعمال و وظائف اور تعویذات جمع فرمائے ہیں جو احادیث میں مروی یا علماء سلف سے منقول ہیں قیمت ۶/

قادیانیوں کے رد میں حضرت کی خاص تالیفات

اکفار الملحدین عربی کفر و اسلام کی حقیقت اور انکی حدود کی تعیین ۱۲/

عقیدۃ الاسلام عربی مسئلہ حیات مسیح پر فاضلانہ اور علمی بحث قیمت عہ/

تحیۃ الاسلام عربی عقیدۃ الاسلام کا حاشیہ یا تکملہ قیمت ۱۲/

خاتم النبیین فارسی مسئلہ ختم نبوت پر اپنی شان کی واحد کتاب قیمت ۸/

نفحۃ العنبر حضرت مولٰنا انور شاہ صاحب قدس سرہ کی مختصر حیات بزبان عربی از مولٰنا محمد یوسف صاحب بنوری قیمت عہ/

احکام القبلۃ والمحاریب قبلہ اور سمت مساجد کے متعلق احکام و تفصیل

(مولوی) محمد منظور نعمانی پرنٹر و پبلشر نے بریلی الکٹرک پریس بریلی میں چھپوا کر دفتر "الفرقان" بریلی سے شایع کیا

مسئلہ علم غیب پر معرکہ خیز اور فیصلہ کن مناظرہ یہ سلانوالی (پنجاب) کے اس معرکۃ الآرا مناظرہ کی مکمل روئداد ہے جو حضرت مدیر الفرقان اور بریلوی پارٹی کے نقیب اعظم مولوی حشمت علی صاحب کے مابین مسئلہ علم غیب پر ذی الحجہ ۵۵ھ میں ہوا تھا۔ اس موضوع پر اتنا مکمل مناظرہ نہ اس سے پہلے کہیں ہوا اور نہ غالباً آئندہ ہو۔ اس مناظرہ نے فی الحقیقت اس بحث کو ہمیشہ کیلئے ختم کردیا، اہل بدعت کے تمام "دلائل" کے جوابات اور اہل سنت کے بے شمار لاجواب دلائل آپ اس میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں، یہ پورا مناظرہ مجلس مناظرہ ہی میں ایک دو نویسان مختصر نویس کی خاص کوشش سے قلمبند کرلیا گیا تھا آپکو اسکے مطالعہ میں مناظرہ ہی کا لطف آئیگا قیمت قسم اول ۸ر قسم دوم ۶ر

صاعقہ آسمانی کامل ہر دو حصہ در ضلع نینی تال و سنبھل ضلع مرادآباد کے دو زبردست اور معرکۃ الآرا مناظروں کی روئداد قیمت ہر دو حصہ ۱۲ر (صرف چند نسخے باقی ہیں)

فتح بریلی کا دلکش نظارہ یہ مرکز بدعت بریلی کے اس معرکہ خیز مناظرہ کی مکمل روئداد ہے جو محرم ۵۴ھ ہجری میں رضا خانیوں کے مدرسہ جامعہ رضویہ میں ہوا تھا، بانی مناظرہ نے جو بریلی ہی کے باشندہ تھے اہلسنت کے حق میں زبردست فیصلہ دیا ہے وہ بھی آخر میں درج ہے ضخامت مع ضمیمہ ۱۳۶ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے ۸ر رعایتی چھ آنے (۶ر)

کتب رد آریہ و عیسائی

مباحثہ سماج بریلی یہ تناسخ اور الہام وید کے موضوع پر جناب مولنا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان اور آریہ سماج کے مشہور مایہ ناز مناظر پنڈت رامچندر جی دہلوی کے ایک معرکۃ الآرا مناظرہ کی روئداد ہے مولنا ممدوح کی طرف سے وید کے غیر الہامی ہونے کی لاجواب دو خاص عقلی دلیلیں اور تناسخ کے ابطال میں دس نہایت روشن براہین اسمیں آپکو ملیں گی قیمت تین آنے (۳ر) رعایتی ڈھائی آنے (۰۲ر)

حدوث روح و مادہ یہ حضرت مدیر الفرقان دام فیضہ اور پنڈت گوپی چند دہلوی کے ایک عجیب مناظرہ کی روئداد ہے اسمیں بھی مدیر ممدوح نے روح و مادہ کو حادث ہونے پر عقلی و نقلی دلائل پیش کیے ہیں قیمت ۱ر رعایتی ۱ر

عدم انجیل اس رسالہ میں نہایت زبردست دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ جو انجیل خدا کی طرف سے حضرت مسیح پر نازل ہوئی تھی وہ دنیا میں کہیں موجود نہیں قیمت ۳ر رعایتی ۰۲ر

میلہ خدا شناسی از حضرت مولنا محمد قاسم صاحبؒ تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلامی حقانیت اور صداقت کا ثبوت قیمت ۳ر رعایتی ۰۲ر

ہدایت بانی برائے فرقہ رضا خانی یعنی روئداد "مناظرہ گیا" یہ اس عظیم الشان تحریری اور تقریری مناظرہ کی روئداد ہے جو "حسام الحرمین" کی تکفیری بحث پر اواخر ۵۵ھ میں "مدیر الفرقان" اور رضا خانیوں کے نقیب اعظم مولوی حشمت علی صاحب کے مابین صوبہ بہار کے مشہور شہر گیا میں تین دن متواتر ہوا تھا عجیب و غریب تحقیقات پر حاوی ہے ضخامت ۱۵۰ صفحات قیمت ۸ر رعایتی ۶ر

رضا خانیت پر کاری ضرب یعنی رسالہ "مقامع الحدید" اس رسالہ میں تحریک رضا خانیت کی تاریخ اور اسکی اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے اور رضا خانیوں کے ان تیس اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے جو اکابر علماء دیوبند پر کئے جاتے ہیں نیز رضا خانی مذہب کا نہایت دلچسپ فوٹو رضا خانی لٹریچر سے پیش کیا گیا ہے یقین ہے کہ آپنے اس موضوع پر ایسی پُرلطف کتاب ملاحظہ نہ فرمائی ہوگی ضخامت ۷۰ صفحے کاغذ اعلیٰ قیمت ۶ر رعایتی ۵ر

تحریری مناظرہ اسمیں آپکو اہل بدعت کے اکثر مشہور اختلافی مسئلوں پر مکمل بحث ملیگی قیمت ۱۰ر رعایتی ۸ر

کوائف بمبئی ربیع الاول ۵۵ھ میں مولوی حشمت علی وغیرہ رضا خانی مولویوں کی نفاق انگیز شورش اور مسلمانان بمبئی کی اصرار استدعا پر مناظرہ کیلئے حضرت مدیر الفرقان کا سفر بمبئی اور اسکے کوائف و حالات قیمت ۲ر رعایتی ۱ر

جہنم کی بشارت قبلگان بریلی کی طرف سے ایک رسالہ بنام "موت کا پیغام" شایع ہوا تھا یہ اس کا مسکت اور دنداں شکن جواب ہے یہ بحث بھی نہایت تفصیل اور تحقیق سے آگئی ہے کہ جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی اپنے فتوے اور اپنے اصول سے خود کافر ٹھہرتے ہیں بالکل لاجواب ہے قیمت ۲ر رعایتی ۱ر

نئے مجدد کا نیا ایمان دلچسپ و قابل دید ہے قیمت رعایتی ۱ر

الکوکب الیمانی اسکا روشن ثبوت کہ خانصاحب بریلوی کے فتوے سے انکے کسی معتقد کا نکاح درست نہیں ہوسکتا۔ قیمت ۲ر رعایتی ۱ر

بریلوی کا نادان دوست موضوع نام سے ظاہر ہے قیمت آدھ آنہ (۰ر)

نوٹ:۔ فرمایش کے ساتھ اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیے اور کتابیں زیادہ منگوانی ہوں تو قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام بھی لکھیے

رجسٹرڈ نمبر اے (۳۵۳)

ہماری خاص قابل دید کتابیں

داڑھی اور فطرت قیمت ۳ رعایتی ۲

سیرت و مذہب و اخلاق نعمت بیجانی ۱۲

تذکرہ امام ربّانی (یعنی الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر ۱۳۵۷ھ)

ہم کو بجا فخر ہو کہ حضرت امام ربّانی کے جن تجدیدی کارناموں کو دنیا نے یکسر بھلا دیا تھا تین سو برس کے بعد ادارہ الفرقان کی اس کوشش نے پھر اس کی یاد تازہ کر دی ہی۔ اس نمبر میں حضرت مجدد الف ثانی کے حالات زندگی اور مساعی احیاء ملت کے متعلق مشاہیر علماء کرام و ارباب تحقیق کے بیس مقالے ہیں، اس کے مطالعہ سے آپکو یہ معلوم ہوسکیگا کہ اسلامیان ہند پر حضرت امام ربّانی کا کتنا احسان ہے اور اسی کے مطالعہ سے آپ پر یہ راز کھل سکیگا کہ حضرت کے مجدد الف ثانی ہونے کا کیا مطلب ہی؟ اور تمام اُمت میں صرف آپ ہی کو پوری ہزار برس کی تجدید کا یہ منصب جلیل کن خصوصیات کی بنا پر عطا ہوا۔ بعض اکابر کا ارشاد ہی کہ جس شخص نے یہ نمبر نہ دیکھا درحقیقت وہ بڑی نعمت اور بڑی روشنی سے محروم رہا (اب بہت تھوڑے سے نسخے باقی ہیں) قیمت کاغذ اعلیٰ عہ کاغذ معمولی عہ

تذکار شہید (یعنی الفرقان کا شہید نمبر ۱۳۵۵ھ)

الفرقان کا یہ نمبر حضرت شاہ اسمٰعیل شہید فی سبیل اللہ کی یادگار میں شایع ہوا تھا اسمیں شہید ممدوح کی سوانح حیات آپ کی دینی و ملّی خدمات اعلاء کلمۃ الحق کیلئے آپ کی تحریک جہاد اور احیاء توحید و سنت کے لیئے آپ کی عام مساعی کا نہایت مکمل و مفصل تذکرہ ہی، نیز اہل بدعت نے آپ کے خلاف جو بعض ناپاک الزامات تراشے ہیں اُنکا نہایت مدلل اور بلیغ رد کیا گیا ہی (قریب الختم ہی) قیمت ۸

اسلام کا نظریہ سیاسی

اسلام کے سیاسی نظام پر متکلم اسلام مولٰنا سید ابو الاعلےٰ مودودی کا بصیرت افروز مقالہ ہی جسمیں اسلامی سیاست کے بنیادی اصول کتاب و سنت کی روشنی میں واضح کر کے ثابت کیا گیا ہی کہ سیاست کا اس سے اعلیٰ اور بلند نظریہ کوئی نہیں ہوسکتا اور صرف یہی سیاسی نظام ایسا ہی جو دنیا کو دائمی امن و چین کا ضامن ہوسکتا ہی قیمت صرف ۲

اسلام میں قربانی

بعض منکرین حدیث" کے رد میں یہ بھی مولٰنا مودودی ہی کا مختصر مقالہ ہی جس میں صرف آیات قرآنی سے قربانی کا ثبوت دیا گیا ہی اور اسکی حکمتیں بھی لکھی گئی ہیں قیمت ۱

سیرت نبویہ کے متعلق ساڑھے تین سو جدید نظریات پیغمبر اسلام کو برہان کامل کی صورت میں پیش کرنیوالی پہلی کتاب

النبی الخاتم (صلی اللہ علیہ وسلم)

(تصنیف رئیس التحریر حضرت مولٰنا سید مناظر احسن گیلانی مدظلہ العالی)

اس جلیل القدر اور عدیم النظیر کتاب میں سیرت نبوی کے متعلق تقریباً ساڑھے چار سو عنوانات کے ماتحت بحث کی گئی ہی جن میں سے تین سو سے زائد عنوانات کا تعلق اُن جدید نظریات سے ہی جن کی طرف سیرت کے باب میں اس سے پہلے غالباً کسی مولف سیرت نے توجہ نہیں کی، اس کتاب کو دیکھ کر ہر صاحب عقل و بصیرت انسان اس یقینی نتیجہ پر پہنچیگا کہ داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک اور مقدس زندگی ہی اُن کی صداقت کی روشن ترین دلیل ہے، جس کے بعد کسی اور دلیل و برہان کی قطعاً حاجت نہیں۔ کاغذ بہترین، کتابت طباعت عمدہ، مجلد خوشنما۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

فتنہ رفض و تفضیلیت کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا جہاد

رد رفض کے رد میں اگرچہ علماء کرام نے بے شمار کتابیں لکھی ہیں لیکن حضرت امام ربّانی نے اپنے مختلف مکتوبات میں اس پر جو کچھ لکھا ہی وہ بالکل بے نظیر ہے بعض مضامین کے متعلق تو خود حضرت نے تصریح فرمادی ہی کہ یہ الہامی ہیں۔ حضرت کے یہ تمام مضامین مع ترجمہ کے اس رسالہ میں جمع کر دیئے گئے ہیں قیمت ۳ رعایتی ۲

تمدن اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے نام

یہ درحقیقت مولٰنا عبد الماجد صاحب دریابادی بی اے ایڈیٹر صدق لکھنؤ کا ایک لکچر ہی جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی بزم تاریخ و تمدن اسلام کے روبرو پڑھا گیا تھا آج کل کے ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو اسکا دیکھنا ضروری ہی قیمت صرف ۱۰ (انگریزی کالجوں کے طلبہ ۱ کا ٹکٹ بھیجکر مفت منگا سکتے ہیں)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ الفرقان بریلی